چین پاکستان کا سب سے بڑا تجارتی ساتھی بن چکا... لی شاؤ تنگ اکنامک کونسلر چائنہ (۳۲ الف)

urdudigest.com

اُردو ڈائجسٹ

مارچ ۲۰۱۶ء



urdudigest.pk

www.urdudigest.com

نڈر، بے باک

لاکھوں دلوں کی دھڑکن

قدرتی آفات میں دکھی انسانیت کے مسیحا

دنیا کی طاقتور حکومتوں کو مطلوب

شعلہ بیان مقرر

امیر جماعۃ الدعوۃ

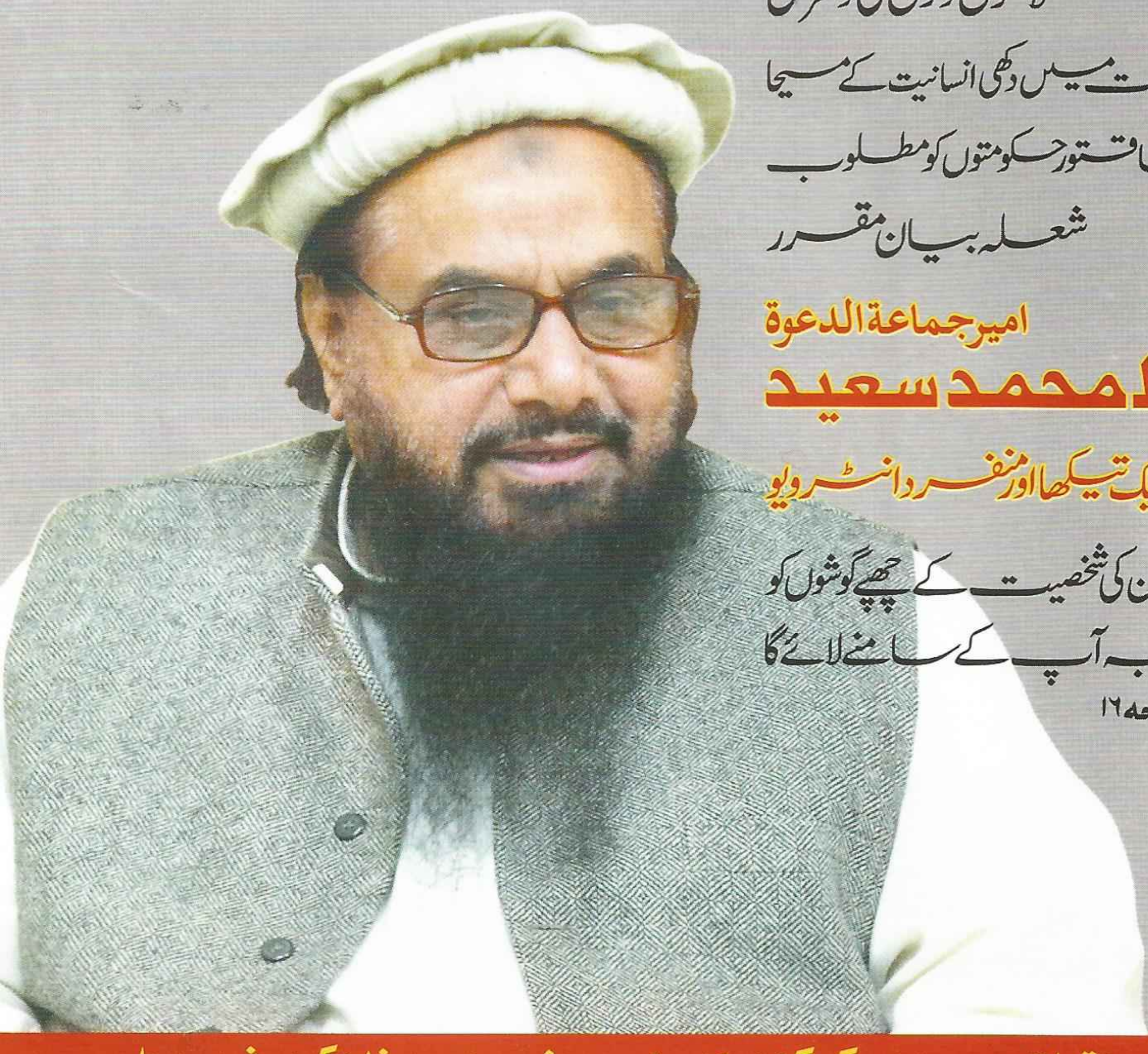
حافظ محمد سعید

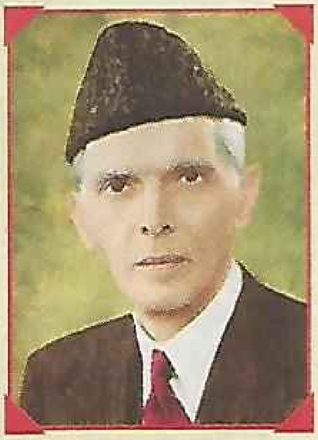
سے ایک تیکھا اور منفرد انٹرویو

جو اُن کی شخصیت کے چھپے گوشوں کو

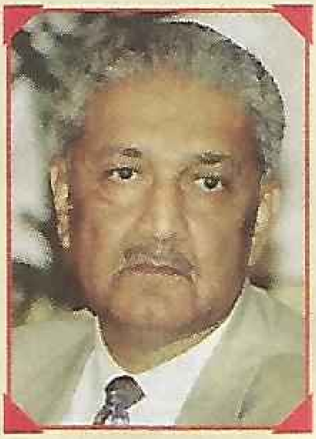
پہلی مرتبہ آپ کے سامنے لائے گا

صفحہ ۱۶





محسنِ پاکستان ڈاکٹر عبدالقدیر خان
کا پیغام اہلِ دانش کے نام



جہانِ قائد ایک ایسی تاریخی دستاویز ہے جو حضرت قائداعظم محمد علی جناح کے تمام تر حالاتِ زندگی کا احاطہ کرتی ہے۔ پانچ جلدوں پر مشتمل یہ نہایت ہی معلومات افزاء کتاب ہے جسے علامہ عبدالستار عاصم صاحب نے پوری دیانت، خلوص اور جذبہ حُب الوطنی سے مرتب کیا ہے۔ مجھے یقین ہے ہمارے تعلیمی ادارے سکولز، کالجز اور یونیورسٹیاں اس نادر نسخے کو اپنی لائبریریز میں شامل کر کے طلباء کی تعلیمی ضرورتوں کا کما حقہ استفادہ کریں گے۔

جہانِ قائد کا ہر گھر میں ہونا بھی اس لئے ضروری ہے تاکہ ہماری نوجوان نسل اپنے اس محسن کی تنظیم، یقینِ محکم، عملِ پیہم اور کام کام اور صرف کام کے فلسفے سے آگاہی حاصل کر سکیں جس پر چل کر پاکستان جیسا خطہ وجود میں آیا جہاں آج آزادی جیسی نعمتیں فراواں ہیں۔

علامہ عبدالستار عاصم صاحب اور ان کے معاونین اور شریک کار کو میری دلی مبارکباد کہ انہوں نے برسوں کو لمحوں میں سمیٹ دیا ہے۔ صوبائی اور مرکزی حکومت کو بھی اس علمی خزانے کو کتابی شکل میں محفوظ کرنے والوں سے دام درمے اور سخنے تعاون کرنا چاہیئے۔

ڈاکٹر عبدالقدیر خان 21 دسمبر 2015ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اللہ کا قرآن

بلاشبہ جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے، ہم نے ان کے لیے ان کے اعمال پُرکشش بنا دیے ہیں، لہٰذا وہ بھٹکے پھرتے ہیں O وہی لوگ ہیں جن کے لیے بدترین عذاب ہے اور آخرت میں بھی وہی زیادہ خسارے میں ہوں گے O اور (اے نبی!) بلاشبہ آپ کو تو ایک حکیم اور علیم کی طرف سے یہ قرآن سکھایا جاتا ہے۔

(سورہ النمل)

رسول ﷺ کا فرمان

حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ''تم کبھی اپنے حق میں یا اپنی اولاد اور مال و جائداد کے حق میں بددعا نہ کرو، مبادا وہ وقت دعا کی قبولیت کا ہو اور تمھاری وہ دعا اللہ تعالیٰ قبول فرما لے۔ (جس کے نتیجے میں خود تم پر یا تمھاری اولاد یا مال و جائداد پر کوئی آفت آجائے)''

(صحیح مسلم)



اُردو ڈائجسٹ

مارچ 2016ء
جمادی الاوّل 1437ھ
جلد نمبر 56 شمارہ نمبر 03

urdudigest.com www.urdudigest.pk

مارکیٹنگ

ڈائریکٹر: ذکی اعجاز قریشی 0300-8460093

اشتہارات

advertisement@urdu-digest.com
مینیجر ایڈورٹائزمنٹ: 0300-4005579
لاہور: ندیم حامد

سالانہ خریداری 560 روپے کی بچت کے ساتھ

خریداری کے لیے رابطہ subscription@urdu-digest.com
19/21 ایکڑ سکیم، سمن آباد، لاہور فون: 92 42 37589957
پاکستان 1560 کے بجائے 1000 روپے میں اُردو ڈائجسٹ گھر بیٹھے حاصل کیجیے
بیرون ملک 100 امریکی ڈالر
اندرون و بیرون ملک کے خریدار اپنی رقم بذریعہ بینک ڈرافٹ
درج ذیل اکاؤنٹ نمبر پر ارسال کریں
URDU DIGEST Current A/C No. 800380
Bank of Punjab (Samanabad, Lahore.)
Branch Code No. 110

ادارتی آفس

اپنی تحریریں اس پتے پر بھیجیں
325, G-III جوہر ٹاؤن، لاہور
فون نمبر: +92-42-35290738 فیکس: +92-42-35290731
ای میل: editor@urdu-digest.com

قیمت: 100 روپے

طابع و ناشر الطاف حسن قریشی نے اردو ڈائجسٹ پرنٹرز 24۔ سرکلر روڈ سے چھپوا کر سمن آباد لاہور سے شائع کیا

ایگزیکٹو ایڈیٹر نوٹ



اہل تیونس کا پیغام ہمارے حکمرانوں کے نام

موسم کی حدت نے سیاسی درجہ حرارت بھی بڑھا دیا۔ آرمی چیف کی مدت ملازمت میں توسیع کے حوالے سے بیان کی گونج ابھی فضاؤں میں تھی کہ آصف زرداری کا متنازع اور ذومعنی بیان سامنے آ گیا۔ اس بیان نے جلتی پر تیل کا کام کیا اور پرنٹ و الیکٹرانک میڈیا میں اس حساس موضوع پر تجزیوں و تبصروں کے در کھل گئے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ سندھ میں وسیع پیمانے پر پکڑ دھکڑ، عزیر بلوچ کے ہوشربا انکشافات اور ذوالفقار مرزا کے رینجرز کو بیان سے گھبرا کر خود ساختہ جلاوطن آصف زرداری نے پہلے تو فوج کی حمایت میں بیان دینے میں ہی عافیت جانی لیکن جب اس غیر متوقع بیان پر پیپلزپارٹی کے اکابرین بوکھلاہٹ کا شکار ہو گئے تو انھوں نے اپنے ہی بیان کے ایک حصے کی تردید کر دی۔ دوسری طرف چند دن پہلے جناب نواز شریف نے نیب کو براہ راست مخاطب کرتے ہوئے کارروائی کی دھمکی دے ڈالی۔ بلاشبہ گزشتہ کچھ عرصہ سے نیب خاصا متحرک ہو گیا ہے۔ پہلے ڈاکٹر عاصم کی گرفتاری اور پھر ڈی ایچ اے کے اعلیٰ افسران سے تحقیقات پر ایک ہنگامہ بپا ہو گیا۔ اس کے علاوہ کچھ بڑے کاروباری افراد کے ساتھ توہین آمیز سلوک کی کہانیاں بھی زبان زد عام ہیں۔ کرپشن کے حوالے سے اب صرف پیپلزپارٹی یا تحریک انصاف ہی نہیں، لیگی وزرا کے نام بھی سوشل میڈیا اور خبروں کی زینت بن رہے ہیں۔ افراتفری کا یہ ماحول لڑکھڑاتی معیشت میں بہتری کے مواقع ضائع کرنے کا سبب بن رہا ہے۔ اُدھر طاقت کے ستون، سی پیک اور تیل کی قیمتوں میں ناقابل یقین کمی جیسی نعمتوں سے مستفید ہونے کے بجائے کرپشن جیسے ناسور کو مس ہینڈل کر کے پتا نہیں قوم کی کون سی خدمت سرانجام دے رہے ہیں۔

کسی کو احساس تک نہیں کہ نوجوان نجی اور سرکاری مگر غیر معیاری ڈگریاں لیے نوکریوں کی تلاش میں دربدر ہیں۔ چند سال پہلے تک اجناس کی معقول قیمتیں حاصل کرنے والے کسان دنیا میں زرعی اجناس کی قیمتوں میں غیر معمولی کمی کی بدولت قرضوں کے بوجھ تلے سسک رہے ہیں۔ ٹیکسٹائل سمیت کئی صنعتوں سے وابستہ کارخانے مختلف وجوہات کی بنا پر بند ہو رہے ہیں۔ ایکسپورٹ کے اعداد و شمار یہ ظاہر کرتے ہیں کہ صنعت، زراعت اور برآمدات کے حوالے سے حکومتی پالیسی سرے سے موجود ہی نہیں۔ عالمی اسٹاک مارکیٹوں میں مندی کی بدولت ہماری ننھی منی اسٹاک مارکیٹ میں بھی بھونچال آ چکا ہے۔ ۸۰ء کی دہائی میں طلب میں کمی کی وجہ سے تیل کی قیمتیں ۱۰ ڈالر تک گر گئی تھیں جس کی وجہ سے تیونس سمیت کئی ممالک کو سیاسی عدم استحکام کا سامنا کرنا پڑا۔ تیل کی آمدنی

میں کمی کی وجہ سے تیونس کے صدر حبیب بورغیبہ کی حکومت نے آئی ایم ایف سے کڑی شرائط پر قرضے لیے اور اسے گندم پر دی گئی سبسڈی ختم کرنا پڑی۔ روٹی کی قیمت بڑھنے سے عوام سڑکوں پر نکل آئے۔ مظاہرین کو کنٹرول کرنے کی تگ و دو میں ۱۰۰ افراد ہلاک ہو گئے اور ملک میں ایمرجنسی لگانی پڑی۔ کچھ ہی عرصہ بعد ایک ''کُو'' کے ذریعہ ڈاکٹروں کے ایک پینل نے صدر حبیب بورغیبہ کو ان فٹ قرار دے کر ان کی کابینہ کے ایک وزیر اور اعلیٰ فوجی عہدیدار زین العابدین کو ملک کا نیا صدر بنا دیا۔ زین العابدین نے ۱۹۸۸ء میں اپنی بیوی نائمہ الکافی کو طلاق دے دی۔ تین بیٹیوں کی ماں نائمہ صدر زین العابدین کے سابق باس جنرل کافی کی بیٹی تھی۔ پھر انہوں نے ۱۹۹۲ء میں طرابلیسی خاندان کی کم تعلیم یافتہ، معاشقوں اور شبینہ پارٹیوں کی دلدادہ ہیئر ڈریسر لیلیٰ بن علی سے شادی کر لی۔ اس کو متعارف کرانے میں اس کے ایک سابق عاشق اور صدر کے بزنس مین دوست فرید مختار نے اہم کردار ادا کیا۔ یہ شادی صدر زین العابدین اور ''عرب بہار'' کے آغاز کی بڑی وجہ بن گئی۔ شادی کے بعد لیلیٰ اور اس کا خاندان طاقت، لالچ اور بے رحمی کا نشان بن گیا۔ لیلیٰ اکثر قومی طیارے پر یورپ کی مارکیٹوں میں شاپنگ کرنے جاتی۔ اس کے بھانجے اور داماد پر فرانس میں منشیات کے مقدمے بنے اور سزائیں ہوئیں۔ ملک سے فرار ہوتے ہوئے وہ حکومت کا ۱.۵ ٹن سونا بھی لے گئی۔ کرپشن کے علاوہ مظاہروں اور احتجاج کی بڑی وجہ بے روزگاری بھی تھی۔ ۹۵ء کے لگ بھگ صدر زین العابدین نے عوام کو اعلیٰ تعلیم یافتہ بنانے کے لیے ملک بھر میں تعلیمی اداروں کی سرپرستی کی تاکہ وہ ڈگریاں حاصل کر کے یورپ اور دوسرے ملکوں میں نوکریاں حاصل کر سکیں۔ لیکن وہ معیار تعلیم پر کنٹرول نہ رکھ سکے۔ اُدھر یورپی ممالک کی معیشت بھی کمزور ہو گئی۔ اب تو جوانوں کے پاس ڈگریاں تو تھیں لیکن کوئی ہنر نہ تھا اس لیے بیروزگار نوجوان ناامید ہو گئے۔ تیونس کے شمال مشرقی سرحدی علاقوں میں ترقی نہ ہونے کی بنا پر بیروزگاری عروج پر تھی۔ ۱۷ دسمبر ۲۰۱۰ء کو تیونس میں ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ، چھبیس سالہ ریڑھی بان محمد بوعزیزی نے میونسپل انتظامیہ کے بے رحمانہ روّیے سے دلبرداشتہ ہو کر اپنے آپ کو آگ لگا لی جس سے پُرتشدد ہنگامے پھوٹ پڑے اور زین العابدین کو ۲۴ سالہ اقتدار کو خیرباد کہہ کر جدہ فرار ہونا پڑا۔

ہمارے حکمرانوں کو صدر حبیب بورغیبہ اور زین العابدین کے انجام سے سبق حاصل کرتے ہوئے اپنی ذات اور خاندان کو کرپشن سے دور رکھ کر معیشت کی بہتری کے اقدامات اٹھانے ہوں گے اور صوبوں کی مشاورت سے زرعی پالیسی بھی مرتب کرنا ہو گی۔ معاشی ماہرین کے مطابق آئی ایم ایف سے لیے گئے اربوں ڈالر کے قرضوں کی واپسی کے لیے نہ صرف پی آئی اے اور سٹیل مل جیسے اداروں کی جلد از جلد نجکاری کرنا ہو گی بلکہ یہ بھی یقینی بنانا ہو گا کہ اوورسیز پاکستانی موجودہ تناسب سے ہی اپنے وطن میں زرمبادلہ بھجواتے رہیں۔ اس کے ساتھ ہی یہ دعا بھی کہ عالمی منڈی میں تیل کی قیمتیں ۴۰ ڈالر سے اوپر نہ جائیں اور ملک میں سیاسی استحکام بھی قائم رہے تاکہ سی پیک جیسے منصوبوں سے بھرپور فائدہ اٹھایا جا سکے۔ اگر ایسا نہ کیا گیا تو تیونس کی طرح پاکستان میں بھی عوامی غیض و غضب دور نہیں۔

اس شمارے میں

خصوصی انٹرویو

16

جماعۃ الدعوۃ کے سربراہ

حافظ محمد سعید کا ذہن کشا انٹرویو

کئی سربستہ رازوں سے پردہ اُٹھتا ہے

الطاف حسن قریشی







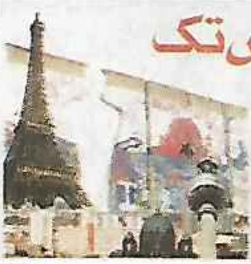
کچھ اپنی زبان میں

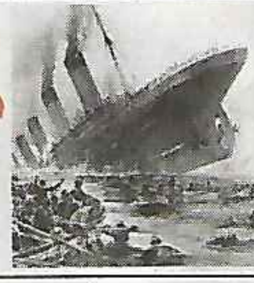
اسلامیات

نکتہ نظر، قومی مسائل

طب وصحت، غذائیات ونفسیات















احتساب کا ایک شفاف نظام

جمہوری اور ترقی یافتہ معاشروں میں چند قدریں بنیادی اہمیت رکھتی ہیں! اقتدار میں عوام کی شرکت، صاحبان اختیارات کا احتساب اور قانون کی عملداری۔ اسلام کے سیاسی نظام کے اندر ایک تصور ہر چیز پر حاوی ہے کہ اقتدار ایک مقدس امانت ہے جسے رب کائنات کی طے شدہ حدود ہی میں بروئے کار لایا جاسکتا ہے۔ قرارداد مقاصد میں یہ شرط بھی عائد کی گئی ہے کہ اقتدار کے استعمال کا حق صرف عوام کے منتخب نمائندوں کو حاصل ہے۔ پاکستان جس ماحول اور جس معاشرتی پس منظر میں قائم ہوا تھا، اس میں انگریزوں کی غلامی کے نتیجے میں بہت ساری سماجی برائیاں پیدا ہوچکی تھیں۔ قائداعظمؒ نے دستور ساز اسمبلی میں ۱۱؍اگست ۱۹۴۷ء کی پالیسی تقریر میں رشوت خوری، بدعنوانی، اقربا پروری اور ذخیرہ اندوزی کی لعنتوں کا بطور خاص ذکر کیا تھا اور اہل وطن کو اُن سے نجات پانے پر زور دیا تھا۔ بھارت اور پاکستان کے مابین آبادی اور جائیداد کے تبادلے سے مزید اخلاقی بیماریاں وجود میں آئیں، مگر سیاست دان اور اعلیٰ سطح کے سرکاری ملازمین بڑی حد تک مالی بدعنوانیوں سے محفوظ رہے اور جنرل ایوب خاں کے اقتدار سنبھالنے سے پہلے کسی وزیر یا کسی سیکرٹری کے بارے میں رشوت لینے کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا تھا۔

ہر مارشل لا کے نفاذ کے ساتھ سیاست دانوں اور سرکاری عمال کے احتساب کا جو نظام وجود میں آتا رہا، وہ زیادہ تر انتقامی جذبے کی پیداوار تھا۔ ایوب خاں نے اپنا اقتدار قائم کرنے کے لیے بڑے بڑے سیاست دان 'ایبڈو' اور طاقت ور اور تجربے کار اعلیٰ وفاقی اور صوبائی سرکاری عمال فارغ کردیے۔ جنرل یحییٰ نے ۳۱۳ بیوروکریٹس نکال دیے اور مسٹر بھٹو سویلین چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر بنے، تو ملازمت سے فارغ کیے جانے والے سرکاری افسروں کی تعداد تیرہ سو سے تجاوز کرگئی تھی۔ جنرل ضیاالحق کے دور حکومت کے ابتدائی مرحلے میں بعض سیاست دان 'انتخابات سے پہلے احتساب' کا نعرہ بلند کرتے رہے اور جن انتخابات کو نوے دنوں کے اندر منعقد ہونا تھا، وہ آٹھ سال تک معطّل رہے۔ جنرل پرویز مشرف نے احتساب کے لیے قومی احتساب بیورو (نیب) اسی دعوے کے ساتھ قائم کیا کہ اس بار سیاست دانوں، جرنیلوں اور ججوں کا احتساب بلاامتیاز ہوگا، مگر اس کا بنیادی مقصد بھی سیاست دانوں کا اثر و رسوخ محدود کرنا اور اپنے اقتدار کی خاطر ایک سیاسی جماعت کا ڈھانچہ کھڑا کرنا تھا، چنانچہ چودھری شجاعت حسین کی سربراہی میں قاف لیگ وجود میں آئی اور میاں نواز شریف اور اُن کا خاندان اپنی بقا کے لیے سعودی عرب میں پناہ لینے پر مجبور ہوا۔ جلاوطنی کے زمانے میں محترمہ بے نظیر بھٹو اور جناب محمد نواز شریف میں شدت سے یہ احساس پیدا ہوا کہ ان کے مابین چپقلش سے غیرسیاسی قوتیں برسر اقتدار آئی ہیں اور ان کی روک تھام کے لیے بنیادی امور پر اتفاق ضروری ہے، چنانچہ لندن میں دونوں راہنماؤں نے 'میثاق جمہوریت' پر دستخط کیے جس میں ایک شق یہ بھی تھی کہ ایک بااختیار

اور غیر جانبدار احتساب کمیشن سپریم کورٹ کے ریٹائرڈ جج کی سربراہی میں قائم کیا جائے گا۔ پرویز مشرف کا دور ختم ہوا اور پیپلز پارٹی برسر اقتدار آئی، مگر بدقسمتی سے بڑی سیاسی جماعتیں نیب کی جگہ ایک غیر جانبدار احتساب کمیشن کے قیام پر ایک دوسرے سے تعاون کرنے پر آمادہ نہیں ہوئیں، البتہ دستور میں یہ ترمیم کی گئی کہ نیب کا چیئرمین قائد ایوان اور قائد حزب اختلاف کی رضامندی سے تعینات کیا جائے گا۔ نیب آرڈیننس کے اغراض و مقاصد اور طریق کار میں بڑے سقم پائے جاتے ہیں اور اس میں ریٹائرڈ فوجی افسروں کا غلبہ ہے جس کے باعث احتساب کا عمل بہت سارے مسائل پیدا کر رہا ہے۔ عمومی تاثر یہ ہے کہ دہشت گردی کے خلاف فوجی آپریشن اس امر کا متقاضی ہے کہ کرپٹ عناصر پر مضبوط ہاتھ ڈالا جائے جو دہشت گردوں کے سہولت کار بنے ہوئے ہیں، چنانچہ اسٹیبلشمنٹ کے ادارے نیب کی پشت پر آن کھڑے ہوئے ہیں اور پکڑ دھکڑ شروع ہوگئی ہے جس سے ایوان اقتدار لرز اُٹھا ہے۔

ماضی کے تجربات اور مستقبل کے تقاضوں کی روشنی میں احتساب کے ایک ایسے نظام کی تشکیل ناگزیر ہوتی جا رہی ہے جس میں کرپشن کو وجود میں آنے سے روکا جا سکے، یعنی ایسے قانونی، اخلاقی اور اصلاحی اقدامات کیے جائیں جو بدعنوانی کا سدباب کر سکیں۔ دیکھنے میں آیا ہے کہ اکثر اوقات ضمیر کی طاقت قانون کی طاقت سے بدرجہا مؤثر ثابت ہوتی ہے، اس لیے انسانی ضمیر کی بیداری کا انتظام ازبس ضروری ہے اور اس مقصد کے لیے میڈیا کو نہایت سلیقے سے استعمال کیا جا سکتا ہے۔ رزق حلال کی اہمیت پر ڈرامے تیار کیے جائیں۔ تعلیمی اداروں میں تقاریر کا سلسلہ شروع کیا جائے۔ وہ سیاسی شخصیتیں اور سرکاری عمال رول ماڈل کے طور پر پیش کیے جائیں جو فرض شناسی اور دیانت داری سے زندگی بسر کر رہے ہیں۔ اس طرح معاشرے میں خیر کا جذبہ فروغ پا سکتا ہے اور جدید ٹیکنالوجی کے ذریعے نگرانی کا عمل بہت بہتر بنایا جا سکتا ہے۔ ایک مؤثر مانیٹرنگ سسٹم خرابیوں اور بے اعتدالیوں کی روک تھام اور سدباب میں بہت مؤثر ثابت ہوگا۔ فیصلے جس قدر بروقت ہوں گے، اسی قدر کرپشن کے امکانات کم ہوتے جائیں گے۔ اطلاعات تک رسائی کے قانون پر اگر نیک نیتی سے عمل کیا جائے، تو اختیارات کا ناجائز استعمال بتدریج ختم ہو جائے گا۔ حقیقی احتساب کے تناظر میں سب سے اہم بات یہ ہے کہ سیاسی اقتدار تک پہنچنے کے ذرائع شفاف ہوں اور بیوروکریسی کے طور اطوار جمہوری اور جواب دہی کے احساس سے معمور نظر آئیں۔ بدقسمتی سے ہماری قومی قیادت اس اہم ترین پہلو سے غفلت برت رہی ہے۔ آئین میں انتخابات لڑنے والوں کی ذہنی استعداد اور شخصی کردار کی چھان پھٹک کے لیے جو چھلنی فراہم کی گئی ہے، وہ مختلف اسباب سے غیر مؤثر ہوئی ہے۔ بددیانت اور بدکردار لوگ انتخابات میں حصہ لینے کے اہل قرار پاتے ہیں جو پیسے کے زور پر اسمبلیوں میں آ جاتے ہیں اور عوام کے منتخب نمائندوں کی حیثیت سے قومی وسائل پر شبخون مارتے ہیں۔ اس کے علاوہ روایتی ایس ایچ او اور مال پٹواری کرپشن کے منبع ہیں اور سرکاری ملازمین ریاست کے بجائے حکمرانوں کے ملازم بنے ہوئے ہیں۔ ہمیں یہ پورا بوسیدہ نظام تبدیل کرنا اور بے لاگ احتساب کا قابل اعتماد بندوبست عدلیہ کے تعاون سے تشکیل دینا ہوگا جس کے سامنے معاشرے کے تمام طبقات جواب دہ ہوں، تاہم اس عمل میں اعتدال، توازن اور شفافیت غایت درجہ ضروری ہے۔

الطاف حسن قریشی

ماہنامہ اردو ڈائجسٹ اپنی اشاعت کے چار پانچ برسوں ہی میں پاکستان کے علاوہ ان ملکوں میں بھی نہایت مقبول ہو چکا تھا جہاں اردو پڑھنے والے قاری موجود تھے۔ ہر روز سینکڑوں خطوط آتے اور ہمارے دفتر میں شائقین کا ایک تانتا بندھا رہتا۔ نوجوان آتے اور اپنے مسائل بیان کرتے۔ کالجوں اور یونیورسٹیوں کے اساتذہ' ادیب' شاعر اور فوج کے چھوٹے اور اعلیٰ افسر بھی گاہے گاہے آتے رہتے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ برادر مکرم جناب ڈاکٹر اعجاز حسن قریشی سے ملاقات کے لیے جناب حافظ عبداللہ بہاولپور سے آتے تھے اور دیر تک علی گڑھ یونیورسٹی کی باتیں کرتے رہتے۔ بعض اوقات اُن کے ہمراہ اُن کے بھانجے بھی ہوتے جو بہاولپور میں تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ اُن کا نام حافظ محمد سعید تھا۔ اس نوجوان کے چہرے سے ذہانت ٹپکتی تھی اور شخصیت میں بلا کی کشش تھی۔ وقت گزرتا گیا اور بدلتے ہوئے ملکی حالات نے ہمارے لیے ان

جماعۃ الدعوۃ کے سربراہ
حافظ محمد سعید کا ذہن کشا انٹرویو

کئی سربستہ رازوں سے پردہ اُٹھتا ہے

الطاف حسن قریشی



گنت محاذ کھول دیے۔ اسلامی ریاست میں سوشلزم کا نظام لانے کی باتیں ہونے لگیں اور اسلامی نظریات پر تابڑ توڑ حملے دیکھنے میں آئے۔ ہمیں خیال آیا کہ دینی زعما اور یونیورسٹیوں میں اسلامی شعبوں کے اساتذہ سے قریبی تعلق پیدا کر کے ایک نہایت مضبوط محاذ قائم کیا جائے۔ پنجاب یونیورسٹی کے علامہ علاؤالدین صدیقی ہم دونوں بھائیوں کے استاد تھے اور اُن سے راہنمائی حاصل کرنے کا سلسلہ پہلے ہی موجود تھا۔ ان دنوں انجینئرنگ یونیورسٹی میں جناب ابوبکر غزنوی شعبہ علوم اسلامی کے سربراہ تھے۔ میں اُن کی خدمت میں حاضر ہوا۔ وہ اپنے زمانے کے جید عالم دین اور جناب ڈاکٹر داؤد غزنوی کے فرزند ارجمند تھے۔ وہ چند اساتذہ کے ہمراہ یونیورسٹی کے لان میں بیٹھے تھے۔ انہی میں جناب حافظ محمد سعید بھی تھے۔

حافظ صاحب سے بعدازاں یونیورسٹی ہی میں چند ملاقاتیں ہوئیں۔ وہ سعودی عرب میں مفتی اعظم عبدالعزیز بن باز سے ذہنی وسعت اور اسلامی دعوت کا عظیم جذبہ لے کر آئے تھے اور انہیں سعودی حکومت کا اعتماد بھی حاصل تھا۔ یہ اعتماد پاکستان میں دینی مدارس اور مساجد کے قیام اور فروغ میں بہت کام آیا۔ حافظ صاحب نے الدعوۃ والارشاد کے نام سے ایک تنظیم قائم کر رکھی تھی اور مظلوم کشمیریوں کو جبر استبداد سے نجات دلانے کے لیے 'لشکر طیبہ' کے نام سے ایک جہادی سلسلہ شروع کر رکھا تھا جس پر بھارت بلبلا اُٹھا اور وہ حافظ سعید پر دہشت گردی کے الزامات لگاتا رہا۔ جب اُن الزامات میں شدت آئی اور پاکستان کے حکمرانوں پر دباؤ بڑھنے لگا، تو ہم نے حافظ سعید صاحب کو وزیر داخلہ جنرل معین الدین حیدر کے ساتھ بیٹھے اور بڑے وقار کے ساتھ اپنا موقف بیان کرتے دیکھا۔ ۲۰۰۴ء میں جنرل پرویز مشرف اور بھارتی وزیراعظم اٹل بہاری واجپائی کے ساتھ اعلان اسلام آباد پر دستخط کیے جس میں طے پایا کہ پاکستان کی سرزمین بھارت میں دہشت گردی کے لیے استعمال نہیں کی جائے گی۔ اس اعلامیے کے بعد لشکر طیبہ اور جناب حافظ سعید کو بہت ساری پابندیوں کا سامنا کرنا پڑا۔ لشکر طیبہ مقبوضہ کشمیر میں بسنے والے کشمیریوں پر مشتمل ہے جو سات لاکھ بھارتی پیراملٹری فورس کا بڑی پامردی سے مقابلہ کر رہی ہے، حافظ صاحب نے ناروا



پابندیوں کے بعد اپنی سرگرمیاں 'فلاح انسانیت فاؤنڈیشن' پر مرکوز کر دیں اور ایک دنیا نے اُن کی جماعت کو ۲۰۰۵ء کے زلزلے میں ان تھک اور وسیع بنیادوں پر کام کرتے دیکھا۔ سیلاب ہوں یا کوئی اور آسمانی آفت، فلاح انسانیت فاؤنڈیشن سب سے آگے نظر آتی ہے۔ بلوچستان میں یہ تنظیم اسکول کھول رہی ہے اور صاف پانی کے پلانٹس نصب کر رہی ہے۔ اسی نوع کی اطلاعات صحرائے تھر سے آ رہی ہیں۔

نومبر ۲۰۰۸ء میں بھارت کے ساحلی شہر ممبئی میں خوفناک دہشت گردی کا سانحہ پیش آیا، تو بھارت نے دو گھنٹوں کے اندر لشکر طیبہ کو موردِ الزام ٹھہرا دیا اور اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل نے بھی اسے دہشت گرد تنظیموں میں شامل کر کے اُس پر مختلف پابندیاں عائد کر دیں۔ حافظ صاحب گھر پر نظر بند کر دیے گئے، مگر وہ عدالت عظمیٰ سے مقدمہ جیتنے میں کامیاب رہے، کیونکہ اُن کے خلاف بھارت کوئی ٹھوس ثبوت پیش نہیں کر سکا تھا۔

دو سال قبل انہوں نے دفاع پاکستان کونسل قائم کی جب فرقہ واریت کا بہت غلبہ ہو چلا تھا اور فوج پر طرح طرح کے الزامات لگائے جا رہے تھے۔ اس تحریک میں سبھی مذہبی اور مسلکی جماعتیں اور نامور ریٹائرڈ جرنیل شامل تھے۔ بھارت کی غراہٹ میں ہر لحظہ اضافہ ہو رہا تھا اور امریکہ پاکستان کا ناطقہ بند کر دینے پر تلا ہوا تھا۔ حافظ صاحب کے بروقت اقدام نے صورت حال بتدریج بدل ڈالی اور عوامی طاقت کے سامنے عالمی سامراج کو بھی گھٹنے ٹیکنا پڑے۔ یہ تمام حیران کن واقعات اس امر کا تقاضا کر رہے تھے کہ حافظ محمد سعید کا ایک مفصّل انٹرویو لیا جائے جس میں اس راز تک پہنچا جائے کہ وہ کس طرح بھارت کی طرف سے پھیلائے ہوئے دام ہم رنگ زمیں سے بچ نکلتے ہیں اور اپنے مقاصد کی طرف شدید مزاحمت کے باوجود پیش قدمی کرتے رہتے ہیں۔ اُن سے یہ معلوم کرنا بھی لازم ہو گیا تھا کہ اُن کا ورلڈ ویو کیا ہے، تکفیری فرقے کے خلاف کس بنیاد پر شمشیر برہنہ بنے ہوئے ہیں اور جدید ترین ٹیکنالوجی اور بے پایاں مادی وسائل سے مالا مال سامراجی طاقتوں کو کیونکر شکست دی جا سکتی ہے۔ ہم نے حافظ صاحب کے پرنسپل اسٹاف آفیسر سے وقت لیا اور ہماری ٹیم ۱۷ فروری کو ٹھیک گیارہ بجے 'القدسیہ' پہنچ گئی جو الدعوۃ کا ہیڈ کوارٹر ہے۔ جناب پروفیسر مظہر، عزیزم طیب اعجاز، عزیزی کامران الطاف اور غلام سجاد انٹرویو پینل میں شامل تھے۔

دو آہنی دروازوں سے گزر کر ہم اندر پہنچے جہاں بلا کا نظم دیکھنے میں آیا۔ میں یہاں کئی بار پہلے بھی آ چکا ہوں، کیونکہ حافظ صاحب اخبار نویسوں اور تجزیہ نگاروں سے مشاورت پر یقین رکھتے ہیں۔ یہ ایک وسیع و عریض علاقہ ہے جس میں ایک شاندار مسجد کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ جناب امیر حمزہ جو پائنا کے مذاکروں میں گاہے گاہے شرکت کرتے رہتے ہیں، انہوں نے ہمارا استقبال کیا اور ہم پہلی منزل پر قدرے کشادہ کمرے میں پہنچ گئے جہاں چند ساعتوں بعد حافظ صاحب تشریف لے آئے۔ حسب معمول اُن کے چہرے پر ایک ہلکی سی مسکراہٹ رقصاں تھی۔ یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ یہ وہی شخص ہے جس نے بھارتی قیادت کی نیندیں حرام کر رکھی ہیں، اس کا نام اقوام متحدہ کے ایوان میں گونج رہا ہے اور اہل ایمان اس کے عزم صمیم سے تقویت پا رہے ہیں۔

رسمی کلمات کے بعد انٹرویو کا آغاز ہوا۔ میں نے سب سے پہلے خاندانی پس منظر اور حالاتِ زندگی کے بارے میں سوال کیا۔ انہوں نے محبّت بھرے لہجے میں کہا: ''قریشی صاحب! آپ کی تشریف آوری میرے لیے باعث مسرت ہے۔ آپ نے اور قریشی خاندان نے جس طرح صحافت وسیاست میں پاکستانیت اجاگر کی ہے، وہ ایک منفرد اور قابلِ تقلید مثال ہے۔''

پھر چند لمحے بعد وہ عہد رفتہ کو آواز دینے لگے اور ہم گوش بر آواز ہو گئے۔

''ہمارا خاندان ہریانہ (ہندوستان) سے ہجرت کر کے پاکستان آیا جو دینی اعتبار سے ہجرت سے پہلے ہی بہت معروف

تھا۔ میرے نانا مولانا عبدالجبار غزنوی کے شاگرد تھے اور انھوں نے اپنی تعلیم مکمّل کرنے کے بعد ایک بڑا مدرسہ قائم کیا تھا۔ ہماری رہائش انبالہ کے ساتھ ''روپڑ'' میں تھی جہاں ہمارا پورا خاندان آباد تھا اور ہم روپڑ کے کھاتے پیتے زمیندار تھے، لیکن ہماری پہلی پہچان دینی خدمات کی بنیاد پر تھی اور دوسری یہ کہ ہمارا خاندان کٹر مسلم لیگی تھا۔ میرے ماموں حافظ عبداللہ جب علی گڑھ میں طالب علم تھے، قائداعظمؒ نے ان کی قیادت میں ایک گروپ تشکیل دے کر تحریک پاکستان کے حق میں آواز اُٹھانے کے لیے سندھ بھیجا تھا اور وہ شب و روز کام کر کے قائداعظمؒ کے قریب تر ہو گئے تھے۔''

ابھی گفتگو کا سلسلہ ذرا آگے بڑھا ہی تھا کہ چائے آ گئی۔ خالص دودھ کی مہکار میں شہد کی آمیزش ہمیں جرعہ کشی کی دعوت دے رہی تھی۔ ادھر ہم نے چائے کی پیالی کی طرف ہاتھ بڑھایا اور اُدھر حافظ صاحب نے ماضی کے تانے بانے بننا شروع کر دیے۔ کہنے لگے: ''ہندو دو سبب سے میرے ماموں حافظ عبداللہ کے جانی دشمن تھے، اوّل اس لیے کہ ان کے قائداعظمؒ سے قریبی تعلّقات تھے اور دوسرا یہ کہ ہمارے ہاں گائے کی قربانی کی جاتی تھی جبکہ ہندو اور سکھ ہمیں قربانی سے منع کرتے تھے۔ گائے ذبح کرنے پر ۱۹۴۴ء میں ہماری ان سے خونریز لڑائی بھی ہوئی تھی جس میں میرے پورے خاندان نے حصہ لیا، جس پر ہندوؤں کے ساتھ دشمنی مزید گہری ہو گئی تھی۔

''جب ہندوستان تقسیم ہوا، تو ہندوؤں نے میرے والد صاحب کمال الدین اور ماموں حافظ عبداللہ کو جان سے مار دینے کا فیصلہ کیا جس کی میرے خاندان کو سن گُن ہو گئی، چنانچہ فیصلہ کیا گیا کہ پورے علاقے کے مسلمانوں کو اکٹھا کر کے قافلے کی صورت میں یہاں سے نکلا جائے۔ اسی ہزار کا قافلہ تیار ہوا جس کی امارت حافظ عبداللہ کے پاس تھی۔ راستے میں بار بار حملے ہوئے اور لوگ شہید ہوتے گئے۔ صرف میرے خاندان کے ۱۳۶ افراد شہید ہوئے اور ہماری خواتین میں سے کسی کی گود سلامت نہ رہی۔ ان حملوں میں اتنی شدت تھی کہ ماؤں نے اپنے بچے دریائے ستلج میں پھینک دیے، کیونکہ ان میں اپنے بچوں کو سنگینوں پر لٹکے دیکھنے کا حوصلہ نہیں تھا۔ اس قافلے میں کچھ لوگ گاڑیوں میں سوار تھے اور ہمارے بزرگوں کو بھی گاڑیاں استعمال کرنے کا مشورہ دیا گیا تھا۔ ان کے پاس معلومات تھیں کہ گاڑیوں کو خصوصی طور پر نشانہ بنایا جائے گا، اس لیے انھوں نے انکار کر دیا۔ پھر وہی ہوا کہ گاڑیوں میں سوار سبھی لوگ زندہ جل گئے۔ ان باتوں کا علم مجھے اپنی دادی اماں کے ذریعے ہوا تھا۔''

حافظ صاحب کے دکھ میں ڈوبے ہوئے الفاظ نے ہم پر سکتہ طاری کر دیا تھا۔ امیر حمزہ بے اختیار بول اٹھے کہ میں عرصۂ دراز سے حافظ صاحب کے ساتھ ہوں، لیکن آج پہلی بار اس دردِنہاں کا علم ہوا ہے۔

حافظ صاحب نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا: ''دادی اماں نے بتایا تھا کہ ایک کیمپ کے ساتھ کنواں تھا جہاں سے قافلے پانی پیتے تھے۔ ظالموں نے اس کنویں میں نیلا تھوتھا ملا دیا اور جس نے بھی پانی پیا، بیمار ہو گیا اور جان سے ہاتھ دھو بیٹھا۔ آخرکار یہ لُٹا پُٹا قافلہ واہگہ کے راستے والٹن کیمپ لاہور پہنچا جو بعدازاں فلیٹیز ہوٹل کے ساتھ بنے چھوٹے چھوٹے کمروں میں منتقل ہو گیا۔ قافلے کے کچھ لوگ گجرات چلے گئے اور جلال پور جٹاں میں آباد ہو گئے۔ میرے ماموں جڑانوالہ آ گئے جہاں مارچ ۱۹۴۸ء میں میری پیدائش ہوئی۔ میں ددھیال اور ننھیال میں پیدا ہونے والا پہلا بچہ تھا۔ باقی سب بچے ہجرت کے دوران شہید کر دیے گئے تھے۔''

حافظ صاحب یادوں کی راکھ کریدتے ہوئے گویا ہوئے:

''میری پھوپھی جان قافلے سے بچھڑ کر پیچھے رہ گئیں۔ انھیں ہندوؤں نے کچھ دوسرے لوگوں کے ساتھ پکڑ کر بند کر دیا اور

باہر مسلح پہرہ بٹھا دیا۔ ان کا مطالبہ تھا ہندو ہو جاؤ۔ وہ انھیں کھانے کے لیے خنزیر کا گوشت دیتے جو انھوں نے نہیں کھایا اور کئی دن بھوکے پیاسے گزار دیے۔ ایک رات موسم بہت خوشگوار تھا اور پہرے دار بے سدھ سوئے ہوئے تھے۔ ایسے میں وہ اللہ کا نام لے کر کھڑی ہوئیں۔ تین میل کے فاصلے پر اُن کا گاؤں تھا۔ وہاں پہنچیں، تو پورا گاؤں جلا ہوا دیکھا۔ وہ ڈر کے مارے کسی سے راستہ بھی نہیں پوچھتی تھیں کہ اگر وہ ہندو ہوا، تو مار دے گا۔ پھر وہ اپنے رب کے سہارے ریل کی پٹڑی کے ساتھ عازم سفر ہوئیں۔ صبح کو کھیتوں میں چھپ جاتیں اور رات گئے پٹڑی کے ساتھ ساتھ اپنا سفر جاری رکھتیں۔ اس طرح تین راتوں کے پیدل سفر کے بعد وہ کنالی کیمپ پہنچ گئیں جہاں ہمارا قافلہ ٹھہرا ہوا تھا۔''

کیا آپ پھر جڑانوالہ میں ہی آباد ہو گئے، میں نے پوری روداد سننے کے لیے پوچھا۔

''جی نہیں! میرے والد صاحب جڑانوالہ سے سرگودھا کے قریب سلانوالی منتقل ہو گئے جہاں پہلے سے خاندان کے کچھ لوگ آباد تھے۔ اسی علاقے میں ہندوستان سے چھوڑی ہوئی زمین کے متبادل کچھ زمین بھی مل گئی جس پر گزر اوقات نہ ہونے کی وجہ سے والد صاحب نے کریانے کی چھوٹی سی دکان کھول لی۔ وہیں میں نے والدہ صاحبہ سے قرآن حفظ کیا۔ اور مجھے سلانوالی مڈل اسکول میں پانچویں جماعت میں داخلہ مل گیا۔ مڈل پاس کرنے کے بعد میں گورنمنٹ ہائی اسکول سرگودھا میں داخل ہوا۔ میرے ماموں حافظ عبداللہ ۱۹۵۳ء میں پنجاب یونیورسٹی سے ایم اے اسلامیات کرنے کے بعد اپنی پہلی تقرری پر ایس ای کالج بہاولپور منتقل ہو چکے تھے۔ ایک بار وہ ہمارے ہاں آئے، تو انھوں نے دیکھا میں فجر کی نماز کے بعد اڑھائی میل پیدل سفر کر کے سرگودھا کی بس لیتا ہوں اور پھر اسی طرح شام کو واپس آتا ہوں۔ وہ کہنے لگے تمہارا بہت وقت ضائع ہوتا ہے، تم بہاولپور میرے ساتھ چلو، چنانچہ وہ مجھے اپنے ساتھ بہاولپور لے آئے جہاں میں نے میٹرک اور ایس ای کالج سے ایف اے کیا۔ بعد ازاں گورنمنٹ کالج سرگودھا سے بی اے کی ڈگری لی۔ جس دن میرا بی اے کا نتیجہ آیا، اسی دن میرا ولیمہ تھا۔ میری شادی میرے ماموں عبداللہ صاحب کی صاحبزادی سے ہوئی۔ میں نے اور میری اہلیہ نے اکٹھے قرآن پاک حفظ کیا تھا۔ شادی کے بعد میں نے سلسلہ تعلیم جاری رکھا اور ۱۹۷۳ء میں پنجاب یونیورسٹی سے ایم اے اسلامیات کیا۔ میرا ابھی نتیجہ نہیں آیا تھا کہ اسلامی نظریاتی کونسل میں کچھ اسامیاں نکلیں۔ چیئرمین صاحب نے میرا انٹرویو لے کر مجھے ریسرچ اسکالر رکھ لیا حالانکہ میرا ابھی نتیجہ بھی نہیں آیا تھا اور اس اسامی کے لیے درکار کوالیفکیشن ایم اے تھی۔ میرا اسلامی نظریاتی کونسل میں ''حدود'' پر لکھا ہوا مقالہ آج بھی موجود ہے۔ ایم اے کا نتیجہ آنے کے بعد میں انجینئرنگ یونیورسٹی میں لیکچرار بھرتی ہوا اور پھر ۲۵ سال وہیں تدریسی فرائض بجا لاتا رہا۔ اس دوران اعلیٰ تعلیم کے لیے دو سال سعودی عرب بھی رہا۔''

میں نے باتوں کا رخ دوسری طرف موڑتے ہوئے پوچھا کہ امیر حمزہ صاحب سے کیسے ملاقات ہوئی۔

کہنے لگے ''یہ شاہکوٹ میں ٹیچر تھے بعد ازاں لاہور آ گئے اور اللہ تعالیٰ نے ان سے ایک تعلق پیدا کر دیا۔ آہستہ آہستہ ساتھی ملتے گئے اور کارواں بنتا گیا۔''

میں حافظ صاحب سے سعودیہ میں قیام کے دوران ہونے والے تجربات اور محسوسات معلوم کرنا چاہتا تھا، پوچھا کیا آپ کے اس مملکت کے ارباب اختیار سے خصوصی تعلقات قائم ہو گئے تھے۔

حافظ صاحب نے زیرِلب مسکراتے ہوئے کہا: ''جی ہاں! سعودی عرب کے مفتی اعظم شیخ عبدالعزیز مجھ پر بہت مہربان تھے۔ ان کی ریاض میں سب سے بڑی مسجد تھی جس کے وہ خطیب بھی تھے۔ فجر کی نماز کے بعد درس شروع کرتے جو ۱۰ بجے ختم ہوتا۔ میں بڑے شوق سے اس میں شامل ہوتا۔ مجھے دینی اعتبار سے فائدہ ہونے کے علاوہ ان کے پورے نظم کا مشاہدہ کرنے کا موقع ملا۔ بہت بڑا نیٹ ورک تھا اور ہزاروں نوجوان وہاں پڑھتے تھے جنھیں بیرونی ممالک میں تبلیغِ دین کے لیے تیار کیا جاتا اور انہیں مختلف زبانیں سکھائی جاتی تھیں۔ وہیں سے میرے ذہن میں پاکستان کے اندر ایک ایسا نیٹ ورک قائم کرنے کا ارادہ پختہ ہوا۔''

حافظ صاحب نے چائے کا جرعہ لیتے ہوئے کہا: ''میں جب سعودی عرب پڑھنے گیا' میرا ذہن قدرے محدود تھا۔ پاکستان میں فرقہ واریت کا زہر نس نس میں اتر چکا ہے، لیکن شیخ صاحب کے حلقہ درس میں شامل رہنے سے میرے اندر یہ سوچ پیدا ہوئی کہ جتنی دیر تک فرقہ واریت کی جراحی نہیں ہوگی اس وقت تک دینِ مبین کے فروغ میں رکاوٹیں کھڑی رہیں گی' لہٰذا ہمیں فرقہ واریت سے بلند ہو کر کام کرنا ہوگا۔ شیخ صاحب مجھ پر خصوصی شفقت فرماتے تھے۔ ان کی خواہش تھی کہ میں کسی مغربی ملک میں جا کر دین کی اشاعت کروں، لیکن میں نے اپنے وطن کو ترجیح دی۔ شیخ عبدالعزیز باز صاحب کے مرکز کا نام مرکز الدعوۃ وارشاد تھا۔ میں نے بھی پاکستان میں آ کر انہی خطوط پر جماعۃ الدعوۃ تشکیل دی۔ ہم نے اپنے ایک رسالے کا نام بھی الدعوۃ رکھا جس کے ایڈیٹر امیر حمزہ صاحب ہیں۔ یہ صحت مند سوچ ہم سعودی عرب سے لے کر آئے ہیں۔''

میں نے سادگی سے پوچھا کیا سعودی عرب میں اسلام کے حوالے سے کچھ زیادہ شدت نہیں پائی جاتی۔ انہوں نے مستحکم لہجے میں جواب دیا:

''نہیں، بلکہ میں نے محسوس کیا کہ وہاں شدت پسندی کا کوئی وجود ہی نہیں' جبکہ پاکستان میں ایک دوسرے کو کافر کہتے ہوئے لوگ ذرا نہیں جھجکتے۔ وہاں تو سب مسلمان بھائی بھائی ہیں اور فرقہ واریت کی لعنت سے محفوظ ہیں۔''

حافظ صاحب بات کرتے کرتے ذرا دیر رکے' تو پروفیسر مظہر نے نکتہ اُٹھایا کہ سعودی عرب میں اہلِ تشیع کے بارے میں کسی قدر شدت پائی جاتی ہے۔ ۱۹۸۷ء میں حج کے موقع پر ایرانیوں نے امریکی پرچم جلایا اور امریکہ کے خلاف نعرے بلند کیے جس کے نتیجے میں احتجاج پر قابو پانے کے لیے ریاست کو طاقت استعمال کرنا پڑی اور سینکڑوں اہل تشیع مارے گئے تھے۔

حافظ محمد سعید نے پوری بات بغور سننے کے بعد بڑے اطمینان کے ساتھ کہنا شروع کیا:

''میرے بھائی! میں ۱۹۸۴ء میں واپس آ گیا تھا۔ اُس وقت تک ایسا ماحول بالکل نہیں تھا۔ خانۂ کعبہ ہو یا مسجد نبوی ﷺ، سب ایک ہی جگہ نماز پڑھتے تھے، کوئی ہاتھ کھول کر کوئی باندھ کر۔ دنیا سے آئے ہوئے ہر فرقے کے مسلمان ایک ہی امام کی اقتدا میں نماز ادا کرتے تھے۔ یہ شدت آہستہ آہستہ بعد میں پیدا ہوئی جس کا تعلق دین سے زیادہ سیاست سے ہے۔ میں تو اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کر چکا ہوں کہ وہاں فرقہ واریت کا زہر کہیں بھی نہیں تھا۔ میرے اپنے اندر یہ کھلا پن سعودی عرب جا کے پیدا ہوا ہے۔''

حافظ صاحب کی باتوں پر مجھے بیک وقت خوشی اور حیرت ہوئی۔ پاکستان میں سعودی عرب کے بارے میں یہ عام تاثر پایا جاتا ہے کہ وہ مذہب کے بارے میں بڑے سخت گیر ہیں اور کوئی اختلاف رائے برداشت نہیں کرتے' جبکہ حافظ صاحب کا مشاہدہ یہ ہے کہ وہاں بہت کھلا پن ہے اور دعوت و تبلیغ میں ایک اعتدال پایا جاتا ہے۔ میں نے اس سلسلے میں سوال کیا کہ آپ نے جماعۃ الدعوۃ کب قائم کی۔

''ہم نے ۱۹۸۵ء ۱۹۸۶ء میں باقاعدہ جماعتی شکل میں الدعوۃ کے نام سے کام شروع کیا' پہلے گھر سے' پھر سبزی منڈی کے

ساتھ دفتر لیا اور ہمیں دعوت کا کام کرتے ہوئے بیس برس ہو چکے ہیں۔''

پھر آپ افغانستان چلے گئے؟ میں نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

''جی ہاں! میں خود افغانستان گیا۔ یہ غالباً ۱۹۸۷ء کی بات ہے۔ وہاں دنیا کے مختلف ممالک سے آئے ہوئے مجاہدین سے ملاقاتیں ہوئیں جن سے افغانستان کے لوگوں نے روسیوں کے مظالم کی ہولناک داستانیں سنائیں جس سے جذبہ جہاد کو مہمیز ملی۔ ایک شخص نے بتایا جلال آباد کے قریب ایک گاؤں سے روسیوں نے کچھ خواتین زبردستی ہیلی کاپٹر میں بٹھائیں۔ جب ہیلی کاپٹر بلند ہوا، تو روسی سپاہی ایک ایک کے کپڑے اُتار کر اُن عزت مآب خواتین کو نیچے پھینکتے رہے۔ یہ دراصل ان کی طرف سے پیغام تھا کہ وہ ہماری خواتین کے ساتھ یہ سلوک بھی کر سکتے ہیں۔ افغانستان میں مختلف مقامات پر مجاہدین کا قتل عام بھی ہوا۔ بہت سے مناظر تو میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھے، جن سے ہمارے جذبہ جہاد میں شدت پیدا ہوئی۔ تب ہم نے افغان مظلوموں کو باقاعدہ مدد پہنچانا شروع کی، مال سے قلم اور جان سے۔ میں اور حمزہ صاحب اکٹھے دعوت کا کام بھی کرتے اور جہاد کی ترغیب بھی دیتے اور مسلمانوں کو سمجھاتے کہ جہاد فرض ہے۔ ہم نے دو کثیر الاشاعت جریدوں کے ذریعے بھرپور قلمی جہاد جاری رکھا۔''

آپ کے رسائل کتنی تعداد میں چھپتے تھے؟ میں نے سوال کیا۔

''ایک رسالہ الدعوۃ کے نام سے تھا جو مارچ ۸۹ء میں شروع ہوا اور ۲۰۰۰ء میں اس کی تعداد ایک لاکھ سے تجاوز کر چکی تھی۔ دوسرا 'جرار' تھا۔''

کیا کوئی عام آدمی بھی اعلانِ جہاد کر سکتا ہے یا صرف ریاست اس کی مجاز ہے؟ پروفیسر مظہر نے سوال کیا۔

حافظ صاحب نے علمی انداز میں جواب دیا: ''جی! حکومت ہی اعلان کرنے کی مجاز ہے اور ضیاالحق نے باقاعدہ اعلان کیا تھا کہ ہمارا فرض ہے کہ ہم افغانیوں کی مدد کریں۔ ہم اس بات کے پوری طرح قائل ہیں کہ اعلانِ جہاد صرف ریاست کر سکتی ہے۔ جب روسی فوجیں ہزیمت اٹھا کر افغانستان سے نکل گئیں تو مجاہدین میں پھوٹ پڑ گئی جو ہمارے لیے بے حد تکلیف دہ واقعہ تھا۔ جہاد کے لیے الحمدللہ ہمارا ذہن بن چکا تھا، اس لیے تمام تر دلچسپی کا محور و مرکز جہادِ کشمیر ٹھہرا۔ ہماری حکمت عملی یہ ہے کہ حکومت اعلان کرے اور ہم اس کے ساتھ مل کر کام کریں، الگ کام کرنے سے اختلافات جنم لیتے اور فساد پھیلتا ہے۔ ۲۰۰۱ء تک ہماری وہی پالیسی تھی جو حکومت کی تھی، لیکن پرویز مشرف نے آ کر پالیسی تبدیل کی اور ہم پر پابندیاں لگا دیں۔ اسی دور میں 'لشکر طیبہ' پر بھی پابندی لگی جسے ہم نے قبول کر لیا اور لشکرِ طیبہ کی پوری تنظیم مقبوضہ کشمیر بھیج دی اور پاکستان میں جماعۃ الدعوۃ کے نام سے کام جاری رکھا۔ اب مقبوضہ کشمیر میں لشکر طیبہ کام کر رہی ہے جس کے امیر عبدالواحد ہیں جو کشمیری النسل ہیں۔''

اس کا مطلب یہ ہوا کہ لشکر طیبہ کشمیر میں جہاد کر رہی ہے اور جماعۃ الدعوۃ پاکستان میں تبلیغ دین اور ریلیف کا کام...... پروفیسر مظہر نے نکتہ آفرینی کی۔

''جی بالکل! لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ جماعۃ الدعوۃ کے پلیٹ فارم سے جہادِ کشمیر کے لیے کچھ نہیں ہو رہا۔ ہم الحمدللہ جو مدد کر سکتے ہیں، کر رہے ہیں کیونکہ ہم کشمیریوں کو حق پر سمجھتے ہیں اور ڈٹ کر اُن کی حمایت کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بھارت ہمارے خلاف زہریلا پروپیگنڈا کرتا رہتا ہے۔''

جہاد کا ذکر آیا تو مجھ پر خوف سا طاری ہونے لگا' کیونکہ اہل مغرب اس لفظ کے شدید مخالف ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ قرآن اور حدیث سے یہ لفظ خارج کر دیا جائے۔ پاکستان میں بھی ایسے لبرل بہت سرگرم ہیں جو قوم کے اندر سے جہاد کی روح کھینچ لینا چاہتے ہیں۔ ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ جہاد کے نام پر غیر ریاستی عناصر قتل و غارت کا بازار گرم کیے ہوئے ہیں۔ سید ابوالاعلیٰ مودودی نے ۱۹۴۸ء میں قرآنی تعلیمات کی روشنی میں فرمایا تھا کہ جہاد کا اعلان کرنے کا حق صرف ریاست کو حاصل ہے۔ میں نے اس پس منظر میں حافظ صاحب سے سوال کیا:

ممبئی حملے میں آپ کا نام بار بار آ رہا ہے، اس کی حقیقت کیا ہے۔ حافظ صاحب نے دوٹوک لہجے میں جواب دیتے ہوئے کہا:

''قریشی صاحب! بھارت جہاد کشمیر کو ناکام بنانے کے لیے ایسی اوچھی حرکتیں کرتا رہتا ہے۔ ممبئی حملے پر ابھی دو گھنٹے بھی نہ گزرے تھے کہ اس نے میرا اور میری جماعت کا نام لے کر واویلا شروع کر دیا، کہ وہ دہشت گردی کے ذمے دار ہیں۔ میں نے اسی وقت پریس کانفرنس بلا کر اعلان کیا یہ ڈرامہ رچایا جا رہا ہے اور ہمارا اس حملے سے کوئی تعلق نہیں۔ بھارت نے میرے خلاف ڈوزئیر (ثبوت) بھیجے جن کی بنا پر مجھے اور میرے بہت سے ساتھی گرفتار کر لیے گئے۔ بھارت اقوام متحدہ میں بھی ہمارا کیس لے کر گیا اور اس نے بھی بھارت ہی کا ساتھ دیا۔ مقدمہ چلا' تو میں نے لاہور ہائیکورٹ میں کھڑے ہو کر کہا آپ جرم ثابت کریں، ہم ہر سزا بھگتنے کو تیار ہیں۔ چھ ماہ کیس چلتا رہا اور لاہور ہائیکورٹ کے ''فل بنچ'' نے الزام ثابت نہ ہونے پر ہمیں رہا اور جماعۃ الدعوۃ کو ''کلیئر'' کر دیا، لیکن اس وقت کے وزیر داخلہ رحمٰن ملک ہائیکورٹ کے فیصلے کے خلاف سپریم کورٹ چلے گئے۔ سپریم کورٹ میں چیف جسٹس افتخار چودھری کی سربراہی میں ''فل بنچ'' نے متفقہ طور پر فیصلہ دیا کہ جماعۃ الدعوۃ کا ممبئی حملے سے کوئی تعلق نہیں۔''

اب پٹھانکوٹ ائیر بیس میں دہشت گردی کا واقعہ سوہان روح بنا ہوا ہے۔ میں نے معاملے کی نزاکت کی طرف توجہ دلائی۔

''پٹھانکوٹ حملے کی ذمے داری تو کشمیری تنظیموں نے قبول کر لی ہے۔'' حافظ صاحب نے برجستہ جواب دیا۔

جی ہاں! قبول تو کر لی ہے لیکن پتہ نہیں اصل حقیقت کیا ہے۔ میں نے بات کی تہ تک پہنچنے کی کوشش کی۔ حافظ صاحب نے زیر لب مسکراتے ہوئے کہا: ''قریشی صاحب! آپ تو ہم سے بہتر جانتے ہیں، ہمیں تو اسی کو حقیقت ماننا پڑے گا جو کشمیری کہتے ہیں اور جو حکومت پاکستان کا موقف ہے۔''

سر! پٹھانکوٹ واقعے سے کشمیر کاز کو کیا فائدہ پہنچ سکتا ہے۔ طیب اعجاز قریشی نے سوال اٹھایا۔

''اس کا جواب تو حزب المجاہدین کے سربراہ سید صلاح الدین نے خود دے دیا ہے کہ دنیا ہماری بات نہیں سن رہی ہے، بھارت کی آٹھ لاکھ فوج مقبوضہ کشمیر میں ظلم کے پہاڑ توڑ رہی ہے' لیکن کوئی بھی ہماری باتوں پر کان دھرنے کو تیار نہیں۔ ہم نے پٹھانکوٹ ائیر بیس پر اس لیے حملہ کیا ہے کہ دنیا کو ہم اپنا پیغام شاید سری نگر سے کہیں زیادہ پٹھانکوٹ سے دے سکتے ہیں۔ سید صلاح الدین نے جو کچھ کہا، وہ ہمیں بھی قبول کر لینا چاہیے۔''

کیا آپ سمجھتے ہیں پٹھانکوٹ حملے سے دنیا کو مثبت پیغام گیا ہے؟ طیب اعجاز نے ایک اور سوال کیا۔

''جی! بالکل مثبت پیغام گیا ہے۔ جب آپ کسی کے گھر پر حملہ آور ہوں گے' تو اسے بھی تو اپنے دفاع کا حق ملنا چاہیے۔''

حافظ صاحب' یہ ڈیوڈ ہیڈلے کا معاملہ کیا ہے؟ میں نے ممبئی کہانی کے اندر اترتے ہوئے پوچھا۔

بھارت کشمیری عوام کو حقِ خود ارادیت دینے پر مجبور ہو جائے گا

’’جی! یہ امریکن اور سی آئی اے کا ایجنٹ ہے جو ۲۰۰۸ء سے امریکہ میں سزا بھگت رہا ہے۔ اب اچانک ۲۰۱۶ء میں اسے وعدہ معاف گواہ بنا کر پیش کیا گیا ہے اور اس نے ہمارے اور ہماری جماعت کے خلاف بیان دیا ہے۔ حقیقت یہی ہے کہ یہ سب کچھ اس نے خود نہیں کیا، اس سے کہلوایا جا رہا ہے۔ اگر ایسا نہیں تو پھر ۲۰۰۸ء کی بات ۲۰۱۶ء میں کیوں کی جا رہی ہے۔ ذکی الرحمن جس پر سب سے بڑا الزام تھا اسے بھی پاکستان کی عدالت نے ضمانت پر رہا کر دیا ہے۔ جج نے ضمانت لیتے ہوئے لکھا کہ ذکی الرحمٰن کے خلاف کوئی ثبوت پیش نہیں کیا گیا' اس لیے ہم اسے جیل میں نہیں رکھ سکتے۔‘‘

کس کے کہنے پر یہ سارا کھیل کھیلا جا رہا ہے؟ میں نے پوری کہانی کا مفہوم سمجھنے کے لیے دریافت کیا۔

’’قریشی صاحب! آپ کو معلوم ہے کہ انڈیا اور امریکہ کی دوستی آج کل بڑے زوروں پر ہے۔ یہ سب اسی کا شاخسانہ ہے۔‘‘

طیب اعجاز قریشی نے ایک نہایت سنجیدہ معاملہ اُٹھایا کہ آج کل بھارت کی جواہر لعل نہرو یونیورسٹی کے اندر کشمیریوں کے مظاہروں کے حوالے سے آپ کی ’’ٹویٹ‘‘ کا بڑا ذکر ہو رہا ہے۔ حافظ صاحب نے قدرے تلخ لہجے میں کہا:

’’دیکھیں جی! ہم تو بھارت کے آئے دن کے ڈراموں سے تنگ آ چکے ہیں۔ جواہر لعل نہرو یونیورسٹی میں جو مظاہرہ ہوا، اس کے بارے میں کہا گیا کہ میری ’’ٹویٹ‘‘ پر کشمیر طلبہ نے مظاہرہ کیا ہے۔ انھوں نے پہلے میرا جعلی ٹویٹر اکاؤنٹ بنایا اور پھر اسی اکاؤنٹ سے میسج نشر کر دیا۔ میں نے فوری طور پر ویڈیو پیغام کے ذریعے سارے الزام کی تردید کی اور کہا یہ اسی طرح کا ایک ڈرامہ ہے، جیسا ممبئی حملے کا ڈرامہ تھا۔ میں تو اللہ کے فضل سے کشمیر کے حق میں ڈٹ کر بولتا ہوں اور تا دمِ زیست بولتا رہوں گا۔ میں دنیا کے سامنے بھارت کا گھناؤنا کردار بے نقاب کرنا چاہتا تھا اسی لیے اس فراڈ کے بارے میں ویڈیو پیغام نشر کیا۔ میرے اس پیغام سے بھارتی وزیر داخلہ راج ناتھ کو پشیمان ہونا پڑا کیونکہ میری تردید کے بعد پورا انڈین میڈیا اس کے پیچھے پڑ گیا ہے۔‘‘

جے این یو کا پھنکارتا بحران!

بھارت کے پہلے وزیر اعظم جواہر لعل نہرو کے نام پر دہلی میں قائم کی گئی یہ پچاس سالہ یونیورسٹی، جسے دنیا بھر میں ’’جے این یو‘‘ کے نام سے پکارا جاتا ہے، گزشتہ دو ہفتوں سے آتش فشاں بنی ہوئی ہے۔ اب تو سارا بھارت اس آگ کی لپیٹ میں آ چکا ہے اور مودی حکومت کے ہاتھ اپنی ہی لگائی گئی آگ سے جھلس رہے ہیں۔ یہ جامعہ اپنے آزاد خیال ماحول، سیکولر نظریات اور اظہارِ آزادی کی منہ پر بولتی تصویر ہے۔ بھارت بھر میں جے این یو کو مخالف خیالات رکھنے والے طلبہ کا مثالی مرکز کہا جاتا ہے۔ یہاں کی اسٹوڈنٹس یونین کی طرف سے کسی بھی مذہب کی پابندیوں کی قطعی پروا نہ کرتے ہوئے ہر موضوع پر اظہارِ خیال کی سہولت فراہم کی جاتی ہے۔ ۹ر فروری ۲۰۱۶ء کو جے این یو کی اسٹوڈنٹس یونین نے مشہور دو کشمیری حریت پسندوں، محمد افضل گرو شہید اور مقبول بٹ شہید کی یاد میں (یونیورسٹی انتظامیہ کی اجازت سے) ایک جلسے کا اہتمام کیا۔ مرکزی خیال یہ تھا کہ مذکورہ دونوں افراد کو دہلی کی تہاڑ جیل میں پھانسی دے کر دراصل ماورائے عدالت قتل کیا گیا تھا۔ جب مقبوضہ کشمیر کے حریت پسند مقبول بٹ اور معصوم محمد افضل گرو اور ممبئی کے یعقوب میمن کو بھارتی عدالتوں کی طرف سے

ویسے جواہر لعل نہرو یونیورسٹی کا واقعہ بھارت کے لیے ایک بہت بڑا دھچکا ہے۔'' طیب اعجاز قریشی نے اپنی جچی تلی رائے دی۔ حافظ صاحب نے اس کے ساتھ اتفاق کرتے ہوئے کہا:

''جی بالکل! اب تو پورے بھارت میں مظاہرے شروع ہو گئے ہیں۔ یہی نہیں، بھارت سے باہر بھی مختلف یونیورسٹیوں میں کشمیریوں کی حمایت دیکھنے میں آ رہی ہے۔ میرے خیال میں اس احتجاج نے مسئلہ کشمیر کے حوالے سے بہت نمایاں کام کیا ہے۔''

سر! آپ اتنا بڑا نظم چلا رہے ہیں۔ ظاہر ہے اس کے لیے بہت فنڈز درکار ہوتے ہیں۔ آپ کی فنڈنگ کہاں سے ہوتی ہے؟ پروفیسر مظہر نے ایک آڈیٹر جنرل کے لہجے میں پوچھا۔

حافظ سعید صاحب نے جواب میں کہا: ''بڑا اچھا سوال ہے۔ ہمارا جتنا بڑا ''سیٹ اپ'' دعوت اور خدمت خلق کا ہے، اس کے لیے کروڑوں روپے درکار ہوتے ہیں۔ ہمارے ایک ایک پروجیکٹ کا ہر سال بہت بڑا بجٹ ہوتا ہے۔ ہم نے بلوچستان میں چھ سو سے زائد واٹر پروجیکٹ مکمّل کیے ہیں اور آٹھ سو سے زائد تھر پارکر میں۔ اللہ کے فضل سے لوگوں کو ہم پر اعتماد ہے۔ وہ جب ہمارے کام دیکھتے ہیں تو خود بخود فنڈنگ کرتے ہیں۔ ہمارا سارا بجٹ عوامی سطح پر ہمیں مل رہا ہے۔''

کیا اسلامی ممالک سے فنڈنگ نہیں ہوتی؟ پروفیسر مظہر نے مزید وضاحت چاہی۔

''کسی اسلامی ملک سے ہم نے کبھی کوئی پیسہ نہیں لیا، سعودی عرب سے نہ خلیج کے کسی ملک یا حکومت سے۔ ساری فنڈنگ پاکستان کے اندر ہی سے ہوتی ہے۔'' حافظ صاحب کے لہجے میں قطعیت تھی۔

تعلیم کے شعبے میں آپ کو کتنی دلچسپی ہے اور آپ کی ترجیحات میں اس کا کیا مقام ہے؟ میں نے حافظ صاحب سے خدمت خلق کا دائرہ وسیع کرتے ہوئے پوچھا۔

''ہمارے تقریباً تین سو تعلیمی ادارے ہیں جن میں ہائی اسکولز، کالجز اور دو یونیورسٹیاں ہیں۔ ایک یونیورسٹی تو کراچی میں ہے جامعۃ المدرسات اسلامیہ جس میں ماشاءاللہ ایم اے تک کی ڈگری بیرونی یونیورسٹیوں سے منظور شدہ ہے۔ کراچی یونیورسٹی اور

سزائے موت سنائی جا رہی تھی تو کئی انصاف پسند اور باضمیر حلقے یہ دہائی دے رہے تھے کہ تینوں کو بھارتی حکومت کی طرف سے نہ ہونے کے برابر اپنا مؤقف پیش کرنے کی سہولتیں دی جا رہی ہیں۔ مگر کسی نے ان احتجاجات پر کان نہ دھرا۔ یوں تینوں کو باری باری پھانسی دے کر شہید کر دیا گیا۔ اب سالہا سال بعد دہلی کی جواہر لعل نہرو یونیورسٹی میں اسٹوڈنٹس یونین کی طرف سے ان مسلمان شہدا کے بارے میں جلسہ منعقد کر کے یہ کہنا کہ یہ عدالتی قتل تھا، دراصل اس امر کا اظہار ہے کہ معصوم خون بول اٹھا ہے۔ قدرت نے ساری دنیا کے سامنے بھارتی حکومتوں اور بھارتی اسٹیبلشمنٹ کے تعصّبات کو برہنہ کر دیا۔

مبینہ طور پر اس جلسے میں پاکستان کے حق میں اور بھارت کے خلاف چند نعرے بھی بلند ہوئے۔ اے بی وی پی نام کی مخالف طلبہ تنظیم، جو اسٹوڈنٹ یونین انتخابات میں تازہ تازہ شکست کھا چکی ہے، نے اسے بہانہ بنایا اور جے این یو کے اسٹوڈنٹ یونین صدر اور ان کے دس ساتھیوں کے خلاف غداری و بغاوت کا مقدمہ بھی درج کروایا اور جلسہ بھی درہم برہم کر دیا۔ یہ طلبہ اب گرفتار ہو چکے ہیں اور بھارت کی تقریباً تمام یونیورسٹیاں حکومت کے خلاف تو بغاوت پر آمادہ ہو ہی چکی ہیں، اپوزیشن جماعتیں، قانون دان حلقے اور اہل دانش بھی گرفتار طلبہ کی طرفداری میں بھارتی پارلیمنٹ کے دونوں ایوان مچھلی منڈی بن گئے ہیں اور مودی حکومت ایک نئے بحران کا شکار بن چکی ہے۔ (تنویر قیصر شاہد کے کالم سے اقتباس)

جامع اسلامیہ اسلام آباد سے بھی منظور شدہ ہے۔ اس کے علاوہ ہمارے سائنس کالجز اور ریسکیو ٹیمیں بھی ہیں جن میں ایک لاکھ کارکن کام کر رہے ہیں۔‘‘

کہا جاتا ہے زلزلے میں آپ سب سے پہلے پہنچتے ہیں۔ طیب اعجاز قریشی نے ایک احساس فخر کے ساتھ پوچھا۔

’’جی! جس علاقے میں زلزلہ آتا یا سیلاب آتے ہیں، ہماری ٹیمیں وہاں فوراً پہنچتی ہیں اور بالعموم ہماری فلاح انسانیت فاؤنڈیشن اور جماعت اسلامی کی الخدمت فاؤنڈیشن تو ہنگامی صورت میں تقریباً مل کر ہی کام کرتی ہیں۔‘‘

تعلیمی نصاب کے حوالے سے حافظ صاحب نے انکشاف کیا: ’’ہم نے اپنا نصاب بھی تیار کیا ہے۔ میٹرک تک بورڈز کے امتحانات ہوتے ہیں، ہر جگہ ہمارا متعلقہ بورڈ سے الحاق ہے، لیکن جہاں گنجائش ہوتی ہے، ہم وہاں اپنا نصاب پڑھاتے ہیں۔ اب ماشاءاللہ دوسرے تقریباً گیارہ سواداروں میں بھی ہمارا نصاب رائج ہے۔‘‘

حافظ صاحب! افغان جہاد کے بعد کچھ مجاہدین الگ ہو کر بیٹھ رہے، کچھ نے خودکش حملوں اور مسلمانوں کو کافر کہنے کا راستہ اختیار کیا۔ کیا آپ نے اچھے لوگوں کو اپنے ساتھ ملانے کے لیے کچھ انتظامات کیے؟ غلام سجاد نے سوال کیا۔

اس سوال پر گویا ایک دبستاں کھل گیا۔ یہ غالباً حافظ سعید صاحب کا پسندیدہ موضوع تھا۔ انھوں نے فرمایا: ’’آپ نے بڑی زبردست بات کی ہے جس پر کھل کر بات ہونی چاہیے۔ دراصل ہوا یہ کہ جب روس ہزیمت اٹھا کر افغانستان سے نکل گیا اور مجاہدین باہم دست و گریباں ہو گئے، تو ایک افراتفری نے جنم لیا۔ جو لوگ واقعی ’’جہادی‘‘ تھے، ان میں سے کچھ کشمیر چلے گئے اور کچھ نے بوسنیا میں جہاد شروع کر دیا۔ کچھ چیچنیا، سوڈان اور انڈونیشیا منتقل ہو گئے، لیکن بعض ایسے بھی تھے جو کہیں نہیں گئے۔ دراصل یہ وہ لوگ تھے جو اس خوف کے پیش نظر واپس اپنے ملک نہیں گئے کہ وہاں کی حکومتیں انھیں قتل کر دیں گی۔ وہ لیبیا، الجزائر، عراق اور مصر کے لوگ تھے جنھیں ہم تکفیری کہتے ہیں۔ تکفیری وہ لوگ ہیں جو کسی بھی حاکم کے خلاف کفر کا فتویٰ دے کر اسے واجب القتل قرار دیتے ہیں۔ خیر! یہ لوگ آئے تو جہاد افغانستان کے نام پر تھے، مگر انھوں نے جہاد میں حصہ نہیں لیا۔ ضیا حکومت میں انھیں ہر قسم کی سہولت مہیا کی گئی، حتیٰ کہ شناختی کارڈ بھی بنا کر دیے گئے۔ یہ لوگ درحقیقت مجاہد نہیں تھے اور انہوں نے جہادیوں کو دی جانے والی سہولتوں سے بھرپور فائدہ اٹھانے کے بعد تکفیری فکر پھیلانا شروع کر دی۔ ’’تکفیری فکر‘ کا بنیادی اصول ہی مسلمان حکمرانوں کو کافر قرار دے کر نوجوانوں کو اُن کے خلاف اُکسانا ہے۔ پھر شمالی اور جنوبی وزیرستان میں انھی تکفیریوں نے اپنی جڑیں مضبوط کیں، یہیں شادیاں کر لیں اور اسی ماحول میں رچ بس گئے اور بعد ازاں پاکستان کے خلاف منظم سازشوں کا حصہ بن گئے۔ امریکہ اور کئی دوسرے نیٹو ممالک ان کی پیٹھ تھپتھپاتے اور انھیں پاکستان کے خلاف استعمال کرتے رہے۔ پھر بھارت نے ان پر سرمایہ کاری شروع کر دی، ان کے گروپ بنائے جن کی وجہ سے پاکستان میں تکفیری سلسلہ زور پکڑتا گیا۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ ان میں سے کوئی بھی مجاہد نہیں تھا۔ یہی لوگ پہلے تحریک طالبان پاکستان میں پیش پیش تھے اور یہی اب داعش میں چلے گئے ہیں۔‘‘

سر! کیا آپ یہ کہہ رہے ہیں کہ تحریک طالبان پاکستان اور داعش دونوں تکفیری فرقے ہیں۔ پروفیسر مظہر نے وضاحت چاہی۔

’’تکفیری ہیں، سارے تکفیری..... یہ کوئی جہاد نہیں کرتے، یہ تو جہاد کے دشمن ہیں جو بدفطرت کافروں سے نہیں لڑتے،

جبکہ مسلمانوں کو قتل کرتے ہیں۔'' حافظ صاحب نے بڑی قطعیت کے ساتھ جواب دیا۔

لیکن وہ مولانا سمیع الحق صاحب کو تو اپنا استاد تسلیم کرتے ہیں اور انہوں نے بھی کبھی اس سے انکار نہیں کیا۔ پروفیسر مظہر نے دھیمے انداز میں ایک مشکل سوال اٹھایا۔

''میں مولانا کو جانتا ہوں اور اُن کا ساتھی ہوں۔ دراصل ملاعمر نے مولانا کے مدرسے میں پڑھا تھا اور ان کا شاگرد تھا۔ اس نے ہی اپنے گروپ کا نام 'طالبان' رکھا۔ اب طالبان دو قسم کے ہیں، ایک وہ جو افغان طالبان ہیں اور دوسرے وہ جو طالبان کی اچھی شہرت سے فائدہ اٹھا کر تحریک طالبان پاکستان کے روپ میں ہیں جو افغان طالبان کے دشمن ہیں اور پاکستان کے بھی۔ میں ذاتی طور پر جانتا ہوں کہ ملاعمر ان کے ہاتھوں بہت پریشان رہا۔'' حافظ صاحب نے وضاحت کی۔

کہا جاتا ہے کہ پاکستانی طالبان نے ملاعمر کے ہاتھ پر بیعت کی تھی؟ طیب اعجاز قریشی نے ٹی ٹی پی کی اصل حقیقت معلوم کرنا چاہی۔

حافظ صاحب نے اس اہم پہلو کی وضاحت کرتے ہوئے کہا:

''یہ تکفیری بہت دروغ گو ہیں اور جس کی بیعت کرتے ہیں، اسی کو قتل بھی کر دیتے ہیں۔ مولانا سمیع الحق افغان طالبان کے ساتھ ہمدردی رکھتے ہیں، لیکن ان تکفیریوں کے ساتھ اُن کا ہرگز کوئی رشتہ نہیں۔''

اس موضوع پر گفتگو کا سلسلہ دراز ہوا' تو القدسیہ کی فضائیں اذان کی صدا سے معطّر ہونے لگیں۔ پھر ہم سب نے حافظ صاحب کی امامت میں نماز ظہر ادا کی۔ واپس نشست گاہ پہنچے' تو میزوں پر پُرتکلّف کھانا لگ چکا تھا۔ کھانے کی اشتہا انگیز خوشبوؤں کی مہک سے ہماری بھوک چمک اُٹھی جس کا مکالمے کے دلچسپ مرحلے میں احساس ہی ختم ہو گیا تھا۔

کھانا کھانے کے بعد چائے کا دور چلا اور اس دوران گفتگو کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ حافظ صاحب نے ایک بار پھر تکفیری فتنے پر بات شروع کی اور فرمایا: ''تکفیری فتنے کی تاریخ بہت پرانی ہے۔ اس کا آغاز خلفائے راشدین کے دور میں ہی ہو گیا تھا۔ ہوا یہ کہ جب حضرت عمرؓ کے دور میں مسلمانوں کی فتوحات کا سلسلہ حیرت انگیز حد تک دراز ہوا' تو یہودیوں نے مسلمانوں کے اندر خوارج کا فتنہ کھڑا کیا جس سے اُمت کے اندر ایک خوفناک انتشار پیدا ہوا۔ اس فتنے کے پیچھے آج بھی کہیں یہودی اور کہیں عیسائی ہیں۔ اب تو یہ واضح ہو گیا ہے کہ داعش امریکہ کی پیداوار ہے۔ صدر اوباما نے اس کا کھلے بندوں اعتراف کیا ہے۔ حضور اکرم ﷺ کا اس تکفیری فرقے کے بارے میں فرمان ہے: ''یہ بت پرستوں کو چھوڑیں گے اور مسلمانوں کو قتل کریں گے۔'' آپ دیکھ لیں کہ یہ لوگ مقبوضہ کشمیر میں کشمیریوں کے حق میں اور فلسطین میں اسرائیل کے خلاف لڑنے کے لیے تیار نہیں۔ مسلم دشمن طاقتوں کی کوشش ہے کہ 'داعش' مسلمانوں کی نمائندہ طاقت بن جائے' اسی لیے اسے میڈیا پر پروجیکشن مل رہی ہے' جبکہ ہم اس فتنے کے خلاف پوری طرح سرگرم ہیں۔''

حافظ صاحب نے کفر کے فتوے دینے اور مسلمانوں کی گردنیں کاٹنے والوں کی تاریخ جس وضاحت سے بیان کی اور اُن کے خلاف سخت موقف اختیار کیا' اس نے ہمارے ایمانی جذبوں اور ہماری معلومات میں گراں قدر اضافہ کیا۔ عالم حیرت میں طیب اعجاز قریشی نے پوچھا کہ جب یہ تکفیری پاکستان آئے تو کیا ہماری ایجنسیوں، ہمارے سکیورٹی اداروں کو پتہ نہیں چلا کہ یہ لوگ کون ہیں اور کہاں سے آئے ہیں؟

حافظ صاحب نے بلاتوقف جواب دیا: ''ان بے چاروں کو تو شروع شروع میں پتہ ہی نہیں چلا کہ یہ کون لوگ ہیں۔ وہ مجاہدین سمجھ کر اُن سے صرف نظر کرتے رہے' لیکن جب معلوم ہوا' تو پوری طرح چوکس ہوئے۔''

کیا مولوی فضل اللہ اسی گمراہ ٹولے کا ہی حصہ ہے؟ طیب اعجاز نے مزید سوال کیا۔

حافظ صاحب بے اختیار بول اُٹھے: ''بھائی جان! مولوی فضل اللہ ان خوارج کا امام ہے۔''

حافظ صاحب! آپ کے خیال میں کشمیر کاز کے لیے کس نے سب سے زیادہ اور بہتر کام کیا ہے؟ پروفیسر مظہر ایک اور اہم پہلو پر پاکستان کی قد آور شخصیت سے راہنمائی لینا چاہتے تھے۔

انہوں نے قدرے غور و فکر کے بعد کہنا شروع کیا: ''میرے خیال میں پاکستان کی اکثر حکومتیں دباؤ کا شکار رہیں' البتہ ضیاالحق کی کشمیر پالیسی بہت کھلی اور واضح تھی۔ نواز شریف نے یہ مسئلہ جنرل اسمبلی میں ضرور اُٹھایا ہے' مگر انہوں نے بنیادی مسائل نظر انداز کیے ہیں۔ بھارت نے کشمیر کی سرحد پر باڑ لگالی اور مقبوضہ کشمیر میں پختہ مورچے بنا ڈالے' مگر اُن کی حکومت نے کبھی احتجاج نہیں کیا کہ کس قانون کے تحت بھارت متنازع علاقے میں باڑ لگا رہا ہے اور پختہ مورچے بنا رہا ہے۔''

آپ کے خیال میں مسئلہ کشمیر کا پائیدار حل کیا ہے۔ کامران الطاف نے ایک اہم سوال اُٹھایا۔

حافظ صاحب نے کسی قدر گرجدار آواز میں کہا: ''حل یہ ہے کہ پاکستانی حکومت کشمیریوں کے ساتھ کندھا ملا کر کھڑی ہو جائے اور اقوام متحدہ کی قراردادوں کے مطابق مسئلہ حل کرنے پر پوری توجہ مرکوز کر دے۔ ہمیں تحریک آزادی کے ساتھ ہر صورت کھڑا رہنا چاہیے۔ انڈیا کی دوستی جائے بھاڑ میں۔''

مجھے محسوس ہوا کہ حافظ صاحب شدت جذبات میں بہت دور نکل گئے ہیں اور بدلے ہوئے عالمی حالات سے چشم پوشی کر رہے ہیں۔ ایسے وقت میں جب اہل مغرب مسلمانوں پر دہشت گردی کے آئے دن الزامات کی بوچھاڑ کر رہے ہیں اور علاقائی اور عالمی امن کا قیام عالمی برادری کی سب سے بڑی ضرورت بن گیا ہے' تو پاکستان کو پھونک پھونک کر قدم رکھنا اور مفاہمت کی فضا پیدا کرنا ہوگی۔

طیب اعجاز قریشی نے اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ چین بہت سے معاملات پر اپنے موقف پر ڈٹا ہوا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ اپنی معیشت کو بھی مضبوط کرتا جا رہا ہے تاکہ دنیا سے اپنا موقف منوا سکے۔ اسی طرح ہمیں بھی اپنے موقف پر قائم رہنے کے ساتھ ساتھ اپنی معیشت کی مضبوطی کے لیے دوستانہ ماحول پیدا کرنا ہوگا۔ حافظ صاحب نے اپنی ایمانی بصیرت سے کام لیتے ہوئے جواب دیا:

''جتنی دیر میں ہم مضبوط ہوں گے، اُس وقت تک انڈیا مضبوط تر ہو چکا ہوگا۔ مجھے اللہ تعالیٰ کی ذات پر یقین ہے کہ آپ صرف ڈٹ کر کھڑے ہو جائیں' تو مسئلہ حل ہوتا جائے گا۔''

حافظ صاحب کے ساتھ ہمارا مکالمہ ایک خاص فضا میں آگے بڑھ رہا تھا اور تاریخ کے اوراق کھلتے جا رہے تھے۔ میں نے جماعۃ الدعوۃ کے مشن کے حوالے سے اپنے تاثرات بیان کرتے ہوئے کہا کہ اسلام کی فکر میں اسی قدر قوت اور عالمگیریت ہے کہ اگر اسے اہل یورپ کے سامنے مؤثر انداز میں پیش کیا جائے' تو وہاں اذہان وقلوب مسخر کیے جا سکتے ہیں۔ میں پوچھنا چاہتا ہوں کہ آپ نے ایسے مبلغ تیار کیے ہیں جو مختلف زبانیں جانتے ہوں اور اسلام کی دعوت جدید محاورے اور سلیس انداز میں پیش کرنے کی صلاحیت رکھتے ہوں۔ حافظ صاحب نے ایک توانا آواز میں جواب دیا:

"جی قریشی صاحب! الحمدللہ ہمارے پاس ایک کھیپ تیار ہے جو الیکٹرانک میڈیا پر اسلام کی دعوت دینے کی صلاحیت رکھتی ہے، البتہ دوسرے ملکوں میں بھیجنے کے لیے زبان کا مسئلہ درپیش ہے۔ انشااللہ ہم اس کا بھی اہتمام کریں گے۔ آپ یہ جان کر خوش ہوں گے کہ ہمارے ڈیڑھ سو طلبہ کی کلاسز جاری ہیں جن کو ہم سائنٹفک بنیادوں پر تیار کر رہے ہیں۔"

میں نے دل ہی دل میں کہا کہ دینی جماعتوں کے دعوؤں کے برعکس عالمی سطح کے سیمیناروں، مذاکروں، بین المذاہب مکالموں اور عالمی میڈیا میں ایسے افراد کی تعداد انتہائی کم ہے جو اسلام کا علمی بنیادوں پر دفاع اور اس کا اصل چہرہ کمال مہارت سے واضح کر سکیں۔ مسلم اُمہ کی ناکامی کا اس سے بڑا اور کیا ثبوت ہو گا کہ وہ اپنی ایک نیوز ایجنسی بھی قائم نہیں کر سکی۔ ایک زمانے میں او آئی سی نے اس کے قیام کا فیصلہ کیا اور پاکستان کی طرف سے تعاون بھی پیش کیا تھا، مگر باہمی اختلافات کی بہتات سے وہ منصوبہ ناکام رہا۔ مجھے یہ بھی یاد آیا کہ ایک بار پاکستان سے ایک درجن سے زائد صحافی مدینہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر کی دعوت پر ماہ رمضان میں سعودی عرب گئے اور انہوں نے سات روز قیام کیا۔ رخصت ہونے کی شب تراویح کے بعد رابطہ عالم اسلامی کے زعما سے ایک طویل نشست ہوئی اور مسلم اُمہ کو درپیش چیلنجز زیرغور آئے۔ میں نے چند تجاویز پیش کیں جو رابطہ عالم اسلامی کے سیکرٹری جنرل کو بہت پسند آئیں۔ انہوں نے ان تجاویز کو مرتب کرنے کا مشورہ دیا اور مجھے اور جناب مصطفیٰ صادق (مرحوم) کو مزید قیام کرنے پر اصرار کیا۔ ہم دونوں نے تجاویز مرتب کیں اور اُن کے حوالے کر دیں۔ ان میں سفارش کی گئی تھی کہ عالم اسلام کو میڈیا پر سب سے زیادہ توجہ دینا اور ٹی وی چینلز یورپ اور امریکہ میں بھی قائم کرنے چاہئیں۔ اس مقصد کے لیے باصلاحیت نوجوان اعلیٰ تعلیم و تربیت کے لیے دنیا کی بہترین یونیورسٹیوں میں بھیجے جائیں۔ یہ تربیت یافتہ نوجوان واپس آ کر اپنے ملکوں میں اعلیٰ درجے کے ٹی وی اسٹیشنز قائم کریں اور کامل اعتماد اور جدید علوم کے ساتھ اپنا نقطہ نظر پیش کریں۔

دوسری تجویز یہ تھی کہ اسلام کے ایسے اسکالر تیار کیے جائیں جو مختلف زبانوں میں مہارت کے ساتھ اسلام کا آفاقی پیغام دے سکتے ہوں اور دوسرے مذاہب کے علما سے منطق اور دلیل کے ساتھ بات کرنے کی اہلیت رکھتے ہوں۔ رابطہ عالم اسلامی کے سیکرٹری جنرل نے ہم سے جلد رابطہ قائم کرنے اور تجاویز پر عمل کرنے کا یقین دلایا، مگر سب کچھ بقرا لیعنی کل کی نذر ہو گیا۔ وہ کل جو شاذونادر ہی آتی ہے۔

میری طویل کہانی سننے کے بعد جماعۃ الدعوۃ کے امیر جناب حافظ محمد سعید نے فرمایا ہم آپ کی تجاویز کو عملی صورت دینے کی پوری کوشش کریں گے اور دین کی طرف سے ہم پر جو فرض عائد ہوتا ہے، اسے پوری ذمے داری سے ادا کریں گے۔ اس پر طیب اعجاز نے حافظ صاحب کی توجہ اس تلخ حقیقت کی طرف مبذول کرائی کہ ہماری بیشتر مذہبی جماعتیں دعوت دین کا حق ادا کر رہی ہیں نہ سائنسی بنیادوں پر کام کر رہی ہیں۔ اُن کا الیکٹرانک میڈیا میں اثر و رسوخ نہ ہونے کے برابر ہے۔ بھارت میں ڈاکٹر ذاکر نائیک پیس ٹی وی پر سائنٹفک بنیادوں پر کام کر کے لاکھوں لوگوں کو اسلام کی طرف راغب کر رہے ہیں۔ نوجوانوں کے اندر اسلامی روح پیدا کرنے اور معاشرے میں دینی اقدار کے فروغ اور استحکام کے لیے سائنسی بنیادوں پر ایسا ہی کام پاکستان میں بھی ہونا چاہیے۔ بے شک سوشل میڈیا ایک خوفناک بلا ہے، لیکن اگر اسے مثبت انداز میں استعمال کیا جائے تو نئی نسل پر مثبت اثرات مرتب کیے جا سکتے ہیں، کیونکہ وہ سوشل میڈیا کی اسیر ہے۔ آج الیکٹرانک میڈیا پر ایسے ڈرامے دکھائے جا رہے ہیں جو ہمارے رشتوں کا تقدس پامال کر رہے ہیں۔ آپ کو یاد ہو گا کہ ضیاالحق کے دور میں نازیہ زوہیب کا گانا آیا، تو بڑا زبردست احتجاج ہوا اور اس گانے پر پابندی لگانا پڑی۔ اب پاکستانی چینلز بے دھڑک انڈیا کے لچر ڈرامے دکھا رہے ہیں جو بے حیائی کے علاوہ بھارتی تہذیب ہم پر

مسلّط کرتے جا رہے ہیں، لیکن ہماری دینی جماعتیں خاموش ہیں۔ اور نظریاتی محاذ روز بروز کمزور ہوتا جا رہا ہے۔

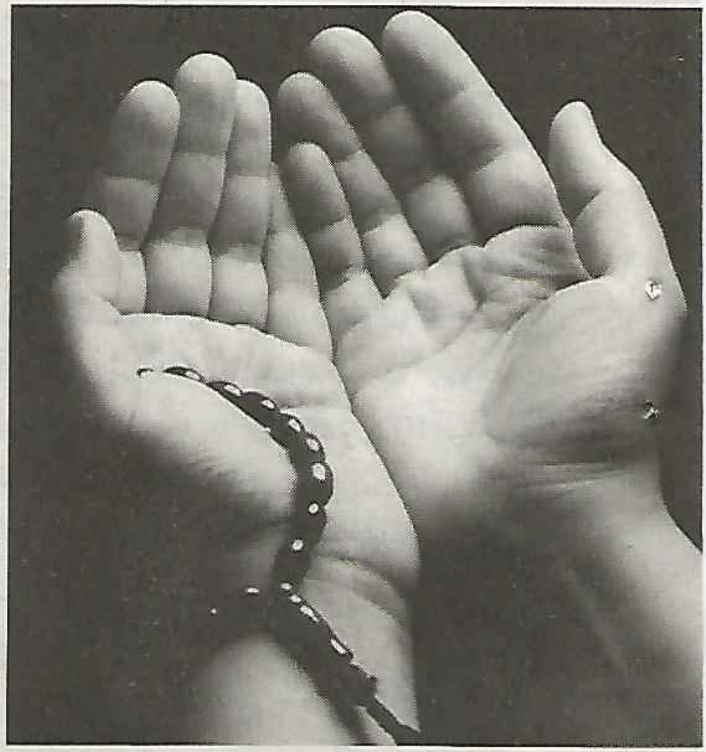
حافظ سعید صاحب نے بڑی توجہ سے پوری بات سننے کے بعد فرمایا: ''آپ کی تجویز بہت اچھی ہے اور اس پر کام کرنے کی ضرورت ہے۔ دہشت گردی کے خاتمے کے لیے ضربِ عضب آپریشن تو جاری ہے، میری سوچی سمجھی رائے ہے کہ جب تک تکفیری نرسری ختم نہیں ہوگی، دہشت گردی کا خاتمہ نہیں ہوگا۔ ہم لوگوں کی ذہن سازی پر بھرپور توجہ دے رہے ہیں۔ اللہ کا کرم ہے کہ ہمارے لٹریچر اور ہماری دعوت سے ہزاروں لوگ گمراہ ہونے سے بچ گئے ہیں۔ تکفیری نرسری کے بارے میں، میں نے وزیر داخلہ چودھری نثار سے ایک بار کہا تھا کہ پورا پاکستان دہشت گردی کے سدباب کے لیے آپ کے ساتھ کھڑا ہے۔ آپ ایسے مدارس اور علما کو پوری تحقیق اور چھان بین کے بعد سامنے لائیں جو دہشت گردی میں ملوث ہیں، ہم اُن کے خلاف کھڑے ہوں گے۔ قریشی صاحب! ہمیں یہ بھی مدنظر رکھنا ہوگا کہ ہر سانحے میں مدارس ملوث نہیں ہیں۔ سانحہ صفورا میں دینی مدرسے کا ایک طالب علم بھی شامل نہیں تھا۔ یہ زہر تو اسکولوں، کالجوں یونیورسٹیوں میں بھی پھیل چکا ہے، اس دہشت گردی میں تو ڈاکٹرز، انجینئرز، مولوی سبھی ملوث ہیں۔ داعش کے فتنے میں بڑے بڑے ڈاکٹر، اعلیٰ تعلیم یافتہ، پی ایچ ڈی سرگرم ہیں۔ دراصل ہمیں پوری توجہ فرقہ واریت کے خاتمے پر دینا ہوگی اور اس کے لیے تمام مکاتب فکر کے علما کو یکجا کر کے ایک ضابطہ اخلاق مرتب کرنا اور اسے عملی جامہ پہنانے کا ایک خودکار نظام وضع کرنا ہوگا۔ ہماری مساجد میں ایک خطبہ جمعہ کا نظام نہیں چل سکتا، البتہ راہنما اصول طے ہو سکتے ہیں اور مجھے یقین ہے کہ اگر حکومت سنجیدگی سے اس کام کا بیڑا اُٹھائے، تو علما راہنما اصولوں پر متفق ہو جائیں گے۔

حافظ صاحب نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا:

''ہم نے دفاعِ پاکستان کونسل اسی مقصد کے لیے بنائی تھی اور الحمدللہ اس میں ہم کافی حد تک کامیاب رہے۔ اب آپ کو پاکستان میں کہیں بھی اس شدومد سے شیعہ کافر، سنی کافر کا نعرہ سنائی نہیں دے گا ورنہ پہلے تو پاکستان کے درودیوار پر یہی نعرے درج ہوتے تھے۔''

اس نشست میں جناب محمد یعقوب بھی شریک تھے جو نظریہ پاکستان رابطہ کونسل کے چیئرمین ہیں۔ انہوں نے بتایا کہ ہم اسکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں نظریہ پاکستان کی ترویج کے لیے سائنسی بنیادوں پر کام کر رہے ہیں۔ ہماری کوشش ہے کہ قیامِ پاکستان کی مکمل داستان حقیقی جذبوں کے ساتھ نئی نسل تک پہنچائی جائے اور ان عوامل کی تاریخی شعور کے ساتھ نقاب کشائی کی جائے جن میں پاکستان کا قیام ناگزیر ہو گیا تھا اور اسے عہد جدید میں اسلام کی تجربہ گاہ بننا تھا۔ ہم یہ کام جناب حافظ محمد سعید کی نگرانی میں اپنی تمام تر توانائیوں سے سرانجام دینے کی کوشش کر رہے ہیں۔

ہمیں حقیقتوں اور جذبوں کا سراغ لگاتے ہوئے دو گھنٹوں سے زائد گزر چکے تھے اور قدسیہ کا ماحول ہمارے اندر ایک تازگی اور سرشاری کی کیفیت پیدا کر رہا تھا۔ اُٹھنے لگے، تو کامران الطاف نے حافظ صاحب سے بڑے ادب سے کہا آپ کے بارے میں عام تاثر یہ ہے کہ آپ فوجی حکمت عملی کے تقاضے خوب سمجھتے ہیں اور ہر قدم اُن کے مطابق اُٹھاتے ہیں۔ وہ ہلکے سے مسکرا دیے اور اپنے رب سے پاکستان کی سلامتی اور عظمت کے لیے دعائیہ کلمات ادا کیے اور ہم سب اس میں شریک ہو گئے۔ ان کی مہمان نوازی کا شکریہ ادا کیا۔ حافظ صاحب سے اجازت چاہی اور مرکز الدعوۃ والارشاد سے رخصت ہوئے۔ جناب امیر حمزہ اور شیخ محمد یعقوب ہمیں دروازے تک چھوڑنے آئے۔ سامنے چوبرجی کی تاریخی عمارت ہمیں الوداع کہہ رہی تھی جس کا وجود خطرے میں بتایا جا رہا ہے۔



دنیا مسائل کی آماجگاہ!

حاجت روائی کے لیے اسمائے حسنیٰ کی برکات

حافظ عمران حمید اشرفی

تمام تعریفیں اللہ جل شانہ ہی کے لیے ہیں۔ ہم اس کی حمد کرتے ہیں۔اس سے مدد مانگتے ہیں، اس سے بخشش طلب کرتے ہیں۔ اس پر ایمان لاتے ہیں، اس پر بھروسا کرتے ہیں، اپنے نفسوں کی شرارت اور اپنے اعمال کی برائیوں سے ہم اللہ رب العزت کی پناہ چاہتے ہیں۔ جس کو اللہ تعالیٰ ہدایت دے تو اس کو کوئی گمراہ کرنے والا نہیں اور جس کو وہ گمراہ کرے تو اس کو کوئی ہدایت دینے والا نہیں ہے۔ ہم گواہی دیتے ہیں کہ اللہ ذوالجلال کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ اکیلا ہے، اس کا کوئی شریک نہیں اور ہم گواہی دیتے ہیں کہ سرکار دو عالم، رحمتہ للعالمین حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ اس کے بندے اور رسول ﷺ ہیں۔

یہ دنیا کیا ہے! مسائل کی آماجگاہ ہے۔ برگزیدہ ہستیوں کے علاوہ جو بھی اس دنیا میں آیا ہے۔ مسائل اور پریشانیوں سے دوچار ہے۔ ہر انسان کبھی نہ کبھی کسی نہ کسی مسئلہ کا شکار ہو کر پریشان ہو جاتا ہے۔ ہماری ان پریشانیوں اور مسائل کو کون حل کر سکتا ہے؟ کس کو تلاش کریں؟ کس کا دروازہ کھٹکھٹائیں کہ جو ہمارے ان مسائل کو حل کر دے۔ ہماری دعاؤں کو قبول کر لے۔اللہ رب العزت کا ارشاد گرامی ہے کہ

''اور تمھارا رب کہتا ہے، مجھ سے دعا مانگو میں تمھاری دعا کو قبول کروں گا۔'' (المومن: ٦٠) اللہ تعالیٰ کا در ہی ہمارے پاس واحد سہارا ہے۔ جو کچھ بھی ملنا ہے ہمیں اسی در سے ملنا ہے۔ رب جلیل کے علاوہ عطا کرنے والا اور کون ہے؟ وہی ہمارا خالق، مالک اور رازق ہے۔ اگر دعا کے قبول ہونے میں تاخیر ہو جائے تو ہمیں مایوس نہیں ہونا چاہیے۔اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ

''تم اللہ کی مہربانی سے مایوس نہ ہو۔'' (الزمر: ۵۳)

ہمیں جو کچھ بھی مانگنا اور حاصل کرنا ہے وہ اپنے مولیٰ ہی سے حاصل کرنا ہے اس کے علاوہ اور کوئی پوری کائنات میں ایسا نہیں جو ہماری حاجت روا اور مشکل دور کر سکے۔ بیمار کو شفا دے سکے، محتاج کو غنی کر سکے، پریشان حال کی پریشانی ختم کر سکے اور سکون دے سکے۔ یہ میرا رب ہی ہے جس کے قبضہ قدرت میں یہ سب کچھ ہے۔ کیونکہ ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ ''بے شک اللہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔'' (البقرہ: ۲۰)

جب اللہ ہی ہر چیز پر قادر ہے اور کہتا بھی ہے کہ تم مجھ

سے مانگو میں تمھیں عطا کروں گا۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس سے کس طریقہ سے مانگا جائے کہ بارگاہ الٰہی میں ہماری دعا کو شرف قبولیت حاصل ہو جائے؟ آئیے یہ بھی قرآن مجید ہی سے سیکھتے ہیں کہ مانگنے کا طریقہ کیا ہے؟ ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ ''اور اللہ کے سب نام ہی اچھے ہیں تو اس کو ان ناموں سے پکارو۔'' (الاعراف: ع۲۲) تو معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کے ناموں کے ذریعہ سے دعا مانگی جائے تو اللہ تعالیٰ اسے قبول فرماتے ہیں کیونکہ ارشاد رب العالمین ہے کہ

''اور اللہ سے سچی کس کی بات ہے۔'' (النسا: ۸۷)

قرآن مجید میں کئی اور مقامات پر بھی خدائے بزرگ و برتر نے اپنے بندوں کو اپنے ناموں کے ذریعہ دعا مانگنے کا حکم فرمایا ہے۔

''کہہ دیجیے! کہ تم اللہ کہہ کر پکارو یا رحمٰن کہہ کر، جو کہہ کر پکارو گے تو اس کے سارے نام اچھے ہیں۔'' (بنی اسرائیل: ع۱۲)

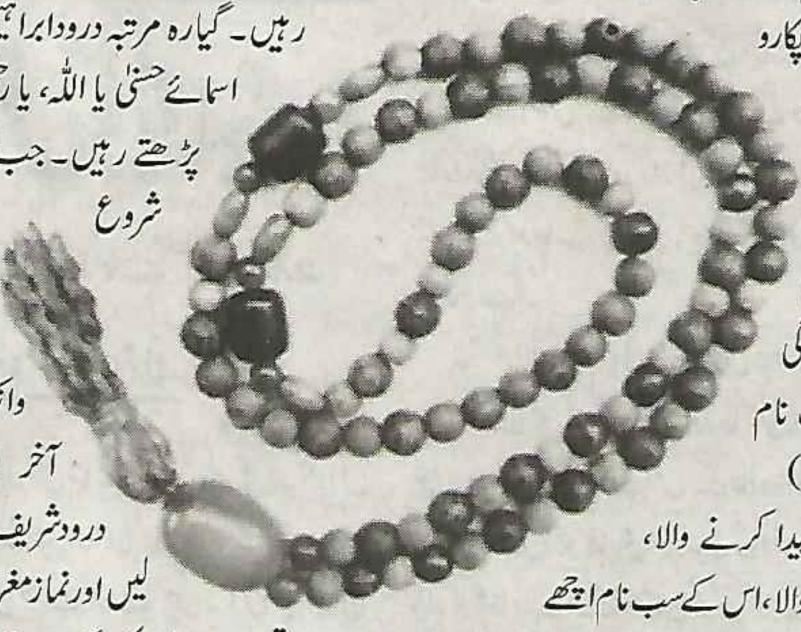
''اللہ ہے جس کے سوال کسی کی بندگی نہیں، اس کے سب نام اچھے ہیں۔'' (طٰہٰ: ع۱)

''وہ اللہ ہے پیدا کرنے والا، موجد، صورتیں بنانے والا، اس کے سب نام اچھے ہیں۔'' (الحشر: ع۳)

اللہ جل شانہ کے اسمائے حسنیٰ میں سے یا اللہ، یا رحمٰن، یا رحیم کا وظیفہ درج ذیل ہے۔ آپ کا کوئی بھی مسئلہ خواہ بے روزگاری، ترقی کاروبار، صحت، تعلیم، تنگی رزق، ادائیگی قرض، ترقی ملازمت، سحر، نظر بد، پریشانی، مقدمہ، بچوں یا بچیوں کی شادی سے متعلق یا ان کے علاوہ ہو۔ ان شاءاللہ العزیز آپ کا ہر مسئلہ اللہ جل شانہ کے ان پاک ناموں کی برکت سے یقیناً حل ہو جائے گا۔ پورے خشوع و خضوع، مکمل آداب اور پوری ترکیب کے ساتھ اگر عمل کریں گے تو اللہ، رحمٰن و رحیم کے اسمائے مبارکہ کا اثر یقینی ہے۔ بزرگان دین نے اسے حاجت روائی کے لیے بڑا ہی زوداثر اور عجیب عمل قرار دیا ہے۔ لاکھوں نہیں بلکہ کروڑوں حاجت مند اللہ رب العزت کے ان اسمائے مبارکہ سے فیض حاصل کر چکے ہیں۔ لہٰذا آپ بھی ان نورانی ناموں سے استفادہ کر سکتے ہیں۔ بندہ کو اپنے رب جلیل پر پورا بھروسا ہے کہ اس وظیفہ کو پڑھنے والے کی ہر جائز مراد ضرور پوری ہوتی ہے۔

نادر وظیفہ

نوچندی جمعتہ المبارک کو نماز عصر پڑھ کر اسی جگہ پر بیٹھے رہیں۔ گیارہ مرتبہ درود ابراہیمی پڑھ کر بعد تسمیہ اسمائے حسنیٰ یا اللہ، یا رحمٰن، یا رحیم بے شمار پڑھتے رہیں۔ جب نماز مغرب کی اذان شروع ہو تو اپنے مقصد کی دعا اللہ تعالیٰ سے نہایت عاجزی وانکساری سے مانگیں اور آخر میں دوبارہ مذکورہ درود شریف پڑھ کر وظیفہ مکمل کر لیں اور نماز مغرب ادا کریں۔ یہ عمل تین جمعتہ المبارک تک جاری رکھیں۔ وقت اور جگہ کی پابندی کریں۔ اکل حلال و صدق مقال پر عمل کریں۔ حاجت جائز ہونی چاہیے۔ باقی دنوں میں بالعموم اور دوران وظیفہ بالخصوص پنجگانہ نماز کی پابندی اور گناہوں سے پرہیز ضروری ہے۔





چین پاکستان کا سب سے بڑا تجارتی ساتھی بن چکا

وطن عزیز میں چین کے اکنامک کونسلر، لی شاؤ تنگ کی اُمید افزا اور معلومات سے بھرپور گفتگو

ملاقات: طیب اعجاز قریشی، ذکی اعجاز قریشی

پچھلے ماہ اسلام آباد جانا ہوا۔ ایک کام سے چین کے سفارت خانے بھی جانا پڑا۔ وہاں اکنامک و کمرشل کونسلر، مسٹر لی شاؤ تنگ سے ملاقات ہوئی جو ایک مختصر انٹرویو میں ڈھل گئی۔ مسٹر شاؤ تنگ بلند قامت ہونے کے باعث منفرد لگے ورنہ چینی عموماً پست قامت ہوتے ہیں۔ عربی زبان پر دسترس نے بھی حیران کیا۔ وہ پاک چین تعلّقات میں بہتری لانے کے لیے کوشاں ہیں۔ مسٹر شاؤ تنگ سے جو پُر مغز اور مفید گفتگو ہوئی، وہ پیش خدمت ہے۔

سوال: امریکا کے بعد چین دنیا کی دوسری بڑی معیشت بن چکا۔ اسی لیے سبھی اس کی معاشی کارکردگی پر گہری نظر رکھتے اور خوبیاں و خامیاں جانچتے ہیں۔ پچھلے چند ماہ سے عالمی ذرائع ابلاغ میں یہ خبر گرم ہے کہ چینی معیشت زوال پذیر ہے۔ اس خبر نے عالمی معیشت پر منفی اثرات مرتب کیے۔ آپ کی نگاہ میں چینی معیشت کس مقام پر کھڑی ہے؟

جواب: چین کی معیشت کے خلاف پروپیگنڈا نئی بات نہیں، ماضی میں بھی کئی بار ایسا ہو چکا۔ تب یہ پیش گوئیاں کی گئیں کہ چینی معیشت جلد دھڑام سے گر پڑے گی۔ مگر خوش قسمتی سے یہ مایوس کن خبریں درست ثابت نہ ہو سکیں۔ اب







بھی یہ پیش گوئیاں عملی روپ اختیار نہیں کر سکیں گی۔

یہ درست ہے کہ پچھلے سال چینی معیشت اتار چڑھاؤ کا شکار رہی۔ خاص طور پر اسٹاک مارکیٹ اور چینی کرنسی پر خاصا دباؤ رہا لیکن غیر جانب دار ماہرین معاشیات کا تجزیہ آشکارا کرتا ہے کہ چینی معیشت نے نشوونما و افزائش کا روایتی چلن برقرار رکھا۔

یہ دیکھیے کہ ۲۰۱۵ء میں چینی معیشت کی جی ڈی پی شرح ترقی ۶ء۹ فی صد رہی جو اطمینان بخش ہے۔ یہ خوش کن شرح ترقی اسی لیے حاصل ہوئی کہ چینی معیشت کا حجم دس ٹریلین ڈالر سے بھی زیادہ ہے۔ یہ کوئی معمولی رقم نہیں! یہی وجہ ہے، پچھلے سال عالمی معیشت کی مجموعی ترقی میں ’’۳۰ فی صد حصہ‘‘ چین کا رہا۔ جو ہمارے لیے قابل رشک امر ہے۔

دوسری بات یہ کہ چینی معیشت جامد نہیں لچک دار ہے۔ ابھی اس کی کئی خوبیوں سے فائدہ نہیں اٹھایا جا سکا۔ چین میں شعبہ صنعت و تجارت، شہری آباد کاری اور زراعت جدت (ماڈرنائزیشن) کے عمل سے گزر رہی ہیں۔ مستقبل میں یہ عمل چینی معیشت کو پھلنے پھولنے میں بہت مدد دے گا۔ گویا چینی معیشت کی ترقی طویل عرصہ برقرار رہے گی۔

تیسرے چین کا مالیاتی شعبہ عمدہ حالت میں ہے۔ خسارہ اور قرضے، دونوں حکومت کے کنٹرول میں ہیں۔ اس بنا پر چینی حکومت ہمہ اقسام کی مائیکرو اکنامک پالیسیاں تشکیل دے سکتی ہے تاکہ معیشت بدستور پھلتی پھولتی رہے اور اغلاط کا نشانہ نہ بنے۔

چین کی معاشی ترقی اس لیے بھی برقرار رہی کہ حکومت وسیع پیمانے پر معیشت کی ہیئت و ساخت (اسٹرکچر) میں مثبت تبدیلیاں لائی ہے۔ ان تبدیلیوں

کے باعث معیشت کے معیار اور کارکردگی میں اضافہ ہوا۔ حکومت قومی سطح پر کاروباری و تجارتی مہم جوؤں اور اختراع کاروں کی حوصلہ افزائی کرتی ہے۔ ہمارے نزدیک یہ معیشت چلانے والا نیا انجن ہے۔ اس حکمت عملی کے ذریعے جدید ترین ٹیکنالوجی اور مہارت نامہ رکھنے والی افرادی قوت سے لیس صنعتیں جنم لیں گی۔ یوں نت نئی کاروباری کمپنیاں سامنے آئیں گی جو تخلیقی ہوں گی اور ترقی کی متمنّی بھی!

درج بالا حقائق عیاں کرتے ہیں کہ چینی معیشت اب بھی متحرک، متاثرکن اور پُرکشش ہے۔ پچھلے سال چین میں ۱۲۵ارب ڈالر کی غیرملکی سرمایہ کاری ہوئی جو ایک نیا ریکارڈ ہے۔ اس میں سے ۷۰ فی صد سرمایہ ہائی ٹیک اور خدمت (سروسز) فراہم کرنے والی صنعتوں کو ملا۔ چینی حکومت ساتھ ساتھ ''ایک پٹی ایک شاہراہ'' (One Belt and one road) منصوبے کے تحت بیرون ممالک میں بھی اپنی سرمایہ کاری بڑھا رہی ہے۔

۲۰۱۵ء میں چینی سرمایہ کاروں نے دنیا کے ''۱۵۵'' ممالک اور علاقوں میں سرمایہ کاری کی۔ ان کی کُل سرمایہ کاری ۱۱۸ارب ڈالر سے زیادہ بنتی ہے۔ یہ رقم سال بہ سال ۱۴ء۷ فی صد بڑھ رہی ہے۔ اس دوران تاریخ میں پہلی بار بیرون ممالک میں چینی سرمایہ کاری کی مالیت ایک ٹریلین ڈالر سے بڑھ چکی۔

سوال: پچھلے سال چین اور پاکستان کے تعلّقات کی نوعیت کیا رہی؟

جواب: پاک چین تعلّقات کی تاریخ میں ۲۰۱۵ء کا سال سنگ میل جیسی حیثیت رکھتا ہے۔ اسی برس دونوں ممالک کے مابین نہ صرف دوستانہ گرم جوشی میں اضافہ ہوا بلکہ نتیجہ خیز معاہدے بھی انجام پائے۔ اپریل میں چینی صدر نے پاکستان کا کامیاب دورہ کیا۔ دونوں ممالک کا تعاون سدابہار اور تزویراتی گہرائی رکھتا ہے۔ چینی صدر کے دورے سے اس دیرپا تعاون میں مزید گہرائی آئی اور پاک چین تعلّقات کا نیا باب رقم ہوا۔

چین اور پاکستان کی مشترکہ کوششوں کے باعث باہمی تجارتی اور کاروباری سرگرمیوں میں بیش بہا اضافہ ہوا ہے۔ دونوں ممالک کی دوستی بہت پائیدار ہے۔ معیشتیں ایک دوسرے کی مددگار ہیں اور حکومتوں کو اپنے اپنے عوام کی بھرپور حمایت حاصل ہے۔ ان وجوہ کی بنا پر دونوں ممالک کے مابین باہمی تجارت روزافزوں ہے اور ایک خوشحال مستقبل ہمارا منتظر ہے۔

پاکستان اور چین نے ۲۰۰۷ء میں ''آزاد تجارت معاہدہ'' (فری ٹریڈ ایگریمنٹ) کیا تھا۔ تب سے باہمی تجارت کا حجم مسلسل بڑھ رہا ہے۔ فی الوقت دونوں ملک معاہدے کے دوسرے مرحلے پر گفت وشنید کر رہے ہیں۔ پاکستانی اعداد و شمار کے مطابق ۱۵ء۔۲۰۱۴ء کے مالی سال سے چین پاکستان کا سب سے بڑا تجارتی ساتھی بن چکا جو ایک تاریخی اور خوش آئند بات ہے۔

چین کے اعداد و شمار کی رو سے پاک چین تجارت کا حجم ۲۰۱۵ء میں تقریباً ۱۹ارب ڈالر تک پہنچ گیا ہے۔ گویا پچھلے سال کی نسبت ۱۸ء۲ فی صد اضافہ ہوا۔ ۱۴ء۔۲۰۱۳ء کے مالی سال سے چین تمام ممالک میں سب سے زیادہ پاکستان ہی میں براہ راست (ڈائریکٹ) سرمایہ کاری کر رہا ہے۔ یہ رجحان پچھلے دو برس سے جاری ہے۔ جنوبی ایشیا میں پاکستان ہی چینی سرمایہ کاری کا سب سے بڑا مرکز ہے۔ پاکستان اسٹاک مارکیٹوں میں چینی سرمایہ کاری کا حجم ۳ء۹۴ ارب ڈالر سے بڑھ چکا۔ درج بالا اعداد و شمار سے عیاں ہے کہ چینی سرمایہ کاروں کو پاکستانی معیشت پر مکمل اعتماد ہے اور وہ بلاخوف وخطر پاکستان میں اپنا پیسا لگا رہے ہیں۔

جہاں تک خصوصی منصوبوں کا سوال ہے، یہ حقیقت سبھی جانتے ہیں کہ "ایک پٹی ایک شاہراہ منصوبے" سے وابستہ "پاک چین اقتصادی راہداری" چینی حکومت کا اہم و قیمتی پروجیکٹ ہے۔ یہ بتدریج عمل میں ڈھل رہا ہے۔ پچھلے دسمبر کو قراقرم ہائی وے فیز ٹو (حویلیاں تا تھاکوٹ) اور کراچی لاہور موٹروے (ملتان۔ سکھر سیکشن) منصوبوں کی تقریب رونمائی کامیابی سے انجام پائی۔ یہ پاک چین اقتصادی راہداری کے قابل عمل ہونے کی دلیل ہیں۔

حکومت چین پاکستانی قوم کو زیادہ سے زیادہ فوائد پہنچانے پر کمربستہ ہے۔ جب اکتوبر ۲۰۱۵ء میں پاکستان زلزلے کا نشانہ بنا تو محض دس دن میں چینی حکومت نے متاثرین کو امدادی اشیا بھجوا دیں اور ان کی ہر ممکن مدد کرتی رہی۔ چین نے پاکستان میں کئی فلاحی منصوبے شروع کر رکھے ہیں۔ مثال کے طور پر گوادر میں اسپتال کی تعمیر اور مہاجرین فاٹا کی مالی امداد تاکہ وہ آباد ہو سکیں۔

سوال: چین کی معاشی ترقی بہرحال کچھ سست روی کا شکار ہے۔ اس سے کیا پاک چین تعلّقات متاثر ہوں گے؟ نیز تعلّقات میں گرم جوشی برقرار رکھنے کے لیے کس قسم کے اقدامات کرنا ضروری ہیں؟

جواب: چینی معیشت اور پاک چین تعلّقات کی موجودہ صورت حال دیکھتے ہوئے مجھے یقین ہے کہ مستقبل میں جوش و ولولہ برقرار رہے گا۔ دونوں ممالک کی دوستی سدابہار، دیرپا اور ٹھوس ہے۔ وہ اب تک ایسا آئیڈیل پلیٹ فارم تخلیق کر چکے جس کی مدد سے دونوں ممالک کے کاروباری، تاجر اور صنعت کار صنعت بخش شراکتی منصوبے شروع کر سکتے ہیں۔ چینی حکومت مسلسل مالی طور پر مضبوط اور تجربے کار کاروباری کمپنیوں پر زور دے رہی ہے کہ وہ پاکستان میں سرمایہ کاری کریں۔

مجھے یقین ہے، پاک چین تعلّقات سست روی کا شکار نہیں ہو سکتے بلکہ پاکستانی قوم کے لیے زیادہ پھل پھول لائیں گے۔ چینی حکومت اپنی معیشت کو "نیونارمل" (New Normal) پالیسی کے تحت نیا رخ دینا چاہتی ہے۔ پائیدار شرح ترقی، متفرق معاشی قوتوں کی شمولیت اور خوشحال مستقبل اس پالیسی کی خصوصیات ہیں۔ یہ پالیسی دونوں برادر ممالک کے دوطرفہ تعلّقات کو مزید تقویت پہنچائے گی۔

چین اور پاکستان کے مابین ۱۹۵۰ء میں سفارتی تعلّقات قائم ہوئے تھے۔ گویا اس سال ہم دونوں اپنے تعلّقات کی ۶۵ ویں سالگرہ تزک و احتشام سے منائیں گے۔ چین پوری طرح تیار ہے کہ ترقی و خوشحالی کے لیے پاکستان کا پورا پورا ساتھ دے۔ یوں باہمی تعلّقات کو عروج پر پہنچانا مقصود ہے۔

مستقبل میں جھانکتے ہوئے میں سوچتا ہوں، دونوں ممالک کو قربت و الفت سے کام کرنا چاہیے تاکہ سبھی جاری منصوبے بہترین انداز میں پایہ تکمیل تک پہنچ سکیں۔ یوں باہمی تعاون کی نئی بنیادیں بھی رکھی جائیں گی۔ ان منصوبوں میں اہم ترین قراقرم ہائی وے فیز ٹو کی تعمیر ہے۔ جب یہ منصوبہ مکمل ہوا تو چینی سرمایہ کار زیادہ سہل انداز سے پاکستانی مارکیٹوں میں سرمایہ کاری کر سکیں گے۔

مجھے یقین واثق ہے، دونوں برادر ممالک باہمی کوششوں سے خوشحالی، کامرانی اور ترقی کی نئی منازل پر جا پہنچیں گے۔ ایک سنہرا مستقبل چین اور پاکستان کا منتظر ہے۔

☆☆

سدا مسکراتے رہنے والے مسٹر لی شاؤ تنگ کی گفتگو پاک چین تعلّقات کے حوالے سے تابناک اور روشن منظرنامہ پیش کرتی ہے۔ ان سے طے پایا کہ اس موضوع پر سفیر چین سے تفصیلی گفتگو ہو گی۔ ہمیں یقین ہے کہ سفیر چین پاک چین تعلّقات کے حوالے سے چھپے ان چھپے گوشے پاکستانی قوم کے سامنے لائیں گے۔



''شہد.....شفاء ہے''

طبی وغذائی خصوصیات کی بنا پر لاثانی نعمت خداوندی ہے

حکیم علی حسنین تابش

اکثر دیکھنے میں آیا ہے کہ اگر کوئی طبیب یا اہل علم کسی کو شہد استعمال کرنے کی رائے دیتا ہے تو کئی سوالات ذہن میں اُٹھتے ہیں۔شہد گرم ہے، جسم میں گرمی نہ پیدا ہو جائے، جگر کو گرم نہ کر دے یا اسی طرح کے اور کئی وہم ذہن میں آجاتے ہیں حالانکہ شہد شفاء ہے۔

قرآن مجید فرقان حمید میں درج کر دیا گیا کہ

''اے پیغمبرﷺ تیرے مالک نے شہد کی مکھی کو سکھایا کہ پہاڑوں اور درختوں اور چھتوں میں گھر بنائے (یعنی چھتے بنا)''

پھر ہر قسم کے پھل دار پھول چوستی رہ پھر (لوٹ کر) اپنے مالک کے آسان رستوں میں چلی جا (اور چھتے میں داخل ہو جا) اُس کے پیٹ سے پینے کی چیز نکلتی ہے، یعنی شہد۔کئی طرح کے رنگ کے ساتھ۔اس میں لوگوں کے لیے تندرستی شفاء ہے۔ کئی بیماریوں کے لیے جو لوگ غور کرتے ہیں ان کے لیے اس میں اللہ تعالیٰ کی قدرت کی نشانیاں ہیں۔

قرآن مجید میں سورۃ محمد میں فرمان رب کریم ہے:

''اور صاف شفاف شہد کی بھی نہریں ہیں اور ان کے سوا ہر طرح کے میوے ان کے لیے وہاں موجود ہیں۔''

مندرجہ بالا دونوں مقامات میں شہد کا ذکر جس انداز میں ہے وہ خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ پہلے مقام پر شہد کی مکھی کو بالواسطہ اللہ تعالیٰ کی ہدایت ملی، یہ بذات خود ایک مقام عظمت ہے، پھر اُسے زمین سے اوپر بلند مقامات پر اپنے چھتے بنانے کا حکم بھی مصلحت خیز ہے، پھر تیسرے نمبر پر اسے غذا اخذ کرنے کے لیے پھلوں اور پھولوں کا انتخاب بھی شہد کی خصوصیات اور اہمیت کو واضح کرتا ہے۔ اللہ پاک نے عام اعلان کر رکھا ہے کہ یہ قیامت تک کے آنے والوں کے لیے شفاء ہے۔ یہ صرف امت محمدیہﷺ کے لیے نہیں کسی خاص نسل، کسی مسلمان کے لیے نہیں، کسی غیر مسلم کے لیے نہیں بلکہ تمام کے لیے شفاء بنا کر بھیجا گیا ہے۔

اس اعلان عام کے بعد اصحاب علم واہل ایمان کے لیے نکتہ فرما دیا گیا ہے کہ اس شہد کی تیاری میں اس کی افادیت خصوصیات تلاش کرو، اس کے شفائی اثرات میں شکوک وشبہات میں پڑنے والوں اور شکوک وشبہات پیدا کرنے والوں کو تنبیہ کر دو کہ شہد کی شفاء بخشی میں شک وشبہ کرنا ایمان کی کمزوری ہے۔ جسے رب کہہ

دے شفاء ہے تو تم کیونکر اسے مشکوک بنا سکتے ہو۔

جب اللہ پاک نے فرما دیا ہے کہ شہد شفاء ہے تو بس شفاء ہے، اس کا کوئی نقصان نہیں۔ اس تصور کو بھی ذہن سے نکال دینا چاہیے کہ شہد کی وجہ سے کوئی نقصان ہو سکتا ہے۔ ہاں کئی باتیں غور و فکر کا تقاضا کرتی ہیں وہ یہ ہیں کہ:

استعمال اوقات، استعمال کے مواقع، استعمال کے طریقے، ان تینوں باتوں پر عمل کر کے شہد سے بیشمار فوائد حاصل کئے جا سکتے ہیں۔ شہد کی اتنی تعریف اور اس کی افادیت و فوائد بیان کرنے کے بعد یہ بات بیان کرتے ہوئے کچھ عجیب سا محسوس ہو رہا ہے کہ اس کے نقصانات کیا ہیں۔ نہیں بلکہ نقصانات کا مطلب یہ ہے کہ اگر شہد کو بے موقع بے وقت بلاوجہ استعمال میں لایا جائے تو اس سے نقصان ہو سکتا ہے۔

یہ ضروری نہیں کہ شہد ہی سے بلکہ ہر چیز جس کو بے موقع، بے وقت استعمال میں لایا جائے گا تو ظاہری سی بات ہے اس سے نقصان ہی ہو گا۔ اس لیے اس کو استعمال کرنے کے لیے مناسب مقدار، مناسب وقت کا معلوم ہونا ضروری ہے اور یہ بھی معلوم ہو کہ یہ کس مرض میں کس طرح کام کرتا ہے۔

افعال و استعمال:

قدرے ملین محلل ریاح، دافع تعفّن، بدن کو طاقت بخشتا ہے۔ پھیپھڑوں میں بلغم ختم کرتا ہے۔ دواؤں کو تعفّن سے بچانے، ذائقہ خوشگوار کرنے اور ان کی قوت کو عرصہ تک برقرار رکھنے کے لیے اس کے قوام میں معجونات، جوارشات اور مربے تیار کر دیے جاتے ہیں۔

قوت بدن کے لیے گرم دودھ میں ملا کر استعمال کریں۔ بلغم یا دمہ کھانسی میں تنہا یا مناسب ادویہ کے ساتھ چٹاتے ہیں۔

سرد بیماریوں میں اکسیر ہے۔ لقوہ، فالج میں ماءالعسل بنا کر پلاتے ہیں۔ جلاء بصر (نظر) کیلئے آنکھوں میں لگاتے ہیں۔ شہد تصفیہ خون اور امراض قلب کے لیے بھی نافع ہے۔

موجودہ سائنسی تحقیقات نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو جو بھی غذائی نعمتیں عطا کی ہیں ان میں سے شہد مکمّل اور جامع غذاء ہی نہیں بلکہ اپنی طبی خصوصیات کی بناء پر غذا اور دواء کے طور پر لاثانی ہے۔ شہد کو چہرے پر سے پھنسیاں اور مہاسے دور کرنے کا بھی ایک اچھا علاج سمجھا جاتا ہے۔ یورپ میں اسپتالوں میں چہرے کی حفاظت کے لیے جو فیشل ماسک بنائے جاتے ہیں۔ ان میں بھی شہد ایک لازمی جزو ہوتا ہے۔

حضرت مولانا حکیم محمد عبداللہ نوراللہ مرقدہ اپنی تصنیف خواص شہد میں تحریر فرماتے ہیں: یہ گاڑھا، نیم شفاف، ہلکا زردی مائل کا یا کسی قدر بھورا سیال ہے جو پرانا ہو جانے پر غیر شفاف ہو جاتا ہے اور اس میں قلمی ذرات نظر آتے ہیں جو گنے کے رس کی طرح شیریں ذائقہ رکھتے ہیں۔ اس سے لطیف قسم کی خوشبو بھی آتی ہے۔ بہترین شہد جو دوائی کے لیے مستعمل ہے اس کی صفاف درج ذیل ہیں۔

خوشبودار ہو، پاکیزہ پھولوں سے حاصل کیا گیا ہو، اس میں شیرینی زیادہ ہو، ذائقہ میں تیزی ہو لیکن کڑواہٹ نہ ہو، سرخی مائل ہو، شفاف اور موم سے صاف ہو۔

یہ تمام خصوصیات مولانا صاحب اپنی کتاب خواص شہد میں لکھتے ہیں جو اوپر بیان کر چکا ہوں۔

شہد کو سر کے بالوں میں لگانے سے بال مضبوط اور چمکدار ہو جاتے ہیں دانتوں پر بطور پیسٹ لگانے سے مسوڑھے مضبوط ہوتے ہیں۔ شہد کا شربت صبح نہار منہ استعمال کرنا ہمارے پیارے نبی ﷺ کی سنت بھی ہے آپ ﷺ نہار منہ شہد کا شربت استعمال کرتے تھے۔ شہد کے مسلسل استعمال سے موٹاپا دور ہوتا ہے۔ غرض یہ کہ ہر بیماری کیلئے شہد شفاء ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ہمیں بہت سی نعمتوں سے نوازا ہے اور ہمیں اس کا شکر ادا کرنا چاہیے۔ اب وہ حضرات جن کے ذہن میں شہد گرم ہونے یا کسی اور طرح کا کوئی بھی وہم ہو تو مہربانی فرما کر اس وہم کو دور کریں اور شہد ضرور استعمال کیا کریں۔ تاہم کسی اچھے معالج سے مشورہ کر لیں تاکہ شہد استعمال کرنے کا طریقہ معلوم ہو جائے۔

حضرت عبداللہؓ بن عمرؓ..... فقیہ الاُمتّ

تمام صحابہؓ و تابعین اُن کے اوصافِ حمیدہ، علمی وجاہت اور جلالت قدر کے مداح تھے

طالب الہاشمی

حضرت سفیان ثوریؒ، امام شعبیؒ سے روایت کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ قریش کے چار نوجوان حرم کعبہ میں جمع ہوئے اور چاروں میں طے پایا کہ ہم میں سے ہر شخص رکن یمانی پکڑ کر اللہ تعالیٰ سے اپنی زندگی کی سب سے بڑی خواہش پوری کرنے کے لیے دعا مانگے۔ چناں چہ پہلے ایک جوان اٹھا اور اس نے دعا مانگی:

''الٰہی تو عظیم ہے اور تجھ سے عظیم چیزیں ہی مانگی جاتی ہیں اس لیے میں تجھ کو تیرے عرش، تیرے حرم، تیرے نبیؐ اور تیری ذات کی حرمت کا واسطہ دے کر دعا کرتا ہوں کہ مجھے اس وقت تک زندہ رکھ جب تک ارضِ حجاز پر میری خلافت قائم ہو جائے۔''

اس کے بعد دوسرے جوان نے رکنِ یمانی پکڑ کر دعا مانگی:

''بارِ الٰہا تو کائنات کی ہر شے کا خالق ہے۔ آخر میں ہر چیز کو تیری ہی طرف لوٹنا ہے۔ میں تجھ سے تیری قدرت کا واسطہ دے کر جس کے قبضہ میں تمام عالم ہے، دعا کرتا ہوں کہ مجھے اس وقت تک زندہ رکھ جب تک کہ میں عراق کا والی ہو جاؤں.....''

پھر تیسرے جوان نے دعا مانگی:

''اے ارض و سما کے مالک میں تجھ سے ایسی چیز مانگتا ہوں جس کو تیرے اطاعت گزار بندوں نے تیرے حکم سے مانگا ہے۔ میں تجھ سے تیری ذات کی کبریائی، تیری مخلوقات اور اہلِ حرم کے حق کا واسطہ دے کر دعا مانگتا ہوں کہ تو مجھے دنیا سے اس وقت تک نہ اٹھا جب تک مشرق و مغرب پر میری حکومت قائم نہ ہو جائے اور جو شخص میرے خلاف کھڑا ہو اس کا سر نہ کچل دوں۔''

اس کے بعد چوتھا جوان اٹھا اور اس نے بڑے خشوع و خضوع کے ساتھ یہ دعا مانگی:

''اے اللہ تو رحمٰن و رحیم ہے میں تیری اس رحمت کا واسطہ دے کر دعا کرتا ہوں جو تیرے غضب پر غالب ہے کہ مجھے آخرت میں رسوا نہ کرنا اور مجھے اس عالم میں جنت عطا فرمانا۔''

پہلے جوان حضرت عبداللہ بن زبیرؓ تھے، دوسرے ان کے چھوٹے بھائی مُصعَب بن زبیرؓ، تیسرے عبدالملک بن مروان اور چوتھے جوان جن کی زندگی کی سب سے بڑی تمنا صرف اور صرف آخرت کی بھلائی تھی، فقیہ الاُمّت حضرت عبداللہ بن عمرؓ تھے۔

سیّدنا حضرت ابو عبدالرحمٰن عبداللہ بن عمرؓ کا شمار اساطینِ اُمّت میں ہوتا ہے۔ وہ عام طور پر ''ابنِ عمرؓ'' کے نام سے مشہور ہیں یعنی اس عمرِ فاروقؓ کے فرزند جن کے بارے میں سید الانبیا والمرسلینؐ نے فرمایا تھا کہ:

''لو کان بعدی نبی لکان عمر نبیا الا انہ لا نبی بعدی۔'' (اگر میرے بعد کوئی نبی ہوتا تو عمرؓ ہوتا لیکن میرے

بعد کوئی نبی نہیں۔)

حضرت ابنِ عمرؓ کا سلسلہ نسب یہ ہے:

عبداللہؓ بن عمرؓ بن خطاب بن نُفَیل بن عبدالعزّیٰ بن رباح بن قرط بن زراح بن عدی بن کعب بن لُوَیّ۔

کعب بن لُوَیّ پر ان کا سلسلہ نسب سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے نسب نامہ سے مل جاتا ہے۔ ماں کا نام زینبؓ بنتِ مظعون تھا وہ بنوجُمَح سے تھیں اور شرفِ صحابیت سے بہرہ ور تھیں۔

اُمُّ المُومنین حضرت حفصہؓ بنتِ عمرؓ، حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی حقیقی بہن تھیں۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ تاریخِ اسلام کے چار معروف عبادلہ میں سے ایک ہیں۔ باقی تین عبداللہ، حضرت عبداللہ بن عباسؓ، حضرت عبداللہ بن عمرؓو بن العاص اور حضرت عبداللہ بن زبیرؓ ہیں۔ یہ چاروں نادرِ روزگار شخصیات تھیں۔

معتبر روایات کی رو سے حضرت عبداللہ بن عمرؓ ۲ ؁ بعدِ بعثت میں پیدا ہوئے۔ حضرت عمرؓ ۲ ؁ نے بعدِ بعثت میں اسلام قبول کیا تو حضرت ابنِ عمرؓ تقریباً پانچ برس کے بچے تھے۔ والدِ گرامی کے قبول اسلام کے ساتھ وہ خود بخود ہی اسلام کے دامنِ رحمت سے وابستہ ہو گئے اور ان کی نشوونما خالص اسلامی ماحول میں ہوئی۔ ۱۳ ؁ بعدِ بعثت میں حضرت عمر فاروقؓ نے اپنے اہل وعیال کے ساتھ مدینہ منورہ کی طرف ہجرت کی تو حضرت عبداللہؓ بھی والدِ گرامی کے ساتھ مدینہ منورہ پہنچ گئے اس وقت ان کا سن گیارہ برس کا تھا۔ غزوات کا آغاز ہوا اور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم غزوۂ بدر کے لیے روانہ ہوئے تو حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے شوقِ جہاد سے بے تاب ہو کر حضورؐ سے لڑائی میں شریک ہونے کی اجازت مانگی لیکن آپؐ کا معمول تھا کہ پندرہ برس سے کم عمر کے لڑکوں کو لڑائی میں شریک ہونے کی اجازت نہ دیتے تھے چونکہ حضرت ابن عمرؓ کی عمر اس وقت صرف تیرہ برس تھی اس لیے حضورؐ نے انھیں واپس بھیج دیا۔ غزوۂ اُحد میں وہ چودہ برس کے تھے اس لیے اس میں بھی شریک نہ ہو سکے۔

سب سے پہلا غزوہ جس میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے دادِ شجاعت دی غزوۂ احزاب (۵ ؁ ھ) تھا۔

۶ ؁ ہجری میں صلح حدیبیہ سے پہلے انھیں بیعتِ رضوان میں شریک ہونے کا عظیم شرف حاصل ہوا۔ اس طرح وہ اصحاب الشجرہ میں شامل ہو گئے جنھیں اللہ تعالیٰ نے کھلے لفظوں میں اپنی خوشنودی کی بشارت دی۔ صحیح بخاری میں ہے کہ حسنِ اتفاق سے بیعتِ رضوان کا شرف انھیں اپنے جلیل القدر والد سے پہلے حاصل ہو گیا وہ اس طرح کہ حضرت عمرؓ نے حضرت عبداللہؓ کو ایک انصاری سے گھوڑا لانے کے لیے بھیجا۔ حضرت عبداللہؓ باہر نکلے تو سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کرامؓ سے بیعت لے رہے تھے، انھوں نے لپک کر پہلے خود بیعت کی اور پھر والدِ گرامی کو جا کر اطلاع دی۔ وہ بھی فوراً بارگاہِ رسالت میں پہنچے اور بیعت کی سعادت حاصل کی۔

بیعتِ رضوان کے بعد حضرت ابنِ عمرؓ نے خیبر، فتح، حنین، طائف اور تبوک کے غزوات میں سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی ہم رکابی کا شرف حاصل کیا۔

امام بخاریؒ نے فتح مکہ کے سلسلے میں ایک دلچسپ واقعہ بیان کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ فتح مکہ کے وقت حضرت ابنِ عمرؓ کا سن بیس برس کا تھا اور وہ ایک منہ زور تیز رفتار گھوڑے پر سوار تھے۔ ان کے جسم پر ایک چھوٹی سی چادر تھی اور ہاتھ میں ایک بھاری نیزہ۔ ایک جگہ گھوڑے سے اتر کر اس کے لیے گھاس کاٹنے لگے۔ اتفاق سے حضورؐ کی نظر ان پر پڑی تو آپؐ نے مدح و تحسین کے لہجے میں فرمایا، ''یہ عبداللہ ہے عبداللہ۔'' اس کے بعد وہ حضورؐ کے پیچھے پیچھے مکہ میں داخل ہوئے۔ حضرت اُسامہؓ بن زیدؓ حضورؐ کے ساتھ سوار تھے اور حضرت بلالؓ اور حضرت عثمانؓ بن طلحہ آپؐ کے جلو میں تھے۔ خانۂ کعبہ کے صحن میں اونٹ بٹھا کر کنجی منگائی گئی اور کعبہ کا دروازہ کھول کر تینوں

ایک ساتھ داخل ہوئے۔ ان کے بعد خانۂ کعبہ میں سب سے پہلے داخل ہونے کی سعادت حضرت ابنِ عمرؓ کو حاصل ہوئی۔

۱۰ھ ہجری میں حضرت ابنِ عمرؓ نے حجتہ الوداع میں سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی ہم رکابی کا شرف حاصل کیا۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے دل میں جہادِ فی سبیل اللہ کی بے پناہ تڑپ تھی۔ عہدِ صدیقی میں تو وہ بعض وجوہ کی بنا پر مدینہ منورہ سے باہر نہ جا سکے لیکن عہدِ فاروقی میں ایران، شام اور مصری فتوحات میں سرفروشانہ حصہ لیا۔ والدِ گرامی امیر المومنینؓ تھے لیکن وہ ایک عام مجاہد کی حیثیت سے لشکرِ اسلام میں شریک ہوئے اور کبھی کسی عہدے کی خواہش نہیں کی۔

۲۳ھ ہجری کے اواخر میں حضرت عمر فاروقؓ پر قاتلانہ حملہ ہوا اور ان کی جانبری کی کوئی امید نہ رہی تو انھوں نے اپنی جانشینی کا مسئلہ مسلمانوں کی ایک جماعت کے سپرد کر دیا جس میں اکابر صحابہؓ داخل تھے۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ اگرچہ اپنے علم وفضل اور دوسری صلاحیتوں کی بنا پر ہر طرح سے خلافت کے اہل تھے لیکن حضرت عمر فاروقؓ تقویٰ کے اتنے بلند مقام پر فائز تھے کہ انھیں اپنے فرزند کو خلیفہ نامزد کرنا گوارا نہ ہوا۔ انھوں نے وصیت کر دی کہ وہ خلیفہ کے انتخاب میں مشیر کی حیثیت سے تو شریک ہو سکتے ہیں لیکن خلافت کے لیے ان کے نام پر کسی صورت میں غور نہ کیا جائے۔ حضرت عثمان ذوالنورینؓ نے اپنے عہدِ خلافت میں حضرت ابنِ عمرؓ کو قضا کا عہدہ پیش کیا لیکن انھوں نے اس کو قبول کرنے سے معذرت کر لی۔ علامہ بلاذُریؒ نے ''فتوح البلدان'' میں لکھا ہے کہ ۲۷ھ ہجری میں حضرت عثمانؓ نے افریقیہ (تیونس، الجزائر اور مراکش) پر فوج کشی کی تو حضرت ابنِ عمرؓ لشکرِ اسلام میں شریک ہو گئے اور جہادِ فی سبیل اللہ میں پُرجوش حصہ لیا۔ ابنِ اثیرؒ کے بیان کے مطابق ۳۰ھ ہجری میں انھوں نے خراسان اور طبرستان کے معرکوں میں بھی حصہ لیا۔

حضرت عثمان ذوالنورینؓ کے عہد میں فتنوں نے سر اٹھایا تو حضرت ابنِ عمرؓ نے گوشہ نشینی اختیار کر لی کیونکہ انھیں مسلمانوں کا ایک دوسرے سے برسرِ پیکار ہونا کسی صورت بھی گوارا نہ تھا۔ ابنِ سعدؒ کا بیان ہے کہ امیر المومنین حضرت عثمان غنیؓ کی شہادت کے بعد لوگوں نے انھیں مسندِ خلافت پر بٹھانا چاہا لیکن انھوں نے یہ بارِ گراں اٹھانے سے صاف انکار کر دیا۔

امام حاکمؒ نے اپنی ''مستدرک'' میں غسان بن عبدالحمید کے حوالے سے بیان کیا ہے کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ، سریر آرائے خلافت ہوئے تو حضرت ابنِ عمرؓ نے اس شرط پر ان کے ہاتھ پر بیعت کی کہ وہ خانہ جنگی میں شریک نہ ہوں گے۔ چناں چہ وہ جنگِ جمل اور جنگِ صفین سے بالکل کنارہ کش رہے لیکن بعد میں ہمیشہ اس بات پر افسوس کا اظہار کرتے رہے کہ انھوں نے حضرت علیؓ کی عُملاً حمایت نہیں کی۔ حضرت علیؓ کی شہادت اور حضرت حسنؓ کی خلافت سے دستبرداری کے بعد انھوں نے حضرت امیر معاویہؓ کی بیعت کر لی اور قسطنطنیہ کی مہم میں بڑے جوش وجذبے کے ساتھ شریک ہوئے۔

حضرت امیر معاویہؓ کے بعد یزید تختِ حکومت پر بیٹھا تو بقولِ ابن سعدؒ انھوں نے اختلافِ اُمّت کے فتنہ سے بچنے کے لیے یہ کہہ کر اس کی بیعت کر لی کہ اگر یہ خیر ہے تو ہم اس پر راضی ہیں اور اگر بلا ہے تو ہم نے صبر کیا۔ پھر انھوں نے یہ آیت پڑھی:

فان تولوا فانما علیہ ماحمل وعلیکم ما حملتم۔

(پھر اگر تم نے منہ پھیرا تو اس کے ذمہ ہے جو بوجھ اس پر رکھا گیا..... اور تمھارے ذمہ ہے جو بوجھ تم پر رکھا گیا۔)

یزید کے بعد معاویہ ثانی اور مروان بن الحکم مسندِ حکومت پر بیٹھے۔ ۶۵ھ ہجری میں مروان نے وفات پائی تو اس کا بیٹا عبدالملک خلیفہ بنا۔ حضرت ابن عمرؓ نے اس کو تحریری بیعت

نامہ بھیج دیا جس میں لکھا کہ میں اور میرے لڑکے اللہ اور اللہ کے رسولؐ کی سنت پر امیر المومنین عبدالملک کی سمع و اطاعت کا بقدرِ استطاعت عہد کرتے ہیں۔

حضرت ابنِ عمرؓ نے عبدالملک ہی کے عہدِ خلافت میں ۷۴ھ ہجری میں بعمر چوراسی سال وفات پائی۔ اہلِ سیر نے ان کی وفات کے بارے میں مختلف روایتیں بیان کی ہیں۔ ابنِ سعدؒ نے لکھا ہے کہ ایک مرتبہ حجاج بن یوسف خطبہ دے رہا تھا اس میں اس نے اپنے حریف حضرت عبداللہ بن زبیرؓ پر تہمت لگائی کہ انھوں نے قرآن حکیم میں تحریف کی ہے۔ حضرت ابن عمرؓ یہ سن کر اٹھ کھڑے ہوئے اور بھرے مجمع میں کڑک کر کہا، تو جھوٹ بولتا ہے۔ نہ ابنِ زبیرؓ میں اتنی طاقت ہے اور نہ تجھ میں یہ مجال کہ کلام اللہ میں تحریف کرسکو..... حجاج کو حضرت ابنِ عمرؓ کی یہ ڈانٹ سخت ناگوار گزری لیکن علانیہ ان پر ہاتھ اٹھانے کی جرأت نہ ہوئی۔ البتہ ایک شامی کو اس بات پر مقرر کر دیا کہ حج کے موقع پر نیزہ کی زہر آلود نوک ان کے پاؤں میں چبھو دے۔ اس نے ایسا ہی کیا۔ زہر ان کے جسم میں سرایت کر گیا اور وہ جانبر نہ ہو سکے۔

امام حاکمؒ نے اپنی ''مستدرک'' میں بیان کیا ہے کہ جب حجاج ابنِ زبیرؓ سے لڑنے کے لیے مکہ معظمہ آیا اور منجنیق نصب کرا کر خانہ کعبہ پر سنگ باری کی تو وہ سخت برہم ہوئے اور حجاج کو بہت برا بھلا کہا۔ اس پر وہ غضب ناک ہو گیا اور اس کے اشارے پر ایک شامی نے ان کو اپنے نیزے کی زہر آلود نوک سے زخمی کر دیا۔ جب وہ بیمار ہوئے تو حجاج ان کی عیادت کے لیے آیا اور کہا، کاش مجھ کو مجرم کا پتا چل جاتا تو میں اس کا سر اڑا دیتا۔ حضرت ابن عمرؓ نے فرمایا، یہ سب کچھ تمھارا ہی کیا دھرا ہے۔ نہ تم حرم میں ہتھیار لانے کی اجازت دیتے اور نہ یہ واقعہ پیش آتا۔

ابنِ اثیرؒ کا بیان ہے کہ ایک دن حجاج خطبہ دے رہا تھا۔ اس کو اتنا طول دیا کہ عصر کا وقت تنگ ہو گیا۔ حضرت ابنِ عمرؓ نے فرمایا، آفتاب تیرا انتظار نہیں کر سکتا۔ اس پر حجاج برافروختہ ہو گیا اور ان کا دشمن بن گیا۔

ابنِ سعدؒ نے یہ واقعہ بھی بیان کیا ہے کہ ایک مرتبہ حجاج کو خطبہ دیتے دیتے شام ہو گئی۔ نماز کا وقت آیا تو حضرت ابنِ عمرؓ نے کہا ''اے شخص نماز کا وقت آ گیا ہے اب بیٹھ جا۔'' ان الفاظ کا تین بار اعادہ کیا لیکن اس نے خطبہ جاری رکھا۔ چوتھی بار انھوں نے لوگوں سے مخاطب ہو کر کہا کہ اگر میں اٹھ جاؤں تو کیا تم لوگ اٹھنے کے لیے تیار ہو۔ لوگوں نے کہا کہ ہاں ہم تیار ہیں۔ یہ کہہ کر اٹھے اور حجاج سے کہا کہ مجھے معلوم ہوتا ہے تمھیں نماز کی ضرورت نہیں ہے۔ اب حجاج منبر سے اتر آیا اور نماز پڑھی۔ نماز کے بعد حضرت ابنِ عمرؓ کو بلا کر پوچھا کہ آپ نے ایسا کیوں کیا؟ انھوں نے فرمایا، ہم نماز کے لیے آتے ہیں اس لیے جب نماز کا وقت آ جائے تو ٹھیک وقت پر نماز پڑھ لو اس کے بعد جو چاہو کہتے رہو۔

حضرت ابنِ عمرؓ کی اسی صاف گوئی کی وجہ سے حجاج ان کا دشمن بن گیا اور زہر آلودہ نیزہ سے حج کی بھیڑ بھاڑ میں انھیں زخمی کرا دیا۔

حضرت ابنِ عمرؓ کی دلی تمنا تھی کہ وہ مدینہ منورہ میں وفات پائیں لیکن قدرت نے ان کی وفات مکہ معظمہ میں لکھ رکھی تھی۔ وفات سے پہلے اپنے فرزند سالمؒ کو وصیت کی کہ اب میں یہاں وفات پا رہا ہوں تو مجھے حدودِ حرم کے باہر دفن کرنا۔ انھوں نے والدِ گرامی کی وصیت پر عمل کرنا چاہا لیکن حجاج نے مداخلت کی اور ان کی نمازِ جنازہ پڑھا کر ''فخِ مہاجرین'' کے قبرستان میں سپردِ خاک کیا۔

علم و فضل کے اعتبار سے حضرت عبداللہ بن عمرؓ کا شمار ان صحابہ کبارؓ میں ہوتا ہے جو جملہ دینی علوم کا بحرِ بے پایاں تھے۔ انھیں نہ صرف سالہا سال تک فیضانِ نبوی ﷺ سے براہ راست بہرہ یاب ہونے کا موقع ملا بلکہ سیدنا فاروقِ اعظمؓ جیسے نابغہ عصر والد کی تعلیم و تربیت بھی میسر آئی۔ اس طرح وہ فضل و

کمال کے اتنے بلند مقام پر فائز ہو گئے کہ بڑے بڑے فضلا صحابہؓ ان پر رشک کیا کرتے تھے۔ قرآن حکیم اور اس کی تفسیر سے اتنا شغف تھا کہ اپنے وقت کا بیشتر حصہ قرآنی سورتوں اور آیات پر فکر و تدبّر میں گزارتے تھے۔ مؤطّا امام مالکؒ میں ہے کہ انھوں نے صرف سورۂ بقرہ پر فکر و تدبّر میں چودہ برس صَرف کیے۔ عہدِ رسالت میں انھیں اکابر صحابہؓ کے ساتھ اکثر سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی علمی مجلسوں میں شریک ہونے کی سعادت حاصل ہوتی تھی، اس طرح ان کو قرآن حکیم کی تفسیر اور تفہیم میں غیر معمولی بصیرت حاصل ہو گئی تھی۔

صحیح بخاری میں ہے کہ ایک مرتبہ حضورؐ صحابہ کرامؓ کے مجمع میں رونق افروز تھے۔ حضرت ابن عمرؓ بھی موجود تھے۔ حضورؐ نے قرآنِ حکیم کی یہ آیت پڑھی:

الم ترا کیف ضرب الله مثلاً کلمة کشجرة طیبة اصلها ثابت و فرعها فی السّمآء ۝ تؤتیۤ اکلها کل حین باذن ربها ط (سورۂ ابراهیم)

(کیا تم نے نہیں دیکھا کہ اللہ نے پاک بات کی کیسی مثال بیان فرمائی ہے جیسے پاکیزہ درخت جس کی جڑ مضبوط ہو اور شاخیں آسمان میں۔ اپنے پروردگار کے حکم سے ہر وقت پھل لاتا اور میوے دیتا ہو)

پھر آپؐ نے صحابہ کرامؓ سے پوچھا کہ اس آیت میں کس درخت کی مثال دی گئی ہے؟ تمام صحابۂ کرامؓ خاموش رہے تو آپؐ نے خود بتایا کہ یہ کھجور کا درخت ہے۔ بعد میں حضرت ابنِ عمرؓ نے اپنے والدِ گرامی حضرت عمرؓ کو بتایا کہ میں سمجھ چکا تھا کہ یہ کھجور کے درخت کی مثال ہے لیکن بزرگ صحابہؓ کی خاموشی کی وجہ سے چپ رہا۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ بیٹے اگر تم اس مجلس میں بتا دیتے، تو مجھے فلاں فلاں چیز سے زیادہ محبوب ہوتا۔

قرآنِ حکیم میں فہم و بصیرت کے علاوہ حضرت ابنِ عمرؓ کو حدیث سے بھی گہرا لگاؤ تھا۔ ان سے ایک ہزار چھ سو تیس احادیث مروی ہیں۔ ان میں ۱۷۰ متفق علیہ ہیں۔ ۸۱ میں بخاری اور ۳۱ میں مسلم منفرد ہیں۔ وہ حضورؐ کے نہ صرف ان ارشادات کو جو آپؐ سے براہِ راست سنتے تھے، حرزِ جان بنا لیتے تھے بلکہ ان کو بھی جو دوسروں کی وساطت سے ان تک پہنچتے تھے یاد رکھتے تھے، اس طرح حُفّاظِ حدیث میں ان کو ایک خاص مقام حاصل ہو گیا تھا۔ بایں ہمہ وہ روایتِ حدیث میں بہت محتاط تھے اور اسی وقت کوئی حدیث بیان کرتے تھے جب پورا یقین ہوتا تھا کہ اس میں کسی قسم کی کمی بیشی نہیں ہے۔ اسی شدّتِ اختیار کی بنا پر ان کی مرویات کو بہت مستند تسلیم کیا جاتا ہے۔ فقہ جس پر تشریعِ اسلامی کا دار و مدار ہے، حضرت ابنِ عمرؓ کو اس میں بھی درجۂ تبحّر حاصل تھا۔ انھوں نے اپنی عمر کا بیشتر حصہ تعلیم و تعلّم اور درس و افتا میں گزارا۔ حافظ ابنِ قیم کہتے ہیں کہ ''اگر حضرت ابنِ عمرؓ کے فتاویٰ جمع کیے جائیں تو ایک ضخیم کتاب تیار ہو سکتی ہے۔'' فقۂ مالکی کا تمام تر دار و مدار حضرت ابنِ عمرؓ ہی کے فتاویٰ پر ہے۔ امام مالکؒ کا قول ہے کہ حضرت ابنِ عمرؓ ائمہ دین میں سے تھے۔ اپنے تفقّہ فی الدّین کی بنا پر حضرت ابنِ عمرؓ فقیہ الاُمّت کے لقب سے مشہور ہو گئے تھے۔ بایں ہمہ وہ فتویٰ دینے میں بے حد محتاط تھے۔ اگر کسی بات میں ذرا بھی شبہ ہوتا تو ہرگز فتویٰ نہ دیتے اور مستفتی کو یہ کہہ کر لوٹا دیتے کہ یہ مسئلہ مجھے معلوم نہیں۔ قیاس و اجتہاد میں بھی خداداد ملکہ حاصل تھا لیکن اس سے اسی وقت کام لیتے جب کتاب و سنت میں کسی مسئلہ کے بارے میں واضح احکام نہ ملتے ہوں۔ ایسا کرتے وقت وہ مستفتی سے صاف صاف کہہ دیتے کہ یہ میرا قیاس ہے اس کے باوجود بڑے بڑے ائمہ ان کی رائے کے بعد پھر کسی دوسری رائے کی ضرورت نہ سمجھتے تھے۔

بحیثیت مجموعی وہ علم و فضل کے مجمع البحرین تھے اور بقول ابنِ سعدؒ ایک زمانہ میں لوگ دُعا مانگا کرتے تھے کہ الٰہی ہماری زندگی میں ابنِ عمرؓ کو زندہ رکھ تا کہ ہم ان کے چشمۂ فیض سے سیراب ہوتے رہیں، آج ان سے زیادہ عہدِ رسالت کا کوئی

واقف کار نہیں۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے گلشنِ اخلاق میں حب رسولؐ، اتباعِ سنت، خشیتِ الٰہی، شوقِ جہاد و عبادت، زُہد و تقویٰ، فیاضی وایثار نفسی، تواضع وانکسار، استغنا و قناعت سادگی اور حق گوئی وبیبا کی سب سے خوش رنگ پھول ہیں۔

حب رسولؐ کی یہ کیفیت تھی کہ عہدِ رسالت میں زیادہ سے زیادہ وقت بارگاہِ رسالت میں حاضر رہنے کی کوشش کرتے تھے۔ حضورؐ کا وصال ہوا تو وہ اس قدر مغموم اور شکستہ دل ہوئے کہ عمر بھر نہ کوئی مکان بنایا اور نہ کوئی باغ لگایا۔ جب بھی زبان پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اسمِ گرامی آتا آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگ جاتی۔ جب غزواتِ رسولؐ کے مقامات سے گزر ہوتا تو آنکھوں کے سامنے عہدِ رسالت کا نقشہ کھنچ جاتا اور اشکبار ہو جاتے۔ کوئی ان کے سامنے حضورؐ کا ذکر کرتا تو بے قابو ہو کر رونے لگتے۔ یحییٰ بن یحییٰؒ کہتے ہیں کہ میں نے اپنے شیوخ سے سنا ہے کہ بعض لوگ حضرت ابنِ عمرؓ کو عشقِ رسولؐ کی بنا پر پابندیٔ سنت کا والہانہ جنون تھا اور ان کی زندگی سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی حسین و دلکش زندگی کا پرتو جمیل بن گئی تھی۔ وہ چھوٹی سے چھوٹی باتوں میں بھی نہایت شدت کے ساتھ اتباعِ سنت کا التزام کرتے تھے حتیٰ کہ اتفاق اور بشری عادات میں بھی وہ حضورؐ کے نقش قدم پر چلنے کی کوشش کرتے تھے۔ سفر و حضر میں حضورؐ نے جہاں کبھی نماز ادا کی، حضرت ابنِ عمرؓ بھی وہاں نماز ادا کرتے تھے اور جہاں آپؐ نے آرام فرمایا وہاں آرام کرتے تھے۔ جہاں آپؐ نے تھوڑی دیر کے لیے قیام فرمایا، حضرت ابنِ عمرؓ نے بھی وہاں ضرور قیام کیا۔ جن درختوں کے سایہ میں حضورؐ نے کبھی آرام فرمایا تھا، حضرت ابنِ عمرؓ ان کو پانی دیتے رہتے تھے تاکہ خشک نہ ہونے پائیں اور وہ بھی ان کے سایہ میں آرام کر کے سنت کی پیروی کر سکیں۔ جب سفر سے لوٹتے تو سب سے پہلے روضہ نبویؐ پر حاضر ہوتے اور سلام کہتے۔ مدینہ منورہ سے اس قدر محبّت تھی کہ کسی حالت میں بھی وہاں سے نکلنا گوارا نہ تھا۔ ایک مرتبہ ان کے غلام نے تنگدستی کی بنا پر مدینہ چھوڑنے کی اجازت چاہی۔ فرمایا، میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ جو شخص مدینہ کے مصائب پر صبر کرے گا، قیامت کے دن میں اس کی شفاعت کروں گا۔

سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی آل اولاد سے بھی غیر معمولی محبّت تھی اور وہ لوگوں کو اکثر ان کے فضائل سے آگاہ کرتے رہتے تھے۔ عام طور پر معلوم ہے کہ حضرت ابنِ عمرؓ مناسک حج کے سب سے بڑے عالم تھے۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ وہ مناسک حج میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام سُنن کا بدرجہ غایت لحاظ رکھتے تھے یہاں تک کہ آپؐ نے جہاں جہاں طہارت کی تھی وہاں وہ بھی ضرور طہارت کرتے تھے۔ حج کے سفر میں وہی راستہ اختیار کرتے تھے جو حضورؐ نے اختیار کیا تھا۔ حضورؐ ذوالحلیفہ میں اتر کر نماز پڑھتے، حضرت ابن عمرؓ بھی ذوالحلیفہ میں ضرور نماز پڑھتے تھے۔ حضورؐ نے جن مقامات پر منزل کی تھی وہ بھی وہاں منزل کرتے تھے۔ صحیح بخاری میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مسجدِ قبا میں کبھی پا پیادہ اور کبھی سواری پر تشریف لے جاتے تھے۔ حضرت ابن عمرؓ بھی ایسا ہی کیا کرتے تھے۔ حضورؐ مکہ میں داخل ہونے سے قبل بطحا میں تھوڑا سا سو لیتے تھے، حضرت ابن عمرؓ کا بھی یہی معمول تھا۔ حضورؐ اپنے جاں نثاروں کی دعوت ہمیشہ قبول فرما لیا کرتے تھے۔ حضرت ابن عمرؓ بھی کسی کی دعوت رد نہیں کرتے تھے، یہاں تک کہ روزہ کی حالت میں بھی دعوت میں تشریف لے جاتے تھے گو کھانے میں شریک نہیں ہوتے تھے۔ غرض وہ تمام کاموں میں اسوۂ نبویؐ کو پیشِ نظر رکھتے تھے۔

حضرت ابن عمرؓ نے نہایت گداز دل پایا تھا۔ خوفِ خدا اور روزِ اجزا سے ہر وقت لرزاں و ترساں رہتے تھے۔ کوئی آیت جس میں محاسبۂ آخرت کا ذکر ہوتا، سنتے تو لرزہ براندام ہو جاتے اور رونے لگتے۔ ایک دن عبید بن عمر سے

یہ آیت سنی:

فکیف اذا جئنا من کل امۃ بشھید و جئنا بک علیٰ ھو لاء شھیدا۔

(اے رسولؐ! آخرت کے) اس دن کیا حال ہوگا جب ہم ہر امت سے ایک گواہ لا کھڑا کر دیں گے اور آپ ﷺ کو ان سب پر گواہ لائیں گے۔)

آیت سنتے ہی بے اختیار رونے لگے۔ یہاں تک کہ ڈاڑھی اور گریبان آنسوؤں سے بھیگ گئے۔

خشیت الٰہی نے ان کے دل میں جہاد اور عبادت کا ایسا شوق پیدا کر دیا تھا کہ ان کے بغیر رہ ہی نہیں سکتے تھے۔ پندرہ برس کی عمر سے لے کر بڑھاپے تک جہادِ فی سبیل اللہ میں برابر حصہ لیتے رہے۔ عبادت کی یہ کیفیت تھی کہ قائم اللّیل اور دائم الصوم تھے (نہایت کثرت سے نمازیں پڑھتے تھے اور نہایت کثرت سے روزے رکھتے تھے) بعض اوقات ایک رات میں پورا قرآن پڑھ لیتے تھے۔ ہر نماز کے لیے تازہ وضو کرتے تھے۔ انھوں نے اپنی زندگی میں ساٹھ حج کیے اور ایک ہزار عمرے۔

زہد و تقویٰ میں اپنی مثال آپ تھے۔ حافظ ابنِ حجرؒ نے ''تہذیب التہذیب'' میں لکھا ہے کہ جوانانِ قریش میں عبداللہ بن عمرؓ سے زیادہ کوئی شخص اپنے نفس پر قابو رکھنے والا نہیں تھا۔

صحیح بخاری میں ہے کہ حضرت ابن عمرؓ آغازِ شباب ہی میں مسجد میں جا کر سویا کرتے تھے۔ ایک دفعہ انھوں نے خواب میں دوزخ کے فرشتوں کو دیکھا۔ دوسرے دن اس کا ذکر اپنی بہن ام المومنین حضرت حفصہؓ سے کیا۔ انھوں نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کا تذکرہ کیا تو آپؐ نے فرمایا: ''عبداللہ جوانِ صالح ہے۔''

حضرت جابرؓ بن عبداللہ انصاریؓ فرمایا کرتے تھے کہ ہم میں سوائے ابن عمرؓ کے کوئی شخص ایسا نہ تھا جس کو دنیا کی دلفریبیوں نے اپنی طرف مائل نہ کیا ہو لیکن ان کا دامن کبھی دنیا سے آلودہ نہ ہوا۔ جو شخص حضورؐ کے کسی ایسے صحابیؓ کو دیکھنا چاہے جس میں آپؐ کے وصال کے بعد بھی مطلق کوئی تغیر نہیں ہوا تو وہ ابن عمرؓ کو دیکھے۔

ایک دفعہ کوئی شخص ان کی خدمت میں جوارش (یا چورن) لے کر حاضر ہوا۔ پوچھا، یہ کیا ہے؟ اس نے کہا، ہاضمِ طعام۔ انھوں نے فرمایا، مجھے اس کی کیا ضرورت ہے، میں نے تو مہینوں سے پیٹ بھر کر کھانا نہیں کھایا۔

ایک مرتبہ کسی سے پانی مانگا۔ اس نے شیشے کے پیالے میں لا کر پیش کیا۔ انھوں نے پینے سے انکار کر دیا۔ پھر ان کے سامنے لکڑی کے پیالے میں پانی پیش کیا گیا، اب انھوں نے پی لیا۔ پانی پی کر وضو کے لیے برتن مانگا تو ان کے سامنے طشت و آفتابہ لایا گیا۔ انھوں نے صاف انکار کر دیا اور لوٹے سے وضو کیا۔

میمون بن مہرانؒ کا بیان ہے کہ میں ایک دفعہ ان کی خدمت میں حاضر ہوا اور ان کے تمام اثاث البیت کی قیمت لگائی تو سو درہم سے زیادہ کا سامان نہ تھا۔ اس میں فرش اور بستر بھی شامل تھا۔

سادگی کا یہ عالم تھا کہ تمام کام جو خود کر سکتے تھے اپنے ہاتھ سے انجام دیتے تھے حتیٰ کہ اونٹنی وغیرہ بٹھانے میں بھی دوسروں سے مدد نہ لیتے تھے۔ لباس عموماً نہایت معمولی پہنتے تھے۔ البتہ کبھی کبھار عمدہ لباس بھی زیب تن کر لیتے تھے وہ بھی اس لیے کہ ایک دو مرتبہ حضورؐ کو ایسا کرتے دیکھا تھا۔ لباس قمیص، ازار اور سیاہ عمامہ پر مشتمل ہوتا تھا۔ ازار نصف ساق تک ہوتا تھا۔ حضورؐ کو زرد رنگ پسند تھا اس لیے ان کو بھی زرد رنگ مرغوب تھا۔

دستر خوان بھی تکلفات سے خالی ہوتا تھا۔ بعض اوقات ایک بڑے برتن میں کھانا رکھ دیا جاتا تھا۔ وہ اپنے اہل و عیال کے ساتھ اس کے گرد بیٹھ کر کھا لیتے۔ انھیں ہر وہ چیز

ناپسند تھی جس میں کسی قسم کی نمائش یا تکلّف کی آمیزش ہوتی یہاں تک کہ جمعہ کے دن کے سوا کبھی سر ڈاڑھی اور کپڑوں میں خوشبو نہیں لگائی۔

دنیوی حیثیت سے حضرت ابن عمرؓ بہت مرفہ الحال تھے۔ دینی خدمات کی بنا پر ان کا ڈھائی ہزار ماہانہ وظیفہ مقرر تھا۔ اس کے علاوہ صحیح بخاری کے مطابق وہ بہت سی لگانی زمینوں کے مالک بھی تھے لیکن وہ اپنے مال کو بے دریغ راہِ خدا میں لٹاتے رہتے تھے۔ فیاضی اور سیر چشمی ان کی گھٹی میں پڑی تھی۔ کسی سائل کو اپنے دروازے سے خالی ہاتھ نہ جانے دیتے تھے۔ بیسیوں فقرا و مساکین ان کے دسترخوان پر پرورش پاتے تھے۔ عموماً کسی مسکین کو اپنے ساتھ دسترخوان پر بٹھائے بغیر کھانا نہیں کھاتے تھے، بلکہ بعض اوقات اپنے حصے کا کھانا بھی مسکینوں کو کھلا دیتے اور خود بھوکے رہتے۔ ایک مرتبہ ان کو مچھلی کی خواہش ہوئی۔ جب مچھلی بھون کر ان کے سامنے رکھی گئی تو ایک سائل کا گزر ہوا وہ اٹھا کر اس کو دے دی۔

ایک دفعہ علیل ہوئے اور ان کے لیے انگور کے چند دانے ایک درہم کے خریدے گئے، اتفاق سے ایک سائل آ گیا۔ انھوں نے حکم دیا، یہ انگور اس کو دے دو۔ اہل خانہ نے عرض کیا، آپ ان کو کھالیں ہم اس کو کچھ اور دے دیں گے، لیکن وہ مصر ہوئے کہ یہ انگور سائل کو دے دو۔ مجبوراً وہی دینے پڑے اور پھر اس سے خرید کر ان کی خدمت میں پیش کیے گئے۔

طبقات ابن سعد میں حضرت ابن عمرؓ کے غلام اور شاگرد نافعؒ سے روایت ہے کہ ایک مرتبہ ان کے پاس ہزار درہم یا دینار (اس کی تصریح نہیں کی گئی) آئے۔ انھوں نے دونوں ہاتھوں سے لوگوں کو دینے شروع کیے۔ یہاں تک کہ سب ختم کر ڈالے۔ تقسیم ہو جانے کے بعد جو لوگ آئے ان کو دوسرے لوگوں سے (جنھیں پہلے دے چکے تھے) قرض لے کر دیے۔

کہیں قیام ہوتا تو اکثر روزہ رکھتے تھے لیکن کوئی مہمان آ جاتا تو روزہ توڑ دیتے اور فرماتے کہ مہمان کی موجودگی میں روزہ (نفلی) رکھنا فیاضی سے بعید ہے۔

حافظ ابن حجرؒ نے "اِصابہ" میں لکھا ہے کہ حضرت ابن عمرؓ دو دو تین تین ہزار کی رقمیں تو آئے دن خیرات کرتے رہتے تھے لیکن بعض اوقات بیس بیس اور تیس تیس ہزار کی رقمیں بھی یکمشت راہ خدا میں لٹا دیتے تھے۔

اگر کبھی کوئی غلام یا لونڈی بہت پسند ہوتی یا اپنے کسی غلام کو بہت عبادت گزار دیکھتے تو اس کو آزاد کر دیتے۔ اس طرح انھوں نے اپنی زندگی میں ایک ہزار سے زیادہ غلام آزاد کیے۔

ایک دفعہ سفر حج کے لیے ایک اونٹنی خریدی، سوار ہوئے، تو اس کی چال بہت پسند آئی، فوراً اُتر پڑے اور حکم دیا کہ سامان اتار لو اور اس کو قربانی کے اونٹوں میں شامل کر دو۔

ایک مرتبہ چند دوستوں کے ساتھ مدینہ کے ایک نواحی علاقے میں تشریف لے گئے۔ ایک مقام پر دسترخوان بچھایا گیا تو ایک چرواہا اُدھر آ نکلا۔ اس نے سلام کیا۔ حضرت ابن عمرؓ نے اس کو کھانے کی دعوت دی۔ اس نے عذر کیا کہ میں روزے سے ہوں۔ انھوں نے فرمایا، اتنی گرمی میں روزہ رکھتے ہو اور پھر بکریاں بھی چراتے ہو؟ پھر اس سے پوچھا، کیا یہ بکریاں ہمارے ہاتھ فروخت کر سکتے ہو، ہم تمھیں نقد قیمت بھی دیں گے اور افطار کے لیے گوشت بھی۔

چرواہے نے عرض کیا، یہ بکریاں میری نہیں ہیں ان کا مالک میرا آقا ہے۔ حضرت ابن عمرؓ نے (اس کے تقویٰ کا امتحان لینے کی خاطر) فرمایا، تو تمھارا آقا کیا کر لے گا؟

چرواہے نے آسمان کی طرف انگلیاں اٹھائیں اور این اللّٰہ این اللّٰہ (اللّٰہ کہاں ہے اللّٰہ کہاں ہے) کہتا ہوا چلا۔ (مطلب یہ تھا کہ اللّٰہ تو اس بددیانتی کو جان لے گا)۔ حضرت ابنِ عمرؓ کو اس کا یہ قول بہت پسند آیا اور اس کو بار بار دہراتے رہے۔ چونکہ اس کی دیانت اور خدا خوفی سے بے حد خوش ہوئے تھے اس لیے جب مدینے آئے تو اس کے آقا

سے بکریوں سمیت خرید کر آزاد کر دیا اور تمام بکریاں بھی اس کو بخش دیں۔

ایک دفعہ کہیں جا رہے تھے کہ راستے میں بدّو ملا۔ حضرت ابن عمرؓ نے اس کو سلام کیا اور سواری کا گدھا اور سر کا عمامہ اتار کر اس کو دے دیا۔ ابن دینارؒ ساتھ تھے۔ انھوں نے عرض کیا، اللہ آپ کو صلاحیت دے، یہ بدو تو معمولی چیزوں سے خوش ہو جاتے ہیں (گدھا اور عمامہ دینے کی کیا ضرورت تھی) فرمایا، اس کے والد میرے والد کے دوست تھے۔ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ سب سے بڑی نیکی اپنے باپ کے دُوستوں کے ساتھ حسن سلوک ہے۔

ان کے ہاتھ سے جو مال نکل جاتا تھا اس کو پھر واپس نہیں لیتے تھے۔ عطارؒ کا بیان ہے کہ ایک بار میں نے ان کو دو ہزار درہم قرض دیے۔ انھوں نے جب اس قرض کو چکایا تو میں نے ان کے درہموں کا وزن کیا وہ وزن میں دو سو درہم زیادہ نکلے۔ میں نے یہ دو سو درہم واپس کرنے چاہے تو فرمایا، اب یہ تمھارے ہیں۔

چونکہ اکثر اپنا کھانا مسکینوں کو کھلا دیتے تھے اس لیے بہت لاغر ہو گئے تھے۔ لوگوں نے ان کی بی بی کو ملامت کی کہ آپ ان کی خدمت اچھی طرح نہیں کرتیں۔ انھوں نے کہا، میں کیا کروں، جب ان کے لیے کوئی کھانا پکتا ہے تو وہ مساکین کو کھلا دیتے ہیں۔ ان کی اس عادت کی بنا پر جب وہ مسجد سے نکلتے تو فقرا و مساکین ان کے راستے میں آ بیٹھتے وہ انھیں اپنے ساتھ لے آتے اور کھانا کھلا کر بھیجتے۔ چناں چہ ایک دن ان کی بی بی نے ان فقرا کے گھروں پر کھانا بھجوا دیا اور ساتھ ہی کہلا بھیجا کہ ان کے راستے میں مت بیٹھنا اور وہ بلائیں بھی تو مت آنا۔

حضرت ابن عمرؓ اس دن مسجد سے نکلے تو کسی فقیر کو راستے میں بیٹھا نہ پایا، گھر آئے تو واقعہ معلوم ہوا۔ غصہ سے فرمایا کیا تم چاہتی ہو کہ مساکین میرے دسترخوان پر نہ ہوں اور میں رات فاقہ سے بسر کروں۔ چناں چہ اس رات کو کھانا نہ کھایا اور بھوکے پڑ رہے۔

اپنی جلالت قدر کے باوجود حضرت عبداللہ بن عمرؓ تواضع، انکسار اور اخلاق حسنہ کا مجسّمہ تھے۔ لوگوں کو سلام کرنے میں ہمیشہ پہل کیا کرتے تھے اس میں امیر و غریب کی بالکل تفریق نہ کرتے تھے۔ فرماتے تھے کہ میں بازار میں اس لیے نکلتا ہوں کہ لوگوں کو سلام کروں اور (جواب میں) مجھ پر سلام کیا جائے۔ اگر کسی کو سلام کرنا بھول جاتے تو پلٹ کر سلام کرتے۔

مجاہدؒ کہتے ہیں کہ میں ان کے ساتھ سفر میں ہوتا تھا، جہاں تک ممکن ہوتا وہ اپنا کام خود کرتے تھے یہاں تک کہ خود اونٹ کا پاؤں دباتے تو میں اس پر سوار ہوتا۔

مُسند احمد میں ہے کہ اپنی تعریف سننا ان کو سخت ناپسند تھا۔ ایک مرتبہ کوئی شخص ان کی تعریف کر رہا تھا انھوں نے اس کے منہ میں مٹی جھونک دی اور فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ منہ پر تعریف کرنے والوں (خوشامدیوں) کے منہ میں مٹی ڈالا کرو۔

حافظ ابن حجرؒ لکھتے ہیں کہ ایک مرتبہ ایک شخص نے ان پر گالیوں کی بوچھاڑ کر دی۔ انھوں نے جواب میں صرف اتنا فرمایا، بھائی ہم لوگ عالی نسب ہیں۔ پھر خاموش ہو گئے۔ (لاصابہ)

ایک دفعہ ایک شخص نے ان سے پوچھا، آپ کون ہیں؟ فرمایا، جو تم کہو میں وہی ہوں، اس نے کہا، آپ سبط ہیں، آپ وسط ہیں۔

فرمایا، سبحان اللہ، سبط تو بنی اسرائیل تھے اور وسط تمام اُمّتِ محمدؐ یہ ہے البتہ ہم قبیلہ مضر کے اوسط ہیں۔ اس سے زیادہ رتبہ کوئی ہمیں دیتا ہے تو وہ جھوٹا ہے۔

وہ ہمیشہ اس کو مکروہ سمجھتے تھے کہ کوئی ان کو وضو کرائے۔

ایک دفعہ کسی نے ان کو نہایت بیش قیمت ہروی کپڑے

ہدیۃً پیش کیے۔ انھوں نے ان کو یہ کہہ کر واپس کر دیا کہ ان کے پہننے میں کوئی حرج نہیں تھا لیکن ہم کبر وغرور کے خوف سے ان کو نہیں پہن سکتے۔

ایک دفعہ حالتِ احرام میں سردی محسوس ہوئی تو اپنے ایک شاگرد قرعہ عقیلی سے فرمایا، میرے اوپر چادر ڈال دو۔ انھوں نے چادر اوڑھا دی۔ بیدار ہوئے تو اس کے نقش ونگار اور بوٹوں کو جو ریشمی تھے، دیکھنے لگے۔ پھر فرمایا، اگر یہ بوٹے نہ ہوتے تو اس کے اوڑھنے میں کوئی مضائقہ نہ تھا۔

اگر کسی ایسی جگہ تشریف لے جاتے جہاں لوگ انھیں دیکھ کر ازراہِ تعظیم کھڑے ہو جاتے تو وہاں نہ بیٹھتے تھے۔ (ابنِ سعد)

غلاموں کے ساتھ ان کا سلوک نہایت مشفقانہ بلکہ مساویانہ ہوتا تھا۔ انھیں اپنے ساتھ دسترخوان پر بٹھا کر کھانا کھلاتے تھے اور اپنے اہل وعیال کی طرح ان کے کھانے پینے کا خیال رکھتے تھے۔ ایک مرتبہ ان لوگوں کو کھانا کھلانے میں دیر ہو گئی۔ حضرت ابن عمرؓ کو معلوم ہوا تو بہت ناراض ہوئے اور حکم دیا کہ انھیں فوراً کھانا کھلایا جائے۔ پھر فرمایا، انسان کے لیے یہ بہت بڑا گناہ ہے کہ اپنے غلاموں کے کھانے پینے کا خیال نہ رکھے۔ (مسلم)

دسترخوان پر بیٹھے ہوتے اور کسی دوسرے کا غلام بھی وہاں آجاتا تو اس کو بھی شریکِ طعام کر لیتے۔ انھوں نے اپنے غلاموں کو ہدایت کر رکھی تھی کہ جب مجھے خط لکھو تو اس میں میرے نام سے پہلے اپنا نام لکھو۔ حالانکہ اس وقت کے رواج کے مطابق آقا کا نام پہلے لکھا جاتا تھا۔ (ابنِ سعد)

غلاموں کو نہ کبھی سخت سست کہتے تھے اور نہ کبھی ان پر ہاتھ اٹھاتے تھے۔ اگر کبھی ایک آدھ مرتبہ غصہ کی حالت میں کسی غلام پر سختی کر بیٹھے تو کفارہ کے طور پر اس کو آزاد کر دیا۔ (صحیح مسلم)

اپنے اخلاقِ حسنہ، تواضع اور انکسار کی بدولت انھیں عوام النّاس میں درجۂ محبوبیت حاصل ہو گیا تھا۔ لوگ ان سے ٹوٹ کر محبّت کرتے تھے۔ گھر سے باہر نکلتے تو قدم قدم پر لوگ ان کو سلام کرتے تھے۔ ایک مرتبہ حضرت مجاہدؒ ساتھ تھے، ان سے مخاطب ہو کر تحدیثِ نعمت کے طور پر فرمایا، لوگ مجھ سے اس قدر محبّت کرتے ہیں کہ اگر سونے چاندی کے بدلے میں بھی محبّت خریدنا چاہوں تو اس سے زیادہ نہیں مل سکتی۔ (طبقات ابن سعد)

حضرت ابنِ عمرؓ کی طبیعت میں استغنا اور قناعت کا مادہ بدرجۂ اَتم پایا جاتا تھا۔ اگرچہ وہ سنت نبوی ﷺ کے مطابق ہدیہ قبول کر لیتے تھے لیکن کسی کے سامنے کبھی دستِ سوال دراز نہیں کیا۔ علامہ ابنِ سعدؒ نے ان کا یہ قول نقل کیا ہے کہ ''میں کسی سے مانگتا نہیں لیکن جو اللہ تعالیٰ دیتا ہے اس کو رَدّ بھی نہیں کرتا۔'' ایک دفعہ ان کی پھوپھی رملہؓ نے دوسو دینار بھیجے۔ انھوں نے شکریہ کے ساتھ قبول کر لیے اور انھیں دعا دی۔

ایک مرتبہ عبدالعزیز بن ہارون نے ان کو لکھا کہ آپ کی جو حاجت ہو، مجھ سے طلب فرمائیے۔ انھوں نے جواب میں لکھ بھیجا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ اپنے اہل وعیال سے (لینے دینے کی) ابتدا کرو اور اوپر کا ہاتھ نیچے کے ہاتھ سے بہتر ہے۔ میرا خیال ہے کہ دینے والا ہاتھ اوپر کا ہے اور لینے والا نیچے کا۔ میں آپ سے نہ سوال کروں گا اور نہ اس مال کو رَدّ کروں گا جس کو خدا نے میری طرف بھیجا ہے۔

ایک مرتبہ امیر معاویہؓ نے ایک لاکھ کی رقم ایک خاص مقصد کے لیے انھیں بھیجی لیکن انھوں نے یہ رقم قبول کرنے سے صاف انکار کر دیا۔

مال و دولت ان کے نزدیک بالکل بے حقیقت شے تھی۔ اگر ذرا بھی شبہ ہو جاتا کہ مالی ہدیہ خلوص سے نہیں بلکہ کسی ذاتی غرض سے پیش کیا گیا ہے تو اس کو قبول نہ کرتے۔ اسی طرح کسی چیز میں صدقہ کے شائبہ کا بھی خیال ہوتا تو اس کو استعمال نہ کرتے۔ ایک دفعہ انھوں نے اپنی والدہ کی طرف سے ایک غلام صدقہ کیا۔ اتفاق سے اس غلام کے ساتھ بازار گئے وہاں ایک شیر دار بکری فروخت ہو رہی تھی۔ انھوں نے غلام سے

کہا، اپنے مال سے اس کو خرید لو۔ اس نے خرید لی اور افطار کے وقت اسی بکری کا دودھ ان کے سامنے پیش کیا۔ انھوں نے فرمایا، یہ دودھ بکری کا ہے، بکری غلام کے مال کی ہے اور غلام صدقہ کا ہے، اس کو ہٹاؤ میں نہیں پیوں گا۔

مشتبہ چیزوں سے سخت اجتناب کرتے تھے۔ ایک دفعہ کسی نے کھجور کا سرکہ بطور ہدیہ بھیجا پوچھا، کیا چیز ہے، معلوم ہوا کھجور کا سرکہ ہے۔ انھوں نے اس کو فوراً پھینکوا دیا کیونکہ اس کے استعمال سے سُکر پیدا ہونے کا احتمال تھا۔

ابنِ سعدؒ کا بیان ہے کہ وہ ککڑی اور خربوزہ صرف اس لیے نہیں کھاتے تھے کہ ان میں گندی چیزوں کی کھاد دی جاتی ہے۔ (یہ ان کی شدت احتیاط تھی ورنہ ان چیزوں کے استعمال میں کوئی کراہت نہیں) مروان بن الحکم نے اپنے زمانہ میں راستوں پر میل کے سنگی نشان نصب کرائے تھے۔ حضرت ابنِ عمرؓ ان پتھروں کی طرف رخ کر کے نماز پڑھنا مکروہ سمجھتے تھے اور ان سے ہٹ کر نماز پڑھتے تھے کیونکہ ان کی طرف منہ کر کے نماز ادا کرنے میں پتھر کی پرستش کا خیالی شائبہ تھا۔

حضرت ابنِ عمرؓ کی زندگی ہمیشہ مصالحانہ اور مرنجاں مرنج رہی۔ انھوں نے مسلمانوں کے باہمی جھگڑوں میں حصہ لیا نہ حکومتِ وقت کے خلاف کسی سرگرمی میں۔ تاہم جس بات کو حق سمجھتے تھے اس کا برملا اظہار کرتے تھے خواہ حاکمِ وقت کی پیشانی پر بل ہی کیوں نہ پڑ جائیں۔ ان کی حق گوئی اور بے باکی کے کچھ واقعات اوپر بیان کیے جا چکے ہیں۔ اکثر مورخین کی رائے میں ان کی یہی حق گوئی ان کی شہادت کا باعث بنی۔ صحیح بخاری میں ہے کہ ایک مرتبہ ایک شخص نے ان سے پوچھا کہ مچھر کے خون کا کفارہ کیا ہے۔ انھوں نے دریافت کیا، تم کون ہو؟ اس نے کہا، عراقی۔ فرمایا، لوگو ذرا اس کو دیکھنا یہ شخص مجھ سے مچھر کے خون کا کفارہ پوچھتا ہے حالانکہ ان لوگوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جگر گوشہ کو شہید کیا ہے جن کے بارے میں حضورؐ فرماتے تھے کہ یہ دونوں (حسنؓ و حسینؓ) میرے باغِ دنیا کے دو پھول ہیں۔ سانحہ کربلا کے بارے میں اس طرح کے جذبات کا اظہار اربابِ اقتدار کو مشتعل کر سکتا تھا لیکن حضرت ابنِ عمرؓ نے اس کی کبھی پروا نہیں کی، جو دل میں ہوتا وہ بلا جھجک زبان پر لے آتے۔

سیدنا ابن عمرؓ شکل وصورت میں اپنے جلیل القدر والد حضرت عمر فاروقؓ کے مشابہ تھے۔ دراز قد، گندمی رنگ اور بھاری بھرکم جسم، کندھوں تک کاکلیں تھیں جن میں کبھی کبھی مانگ نکالا کرتے تھے۔ ڈاڑھی بقدر یک مشت۔ مونچھیں بہت باریک کترواتے تھے۔ بقول ابن سعدؒ زرد خضاب کرتے تھے۔

تمام صحابہؓ و تابعین جنھوں نے حضرت ابن عمرؓ کو دیکھا تھا بالاتفاق ان کے اوصاف حمیدہ، تجرِ علمی اور جلالتِ قدر کے معترف اور مداح تھے۔ اُمّ المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ فرمایا کرتی تھیں کہ عہدِ رسالت کی حالت و کیفیت کا عبداللہ بن عمرؓ سے زیادہ پابند کوئی نہیں رہا۔ حضرت حذیفہ بن الیمانؓ فرماتے تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ہر شخص کچھ نہ کچھ بدل گیا مگر عمرؓ اور ان کے بیٹے عبداللہؓ نہیں بدلے۔ حضرت سعید بن مسیّبؒ کہا کرتے تھے کہ میں کسی کے جنتی ہونے کی گواہی دے سکتا ہوں تو وہ ابن عمرؓ ہیں۔ میمون بن مہرانؒ کہتے تھے کہ میں نے ابنِ عمرؓ سے بڑھ کر کوئی متقی اور پرہیزگار نہیں دیکھا۔ حضرت سلمہؒ بن عبدالرحمٰنؒ فرماتے تھے کہ میں نے ابنِ عمرؓ کی وفات کے بعد ان جیسا کوئی نہیں دیکھا۔ وہ فضیلت میں اپنے والد کے قریب تھے۔ حضرت علی بن حسینؒ زین العابدین فرماتے تھے کہ عبداللہ بن عمرؓ کو زہد و تقویٰ اور اصابتِ رائے میں ہم سب پر برتری حاصل تھی۔

(رضی اللہ تعالیٰ عنہ)

رسول اللہ ﷺ کا دسترخوان

آپ ﷺ نے کبھی ٹیک لگا کر کھانا نہیں کھایا

عبدالوحید

جس طرح رحمتہ العالمین ﷺ سب سے ممتاز اور بے مثال تھے، اسی طرح آپ ﷺ کا دسترخوان بھی سب سے منفرد اور الگ تھلگ تھا۔ آپ ﷺ کا دسترخوان اور کھانے کی چیزیں دیکھ کر ہی اندازہ ہو جاتا کہ انسان کی تخلیق کا مقصد اس دنیا میں لذت کام و دہن نہیں بلکہ اطاعت و عبادت کے لیے توانائی کا ذریعہ ہے۔ آپ ﷺ کا دسترخوان کوئی میز نہیں بلکہ ایک عام سے چمڑے کا ٹکڑا یا پھر ٹاٹ ہوتا جسے زمین پر بچھا دیا جاتا اور جو بھی کھانے کے لیے ہوتا اس پر رکھ دیا جاتا۔ برتن بھی زیادہ نہیں ایک یا دو طشتریوں پر مشتمل ہوتے تھے۔ پانی پینے کے لیے ایک ہی بڑا پیالہ ہوتا۔ اگر کھانے والے زیادہ لوگ ہوتے تو دس دس کی ٹولی آ کر کھایا کرتی اور سب دائیں طرف سے شروع کرتے۔ جبکہ آپ ﷺ نے کبھی بھی ٹیک لگا کر کھانا نہیں کھایا۔ اس کا ذکر صحیح بخاری کتاب الاطمعتہ میں بھی ہے۔ اب ذکر ہو جائے ان کھانوں کا جو آپ ﷺ کھاتے تھے۔

ثرید

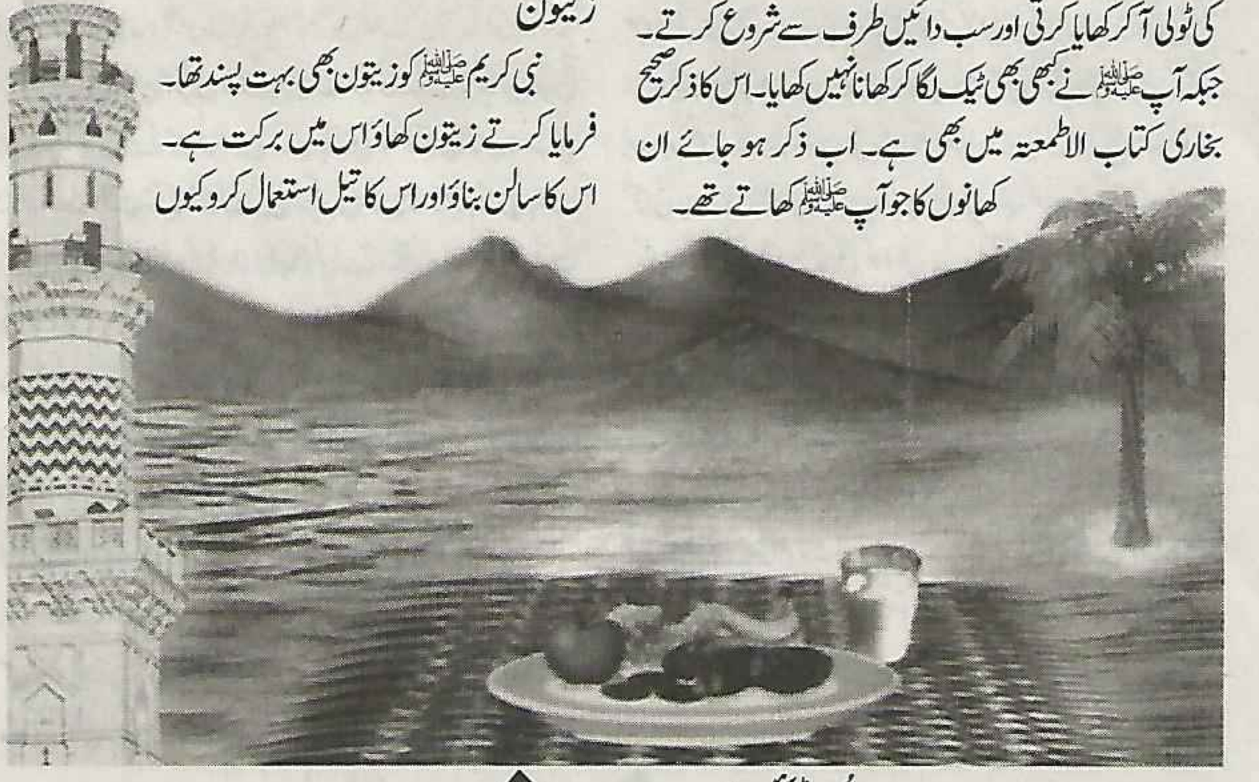
آپ ﷺ ثرید کو بہت شوق سے تناول فرماتے تھے۔ ابوحازم نے سہل بن سعد سے سوال کیا کہ کیا آپ ﷺ نے گندم کے میدے کی روٹی کھائی تو آپ نے جواب دیا نہیں دیکھا۔ پھر پوچھا کیا اس وقت چھلنیاں ہوتی تھیں؟ جواب ملا نہیں۔ پوچھا گیا کہ وہ جو کی روٹی کیسے کھاتے تھے؟ جواب ملا کہ آٹے کو پھونک مارتے جو چھلکے اڑ جاتے ٹھیک تو باقی جیسے ہوتا استعمال میں لے آتے۔

سرکہ

جابر رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ حضور ﷺ نے ایک روز میرا ہاتھ پکڑا اور اپنے گھر لے گئے۔ گھر والوں نے پردہ کر رکھا تھا۔ آپ ﷺ نے پوچھا کھانے کو کچھ ہے؟ تو کہا گیا کہ روٹی کے چند ٹکڑے ہیں۔ حضور ﷺ نے فرمایا کیا سالن ہے؟ جواب ملا نہیں البتہ سرکہ ہے۔ حضور ﷺ نے خوش ہو کر فرمایا! یہی لے آؤ سرکہ تو بہترین سالن ہے۔

زیتون

نبی کریم ﷺ کو زیتون بھی بہت پسند تھا۔ فرمایا کرتے زیتون کھاؤ اس میں برکت ہے۔ اس کا سالن بناؤ اور اس کا تیل استعمال کرو کیوں



کہ یہ ایک بابرکت درخت سے نکلتا ہے۔

کدو

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک غلام نے نبی پاک ﷺ کی دعوت کی اور ثرید کا پیالہ سامنے رکھا۔ جس میں کدو کے قتلے بھی تھے۔ آپ ﷺ پیالے سے کدو کے ٹکڑے ڈھونڈ ڈھونڈ کر کھانے لگے۔ آپ ﷺ کو کدو بہت پسند تھا۔

کھیرا

حضرت عبداللہ بن جعفر رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ میں نے حضور ﷺ کو دیکھا کہ وہ کھجور کے ساتھ کھیرے کھا رہے تھے۔

چقندر

حضرت ام المنذر روایت کرتی ہیں کہ ایک مرتبہ میرے گھر رسول ﷺ تشریف لائے۔ میں نے چقندر کا سالن اور جو کی روٹی پکائی۔ اس پر نبی ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ جو ان کے ہمراہ تھے فرمایا تم اس میں سے کھاؤ یہ بہت مفید ہے۔

میتھی

نبی کریم ﷺ کی پسندیدہ سبزیوں میں سے ایک ہے۔ فرمایا میری امت اگر میتھی کے فوائد جان لے تو وہ اسے سونے کے ہم وزن خریدنے سے بھی دریغ نہ کرے۔

تربوز

(ابن ماجہ، ترمذی) میں ہے کہ حضرت محمد ﷺ تازہ پکی ہوئی کھجوروں کے ساتھ تربوز کھایا کرتے تھے۔

انجیر

انجیر آپ ﷺ کا پسندیدہ پھل تھا فرمایا اگر کوئی کہے کہ کوئی پھل جنت سے زمین پر آسکتا ہے تو میں کہوں گا کہ یہی وہ پھل ہے کیوں کہ یہ بلاشبہ جنت کا میوہ ہے جس سے بواسیر اور جوڑوں کا درد ختم ہو جاتا ہے۔

انار

حضرت علیؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول ﷺ نے فرمایا انار کھاؤ اس کے اندرونی چھلکے سمیت یہ معدے کو حیات عطا کرتا ہے اور فرماتے ہیں کہ جس نے انار کھایا اللہ اس کے دل کو روشن کرے گا۔

میٹھے کھانے

حضور ﷺ کو میٹھے کھانے بھی پسند تھے۔ جن میں کھجور، ستو اور مکّھن کا مالیدہ شامل ہیں۔

شہد

عرب میں شہد ایک عام غذا کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے کہ حضرت محمد ﷺ کو میٹھا اور شہد پسند تھا۔

کھجور کا میٹھا

نبی کریم ﷺ رمضان کے بعد عیدالفطر پر عیدگاہ جانے سے پہلے کھجوریں کھاتے جن کی تعداد طاق ہوتی۔

ستو

ستو اہل عرب کی مجموعی غذا تھی۔ چناں چہ نبوت سے پہلے جب حضور ﷺ غارِ حرا میں تشریف لے جاتے تو ساتھ ستو ہی لے جایا کرتے۔

زم زم

زم زم حضور ﷺ کے پسندیدہ مشروبات میں سے ایک تھا۔ حضرت محمد ﷺ زم زم کھڑے ہو کر پیا کرتے۔

بھیگے ہوئے پھل کا پانی

رات کو انگور یا کھجور میں سے کوئی چیز بھگو دی جاتی اور صبح اسے محمد ﷺ پی لیا کرتے۔

دودھ

حضور ﷺ کو دودھ بہت ہی پسند تھا۔ بہت ساری احادیث مبارکہ میں بھی آپ ﷺ کے دودھ پینے کا خصوصی ذکر ملتا ہے۔

جبلِ اُحد

"احد پہاڑ ہم سے محبّت کرتا ہے اور ہم اس سے محبّت کرتے ہیں" (صحیح بخاری)

محمود میاں نجمی ایڈووکیٹ

احد پہاڑ مدینہ منورہ میں مسجد نبوی کے شمال کی جانب تقریباً ساڑھے پانچ کلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔ اس کی لمبائی مشرق سے مغرب کی جانب ۸ کلومیٹر جبکہ چوڑائی ۳ کلومیٹر ہے۔ اس کی سب سے بلند چوٹی ۳۰۰ میٹر بلند ہے۔

سرخی مائل خالص ٹھوس پتھروں سے مزین اس خوبصورت پہاڑ سے رسول اللہ ﷺ بہت محبت فرمایا کرتے تھے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ھذا جبل یحبنا و نحبہ "یہ ایسا پہاڑ ہے جو ہم سے محبّت کرتا ہے اور ہم اس سے محبّت کرتے ہیں۔ (صحیح بخاری)"

رسول اکرم ﷺ کے ان کلمات سے احد پہاڑ کی اہمیت اور فضیلت کا اندازہ ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا بھر کے مسلمان جبلِ احد سے محبّت اور عقیدت رکھتے ہیں۔ (صحیح بخاری)

روایت میں ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ کسی سفر سے واپسی پر جبل احد کے پاس سے گزرتے تو یہ آپ کو دیکھ کر بہت خوش ہوتا۔ آپ ﷺ سے ملاقات اور دیدار کے شوق میں پھولے نہیں سماتا تھا جس کے جواب میں آپ ﷺ بھی اس سے شفقت اور محبّت فرمایا کرتے تھے۔ دراصل اللہ جل شانہ نے احد پہاڑ میں عشقِ رسول ﷺ اس طرح کوٹ کوٹ کر بھر دیا تھا جس طرح حضرت داؤد علیہ السّلام کے ساتھ پہاڑ تسبیح یعنی اللہ کا ذکر کیا کرتے تھے یا بعض پتھروں میں اللہ کا خوف و ڈر لکھ دیا گیا تھا۔

صحیح بخاری کی ایک اور حدیث حضرت انس بن مالکؓ سے منقول ہے کہ ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ، حضرت ابو بکرؓ، حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ کے ساتھ جبل احد پر چڑھے۔ جبل احد عشق رسول ﷺ میں ہلنے اور لرزنے لگا۔ آپ ﷺ نے فرمایا "اے احد پرسکون ہو جا تجھ پر ایک نبی ایک صدیق اور دو شہید ہیں۔"

رسول اللہ ﷺ کی مکہ مکرمہ سے ہجرت کے دو سال نو ماہ اور سات دن بعد یعنی ۳ ہجری میں اسی احد پہاڑ کے دامن میں مشہور غزوہ احد کا انتہائی غمناک اور المناک واقعہ پیش آیا۔ جس میں آپ ﷺ کے چہیتے چچا حضرت حمزہؓ سمیت ۷۰ صحابہؓ شہید ہوئے۔ اس کے علاوہ آپ ﷺ کا رباعی دانت شہید ہوا اور آپ ﷺ کے چہرے انور اور ہونٹ مبارک پر بھی زخم آئے۔ زخمی ہونے کے بعد آپ ﷺ چند صحابہؓ کے ساتھ احد کی جانب چلے گئے۔ روایت میں ہے کہ آپ ﷺ کو زخمی حالت میں دیکھ کر احد پہاڑ شق ہو گیا اور اس میں اتنی بڑی دراڑ پڑ گئی کہ جس سے ایک وقت میں ایک آدمی اندر داخل ہو سکتا تھا۔ آپ ﷺ اور صحابہؓ اس دراڑ سے اندر داخل ہوئے اور آپ ﷺ نے اس گھاٹی میں آرام فرمایا۔ اب سے چند سال پہلے تک احد پہاڑ میں موجود اس گھاٹی کی زیارت کی جاسکتی تھی بلکہ اس کے اندر داخل ہو کر اس پتھر کو بھی دیکھا جاسکتا تھا جس کے سہارے آپ ﷺ نے اپنے زخمی چہرے اور سر مبارک کو ٹکایا تھا اور وہ پتھر سر مبارک رکھنے کی جگہ پر اس طرح دب گیا تھا جیسے نرم تکیہ۔ لیکن پھر وہاں خلاف شرع حرکات ہونے لگیں۔ لوگوں نے پوجا پاٹ شروع کر دی۔ لہٰذا سعودی گورنمنٹ نے اس گھاٹی کا



منہ پتھروں کی چنائی سے بند کر دیا اور اوپر جانے والے راستے پر خاردار تار لگا کر وہاں جانے پر ہی پابندی لگا دی۔

صحیح بخاری کی روایت ہے کہ حضرت سہلؓ فرماتے ہیں کہ جب آپ ﷺ احد کی اس گھاٹی میں تشریف لے گئے تو مجھے معلوم ہے کہ وہاں رسول اللہ ﷺ کا زخم کس نے دھویا۔ پانی کس نے ڈالا اور علاج کس سے کیا گیا۔ آپ ﷺ کی پیاری اور چہیتی لختِ جگر حضرت فاطمہؓ آپ ﷺ کا زخم دھو رہی تھیں۔ حضرت علیؓ ڈھال سے پانی ڈال رہے تھے (کہا جاتا ہے کہ یہ پانی حضرت علی احد پہاڑ میں موجود ایک قریبی چشمے سے اپنی ڈھال میں لے کر آئے تھے اس چشمے کا نام مہراس تھا)

جب حضرت فاطمہؓ نے دیکھا کہ بابا حضور ﷺ کے زخم سے خون رکنے کا نام نہیں لے رہا تو آپؓ نے چٹائی کا ایک ٹکڑا لیا اور اسے جلا کر زخم کی جگہ پر چپکا دیا جس سے زخم سے خون آنا بند ہو گیا۔

حضرت محمد بن مسلمہؓ آپ ﷺ کے لیے احد پہاڑ ہی میں کہیں سے شیریں اور خوش ذائقہ پانی لے کر آئے۔ آپ ﷺ نے پیا اور انھیں دعائے خیر دی۔ خون زیادہ بہ جانے سے آپ ﷺ نقاہت محسوس کر رہے تھے۔ لہٰذا آپ ﷺ نے جبل احد کی اس گھاٹی میں ظہر کی نماز بیٹھ کر ادا فرمائی۔ آپ ﷺ کے جانثار صحابہؓ نے بھی بیٹھ کر نماز ادا کی۔ آپ ﷺ نے اس گھاٹی میں آرام فرمایا۔ یہاں تک کہ کچھ افاقہ ہوا اور جب مشرکین مکہ واپس پلٹ گئے تو آپ ﷺ نے صحابہؓ کو شہیدوں اور زخمیوں کی خبر گیری کے لیے روانہ کیا۔ اس کے بعد آپ ﷺ خود بھی میدانِ احد میں تشریف لائے اور زخمیوں اور شہدا کا معائنہ فرمایا۔

ابن ہشام کی روایت ہے کہ اس موقع پر آپ ﷺ نے فرمایا کہ ”میں ان لوگوں کے حق میں گواہ رہوں گا اور حقیقت یہ ہے کہ جو شخص اللہ کی راہ میں زخمی ہو جاتا ہے۔ اُسے اللہ قیامت میں اس حالت میں اٹھائے گا کہ اس کے زخم سے خون بہ رہا ہوگا۔ جس کا رنگ تو خون ہی کا ہوگا لیکن اس میں خوشبو کی مہک ہوگی۔“

اس جنگ میں مسلمان مجاہدین کی تعداد ۷۰۰ تھی جبکہ ان کے مقابلے میں مشرکین مکہ ۳۰۰۰ کی تعداد میں تھے اور ان کے پاس سامانِ حرب بھی مسلمانوں سے بہت زیادہ اور بہتر تھا۔ اس کے باوجود مسلمان ان مشرکین کو شکست دے چکے تھے۔ ان کے پاؤں اکھڑ چکے اور وہ مکہ کی طرف بھاگنے پر مجبور ہو گئے تھے۔ ایسے میں چند مجاہدین کی چھوٹی سی حکم عدولی نے جنگ کا پانسہ پلٹ دیا۔ واقعہ کچھ یوں ہے کہ رسولِ اکرم ﷺ نے جنگی حکمت عملی کے تحت احد میدان کے جنوب مغرب میں واقع ایک پہاڑی جس کا نام جبل عینین (رماۃ پہاڑی) ہے پر حضرت عبداللہ بن جبیر بن نعمان انصاری کی زیرِ کمان ۵۰ تیر اندازوں کو کھڑا کر دیا اور یہ حکم فرما دیا کہ چاہے کچھ بھی ہو جائے جب تک میں نہ کہوں تم اس جگہ کو نہ چھوڑنا۔

لڑائی کے دوران ان تیر اندازوں نے بڑی شجاعت کا مظاہرہ کرتے ہوئے مشرکین کے کئی خوفناک اور شدید حملوں کو پسپا کیا لیکن جب مشرکین کے پاؤں اُکھڑ گئے، لڑائی میں شامل مسلمان مالِ غنیمت جمع کرنے لگے تو پہاڑی پر کھڑے تیر اندازوں نے سمجھا کہ اب تو فتح ہو گئی ہے اور دشمن بھاگ رہا ہے تو کیوں نہ ہم بھی مالِ غنیمت جمع کریں۔ لہٰذا ۴۰ تیر انداز رسولِ اکرم ﷺ کی نصیحت اور ہدایت کو نظر انداز کر کے نیچے اترے اور مالِ غنیمت جمع کرنے لگے۔ پہاڑی پر حضرت عبداللہ بن جبیرؓ سمیت صرف ۱۰ تیر انداز رہ گئے۔

خالد بن ولید جو اس وقت تک مسلمان نہیں ہوئے تھے اور مشرکین مکہ کے ایک اہم کمانڈر تھے وہ بھی شکست کھا کر مکہ کی طرف مڑ گئے تھے کہ اچانک انھوں نے پہاڑی کو تیر اندازوں سے خالی پایا۔ خالد بن ولید پہاڑی کی اہمیت سے واقف تھے اور اس سے پہلے تین مرتبہ اس مورچہ کو سر کرنے کی کوشش کر چکے اور جانی نقصان اٹھا کر ناکام ہو چکے تھے۔

لہٰذا وہ فوری طور پر اپنی سپاہ کے ساتھ نہایت تیزی سے

چکر کاٹ کر اسلامی لشکر کی پشت پر جا پہنچے اور ان ۱۰ تیراندازوں کو شہید کر کے مسلمانوں پر حملہ کر دیا جس سے مسلمانوں کو شدید جانی نقصان اٹھانا پڑا۔

ایک حبشی وحشی بن حرب نے آزاد ہونے کے لالچ میں حضرت حمزہؓ کو شہید کیا۔ ابن ہشام کی روایت ہے کہ ابوسفیان کی زوجہ ہند بنت عقبہ نے حضرت حمزہؓ کا سینہ چاک کر دیا۔ اور کلیجا منہ میں ڈال کر چبایا اور نگلنا چاہا لیکن نگل نہ سکی تو تھوک دیا اور شہیدوں کے کٹے ہوئے کانوں، ناکوں اور دیگر اعضا کی پازیب اور گلے کا ہار بنایا۔

رسول اللہ ﷺ نے جب اپنے چچا حضرت حمزہؓ کے جسم اطہر کا یہ حال دیکھا تو آپ ﷺ سخت غمگین ہوئے۔

حضرت ابن مسعودؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ حضرت حمزہؓ بن عبدالمطلب کی شہادت پر جس طرح روئے اس سے بڑھ کر روتے ہم نے آپ ﷺ کو کبھی نہیں دیکھا۔ آپ ﷺ نے ان کے جنازے کو قبلہ رو رکھا اور پھر کھڑے ہو کر اس طرح روئے کہ آواز بلند ہوگئی۔ (بعد میں وحشی بن حرب اور ہند بنت عقبہ دونوں مسلمان ہو گئے تھے اور آپ ﷺ نے دونوں کو معاف فرما دیا تھا)

سنن ابی داؤد اور مستدرک حاکم میں رسول اکرم ﷺ کی ایک حدیث ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''جب احد کے مقام پر تمھارے بھائی شہید ہوئے تو اللہ تعالیٰ نے ان کی روحیں سبز پرندوں میں ڈال دیں۔ وہ جنت کے دریاؤں پر پانی پیتے ہیں۔ جنت کے پھل کھاتے ہیں اور عرش کے سائے تلے لٹکتی ہوئی سونے کی قندیلوں میں پناہ حاصل کرتے ہیں۔ جب انھوں نے ایسا بہترین کھانا، پینا اور آرام پایا تو کہنے لگے کہ کون ہمارے زندہ بھائیوں کو ہمارے بارے میں بتائے گا کہ ہم جنت میں زندہ ہیں۔ ہم کھاتے بھی ہیں اور پیتے بھی، تاکہ وہ جہاد سے بے توجہی نہ کریں اور جنگ میں سستی نہ کریں۔''

اللہ کو اپنے شہیدوں کی یہ بات اتنی پسند آئی کہ اللہ تعالیٰ نے زندوں تک اس پیغام کو پہنچانے کی ذمے داری خود لے لی۔ لہٰذا سورہ آل عمران آیت نمبر ۱۶۹ میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔

ولاتحسبن الذین قتلوفی سبیل الله امواتا بل احیاء عندربھم یرزقون٥

''جو لوگ اللہ کی راہ میں مارے جائیں انھیں مرے ہوئے نہ سمجھنا (وہ مرے ہوئے نہیں ہیں) بلکہ اللہ کے نزدیک زندہ ہیں اور ان کو رزق مل رہا ہے۔''

صحیح بخاری میں امام بخاریؒ تحریر فرماتے ہیں کہ اس غمناک واقعہ کے ۸ سال بعد یعنی ۱۱ ہجری میں رسول اللہ ﷺ نے احد کے شہدا کے لیے یوں دعا فرمائی کہ جیسے انھیں الوداع کہہ رہے ہوں اور پھر منبر پر تشریف فرما ہو کر آپ ﷺ نے فرمایا ''میں تم سے پہلے جا رہا ہوں۔ میں تمھارے حق میں گواہی دوں گا۔ تم سے ملاقات حوض کوثر پر ہوگی۔'' جبل احد کے جنوب میں احد اور جبل رماۃ کے درمیان میدان احد کے ایک احاطے میں شیر خدا حضرت حمزہؓ بن عبدالمطلب حضرت مصعبؓ بن عمیر سمیت ۷۰ شہدا مدفون ہیں۔

جبلِ رماۃ جبل احد کے جنوب مغرب میں ۲۵۰ میٹر کے فاصلے پر وادی قناۃ کے جنوبی کنارے پر ایک چھوٹی سی پہاڑی ہے۔ اس پہاڑی کی لمبائی ۱۸۰ میٹر اور چوڑائی ۴۰ میٹر ہے۔ زائرین جب روضہ رسول اللہ ﷺ پر سلام اور حاضری کے بعد جب شہدائے احد کو سلام پیش کرنے جاتے ہیں تو جبل رماۃ پر بھی چڑھ جاتے ہیں۔ اس طرح کچھ دیر کے لیے وہ غزوہ احد کے عبرت ناک واقعہ کی یادوں میں گم ہو جاتے ہیں کہ جس کی وجہ سے مسلمانوں کو عظیم خسارے سے دوچار ہونا پڑا تھا۔

مدینہ منورہ کی آبادی اب جبل احد تک پھیل چکی ہے۔ کہتے ہیں کہ مدینہ منورہ میں وقت کے ساتھ ساتھ اس قدر تبدیلی آچکی ہے کہ اب صرف احد پہاڑ ہی ایسا ہے جو اپنی اصلی حالت میں موجود ہے۔

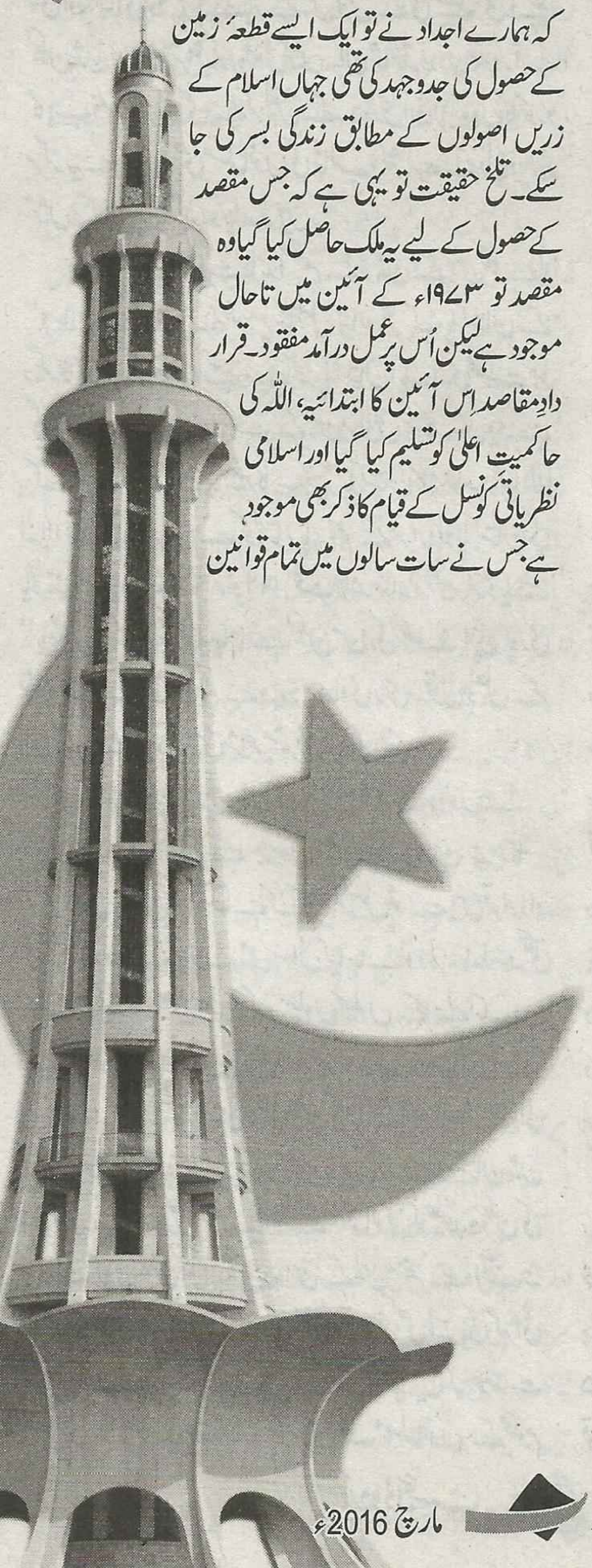
یومِ پاکستان کے تقاضے

نوجوان نسل کو اس ''تعطیل'' کے پس منظر سے بھی آگاہ کرنا ضروری ہے

پروفیسر رفعت مظہر

نسلِ نو بے خبر، بالکل بے خبر کہ اِس قطعہٗ زمین کے حصول کے لیے ہمارے آباؤاجداد نے کتنی قربانیاں دیں۔ کتنے کڑیل جوان، بچے اور بوڑھے شہید ہوئے، کتنے شیر خواروں کو نیزوں کی نوک پر چڑھایا گیا، کتنی سہاگنوں کے سہاگ لٹے، کتنی ماؤں کی گودیں اُجڑیں اور کتنی بہنوں اور بیٹیوں کی عصمتیں تار تار ہوئیں۔ حیرت ہوتی ہے کہ قیامِ پاکستان کے بعد جب بھارت سے انسانی لاشوں سے اَٹی ٹرینیں لاہور کے ریلوے اسٹیشن پر پہنچتیں تو بچے کھچے مسافر پلیٹ فارم پر اترتے ہی پاک سرزمین پر سجدہ ریز ہو کر خدا کا شکر ادا کرتے اور پھر ''پاکستان زندہ باد'' کے نعرے لگاتے۔ یہ الفت و محبّت اور جذبہ و جنوں چشمِ فلک نے پہلے کبھی دیکھا نہ سُنا۔ لاریب اِس جذبے کا اصل محرک دینِ مبیں سے والہانہ وابستگی تھا جس نے آگ اور خون کے دریا سے ایک ایسی مملکت کو ابھارا جس کی بنیاد لاالٰہ الا اللہ تھی...... لیکن اب یومِ آزادی ہو یا یومِ پاکستان، یہ ہمارے لیے محض ایک تعطیل ہے، مقصدیت تو کہیں نظر ہی نہیں آتی۔

ہر سال ۲۳ مارچ کو سارا دن الیکٹرانک میڈیا پر قومی و ملی پروگرام نشر ہوتے ہیں، اخبارات سپلیمنٹ نکالتے ہیں اور قومی راہنماؤں کے پیغامات نشر ہوتے ہیں لیکن ۲۴ مارچ کا سورج طلوع ہوتے ہی، ہم سب کچھ بھلا کر اپنی اُنہی ''حرکتوں'' کی جانب پلٹ کیوں جاتے ہیں جن کا مادرِ وطن کی چاہتوں اور محبّتوں سے کوئی تعلّق ہوتا ہے نہ دینِ مبیں سے۔ ہم یکسر فراموش کر دیتے ہیں کہ ہمارے اجداد نے تو ایک ایسے قطعہٗ زمین کے حصول کی جدوجہد کی تھی جہاں اسلام کے زریں اصولوں کے مطابق زندگی بسر کی جا سکے۔ تلخ حقیقت تو یہی ہے کہ جس مقصد کے حصول کے لیے یہ ملک حاصل کیا گیا وہ مقصد تو ۱۹۷۳ء کے آئین میں تا حال موجود ہے لیکن اُس پر عمل درآمد مفقود۔ قراردادِ مقاصد اس آئین کا ابتدائیہ، اللہ کی حاکمیت اعلیٰ کو تسلیم کیا گیا اور اسلامی نظریاتی کونسل کے قیام کا ذکر بھی موجود ہے جس نے سات سالوں میں تمام قوانین



کو اسلامی سانچے میں ڈھالنا تھا۔ اسلامی نظریاتی کونسل بن بھی چکی اور اسلامی قوانین کے بارے میں اُس کے کئی فیصلے بھی آچکے لیکن شاید ہماری اشرافیہ کو وہ قبول نہیں۔ ان شاءاللہ وہ دن ضرور آئے گا جب ہم یہ منزل بھی طے کرلیں گے۔ ہماری ان اُمیدوں کا محور و مرکز یہ ہے کہ آج بھی مسلمانوں کی غالب اکثریت کے دل دینِ مبین کے نام پر بیقرار ہوجاتے ہیں۔

بانیٔ پاکستان حضرت قائدِاعظمؒ نے زمین کے اِس ٹکڑے کو ''اسلام کی تجربہ گاہ'' کے طور پر حاصل کیا اور تحریکِ پاکستان کے دیگر قائدین بھی برملا کہتے رہے کہ پاکستان ایک ایسی مملکت ہو گی جس کا دستور قرآن و سنت کے عین مطابق ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ تقسیم ہند سے پہلے برِصغیر کا چپہ چپہ ''پاکستان کا مطلب کیا، لاالٰہ الا اللہ'' کے نعروں سے گونجتا رہا۔ ہم نے قراردادِ پاکستان کی یاد میں ۲۲ مارچ ۱۹۶۸ء کو ۱۹۶ فُٹ بلند مینار تو تعمیر کر دیا جسے ''یادگارِ پاکستان'' کہا جاتا ہے لیکن مَن کی کھوٹ اپنی پوری توانائیوں کے ساتھ ہمارے وجود پر حاوی رہی۔ قول و فعل کے اسی تضاد کے بارے میں شاعرِ مشرق نے کہا تھا......

مسجد تو بنا دی شب بھر میں ایماں کی حرارت والوں نے
مَن اپنا پرانا پاپی ہے برسوں میں نمازی بن نہ سکا

وثوق سے کہا جاسکتا ہے کہ آج اگر نسلِ نَو سے اِس قرارداد کی اصل روح کے بارے میں سوال کیا جائے تو وہ ہمارا مُنہ تکتی رہ جائے گی۔ دراصل نسلِ نَو کو تو میلوں ٹھیلوں کے لیے ایک دِن چاہیے۔ وہ خواہ خالصتاً غیر شرعی اور غیر اسلامی ''ویلنٹائن ڈے'' ہی کیوں نہ ہو۔ مستقبل میں ارضِ وطن کی باگ ڈور سنبھالنے والی اِس نسل کو یہ علم تو ہونا چاہیے کہ آخر صدیوں تک ہندوستان میں ہندوؤں کے ساتھ مل کر رہنے والے مسلمانوں کو علیحدہ وطن کی ضرورت کیوں پیش آئی۔ لیکن وہ اِس کے پس منظر سے واقف نہ دوقومی نظریہ کی روح سے اور نہ ہی اُنہوں نے کبھی اُس کی گہرائی میں اتر کر دیکھنے کی زحمت کی۔ تاریخی حقائق یہ ہیں کہ سومنات کی تباہی کے کرب اور گیارہ سو سال تک مسلمانوں کے محکوم رہنے کے درد میں مبتلا ہندوؤں کا جذبۂ انتقام ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے بعد عروج پر پہنچ گیا۔ ہندوستان میں بسنے والے مسلمانوں کے اذہان و قلوب میں دوقومی نظریہ اُس وقت پنپنے لگا جب ۱۸۶۷ء میں ہندوؤں نے لسانی تحریک شروع کی جس کا مقصد اردو کی جگہ ہندی کو سرکاری اور عدالتی زبان قرار دینا تھا۔ اُردو کو مسلمانوں کی زبان سمجھا جاتا تھا اور انگریز مستشرقین اسے ''مورتھ'' (Moreth) یعنی مسلمانوں کی زبان کہتے تھے۔ متعصّب ہندو اپنی بدبودار ذہنیت کی بنا پر ہندی کو اُردو کی جگہ لانا چاہتے تھے۔ سرسید احمد خاں نے جھگڑا نپٹانے کی بہت کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہوسکے اور اس لسانی جھگڑے پر ہندوستان میں بڑے پیمانے پر فسادات شروع ہو گئے جس پر سرسیّد احمد خاں نے ہندوستان کے متحدہ قومیت کے نظریے کو مسترد کرتے ہوئے کہا کہ ہندوستان میں ہندو اور مسلم دو علیحدہ قومیں ہیں۔

قیامِ پاکستان تک آل انڈیا مسلم لیگ کی سیاست کا محور و مرکز یہی دوقومی نظریہ رہا۔ علامہ اقبال نے بھی ۱۹۳۰ء میں الہ آباد کے مقام پر مسلم لیگ کے اکیسویں سالانہ اجلاس کی صدارت کرتے ہوئے نہ صرف دوقومی نظریے کی کھل کر وضاحت کی بلکہ اِس نظریے کی بنیاد پر ایک الگ مملکت کے قیام کی پیشین گوئی بھی کر دی۔ قائدِ اعظم نے بھی پاکستان کا مقدمہ دوقومی نظریے ہی کی بنیاد پر لڑا۔ مارچ ۱۹۴۰ء میں اُنہوں نے فرمایا ''اسلام اور ہندو دھرم محض مذاہب نہیں بلکہ دو مختلف معاشرتی نظام ہیں۔ میں واشگاف الفاظ میں کہتا ہوں کہ وہ دو مختلف تہذیبوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ اِن تہذیبوں کی بنیاد ایسے تصورات اور حقائق پر رکھی گئی ہے جو ایک دوسرے کی ضد ہیں بلکہ اکثر متصادم ہوتے رہے ہیں۔ ۸ مارچ ۱۹۴۴ء کو علیگڑھ یونیورسٹی کے طلبہ سے خطاب کرتے ہوئے کہا ''پاکستان تو اُسی دِن وجود میں آگیا تھا جب ہندوستان میں پہلا غیر مسلم مسلمان ہوا تھا۔'' ۱۷ نومبر ۱۹۴۵ء کو ایڈورڈ کالج پشاور طلبہ سے خطاب میں کہا ''ہم دونوں قوموں میں صرف مذہب کا ہی فرق نہیں، ہمارا کلچر ایک دوسرے

سے الگ ہے۔ ہمارا دین ہمیں ایک ضابطہ حیات دیتا ہے جو زندگی کے ہر شعبے میں ہماری راہنمائی کرتا ہے اور ہم اِس ضابطے کے مطابق زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں۔‘‘ اسی دوقومی نظریے کی بنیاد پر بالآخر ۱۴ راگست ۱۹۴۷ء کو پاکستان معرضِ وجود میں آیا۔ یہ ۲۷ رمضان المبارک کا رحمتوں بھرا دِن تھا۔

ہندوستان میں آزادی کی جدوجہد بغیر کسی وجہ کے شروع نہیں ہوئی، حقیقت یہ کہ یہ سب کچھ انتہاپسند اور متعصّب ہندوؤں کا کیا دھرا تھا۔ اسی لیے بی جے پی کے مرکزی لیڈر اور واجپائی حکومت میں خارجہ اور دفاع جیسی اہم وزارتوں پر رہنے والے جسونت سنگھ نے ۲۰۰۹ء میں لکھی جانے والی کتاب ’’جناح انڈیا تقسیمِ آزادی‘‘ (Jinnah India Partition Independence) میں کہا کہ ملک کی تقسیم کے مسلمان ذمہ دار نہیں جیسا کہ بعض حلقوں کی جانب سے الزام عائد کیا جا رہا ہے۔ اُنہوں نے اپنی کتاب میں قائدِاعظم کو عظیم قائد قرار دیتے ہوئے لکھا کہ ممتاز مجاہدِ آزادی گوپال کرشن گوکھلے نے جناح کو ہندو مسلم اتحاد کا سفیر کہا تھا۔ ہندوستان کی تقسیم کے ذمہ دار پنڈت جواہر لال نہرو اور سردار ولبھ بھائی پٹیل تھے۔ وہ قائدِاعظم کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں ’’میں اُنہیں ایک عظیم انسان سمجھتا ہوں اور میں نے اُنہی سے متاثر ہو کر یہ کتاب لکھی۔ جناح ایک ایسی چیز کو وجود میں لانے میں کامیاب ہوئے جس کا کوئی وجود نہیں تھا۔‘‘ بابائے قوم کی اِس تعریف پر جسونت سنگھ کو بی جے پی سے نکال دیا گیا۔ حقیقت یہی ہے کہ ’’اُردو ہندی جھگڑے‘‘ کے بعد ۱۹۲۰ء ہندو انتہاپسند سوامی دیانند سرسوتی نے مسلمانوں کو زبردستی ہندو بنانے کے لیے ’’شُدھی‘‘ تحریک کا آغاز کیا جسے ہندو راہنماؤں کی بھرپور تائید حاصل رہی۔ ہندو مہاسبھا کے بانی سوامی شردھانند کی تحرک بھی ایسی ہی تھی جسے قاضی عبدالرشید غازی کے ہاتھوں واصلِ جہنّم ہوا تو گاندھی کی اپیل پر پورے ہندوستان میں اِس کا سوگ منایا گیا۔ تب ہندوستان کے مسلمانوں میں یہ احساس غالب آ گیا کہ مسلمانوں پر ہندوستان کی زمین تنگ کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے اور اب یا تو اُنہیں ہندو بن کر ہندوستان میں رہنا پڑے گا یا پھر ہندوستان چھوڑنا پڑے گا۔ یہی وجہ تھی جس نے قیامِ پاکستان کی داغ بیل ڈالی اور قائدِاعظم کی راہنمائی میں دنیا کے نقشے پر ایک نیا ملک اُبھرا۔

پاکستان کو معرضِ وجود میں آئے ۶۸ سال بیت چکے لیکن مذہبی جنونی، انتہاپسند اور متعصّب ہندوؤں کا ذہن ابھی تک نہیں بدلا۔ نریندر مودی کے انتخابی منشور میں واضح طور پر لکھا گیا ’’ریاست کشمیر کو دیے گئے خودمختاری کے خصوصی حقوق ختم کر دیے جائیں گے۔ گائے کے ذبیحہ پر پابندی ہو گی اور بابری مسجد کی جگہ رام مندر تعمیر کیا جائے گا۔ نریندر مودی کے وزیرِاعظم بنتے ہی اُن تمام بدبودار تنظیموں نے دوبارہ سر اٹھا لیا ہے جو نظریہ دیانند اور شردھانند کا تھا، وہی جنتا پارٹی اور سنگھ پریوار کا ہے۔ قدیم شدھی تحریک کا مؤقف یہ تھا کہ مسلمانوں اور عیسائیوں کے آنے سے پہلے تمام لوگ ہندو تھے۔ اِس لیے سب کو ہندو بنانا اُن کا فرض ہے جبکہ نریندر مودی دَور کے ’’ماڈرن سوامی‘‘ بھی یہی کہتے ہیں کہ عیسائی اور مسلمان ہمارے بچھڑے ہوئے بھائی ہیں جنہیں زبردستی ہندوؤں سے مسلمان بنایا گیا۔ اگر وہ ہندوستان میں رہنا چاہتے ہیں تو اُنہیں ہندو مذہب اختیار کرنا پڑے گا، قدیم سنگھٹن تحریک کا بانی مدن موہن مالویہ ہندو مذہبی جنونیوں کو ہندو مذہب اختیار نہ کرنے والے مسلمانوں کو قتل کرنے کی ترغیب دیتا تھا اور آج بھی انتہاپسند جنونیوں، جن کی سربراہی نریندر مودی کے پاس ہے، کا بھی یہی مؤقف ہے لیکن بدقسمتی تو یہ ہے کہ ہمارے عاقبت نااندیش سیکولر دانشور ’’امن کی آشاؤں‘‘ کے گیت گاتے، سرحدوں پر دوستی کے دیپ جلاتے اور امن کی فاختائیں اڑاتے نظر آتے ہیں۔ اُن کے نزدیک سرحد محض ایک لکیر ہے جسے ختم ہو جانا چاہیے۔ وہ بھارت کو پسندیدہ ترین ملک کا درجہ دینے کے لیے واویلا کرتے رہتے ہیں۔ کیا بھارت کو صرف اِس لیے پسندیدہ ترین ملک قرار دے

دیا جائے کہ جس کشمیر کو قائداعظمؒ نے پاکستان کی ''شہ رگ'' قرار دیا تھا وہاں خون کی ہولی کھیلی جا رہی اور عصمتوں کی دھجیاں اڑائی جا رہی ہیں؟ یا پھر اِس لیے کہ وہ نہ تو پانی کی منصفانہ تقسیم کے لیے تیار ہے اور نہ ہی سیاچن اور سرکریک کا جھگڑا طے کرنے کے لیے آمادہ۔ دُکھ کی بات تو یہ ہے کہ ہمارے ''لبرل'' حکمران بھی نریندر مودی کے لیے دیدہ و دِل فرشِ راہ کیے بیٹھے ہیں۔ تحائف کا تبادلہ بھی ہوتا ہے اور ''جادو کی جپھی'' بھی ڈالی جاتی ہے۔ یہی نہیں بلکہ اب تو نوبت یہاں تک آن پہنچی کہ ہمارے حکمرانوں کی شدید خواہش ہے کہ کوئی اُنہیں ''ہولی'' کے رنگوں میں نہلا دے۔ ہوسکتا ہے کہ وہ اِسے وسیع الظرفی کا مظاہرہ سمجھتے ہوں لیکن ہمیں تو یہ مرگِ ایمانی نظر آتی ہے کیونکہ ہمارے سامنے تو آقا محمد مصطفیٰ ﷺ کا یہ فرمان ہے ''جس نے کسی قوم سے مشابہت اختیار کی، وہ اُنہی میں سے ہے۔'' (مسند احمد)

بات جذبات کی رَو میں بہتے بہتے کسی اور طرف نکل گئی حالانکہ میں تو قراردادِ پاکستان کے حوالے سے بات کرنا چاہتی تھی۔ خیر! آمدم برسرِ مطلب، یوں تو ہم ہر سال ۲۳ مارچ کو ہی ''یومِ پاکستان'' مناتے چلے آرہے ہیں لیکن درحقیقت ''قرارداد لاہور'' جسے بعد میں ''قراردادِ پاکستان'' کا نام دیا گیا، ۲۳ نہیں ۲۴ مارچ کو منظور ہوئی۔ تاریخ کے اوراق میں درج ہے کہ ۲۲ مارچ کو منٹو پارک لاہور میں آل انڈیا مسلم لیگ کا اجلاس ہوا۔ ۲۳ مارچ کو بنگال کے وزیرِ اعلیٰ مولوی فضل الحق نے قراردادِ لاہور پیش کی جو ۲۴ مارچ کے اختتامی اجلاس میں منظور ہوئی۔ یہ غلط فہمی دراصل اِس وجہ سے پیدا ہوئی کہ ۲۳ مارچ ۱۹۵۶ء کو پاکستان کا پہلا آئین منظور ہوا اور اِس آئین کے نفاذ کی خوشی میں دو سال تک ۲۳ مارچ ہی ''یومِ جمہوریہ'' کے طور پر منایا جاتا رہا لیکن ایوب خاں نے حکومت سنبھالتے ہی ۱۹۵۶ء کے آئین کو منسوخ کر دیا اور ۲۳ مارچ کو قراردادِ لاہور سے منسلک کرکے ''یومِ پاکستان'' منانا شروع کر دیا۔ تب سے اب تک ہم یومِ پاکستان ۲۳ مارچ کو ہی مناتے چلے آرہے ہیں...... اِس قرارداد کی بنیاد تو ۱۹۳۰ء میں علامہ اقبالؒ نے الٰہ آباد میں اپنے خطبۂ صدارت میں ہی اُس وقت رکھ دی تھی جب اُنہوں نے آزاد و خودمختار مسلم مملکتوں کے قیام کا تصوّر پیش کیا۔ اِس خطبے کے دَس سال بعد قراردادِ لاہور منظور ہوئی اور پھر سات سال بعد پاکستان کا قیام عمل میں آیا۔

قراردادِ لاہور کا اصل مسودہ اُس زمانے کے پنجاب کے یونینسٹ پارٹی کے وزیرِ اعلیٰ سَر سکندر حیات نے تیار کیا۔ اُس زمانے میں یونینسٹ پارٹی مسلم لیگ میں ضم ہو چکی تھی اور سَر سکندر حیات پنجاب مسلم لیگ کے صدر تھے۔ ۲۲ مارچ کے افتتاحی اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے قائداعظمؒ نے فرمایا ''ہندوؤں اور مسلمانوں میں فرق اتنا بڑا اور واضح ہے کہ ایک مرکزی حکومت کے تحت اِن کا اتحاد خطرات سے بھرپور ہوگا۔ اِس کی بَس ایک ہی صورت ہے کہ اِن کی علیحدہ مملکتیں ہوں''۔ ۲۳ مارچ کو پیش کی جانے والی قراردادِ لاہور میں کہا گیا کہ اُس وقت تک کوئی آئینی پلان نہ تو قابلِ عمل ہوگا اور نہ ہی مسلمانوں کو قبول جب تک ایک دوسرے سے ملے ہوئے جغرافیائی یونٹوں کی جداگانہ علاقوں میں حد بندی نہ ہو۔ قرارداد میں یہ بھی کہا گیا کہ اُن علاقوں میں جہاں مسلمانوں کی عددی اکثریت ہے جیسے ہندوستان کے شمال مشرقی اور شمال مغربی علاقے، اُنہیں یکجا کرکے آزاد مملکتیں قائم کی جائیں۔ اِس قرارداد کی تائید یو پی کے مسلم لیگی راہنما چودھری خلیق الزماں، پنجاب سے مولانا ظفر علی خاں، سندھ سے سَر عبداللہ ہارون، سرحد سے سردار اورنگ زیب اور بلوچستان سے قاضی عیسیٰ نے کی۔ انگریزی میں لکھی گئی اِس قرارداد کا اُردو ترجمہ مولانا ظفر علی خاں نے پیش کیا۔

تشکیلِ پاکستان کے صرف ایک سال بعد قائداعظمؒ ابدی زندگی کی طرف لوٹ گئے اور ۱۶ اکتوبر ۱۹۵۱ء کو لیاقت علی خاں بھی لیاقت باغ راولپنڈی میں جلسے کے دوران شہید کر دیے گئے۔ اُن کی شہادت کے بعد ہم اُس قیادت سے محروم ہو گئے جو پاکستان کے تصور کو حقیقت کا روپ دینے میں مصروف تھی۔ ہمارا پالا برطانوی سامراج کے اُن غلاموں سے پڑا جن کے اذہان و

قلوب میں انگریزوں کی چاکری رَچ بَس چکی تھی۔ کچھ ایسا ہی چلن ہمارے حکمران طبقوں کا تھا اور بدقسمتی سے اب بھی ہے۔ اگر معاملہ یہیں تک محدود ہوتا تو امریکہ اور مغربی ممالک کے لیے کوئی مسئلہ ہی نہ تھا کہ ۲ فیصد اشرافیہ تو پہلے ہی اُن کی چاکری میں فخر محسوس کرتی ہے لیکن مصیبت یہ آن پڑی کہ ۹۸ فیصد پاکستانی عوام نظریہ پاکستان سے والہانہ محبّت کرتے ہیں۔ اسی قومی جذبے سے خائف طاغوتی طاقتوں کے لیے ناگزیر ہو گیا کہ وہ علامہ اقبالؒ اور قائدِ اعظمؒ کو سیکولر نظریات کے حامل ثابت کر کے نظریہ پاکستان کی ناکامی کا پرچار کریں اور قوم میں فکری و نظریاتی اختلاف پیدا کریں۔

اسلام اور پاکستان دشمن قوتیں یہ ثابت کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہی ہیں کہ قائدِ اعظمؒ نے سیکولر ریاست کے لیے جدوجہد کی اور علامہ اقبالؒ نے بھی سیکولر مملکت ہی کا خواب دیکھا۔ ہمارے ہاں کے کچھ سیکولر دانشور بھی اُن کی ہاں میں ہاں ملا رہے ہیں۔ اُن سے سوال ہے کہ کیا قائدِ اعظمؒ اور علامہ اقبالؒ سیکولرازم کے مفہوم سے ناآشنا تھے؟ اگر نہیں تو پھر کیا وجہ ہے کہ اُنہوں نے کبھی بھی اور کہیں بھی لفظ ''سیکولر'' کو اسلام سے نتھی کیا نہ ''سیکولر مسلم'' کی اصطلاح استعمال کی۔ علامہ اقبالؒ نے تو الٰہ آباد میں اپنے صدارتی خطبے میں حاضرین سے یہ سوال کیا کہ کیا وہ سیکولر سیاست کو اپنا کر اسلام کا بھی وہی حشر کرنا چاہتے ہیں جو مغربی دنیا نے عیسائیت کا کر رکھا ہے؟ ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ علامہ اقبالؒ کو ''نوجوان مسلم'' سے بہت سی توقعات وابستہ تھیں اور وہ اپنی شاعری میں اُنہیں حصولِ خودی کی تلقین کرتے رہتے تھے۔ یہ بھی اظہر مِن الشّمس کہ اقبالؒ کی شاعری کا محور و مرکز خودی ہے اور ''خودی کا سِرِ نہاں لاالٰہ الااللہ۔'' دینِ مبیں کی محبّت سے سرشار حضرتِ اقبالؒ کے نزدیک تو وہ ریاست بھی ناقابلِ قبول جو دین کے عوض ہاتھ آئے۔ وہ کہتے ہیں......

دیں ہاتھ سے دے کر اگر آزاد ہو ملّت
ہے ایسی تجارت میں مسلماں کو خسارہ

پھر کیسے تصور کیا جا سکتا ہے کہ اقبال سیکولر نظریات کے حامل تھے۔ رہی بانیٔ پاکستان کی بات تو اُنہوں نے اپنی بیشمار تقاریر میں انتہائی صراحت کے ساتھ پاکستان میں اسلامی نظام کی بات کی لیکن سیکولر دانشوروں کی سُوئی تو حضرت قائدِ اعظمؒ کے ۱۱ اگست ۱۹۴۷ء کو آئین ساز اسمبلی کے پہلے خطاب پر اٹکی ہوئی ہے۔ قائدِ اعظم کے اوّلین سوانح نگار ہیکٹر بولائتھو نے لکھا ''چار دِن پہلے جب محمد علی جناح فاتحانہ شان سے کراچی کی سڑکوں سے گزرے تو اُنہوں نے شہر کے ہندوؤں کو خاموش اور متفکّر پایا۔ آئین ساز اسمبلی کا افتتاحیہ خطبہ لکھتے وقت غالباً یہی ہندو قائدِ اعظمؒ کی چشمِ تصور میں ہوں گے۔'' عین ممکن ہے کہ ایسا ہی ہو۔ سوال مگر یہ ہے کہ قائدِ اعظمؒ نے ایسی کون سی بات کہہ دی جو سیکولر دانشور اُنہیں سیکولر نظریات رکھنے والے شخص کے روپ میں دیکھ رہے ہیں۔ قائدِ اعظمؒ نے اپنے اِس خطاب میں کہا ''اب آپ آزاد ہیں۔ اِس مملکتِ پاکستان میں آزاد ہیں۔ اپنے مندروں میں جائیں، مسجدوں میں جائیں یا کسی اور عبادت گاہ میں، آپ کا کسی بھی مذہب، ذات یا عقیدے سے تعلّق ہو، کاروبارِ مملکت کا اِس سے کوئی واسطہ نہیں''۔ قائدِ اعظمؒ کے خطاب کا یہی وہ حصّہ ہے جسے سیکولر دانشور بطور ثبوت پیش کرتے ہیں۔ اب کوئی اِن بزعم خویش دانشوروں کی عقل پر ماتم نہ کرے تو کیا کرے کہ قائدِ اعظمؒ کے خطاب کا یہ حصّہ تو عین اسلام ہے اور دینِ مبیں اپنی عمل داری میں موجود غیر مسلموں کو یہی حقوق دیتا ہے۔ اگر یہ لوگ یکم ہجری کو حضورِ اکرم ﷺ اور یہودیوں کے مابین ہونے والے ''میثاقِ مدینہ'' کا مطالعہ کر لیں تو اِن پر سب کچھ عیاں ہو جائے گا۔

اگر میرے آقا ﷺ یہودیوں کو مکمّل مذہبی آزادی دیتے ہیں، اُنہیں تمدنی و ثقافتی معاملات میں مسلمانوں کے برابر حقوق دیتے ہیں اور اُن کے اندرونی معاملات میں مداخلت نہ کرنے کا حکم صادر فرماتے ہیں تو پھر یہی کچھ تو ۱۱ اگست ۱۹۴۷ء کو قائدِ اعظمؒ نے اپنے خطاب میں کہا۔ پھر اُنہیں سیکولر نظریات کا حامل کیسے قرار دیا جا سکتا ہے؟



فیس بک دوستی کا المناک انجام

سوشل میڈیا کا مثبت استعمال اور برے اثرات سے بچاؤ کیسے؟

ڈاکٹر آصف محمود جاہ (ستارۂ امتیاز)

راولپنڈی میں ایک معصوم طالبہ کو فیس بک کے بے جا استعمال کی وجہ سے المناک انجام سے دو چار ہونا پڑا۔ پچھلے دنوں سپریم کورٹ آف پاکستان نے فیس بک پر ایک طالبہ کو بلیک میل کرنے والے لڑکے کی ضمانت مسترد کر دی۔ فیس بک اور سوشل میڈیا کے بے جا اور غلط استعمال کے باعث کئی نوجوان لڑکے اور لڑکیاں مسائل کا شکار ہو رہے ہیں۔ جن میں سے اکثر تو رپورٹ ہی نہیں ہوتے اور بدنامی کے خوف سے اکثر لڑکیاں کسی سے اس کا تذکرہ نہیں کر پاتیں اور یوں بے جا جنسی استحصال کا شکار ہوتی رہتی ہیں۔

آج کل سوشل میڈیا میں سماجی رابطوں کا بڑا ذریعہ ''فیس بُک'' ہے۔ اس وقت پاکستان میں فیس بُک کے تقریباً ایک کروڑ سے زائد صارفین میں ۸۲ لاکھ سے زیادہ مرد جبکہ ۳۲ لاکھ خواتین شامل ہیں۔ ان میں زیادہ تعداد نوعمر لڑکے لڑکیوں اور ۲۰ سے ۳۰ سال تک کی عورتوں اور مردوں کی ہے۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ فیس بک پر موجود خواتین/لڑکیوں میں سے بہت سے اکاؤنٹس ایسے بھی ہیں جو مردوں/لڑکوں نے اُن کے نام سے بنائے ہیں یا پھر مارکیٹنگ کے شعبہ سے تعلق رکھنے والوں نے انہیں عوام کی توجہ حاصل کرنے کے لیے خواتین/لڑکیوں کا نام دے رکھا ہے۔ آج کے دور میں شاید ہی کوئی شخص ایسا ہو جو سماجی روابط کی مشہور ویب سائٹ ''فیس بُک'' سے واقف نہ ہو۔ بچوں اور نوجوانوں سے بڑوں تک سب ہی اس کے سحر میں جکڑے نظر آتے ہیں۔ اپنی معمولی اور غیر معمولی سرگرمیوں سے لے کر مختلف مسائل کا ذکر اور اپنے خیالات کا اظہار کرنے کے لیے یہ ویب سائٹ دنیا بھر میں مقبول ہے۔

سوشل میڈیا یعنی فیس بُک، ٹویٹر، وٹس ایپ، اسکائپ وغیرہ کے اچھے اثرات بھی ہوتے ہیں اور برے بھی۔ ہر چیز کے دو طرح کے استعمالات ہوتے ہیں۔ یہ آپ پر منحصر ہے کہ آپ اس کا صحیح استعمال کرتے ہیں یا غلط، سوشل میڈیا کو صحیح طریقے سے اچھے مقاصد کے لیے استعمال کیا جائے تو یہ بہت فائدہ مند ثابت ہوتا ہے۔ اس سے ہمیں ہر روز نئی معلومات فوری طور پر دستیاب ہوتی ہیں اور تفصیل کے ساتھ تصاویر بھی مل جاتی ہیں۔ ان میں اسلامی، سیاسی اور معاشرتی و معاشی تمام طرح کی معلومات شامل ہوتی ہیں۔ سوشل میڈیا ہر گزرتے دن کے ساتھ ہماری زندگی میں اہمیت حاصل کرتا جا رہا ہے۔ جہاں خبروں اور معلومات کے حصول کے لیے کروڑوں افراد ایک دوسرے سے منسلک ہیں۔ ٹویٹر اور فیس بُک اس دور کی مقبول ترین ویب سائٹس ہیں جن کے

کروڑوں صارفین دنیا بھر میں موجود ہیں مگر نوجوان ساتھیو! ایک بات ذہن نشین رکھیں کہ ہر چیز کا ایک وقت ہوتا ہے۔ مختلف کام کرنے کی عمر ہوتی ہے۔ نوجوان لڑکے اور لڑکیوں کے لیے سب سے زیادہ اہم ان کی پڑھائی ہے۔ عمر کے اس نازک اور پُرآشوب دور میں آپ اپنی ساری کی ساری توجہ اپنی پڑھائی کو دیجیے۔ دلجمعی سے اپنا کام کریں۔ محنت کریں، اچھے گریڈ حاصل کریں۔ موبائل فون اب ایک ضرورت بن گیا ہے۔ سڑک پر جھاڑو دینے والا ہو یا کار والا ہر کوئی اس کا دلدادہ ہے۔ جھاڑو دیتے ہوئے بھی فون پر خوش گپیاں لگ رہی ہوتی ہیں اور کار چلاتے ہوئے بھی۔ نہ صفائی کرنے والے کو فکر ہوتی ہے کہ اس سے صفائی میں فرق آرہا ہے اور نہ کار چلانے والے کو کہ ڈرائیونگ کے دوران فون پر باتیں کرنے سے کوئی حادثہ ہوسکتا ہے۔ اوائل عمری میں نوجوان بچوں اور بچیوں کے ہاتھ میں موبائل دے کر ان کی پڑھائی کا تو نقصان ہوتا ہی ہے۔ ان کی ساری توجہ فون پر گپیں لگانے، پیغامات (SMS) بھیجنے اور موبائل پر گیمز کھیلنے میں ہوتی ہے۔ اس کچی عمر میں اگر لڑکیوں کا فون پر لڑکوں سے رابطہ ہو جائے تو پھر بھٹکنے کے مواقع زیادہ ہو جاتے ہیں۔ جیسا کہ مضمون کے شروع میں دی گئی مثال سے ظاہر ہوتا ہے۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ نوجوان بچے اور بچیاں اپنے اسکولوں اور کالجوں میں بھی موبائل لے کر جاتے ہیں اور ہر وقت اس سے چپکے رہتے ہیں۔ لیکچر کے دوران SMS آتے جاتے رہتے ہیں یا پھر چیٹنگ چلتی ہے۔ پڑھائی کی طرف بالکل توجہ نہیں دی جاتی۔ اس وجہ سے کئی کالجوں میں تو موبائل فون لے جانے پر پابندی لگا دی گئی ہے۔ حج اور عمرہ کے دوران بھی لوگ دورانِ طواف اور روضۂ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زیارت کرتے ہوئے موبائل پہ مصروف یا پھر تصویریں اتارتے نظر آتے ہیں یعنی موبائل کی وجہ سے مقاماتِ مقدسہ کے احترام میں بھی کمی آگئی ہے۔ سوشل میڈیا کے اچھے اور بُرے اثرات کی چند مثالیں درج ذیل ہیں۔

❁ چھوٹی سی بچی، عمر ۱۴ سال، بابا جب بھی شام کو آتے بابا کا موبائل فون لے کر بیٹھ جاتی۔ گیم کھیلتی، ایک دن گیم کھیلتے کھیلتے کسی کا نمبر مل گیا۔ باتیں شروع ہوگئیں۔ اس کے بعد جب بھی بابا گھر آتے فون لے کر بیٹھ جاتی اور کسی نہ کسی بہانے گھنٹوں باتیں ہوتی رہتیں۔ فون پر رابطے کے ساتھ ساتھ بازار اور اسکول میں ملاقاتیں شروع ہو گئیں۔ ایک دن پرچہ دینے گئی۔ شام گئے تک نہ لوٹی تو گھر والے اِدھر اُدھر بھاگے۔ پریشان ہوئے۔ رات گئے بُرے حالات میں گھر واپس آئی۔ فون والا لڑکا بہلا پھسلا کر لے گیا تھا اور یوں تباہی کا آغاز ہوگیا۔

❁ وہ ہر امتحان میں امتیازی نمبروں سے پاس ہوتا رہا۔ والدین اور اساتذہ سب کی آنکھ کا تارا تھا۔ دوستوں میں بھی مقبول تھا۔ اچانک کیا ہوا گزشتہ چھ ماہ سے پڑھائی میں دلچسپی کم ہوگئی۔ کلاس میں اکثر اونگھتا نظر آتا۔ پتا چلا کہ گزشتہ چند ماہ سے فیس بک پر اکاؤنٹ بنایا ہے اور جب سے اکاؤنٹ بنا ہے، زیادہ وقت فیس بک پر گزرتا ہے۔ کتابوں میں دلچسپی کم ہوگئی ہے۔ پڑھائی میں دل نہیں لگتا۔ ہر وقت دل کرتا ہے کہ فیس بک پر لڑکوں اور لڑکیوں سے بات چیت (Chating) چلتی رہے۔ بعض اوقات پوری پوری رات اس میں گزر جاتی ہے۔

❁ امتحان میں بھی اچھے نمبروں سے کامیابی ہوئی۔ غریبوں سے ہمیشہ ہمدردی کرتی۔ تھر میں قحط کا سنا، اپنی سہیلیوں کو اکٹھا کیا۔ فیس بک پر اپیل کی۔ جس کسی نے سنا بچی کے جذبے کی تعریف کی اور دنوں میں تھر والوں کے لیے لاکھوں روپے کی اشیا اکٹھی ہوگئیں، جو کسٹمز ہیلتھ کیئر سوسائٹی کے تعاون سے تھر کے قحط زدہ عوام کے لیے بھجوائی گئیں۔

طالب علموں کے لیے ہدایات

ا۔ سوشل میڈیا کو استعمال کرنے سے پہلے آپ اپنی پڑھائی پر مکمّل توجہ دیں۔ اسکول/کالج اور گھر میں آپ کا زیادہ سے زیادہ وقت اپنی پڑھائی پر صَرف ہونا چاہیے۔ پڑھائی سے فارغ ہوں یا کچھ دیر آرام کرنا چاہیں، تو مختصر وقت کے لیے فیس بُک وغیرہ استعمال کرنے میں کوئی حرج نہیں۔

۲۔ جب فیس بک شروع کی گئی تب یہ پابندی تھی کہ ۱۸ سال سے کم عمر بچے اپنا اکاؤنٹ نہیں بنا سکتے تھے مگر اب ایسی پابندی نہیں رہی اب ہر عمر کے بچے فیس بُک پر اکاؤنٹ بنا لیتے ہیں اور اس پر خوامخواہ کی وقت گزاری کے لیے گفتگو اور فضولیات میں پڑ کر وقت برباد کرنے میں لگے رہتے ہیں۔ نوجوان دوستوں سے گزارش ہے کہ بہتر ہے ۱۸ سال کی عمر کا انتظار کر لیا جائے۔ اس وقت تک آپ کسی یونیورسٹی یا پروفیشنل کالج میں پہنچ چکے ہوں گے، جہاں آپ فیس بُک اور دوسرے سوشل میڈیا کو اچھے مقاصد اور اپنی تعلیم میں مدد اور راہنمائی کے لیے استعمال کر سکتے ہیں۔

۳۔ کچھ طالب علموں نے سوشل میڈیا پر بڑے اچھے بلاگز (Blogs) بنائے ہوئے ہیں اور وہ ان پر بہت اچھی معلومات شیئر کرتے ہیں۔ آپ بھی فیس بُک اور دوسرے سوشل میڈیا کو اچھے مقاصد کے لیے استعمال کر سکتے ہیں۔

۴۔ جیسا کہ شروع میں بتایا گیا لاہور کے ایک اسکول کی دو بچیوں نے ''تھر چیریٹی اپیل'' کے نام سے فیس بُک پر تھر کے غریب اور پس ماندہ عوام اور افلاس زدہ بچوں کے لیے اپیل کی جس کے نتیجے میں قحط زدہ لوگوں کے لیے لاکھوں روپے کی اشیا اکٹھّی کر لی گئیں اور انہیں تھر پہنچا دیا گیا۔ اسی طرح کسٹمز ہیلتھ کیئر سوسائٹی کی طرف سے جب تھر کے قحط زدہ عوام کے لیے کنویں بنانے کے لیے فیس بُک پر اپیل کی گئی تو دنیا بھر سے لوگوں نے تھر کے عوام کو صاف پانی کی فراہمی کے لیے کنویں بنوانے کے لیے فنڈ زمہیا کیے۔

۵۔ لڑکیوں کے لیے ضروری ہے فیس بُک (facebook) پر انجانٖ اور بڑی عمر کے مردوں اور لڑکوں کو کبھی دوست نہ بنائیں اور اگر کوئی ہے تو اس کے ساتھ خوامخواہ کی لمبی بات یا چیٹنگ نہ کریں اور اس کو کم سے کم اہمیت دیں۔

٦۔ اخبارات میں فیس بُک کرائم کے نام پر خبریں آتی رہتی ہیں۔ لڑکیوں کے لیے ضروری ہے کہ فیس بُک پر اگر کسی انجان شخص سے سلام دعا ہو بھی گئی ہو تو کبھی اسے اکیلے میں ملنے کی بالکل کوشش نہ کریں۔ اگر کوئی اس طرح کی خواہش کا اظہار کرے بھی تو فوراً اس کو اپنی فہرست سے نکال دیں۔ لڑکیوں کے لیے لازم ہے کہ سوشل میڈیا پر کبھی کسی کو اپنے دل کا حال نہ بتائیں اور نہ کسی سے اپنے ذاتی مسائل شیئر کریں۔ جو لوگ زیادہ ہمدردی کا اظہار کریں ان سے بچ کر رہیں اور کسی کو اپنے جذبات سے کھیلنے کی اجازت نہ دیں۔ کسی کی باتوں میں کوئی دلچسپی نہ لیں اور نہ کسی سے جذباتی طور پر بلیک میل ہوں۔ عموماً دیکھا گیا ہے کہ شکاری قسم کے لڑکے اپنی چکنی چپڑی باتوں اور ہمدردانہ جذبات سے معصوم بچیوں کی ہمدردی حاصل کر کے انہیں غلط راہوں پر ڈال کر اپنے مذموم مقاصد میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ اس لیے ایسے لوگوں سے بچنا بہت ضروری ہے۔

والدین کے لیے ہدایات

ا۔ ماں باپ کے لیے ضروری ہے کہ وہ نوعمر بچوں اور بچیوں پر خصوصی نظر رکھیں۔ ان کی جائز ضروریات لازماً پوری کریں لیکن بے جا فرمائشوں پر کبھی کان نہ دھریں۔ یونیورسٹی یا کالج جانے سے پہلے موبائل فون لے کر نہ دیں یا اس کا استعمال کم سے کم کرنے دیں۔ رات گئے بچے اور بچی پر خصوصی نظر رکھیں تا کہ بچے/بچی کو پتا ہو کہ ماں باپ ان کی ہر بات سے باخبر ہیں اور ان کے بارے میں ہر خبر پر ان کی نظر ہے۔

۲۔ بچوں اور بچیوں کے زیرِ استعمال کمپیوٹر یا لیپ ٹاپ گاہے گاہے ضرور چیک کرتے رہیں لیکن اس سلسلے میں اپنے

بچوں کی عزتِ نفس کا خیال ضرور رکھیں اور کبھی انہیں احساس نہ ہونے دیں کہ آپ کو ان پر اعتماد نہیں یا آپ ان کی مکمل نگرانی کررہے ہیں۔ بچوں کے ساتھ عموماً اور بچیوں کے ساتھ خصوصاً دوستانہ اور مشفقانہ رویہ رکھیں۔

۳۔ لڑکوں کے دوستوں پر خاص نظر رکھی جائے۔ والدین کے لیے عموماً اور نوجوان لڑکیوں کی ماؤں کے لیے خصوصاً ضروری ہے کہ اپنی بچیوں کو اعتماد میں لیں۔ ان کی باتیں توجہ سے سنیں۔ ان کے معاملات میں دلچسپی لیں۔ ان کی اصلاح کریں۔ انھیں دین و دنیا کے بارے میں بنیادی معلومات سے آگاہ کریں۔ اچھے بُرے کی تمیز سکھائیں۔ لڑکپن میں جو جسمانی، ذہنی اور نفسیاتی مدوّجزر ہوتے ہیں ان کے بارے میں انھیں بتائیں۔ نوعمر لڑکیوں کی خواہش ہوتی ہے کہ وہ روزانہ اپنے اسکول اور کالج میں گزارے ہوئے تمام لمحات کی داستان اپنی ماؤں کو سنائیں لیکن آج کل کی ماؤں کے پاس وقت نہیں۔ بطور ماں اگر آپ اپنی بیٹی کی روز کی کتھا اور کارگزاری دلچسپی سے اور کان لگا کر سنیں گی تو آپ کی بیٹی اپنے دل کا غبار نکالنے کے لیے کسی قسم کے مصنوعی سہارے یا سوشل میڈیا پر تکیہ نہیں کرے گی اور یوں ہر طرح کے خطرات سے محفوظ رہے گی۔

۴۔ والدین کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے بچوں کے جذبات اور ان کی ضروریات کا خاص خیال رکھیں۔ ان کی ہر جائز خواہش پوری کرنا آپ کی ذمہ داری ہے لیکن خواہشات کو پورا کرتے ہوئے یہ بات مدِنظر رکھیں کہ پڑھائی ان کا بنیادی مقصد ہونا چاہیے اور اس میں ان کی طرف سے کسی قسم کی کوتاہی نہ ہو۔ بچے اکیلے کمرے میں پڑھ رہے ہوں تو کچھ وقت کے لیے ان کے پاس جا کر ضرور بیٹھیں اور ان کی پڑھائی کے بارے میں تبادلۂ خیال کریں۔ بطور والدین آپ کا اپنے بچے کے ساتھ تھوڑی دیر کے لیے رابطہ کسی بھی استاد کے ساتھ گھنٹوں گزارنے سے زیادہ فائدہ مند ثابت ہوتا ہے۔

......☆......

اپنے حصے کی شمع ضرور جلائیں

ہمیں دوسروں پر تنقید کے بجائے پہلے اپنی اصلاح کرنی چاہیے

محمد اقبال

شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندیؒ جنگ آزادی کے عظیم مجاہد، دارالعلوم دیوبند کے صدرِ مدرس اور ہزاروں علمائے کرام کے استاد تھے۔ ان کے بارے میں مشہور ہے کہ جس زمانہ میں وہ مالٹا کے جزیرے میں اسیر تھے، جب بھی جمعتہ المبارک کا دن آتا وہ بڑے اہتمام سے نماز جمعہ کی تیاری میں مصروف ہو جاتے، کپڑے تبدیل کرتے اور اچھی طرح اپنے آپ کو تیار کر کے جیل کے دروازے پر پہنچ جاتے اور یہ الفاظ دہراتے کہ ”اے اللہ! میرے بس میں جو تھا اور جتنا مجھ سے ہوسکا وہ میں نے کرلیا۔ اب آگے آپ کی مرضی ہے۔“ یہ درحقیقت حضرت یوسف علیہ السّلام کی اس سنت کو زندہ کرنا تھا کہ جب زلیخا نے آپ علیہ السّلام کو عزیزِ مصر کے محل میں کئی کمروں کے اندر لے جا کر اپنا مقصد پورا کرنے کی خواہش کا اظہار کیا تھا۔ تو یوسف علیہ السّلام اس حالت میں بھی دروازے کی طرف بھاگے تھے۔ بظاہر ان کا بھاگنا اور بند دروازوں سے باہر نکلنا بے کار تھا۔ مگر اللہ تعالیٰ کی مشیّت سے تمام بند دروازے اور تالے کھلتے ہی چلے گئے کیونکہ اس وقت انھوں نے اپنے حصے کی کوشش کی اور نتائج اللہ تعالیٰ پر چھوڑ دیے۔ ان واقعات میں ہمارے لیے بڑا سبق موجود ہے کہ حالات کی سنگینی سے گھبرانے اور بہتر اوقات کا انتظار کرنے کے بجائے فی الحال جو کچھ ہم کر سکتے ہیں وہ کر گزریں اور دوسروں کی اصلاح کا بیڑا اٹھانے سے پہلے اپنے حال پر غور کرنا چاہیے۔

آج ہماری زندگی کا اصول یہ بن گیا ہے کہ ہم میں سے ہر ایک اپنی حالت درستی کے بجائے دوسروں کی فکر میں سرگرداں ہے۔ ہم اس حد تک جا چکے ہیں کہ ایک طرف عوام حکمرانوں

کوئی امید بر نہیں آتی؟

اب حکمرانوں پر تکیہ کرنے کی بجائے عوام کو خود صحیح فیصلہ کرنا پڑے گا

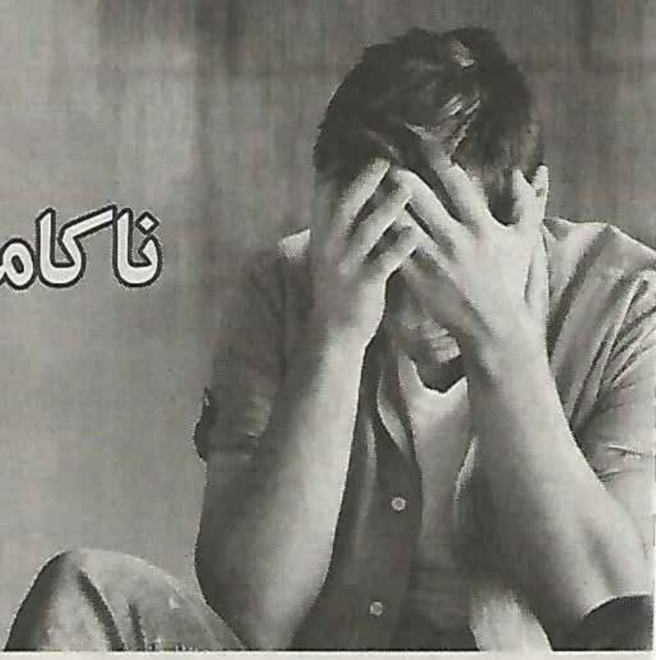
اعجاز شیخ

امریکن ہارٹ سرجن کہتے ہیں کہ دل کے مریضوں کے آپریشنوں میں ان مریضوں کا جلد شفایاب ہونا یقینی ہوتا ہے جن مریضوں کو اپنے آپریشنوں میں بچنے کی امید زیادہ ہوتی ہے۔ اسلام میں ناامیدی کو کفر قرار دیا ہے کیونکہ ناامیدی ہمیں گھپ اندھیروں میں دھکیل دیتی ہے۔ آج پاکستان کے عوام کا سب سے بڑا المیہ ریاست سے ناامید ہونا ہے۔ جب ایسی صورت حال درپیش ہو تو پھر کسی ملک کی ترقی کا ذکر کرنا بھی مناسب نہیں ہوتا۔ قیام پاکستان کے بعد، جب لوگوں کی حالت زار اتنی اچھی نہ تھی مگر ان کے دمکتے چہروں سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ نامساعد حالات کے باوجود ان کا عزم کتنا پختہ تھا۔ اور کچھ کر گزرنے کا جذبہ ہر شہری کے اندر موجود تھا۔ وائے ناکامی کہ ہم نے ان لوگوں کی وطن پرستی کو نہ صرف دبا دیا بلکہ انھیں تہ تیغ کرنے سے بھی ذرا ہچکچاہٹ محسوس نہیں کی۔ وطن کی نظریاتی اساس کو جس قدر اب تک پامال کیا جاتا رہا ہے۔ دنیا کی تاریخ میں کوئی ایسی مثال نہیں ملتی۔ ان حالات میں ارض پاکستان کا قائم رہنا، خطرے میں پڑ چکا ہے۔ کسی دوسری قوم کی ترقی کے باب کی ورق گردانی کر کے دیکھیں تو پتا چلتا ہے کہ ان لیڈروں کا طرز عمل اور عوام کی مسلسل جدوجہد نے انھیں کس طرح بام اوج تک پہنچا دیا ہے جبکہ ہمارے اوپر حادثاتی طور پر مسلط ہونے والے حکمرانوں نے اس ملک سے کیا کیا نچوڑا؟ یہ ایک الگ کہانی ہے۔ ان میں ایک سے ایک بڑھ کر خائن، بددیانت اور مال بٹورو موجود ہے۔ ورنہ پاکستان جیسی نظریاتی ریاست کا یہ حال کبھی نہ ہوتا۔ ہمارے سے نالاں ہیں، تو دوسری طرف حکمران عوام کی بے صبری کا رونا روتے ہیں۔ بچے والدین کی مناسب محبت نہ ملنے پر رنجیدہ ہیں، جبکہ والدین اولاد کی نافرمانیوں سے تنگ آچکے ہیں۔ اگر عورتیں مردوں سے شکایت کرتی نظر آتی ہیں تو مرد بھی عورت کے بے جا اور بے محل مطالبوں کے گلے شکوے کرتے ہوئے اسے مسائل کی جڑ قرار دینے پر تلے ہوئے ہیں۔ غرض ہر ایک ''خود را فضیحت دیگروں را نصیحت'' پر عمل پیرا ہے۔ ہر شخص کو دوسرے پر تنقید کرنے میں لطف محسوس ہوتا ہے۔ بدقسمتی سے اب ایسا لگ رہا ہے کہ ہماری زندگی کا یہ وظیفہ بن چکا کہ ہم دوسروں کو ملامت کرنے میں لگے رہیں اور اپنے آپ کو تمام خرابیوں اور برائیوں سے بری الذمہ قرار دیں۔ اگر ہم دوسروں کی خامیوں، کمزوریوں اور عیبوں پر نظر رکھنے کے بجائے مثبت رویہ اختیار کریں، منفی سوچ سے دستبردار ہو جائیں اور سب سے پہلے اپنی ذات سے اصلاح کا کام شروع کریں تو شاید ہمارے آدھے سے زیادہ مسائل حل ہو جائیں۔

اگر ہم میں سے ہر فرد اپنی ذات کی اصلاح پر توجہ دے، اپنی ذمے داریوں کو صحیح معنوں میں سمجھے اور آنکھیں کھول کر حقائق کا جائزہ لے، تب جا کر بحیثیت قوم ہم ایک پاکیزہ اور باکردار معاشرے کی بنیاد رکھ سکتے اور ایک باوقار قوم بن سکتے ہیں۔ جب ہم میں سے ہر ایک مقدور بھر بہتری کی طرف قدم اٹھائے، اپنے حصے کا کام نیک نیتی اور دیانت داری سے انجام دے اور نتیجہ اللہ تعالیٰ کی مشیّت پر چھوڑ دے اور اپنی مقدور بھر سعی میں رہے، تو وہ وقت دور نہیں کہ ہماری یہ سعی ہمیں کامرانیوں اور کامیابیوں کی طرف لے جائے گی اور ان شاء اللہ تعالیٰ ہم اپنے مستقبل کو اپنے ہاتھوں سے تعمیر ہوتا ہوا دیکھیں گے۔ اب بحیثیت فرد ہمیں خود احتسابی پر زور دینا ہوگا، تب جا کر ہم دنیا میں اپنا کھویا ہوا مقام حاصل کر سکتے ہیں۔ لیکن شرط یہ ہے کہ ہم میں سے ہر ایک کو اپنے حصے کی شمع جلانی ہوگی۔

☆

شہدائے پاکستان جنھوں نے پاکستان کے حصول کے لیے اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کیا، ان میں ہماری پاکیزہ ماؤں، بہنوں اور بچیوں جن کے سروں کو آسمان نے یا پھر ان کے والدین نے ننگے سر نہیں دیکھا تھا ہجرت کرتے ہوئے کئی ایک کو عصمت دری کے ناپاک ہاتھوں نے شہید کر دیا تھا۔ ہمیں سیاست نے یہ بھی دن دکھلائے کہ اقتدار اور شہرت کے لیے سرگرداں حکمران کسی ناگہانی حادثے کا شکار ہو گئے تو ہم نے ان کو بھی شہدا میں شمار کرانا واجب قرار دیا جو فی الواقعہ ایسا نہیں ہے۔ اس کج روی پر خدا کیونکر ہم سے راضی ہو گا؟ اڑسٹھ سالوں سے جاری اس نظام نے جو کچھ ہمیں عطا کیا ہے وہ ایک اذیت ناک باب بن کر رہ گیا ہے۔ ''اس نظام میں ایک گدھ نما گروہ صف آرا موجود رہتا ہے اس گروہ کی معصومیت یہ ہے کہ مردار کھانے میں لاثانی، جیب تراشنے میں یکتا اور بدنیتی میں بلا مقابلہ ہے۔ یہ گروہ ہر دور میں، ہر حکومت میں مراعات یافتہ لاڈلا اور ہمیشہ معزز اور محترم ہوتا ہے۔ ان میں اسمبلیوں کے، وزرا، ایم این ایز، ایم پی ایز، شامل ہیں۔ یہ سرکاری واجبات کی ادائیگی غیر ضروری سمجھتے ہیں اور سرکاری خزانے میں پیسہ جمع کروانے کے قائل بھی نہیں ہوتے۔ ان میں ایسے ایسے اور ایسی ایسی دلربا اور مقتدر شخصیات شامل ہیں جو موروثی جاگیردار، معصوم شکل مگر دلیر اس قدر کہ باہر کے ملکوں کے سیلاب فنڈز کے چیک حکومت کے اکاؤنٹ میں جمع کروانے کے بجائے اپنے ذاتی اکاؤنٹ میں جمع کرا دیتے ہیں۔ کسی نے لاکھوں کے بل دبائے ہوئے ہیں اور کسی نے گیس اور بجلی، کوئی ٹیکس نادہندہ ہے کوئی قرضوں کا، کسی نے سرکاری گاڑیوں سے پرزے اتارنے اور ٹائر بدلنے کو عار نہیں سمجھا چوری چکاری، سینہ زوری اور بددیانتی کی یہ کارروائیاں موٹی کھال کے ان جوان مردوں اور عورتوں کے لیے معمولی اور بے ضرر ہیں بلکہ لوٹ کھسوٹ کو استحقاق سمجھا جاتا ہے حق نمائندگی چوری کا صوابدیدی حق۔'' (کوڑھ کی کاشت ڈاکٹر حقی حق صفحہ نمبر ۲۹) ایسے قبیح حالات میں اقبال کے شاہین کو ڈھونڈنا نہ صرف مشکل بلکہ ناممکن ہے۔ حقائق و شواہد اس بات کے گواہ ہیں کہ جمہوریت کے دعوے داروں نے اب تک عوام کے لیے جو کچرا جمع کیا ہے اس کو آئندہ بننے والی حکومت کس طرح سے اُٹھا پائے گی۔ اقتدار میں رہنے کے لیے پھر انھی کا دست نگر رہنا پڑے گا۔ جن کا ماضی اور حال کبھی قابلِ ستائش نہیں رہا۔ یہ دیکھ کر بڑی حیرانی ہوتی ہے کہ ہمہ وقت مختلف ٹیلی ویژنوں کے چینلوں پر کئی کئی گھنٹے لاحاصل بحث کے لیے تو انھیں وقت میسر ہے مگر یہ شخصیات پارلیمنٹ میں اپنے افکار کو عیاں کرنا، مناسب نہیں سمجھتیں ہاں اگر کہیں لوٹ سیل ہو تو ان کا گٹھ جوڑ بڑا دیدنی ہوتا ہے مگر ملک میں بڑھتے ہوئے انتشار (anarchy) کا سبب اور حقیقت جاننے کے لیے ان کے پاس وقت نہیں، اب تو ہر روز کراچی میں لاشوں پر نوحہ خوانی کرنے والے خود اپنی جانوں کی امان کے لیے پناہ گاہیں ڈھونڈ رہے ہیں۔ ملک سے آئے دن سرمایہ کاروں کے فرار کے متعلق کبھی ان کا موضوع سخن ہی نہیں رہا۔ ایک بات مسلمہ حقیقت ہے کہ اس طرز جمہوریت نے جس طرح حکمرانوں کو نوازا ہے اگر مغل شہزادے ان کو دیکھ پاتے تو پکار اٹھتے کہ وہ شہزادے ہونے کے بجائے کوئی وزیر، سینیٹر یا پھر ایم این اے ہی ہوتے۔ جس وزیر کے پاس پہلے ایک گاڑی تھی اب زیادہ ہو گئیں ہیں۔ مہمان خانے، خفیہ سودے طے کرنے اور متعلقہ محکموں کو ہدایت دینے کے لیے بہت سی آماجگاہیں ہمہ وقت میسر ہیں۔ ان تمام حقائق کی چشم پوشی کے باوجود بھی وطن سے زیادہ انھیں اقتدار میں رہنے کی آرزو چین نہیں لینے دیتی۔ ملک میں بڑھتی ہوئی فرسٹریشن، بے زاری اور ناامیدی کہیں بڑے طوفان کا پیش خیمہ نہ بن جائے کیونکہ حقائق اور نظریاتی اساس میں دن بدن بڑھتا ہوا شگاف مزید بڑھتا ہی جا رہا ہے۔ اس کو پُر کرنے کے لیے مستقبل میں حکمرانوں پر تکیہ کرنے کے بجائے اب عوام کو بھی صحیح فیصلہ کرنا ہو گا۔



ناکامی کا خوف کیوں؟

زندگی میں گھبرائیں نہیں کامیابی کا راستہ ناکامی سے ہو کر گزرتا ہے

غزالہ عزیز

کراچی کی شاہراہِ فیصل ایک ایسی شاہراہ ہے جس میں مشکل ہی سے کوئی سگنل ملتا ہے۔ گورنر ہاؤس سے ائیرپورٹ تک گاڑیاں تیزی سے سفر کرتی ہیں۔ لیکن کچھ ایسے بھی جیالے ہوتے ہیں جو ایسی چلتی ہوئی سڑک پر ایف ٹی سی ٹاور والے موڑ پر الٹی سمت سے شاہراہ فیصل ہو آنے کی کوششیں کرتے ہیں پھر اسی موڑ پر نہیں اور مقامات پر بھی الٹی سمت سے اپنی سواری لیے چلے آتے ہیں۔ یوں اپنی اور دوسروں کی زندگی داؤ پر لگاتے ہیں۔

شام کو آفس سے گھر واپسی کی ہر ایک کو جلدی ہوتی ہے۔ ایک دوڑ لگی ہوتی ہے۔ موقع دیکھ کر سرخ بتی پر بھی نکل جانے والوں کی کمی نہیں..... بہت جلد بازی میں ہوتے ہیں..... آخر کس بات کی جلدی ہوتی ہے؟

گھر پہنچنے کی یا آسمانوں کی سیر کی؟..... یا اپنے مقصد میں ناکامی کا خوف ہوتا ہے..... وہ مقصد کبھی کبھی صرف اتنا ہوتا ہے کہ فلاں وقت سے پہلے فلاں مقام پر پہنچنا ہے! ناکامی کے لفظ کے ساتھ ہی امتحان کا تصور آتا ہے..... لوگ ڈر جاتے ہیں..... یہ لفظ ہے ہی بڑا دہشت پھیلانے والا..... لیکن یہ کیا کہ امتحان میں کامیابی کوئی مسئلہ ہی نہیں۔ بس جیب میں مال ہونا چاہیے پھر کیا ہے پیسہ دیجیے اور دل بھر کر نقل کیجیے۔ لیکن کیا ایسی شارٹ کٹ کامیابی آپ کی قابلیت میں اضافہ کرتی ہے؟ روزی اور رزق میں اضافہ بھی اس میں اضافے کا مرہون منت نہیں۔ بحیثیت مسلمان ہمارا تو یقین ہی یہ ہے کہ اللہ کی مرضی اور منشا کے بغیر کچھ حاصل نہیں ہوسکتا۔ پھر ہم ایسی فضول کامیابی کے حصول کے لیے الٹی سیدھی کوششیں کیوں کرتے رہتے ہیں۔ اس سے ہزار درجہ اچھی ناکامی ہے۔

ہم نے شاید کبھی خواب میں بھی یہ نہ سوچا ہوگا کہ ”ناکامی بھی اچھی ہوسکتی ہے۔“ خاص طور پر ایسی کامیابی کے مقابلے میں جس کی پشت پر جعل سازی اور بددیانتی ہو۔ ہماری دنیا مقابلے کی دنیا ہے۔ جہاں کامیابی کی تعریف میں بہت کچھ کہا جاتا ہے۔ لیکن یہ سمجھنا دشوار ہوتا ہے کہ ناکامی کو تسلیم کرنا، زندگی کے ہر شعبے میں اصل میں آپ کو بڑی کامیابی سے ہمکنار کرسکتا ہے۔ آپ کی تخلیقی صلاحیتوں کو جلا بخش سکتا ہے۔ آپ کو کامیابی کے زینے پر اس مقام تک پہنچا سکتا ہے جس کا آپ نے کبھی خواب دیکھا ہو۔

لندن کے مشہور اسکول و مبلڈن ہائی اسکول کی ہیڈ مسٹریس ”ہیر دہانبری“ کہتی ہیں کہ ”ہم سب ناکامی کے

خوف کی وجہ سے اپنے دوستوں کے سامنے اپنی غلطی تسلیم نہیں کرتے اور جوں جوں ہم بڑے ہوتے جاتے ہیں ہمارے اندر ناکامی کا خوف مزید پختہ ہوتا جاتا ہے۔

ناکامی کا خوف کوئی پیدائشی خوف نہیں ہوتا۔ نہ ہی یہ ہماری جبلّت کا حصہ ہے۔ یہ خوف ہم خود پیدا کرتے ہیں۔ وقت اور عمر کے ساتھ ساتھ یہ بڑھتا چلا جاتا ہے۔ بہت چھوٹے بچوں میں ناکامی کا خوف بالکل نہیں ہوتا۔ اس لیے وہ نئی نئی چیزیں کرتے رہنے کی کوششیں کرتے رہتے ہیں اور تیزی سے سیکھتے ہیں۔

ناکامی کا خوف ایک بڑا غلط اثر یہ ڈالتا ہے کہ ہم ہر قیمت پر کامیابی حاصل کرنے کی کوششیں کرتے ہیں۔ یہ وہ کامیابی ہوتی ہے جو ہرگز کامیابی کہلانے کی حق دار نہیں ہوتی۔ ناکامی کا خوف منفی اثرات اس طرح ڈالتا ہے کہ پھر ہم زندگی میں کوئی بھی نیا کام کرنے سے منہ موڑ لیتے ہیں۔ کوئی خطرہ مول لینے سے گھبراتے ہیں۔ جس کا لازمی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ہم زندگی کے کئی اہم نئے مواقع چھوڑ دیتے ہیں۔

بعض دفعہ ناکامی کا اعتراف نہ کرنا بڑا مہنگا پڑ جاتا ہے جیسا کہ آئرلینڈ سے تعلق رکھنے والے ''فلن اوبرائن'' کو مہنگا پڑا۔ فلن اوبرائن نے ۱۹۴۰ء میں اپنی دوسری کتاب کا مسودہ لندن کے ایک ناشر کو دکھایا۔ ناشر نے اسے مسترد کر دیا۔ لیکن فلن نے اپنی اس ناکامی کا اعتراف کرنے کے بجائے اپنے دوستوں سے یہ کہا کہ ''مسودہ اس کی گاڑی میں پڑا تھا اور ایک دن کہیں جاتے ہوئے وہ مسودہ تیز ہواؤں کے باعث گاڑی سے اڑ گیا۔''

فلن کو یہ جھوٹ بڑا مہنگا پڑا۔ کیونکہ اس کی موت کے بعد یہ مل گیا جو اس کی موت تک اس کے بستر کے قریب میز پر ہی پڑا رہا تھا۔

فلن کی بیوی نے اسے ایک ناشر کو دکھایا، تو اس نے اسے بلا تامل شائع کر دیا اور اب آج اس کتاب کا شمار فلن کی بہترین کتابوں میں ہوتا ہے۔ افسوس اپنے خوف کے باعث فلن اپنی زندگی میں اس کامیابی کو نہ دیکھ سکا۔

بعد میں فلن کی اس کہانی کو ڈبلن کے ٹرنٹی کالج نے اپنی نمائش کے لیے منتخب کیا ''ناکام ہونا اچھا ہے'' اس نمائش کا مقصد زندگی میں ناکامی کے بارے میں بحث کی حوصلہ افزائی کرنا ہے۔ ساتھ ہی یہ بات سمجھانا کہ ناکامی تسلیم کرنا کامیابی کے زینے پر ایک قدم اوپر رکھنے کے مترادف ہے۔

اس کے ساتھ ہی یہ بات بھی اہم ہے کہ ناکام ہونے کا صحیح طریقہ کیا ہے؟

یعنی زندگی میں خطرے کا سامنا کیسے کرتے ہیں؟ اور ناکامی سے کیسے سبق سیکھا جا سکتا ہے؟ اور مقابلے پر آخری نمبر میں آ کر بھی خوش رہا جا سکتا ہے۔ جیسے ''وینسیا سوچا'' اولمپک مقابلے میں آخری نمبر پر آئیں، لیکن خوش تھیں کہ انھوں نے مقابلے میں حصہ تو لیا۔ اسی سوچ کے تحت برطانیہ میں لڑکیوں کے ایک معروف اسکول نے ''ناکامی کا ہفتہ'' منایا۔ اس اسکول کی ہیڈ مسٹریس کا یہ کہنا ہے کہ ''وہ یہ دکھانا چاہتی ہیں کہ زندگی میں بعض دفعہ کامیاب نہ ہونا بالکل نارمل اور قابل قبول بات ہے۔''

اس اسکول کی طالبات برطانیہ میں نمایاں ترین پوزیشن حاصل کرتی رہی ہیں۔ لیکن ناکامی کا ہفتہ منانے کے دوران اب طالبات نے اپنی ناکامیوں کے بارے میں غور کیا۔ اس دوران ہونے والے پروگراموں میں والدین، اساتذہ کے علاوہ مشہور اور کامیاب افراد نے بھی حصہ لیا اور اپنی اپنی ناکامیوں کی داستانیں سنائیں۔ طالبات کے درمیان اس بات پر بحث و مباحثہ بھی کرایا گیا کہ ناکامی کے کیا فائدے ہوتے ہیں اور یہ کہ ناکامی سے بچنے کے لیے بے تحاشا کوششیں کرنے کے منفی پہلو کیا ہوتے ہیں؟

عام لوگوں کے لیے تو اس میں سیکھنے کے لیے بہت کچھ ہے لیکن کیا ہی اچھا ہو کہ سول سوسائٹی کی طرف سے کی جانے والی ان کوششوں سے کچھ سبق حکومتیں بھی حاصل کر لیں۔



علم کا سورج

مسلم ممالک نے ہتھیاروں کی دوڑ میں اُلجھ کر علم و تحقیق کے سورج کو گرہن لگا دیا ہے

راؤ منظر حیات

جس کرہ ارض پر تمام لوگ سانس لے رہے ہیں، یہ درحقیقت سائنسی ایجادات اور نئے تجربات کی دنیا ہے۔ اس مرکزی نکتہ کو سمجھے بغیر کوئی قوم کچھ نہیں کر سکتی۔ کچھ بھی نہیں۔ مغرب یہ سب کچھ دل و جان سے سمجھ چکا ہے اور ان کی بے مثال ترقی علم کی بدلتی ہوئی ہیئت پر عبور پانے کی بدولت ممکن ہوئی ہے۔ مذہب، عقیدہ اور ذاتی ترجیحات مغرب کی عملی دنیا میں اس اہمیت کے حامل نہیں، جس نہج پر ترقی پذیر ممالک میں موجود ہیں۔ علم اور سائنس کی دنیا بنیادی طور پر نفی اور اس کے بعد منطقی طریقے سے سوچنے کی بدولت وجود میں آئی ہے۔ ضروری ہے کہ دیکھا جائے کہ چار دہائیوں میں سائنس کی دنیا میں کیا کیا حیرت انگیز تبدیلیاں آئیں ہیں اور مسلم ممالک کا ان میں کیا کردار رہا ہے۔ یہ بھی اپنی جگہ ایک مکمّل سوال ہے کہ مسلمان ملکوں کو ان ایجادات کا فکری ادراک ہے بھی یا نہیں۔ مجھے ایسے لگتا ہے کہ ایک ارب سے زائد مسلمانوں کو جدید تبدیلی کا کوئی شعور نہیں ہے۔ صرف ۲۰۱۵ء کے بارہ مہینوں کا جائزہ میرے نقطہ نظر کو تصدیق کی مہر لگائے گا۔

۱۹۸۹ء میں چیکوسلواکیہ کی کمیونسٹ حکومت ختم ہو گئی۔ اس کی جگہ کئی نئے جغرافیائی ممالک نے جنم لیا۔ بہت کم لوگوں کو اندازہ ہو گا کہ تمام ممالک جو کمیونزم کے تحت زندگی گزار رہے تھے اور ہیں، ان میں کسی کو بھی فکری جدت کا اختیار نہیں ہے۔ مگر سٹیفن کلین (Stefan Klein) ایک عجیب سی سوچ رکھنے والا شخص تھا۔ اس کو شوق تھا کہ نئی نئی ایجادات کے متعلّق ہر وقت سوچتا رہے۔ وسائل کی شدید کمی کے باوجود وہ مسلسل فکر کی بھٹّی میں جلتا رہا۔ بیس برس پہلے سٹیفن نے لوگوں کو کہا کہ وہ ایک ایسی گاڑی بنانا چاہتا ہے جو سڑکوں پر بھی چلتی رہے اور اس کے بالکل ساتھ فضا میں بھی اڑنے کی صلاحیت رکھتی ہو۔ اسے انتہائی بے وقوف اور پاگل آدمی گردانا گیا۔ اس کے تمام دوستوں کا خیال تھا کہ وہ دیوانوں جیسی باتیں کر رہا ہے۔ مگر سٹیفن ہرگز ہرگز دیوانہ نہیں تھا۔ مسلسل گیارہ برس ایک ایسی کار

کا نقشہ بناتا رہا جو قوتِ پرواز رکھتی ہو۔ ۲۰۱۰ء میں اس کی ملاقات جوراج ویکولک (Juraj Vaculik) سے ہوئی۔ جوراج ایک امیر شخص تھا۔ وہ بھانپ گیا کہ سٹیفن جو بات کہہ رہا ہے، وہ نہ صرف قابل عمل ہے بلکہ اس کے بعد دنیا حیرت انگیز طور پر تبدیل ہو جائے گی۔ مطلب یہ بھی تھا کہ کھربوں ڈالر کی ایویشن انڈسٹری بے معنی ہو کر رہ جائے گی۔ ائیر پورٹ اور بیش قیمت ہوائی جہازوں کی گنجائش ہی ختم ہو جائے گی۔ دونوں نے مل کر تندہی سے وہ کام کرنا شروع کر دیا جو آج سے پہلے کسی نے نہیں سوچا تھا۔ سٹیفن اور جوراج نے مل کر ایک کمپنی تشکیل دے دی جس کا نام ایرو موبل (Aeromobil) رکھا گیا۔ سالہا سال کی محنت کے بعد ۲۰۱۵ء میں دونوں حضرات نے ایک ایسی گاڑی بنا دی جو آپ عام زندگی میں استعمال کر سکتے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ آپ چھوٹے سے میدان سے اڑ کر گاڑی کو ہوائی جہاز بنا کر سفر بھی کر سکتے ہیں۔ مسافر نے کسی قسم کا کوئی کام نہیں کرنا۔ جہاز کے پَر ایک بٹن سے باہر کی طرف آ جاتے ہیں اور پھر بالکل اسی ترتیب سے بند ہو جاتے ہیں۔ آج سے تین ماہ پہلے دونوں نے اپنی حیرت انگیز ایجاد کو لوگوں کے سامنے پیش کر دیا۔ مظاہرہ سینکڑوں لوگوں کے سامنے کیا گیا۔ ایک سبزہ زار میدان میں سٹیفن اپنی کار میں آیا۔ تھوڑی دیر کے بعد گاڑی نے فضا میں اڑنا شروع کر دیا۔ پہلی پرواز میں بارہ میل کا ایک چکر لگایا اور فضا میں ۸۰۰ میٹر کی بلندی پر پرواز کرتا رہا۔ چند منٹ کے بعد آرام سے اسی میدان میں اتر گیا جہاں سے پرواز کا آغاز کیا تھا۔ جہازوں کی کمپنیوں کے تمام نمائندے اس نمائشی پرواز کو دیکھ کر دنگ رہ گئے۔ اکتوبر ۲۰۱۵ء سے اب تک یہ کار چالیس اڑانیں پوری کر چکی ہے۔ اب یورپین یونین میں یہ بحث ہو رہی ہے کہ اس جدید کار کو کسی طرح مزید محفوظ بنایا جائے اور اس کے بعد عام خریداروں کے لیے پیش کر دیا جائے۔ سائنس کی دنیا سے منسلک لوگوں کا خیال ہے کہ بیس سے چالیس سال کے عرصہ میں یہ گاڑی زندگی کو بدل کر رکھ دے گی۔ ہر شخص اس کو خرید کر عام گاڑی کی طرح چلا سکے گا۔ اس کی قیمت بھی عام سی گاڑیوں کی طرح ہو گی۔ اب آپ اپنے ارد گرد دیکھیے۔ آپ کو ہر طرح کی سیاسی اور عامیانہ خبروں کے انبار مل جائیں گے۔ پر اس محیر العقول ایجاد پر گفتگو آپ نے کسی مقامی اخبار یا چینل پر نہیں سنی ہو گی۔ ہمیں یہ تو پتا ہو گا کہ برصغیر میں بہترین رقاصہ کون ہے۔ نئی فلم کون سی آئی ہے۔ ساس اور بہو کی لڑائی پر ٹی وی پر کون سا ڈراما چل رہا ہے۔ مگر ہم اپنے پورے معاشرے میں کسی نئی تحقیق کی بازگشت سننے سے محروم رہیں گے۔

کاترزینا ساویکا (Katarzyna Sawika) کا تعلق سٹونی بروک یونیورسٹی (Stony Brook University) سے ہے۔ بنیادی طور پر بائیومیڈیکل (Biomedical) انجینئرنگ کے شعبہ سے تعلق رکھتی ہیں۔ کاترزینا اسی یونیورسٹی کی طالب علم رہی ہیں اور انھوں نے ڈاکٹریٹ کی ڈگری بھی اسی ادارہ سے حاصل کی ہے۔ اس سائنس دان نے محسوس کیا کہ انجکشن لگانے کا طریقہ کار اس قدر پیچیدہ اور مشکل ہے کہ اکثر اوقات مریضوں کو اس کا فائدہ نہیں ہوتا۔ کاترزینا کا سوال دراصل یہ تھا کہ انجکشن میں استعمال ہونے والی دوائی کو اکثر اوقات آمدورفت کے دوران اس درجہ حرارت میں نہیں رکھا جاتا جس کی اسے ضرورت ہوتی ہے۔ خاتون نے یہ دشواری امریکا میں محسوس کی۔ ہمارے جیسے ممالک میں تو یہ بحث بے معنی ہے۔ ہمارے ملک میں دوائیوں کو خاص درجہ حرارت پر محفوظ رکھنا تقریباً ناممکن ہے۔ اچھے میڈیکل اسٹوروں پر ایک فریج پڑا ہوتا ہے جس میں تمام دوائیوں کو نمائشی طور پر محفوظ رکھا جاتا ہے۔ کسی کے علم میں یہ نہیں کہ ہر دوائی کو مختلف درجہ حرارت کی ضرورت ہے۔ اگر مخصوص درجہ حرارت کے بغیر چند لمحے بھی پڑی رہے تو دوائی انسان کے لیے زہر بن جاتی ہے۔ مگر ہم جہالت کی اس سطح پر ہیں جہاں یہ سوال اٹھانا اور جواب پانا مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن ہے۔ مگر کاترزینا کے ذہن میں یہ سوال بھی تھا اور اس کا

جواب بھی۔ اس سائنس دان نے دس برس کی تحقیق کے بعد انسان کے بدن کو دوائی کی فوری فراہمی کا ایک ایسا طریقہ ایجاد کر لیا جس میں انجکشن کی ضرورت نہیں تھی۔ اس نے ایک پیچ (Patch) بنایا جس میں دوائی کو سمو دیا گیا۔ مریض کو کسی تکلیف کے بغیر وہ پیچ بازو پر لگا دیتی ہے اور چند منٹوں میں دوائی دوران خون میں شامل ہو جاتی ہے۔ اس کا نام "Immuno Matrix" رکھا گیا۔ کاترزینا کو یہ بھی علم تھا کہ انجکشن لگانے کے لیے سرنج کی ضرورت بھی ہوتی ہے اور اس کے ساتھ ساتھ ایک سوئی کی بھی، جو انسانی بدن میں دوائی کو داخل کر سکے۔ اس کے ذہن میں ہمارے جیسے ممالک کے معروضی حالات بھی تھے۔ جہاں کروڑوں لوگ استعمال شدہ سرنج اور سویوں کی بدولت مہلک بیماریوں کا شکار ہو جاتے ہیں۔ اس خاتون کی جدید ایجاد سے یہ تمام جھنجھٹ ہی ختم ہو چکا ہے۔ نہ سرنج کی ضرورت، نہ دوائی کو محفوظ رکھنے کی تگ ودو۔ آپ کسی بھی شخص کے بدن پر پیچ لگائیے۔ دوائی کسی تکلیف اور درد کے بغیر اس کے خون میں شامل ہو جائے گی۔ ساویکا کی ایجاد نے طبعی ماہرین کو حیران کر ڈالا ہے۔ اس جدید تحقیق سے جو انقلاب آئے گا، اس کے متعلق سوچا بھی نہیں جا سکتا۔

میرے سامنے ۲۰۱۵ء کے بارہ مہینوں کی سائنسی ایجادات کی ایک فہرست موجود ہے۔ اس میں پچیس ایسی انقلابی ایجادات ہیں جو انسان کی زندگی کو مکمّل طور پر تبدیل کرنے کی طاقت رکھتی ہیں۔ مگر میرا مقصد ان ایجادات کے متعلق معلومات فراہم کرنا ہرگز ہرگز نہیں ہے۔ میرے لیے سب سے حیرت انگیز بلکہ افسوس ناک امر یہ ہے کہ ۲۰۱۵ء کی تمام ایجادات میں کسی مسلم ملک کا کوئی عمل دخل نہیں ہے۔ ایک ارب سے زیادہ مسلمانوں میں سے ایک شخص بھی ایسا نہیں ہے جس نے گزشتہ بارہ ماہ میں دنیا کو کسی جدید سائنسی تحقیق سے نوازا ہو۔ میں تسلیم ہی نہیں کرتا کہ وسائل کی کمی اس پسماندگی کی اصل وجہ ہے۔ برونائی دنیا کے امیر ترین ممالک میں سرفہرست ہے۔ پورا مشرق وسطیٰ تیل کی دولت سے لبریز ہے۔ ان کے شخصی اور حکومتی خزانوں میں اربوں ڈالر پڑے پڑے گل رہے ہیں۔ ان کے بادشاہ، سلاطین اور مقتدر لوگوں نے آج کے زمانے میں بھی خواتین کے حرم قائم کر رکھے ہیں۔ اپنے ہوائی جہازوں میں شاندار بیڈروم اور باتھ روم بنوائے ہوئے ہیں۔ مگر صاحبان! ان میں سے ایک بھی شخص جدید دنیا کے علوم سے بہرہ ور نہیں۔ کسی مسلمان حکمران نے یہ اعلان نہیں کیا کہ اگر ان کا کوئی بھی سائنس دان تحقیق کرنا چاہے گا، تو حکومت اس کے ساتھ شانہ بشانہ کھڑی ہوگی۔ یہ تمام ممالک شدید عدم تحفّظ اور ذہنی پسماندگی کا شکار ہیں۔ ان کے خزانہ کی اکثریت رقم مغرب سے جدید ہتھیار خریدنے پر صرف ہوتی ہے۔ ہتھیار بھی مغربی دنیا کی فیکٹریوں میں بنتے ہیں۔ ان سے مغربی ممالک مزید خوشحال ہو جاتے ہیں اور خریدار ملک مالیاتی وسائل کو لٹا کر مزید عدم تحفّظ کا شکار ہو جاتے ہیں۔

ذرا سوچیے۔ مسلمان دنیا کی موجودہ پہچان کیا ہے۔ طالبان، القاعدہ اور داعش! اکیسویں صدی میں ہماری مجموعی فکر کس سفر پر گامزن ہے۔ اب ہم شیعہ اور سنی عقیدے کی اختلافی اور خونی سڑک پر دوڑ رہے ہیں۔ مسلم ممالک مہلک ترین ہتھیاروں سے لیس ہیں۔ وہ ایک دوسرے کو برباد کرنے کی استطاعت کے حامل ہیں۔ مگر یہ تمام ممالک مل کر بھی ایک ایسا سائنس دان پیدا نہیں کر پائے جو دنیا کو کسی نئی تحقیق سے آراستہ کرے۔ یہ جنگ کے لیے اتحاد قائم کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے ہیں۔ مگر یہ تمام ممالک مل کر ایک سائنسی اتحاد نہیں بنا سکتے جس سے ہم علم کی دنیا میں پہلا قدم رکھ سکیں۔ فرقہ پرستی، اندھی تقلید، جہالت، انتہا پسندی اور اجتہاد کی غیر موجودگی کے گمبھیر عناصر علم اور سائنس کے سورج کو گرہن لگا چکے ہیں۔ مسلم ممالک میں علمی شمس مکمّل طور پر غروب ہو چکا۔ یہ کیسے اور کیونکر طلوع ہوگا، کچھ نہیں کہا جا سکتا۔

(بہ شکریہ روزنامہ ایکسپریس)

بھارتی کرکٹ ٹیم میں کھیلنے والے مسلمان کھلاڑی

بھارت ہر شعبے میں مسلمانوں کے بل بوتے فتح کے جھنڈے لہراتا رہا ہے

عبدالوحید مزاج

ہمارا ازلی دشمن بھارت مسلمانوں کے جتنا بھی خلاف رہے اور اُنھیں اپنے قدموں تلے روندنے کی خواہش پالتا رہے مگر اس حقیقت سے منکر نہیں ہو سکتا کہ ضرورت پڑنے پر مسلمانوں ہی کی بدولت اکثر وہ اپنے سر پر فتح کا تاج سجاتا رہا ہے۔ چاہے وہ مسلمان اداکار ہوں یا کھیل کے میدان کے ہیرو۔ ایسے بہت سے مسلمان کرکٹرز ہیں جنھوں نے بھارتی ٹیم کی نمائندگی کرتے ہوئے اس کی کامیابیوں میں اہم کردار ادا کیا۔ ان کھلاڑیوں میں سب سے پہلے ذکر آتا ہے محمد نثار کا جنھوں نے ۱۹۳۲ء میں بھارتی ٹیم میں شمولیت حاصل کی۔ ۸ جنوری ۱۹۱۰ء کو ہوشیار پور پنجاب پاکستان میں پیدا ہونے والے برق رفتار اور بڑے اچھے بلے باز ماضی میں سب سے زیادہ وکٹیں حاصل کرنے والے بالر تھے۔ سید نذیر علی اور سید وزیر علی ان دونوں بھائیوں نے ۱۹۳۲ء میں بھارتی ٹیم کی نمائندگی کی اور ۷ ٹیسٹ میچ کھیلے۔ وزیر علی ۱۹۰۳ء میں اور نذیر علی ۱۹۰۶ء میں جالندھر میں پیدا ہوئے۔ محمد جہانگیر خان نہ صرف منجھے ہوئے بالر تھے بلکہ ایک زبردست بلے باز بھی تھے۔ انھوں نے ۱۹۳۲ء ہی میں انگلینڈ کے خلاف ۴ وکٹیں حاصل کیں اور ۳۲ رنز کی شاندار اننگ کھیلی۔

بھارتی ٹیم کے ایک اور مسلمان کھلاڑی دلاور حسین نے اپنا پہلا ٹیسٹ ۳۴-۱۹۳۳ء میں کلکتہ میں کھیلا۔ ۳ نصف سنچریوں کی مدد سے ۲۵۴ رنز بنانے والے دلاور حسین پُراعتماد بلے باز اور پُھرتیلے وکٹ کیپر بھی تھے۔ تاہم تقسیم کے بعد وہ پاکستان آ گئے۔ سید مشتاق علی کا شمار بہترین کھلاڑیوں میں ہوتا تھا۔ انھوں نے ۱۹۳۴ء میں انگلینڈ کے خلاف ٹیسٹ کیرئیر کا آغاز کیا اور ۶۱۲ رنز بنائے۔ اسی طرح بھارتی ٹیم کا حصہ بننے والے جمشید ایرانی بھی مسلمان کرکٹر تھے۔ جنھوں نے بطور وکٹ کیپر ٹیم میں شمولیت اختیار کی تاہم وہ صرف ایک ہی ٹیسٹ کھیل سکے۔

بھارتی کرکٹ ٹیم کے مشہور و معروف کھلاڑی افتخار علی خان پٹوڈی کا شمار بھارتی لیجنڈز میں ہوتا ہے۔ وہ ۱۶ مارچ ۱۹۱۰ء کو پنجاب میں پیدا ہوئے اور شاندار کارکردگی دکھانے کے عوض بھارتی ٹیم کی قیادت کے فرائض بھی سرانجام دیے اور اس طرح انھوں نے بھارتی کرکٹ ٹیم کے پہلے مسلمان کپتان بننے کا اعزاز حاصل کیا۔ اسی طرح ایک اور مسلمان کھلاڑی غلام احمد حسن بھی ہیں جو ۴ جولائی ۱۹۲۲ء کو حیدرآباد میں پیدا ہوئے۔ آف اسپنر کی حیثیت سے کیرئیر کا آغاز کرنے والے غلام احمد حسن کو بھی ۴۹-۱۹۴۸ء میں بھارت کی ٹیسٹ کرکٹ ٹیم کے کپتان بننے کا اعزاز حاصل ہے۔

بھارتی کرکٹ ٹیم کا حصہ بننے والے ایک اور مسلمان کرکٹر غلام احمد پارکر نے ۱۹۸۲ء سے ۱۹۸۴ء تک صرف ایک ٹیسٹ اور ۱۰ ون ڈے میچز کھیلے جبکہ سلیم درانی کا شمار چھکے لگانے والے بلے بازوں میں ہوتا تھا۔ وہ ۱۱ دسمبر ۱۹۳۴ء کو کابل میں پیدا ہوئے اور ۲۹ ٹیسٹ میچوں میں ۱۲۰۲ رنز بنائے اور ۷۵ وکٹیں حاصل کیں۔ وہ



بہترین بلے باز اور بہترین اسپنر تھے۔ عباس علی بیگ ۱۰ مارچ ۱۹۳۹ء کو حیدر آباد میں پیدا ہوئے انھوں نے ۱۰ ٹیسٹ میچ کھیلے اور انگلینڈ کے خلاف ۱۹۵۹ء میں اپنے کیریئر کا آغاز کیا۔

منصور علی خان پٹوڈی ۵ جنوری ۱۹۴۱ء کو بھوپال میں پیدا ہوئے اور اپنے والد سابق ٹیسٹ کرکٹر افتخار علی خان پٹوڈی کی طرح مسلمان کپتان ہونے کا اعزاز بھی اپنے نام کیا۔ ۴۶ ٹیسٹ میچوں میں ۲۷۹۳ رنز بنانے والے کھلاڑی نے ۱۹۶۱ء میں کرکٹ کی شروعات کی، ایک کار حادثہ میں ان کی ایک آنکھ ضائع ہوگئی۔ تاہم ۱۹۷۴ء میں دوبارہ انھوں نے ایک آنکھ ضائع ہونے کے باوجود کرکٹ کھیلی ان کی قیادت میں بھارت نے ۹ ٹیسٹ میچز جیتے۔ سید عابد علی ۹/اکتوبر ۱۹۴۱ء کو پیدا ہوئے اور ۱۹۶۷ء میں آسٹریلیا کے خلاف اپنے کیریئر کا آغاز کیا۔ اگر وکٹ کیپرز کی بات کی جائے تو سید مجتبیٰ حسین کرمانی کا شمار بھارت کے ممتاز وکٹ کیپرز میں ہوتا ہے۔ وہ ۲۹ دسمبر ۱۹۴۹ء کو پیدا ہوئے اور ۸۸ میچز میں نمائندگی کی۔ ایک لمبے عرصے تک بطور وکٹ کیپر خدمات سر انجام دینے والے کرمانی ۱۹۸۳ء ورلڈ کپ فاتح ٹیم کا بھی حصہ تھے۔ محمد اظہر الدین ۸/فروری ۱۹۶۳ء کو حیدر آباد میں پیدا ہوئے اور ۸۴-۱۹۸۵ء میں اپنے پہلے تینوں ٹیسٹ میچوں میں متواتر سنچریاں بنا کر ورلڈ ریکارڈ قائم کیا جو ابھی تک قائم ہے۔ ۱۹۹۰ء میں انھیں کپتان بننے کا اعزاز حاصل ہوا اور ۱۴ ٹیسٹ میچوں میں کامیابی سمیٹی۔ ۲۰۰۰ء میں جنوبی افریقا کے کپتان ہنسی کورنیے نے ان پر میچ فکسنگ کا الزام لگایا جس کی بنا پر بی سی سی آئی نے محمد اظہر الدین پر تاحیات کرکٹ کھیلنے پر پابندی لگادی۔

بھارت کرکٹ ٹیم کے ایک مسلمان کھلاڑی رشید غلام محمد پٹیل ہیں جو یکم جون ۱۹۶۴ء میں گجرات میں پیدا ہوئے۔ وہ بائیں ہاتھ کے فاسٹ بالر ہونے کے ساتھ ساتھ ایک ذمہ دار کرکٹر تھے۔ انھوں نے ۸۸-۱۹۸۹ء میں نیوزی لینڈ کے خلاف اپنا پہلا ٹیسٹ میچ کھیلا۔ ۲/اگست ۱۹۵۸ء کو حیدر آباد میں جنم لینے والے ارشد ایوب نے ۱۹۸۷ء اور ۱۹۹۰ء کے دوران ۱۳ ٹیسٹ اور ۳۲ ون ڈے میچز کھیلے وہ ایک عمدہ اسپنر اور بہترین بلے باز تھے لیکن وہ زیادہ دیر تک ٹیم میں نہ ٹک سکے۔

سید کرمانی کے بعد دوسرے مسلمان وکٹ کیپر سید صباء کریم ۱۴/نومبر ۱۹۶۷ء کو پٹنہ میں پیدا ہوئے۔ وکٹ کیپنگ کے ساتھ ساتھ اچھی بیٹنگ بھی کرتے تھے۔ انھوں نے اپنا پہلا ٹیسٹ ۱۹۹۹ء میں بنگلہ دیش کے خلاف کھیلا۔ وسیم جعفر کی صورت میں بھارتی ٹیم کو ایک اور مسلمان کھلاڑی ۲۰۰۰ء کو ملا جو ۰۵-۲۰۰۶ء تک کھیلے۔ وسیم جعفر ۱۶ فروری ۱۹۷۸ء کو پیدا ہوئے تھے۔ اسی طرح محمد کیف یکم دسمبر ۱۹۸۰ء میں آلہ آباد میں پیدا ہوئے۔ جنھوں نے ۲۰۰۰ء میں اپنا پہلا انٹرنیشنل کرکٹ میچ بنگلور میں کھیلا۔ انھوں نے ورلڈ کپ اور چیمپئن ٹرافی کے علاوہ ٹیسٹ میچز میں بھی شاندار کارکردگی پیش کی لیکن شومئی قسمت کہ وہ طویل عرصہ تک بھارتی ٹیم کی نمائندگی سے قاصر رہے۔

جبکہ موجودہ دور کی بات کی جائے تو ظہیر خان کا کھیل بھی بہت عمدہ ہے۔ تاہم وہ ٹیم میں کبھی اِن کبھی آؤٹ ہوتے ہیں۔ انہی کے ساتھ یوسف پٹھان اور عرفان پٹھان یہ دونوں مسلمان بھائی بھی بھارتی ٹیم کا حصہ بنتے رہتے ہیں۔ دونوں بھائی ایک سے بڑھ کر ایک ہیں۔ ایسے ہی بہترین کھلاڑیوں کی صف میں محمد مناف پٹیل بھی شامل ہیں جو بہترین کھلاڑی ہیں جبکہ مستقبل قریب میں ۲۴ سالہ کشمیری کرکٹر پرویز رسول بھی بھارتی ٹیم کے لیے پر تول رہے ہیں۔ آف اسپن بالر اور بہترین بلے باز جموں کشمیر کے نوجوان کھلاڑی پرویز رسول میں بے پناہ صلاحیت ہے حالانکہ پرویز رسول عابد منجا کے بعد دوسرے کشمیری کھلاڑی ہیں جنھیں بھارت اے کی نمائندگی کا اعزاز ملا۔ ان کے علاوہ بعض ایسے بھی کھلاڑی گزرے ہیں جنھوں نے ابتدا میں بھارت کی نمائندگی کی اور تقسیم کے بعد پاکستان چلے گئے اور وہاں کی ٹیم میں شامل ہوگئے۔ ان میں امیر الٰہی، عبدالحفیظ کاردار اور گل محمد شامل ہیں۔ جنھوں نے بھارتی ٹیم میں بھی کھیلنے کا اعزاز حاصل کیا۔

قابل افسوس امر ہے کہ مسلمانوں کی خوبیوں اور اہمیت سے انکاری بھارت، ہر شعبے میں مسلمانوں کے بل بوتے پر جیت حاصل کر کے بھی ان کے وجود کو ماننے سے انکاری رہا ہے۔



دھوپ کے انسانی جلد پر اثرات

سورج کی شعاعیں، مفید بھی مضر بھی

ڈاکٹر سحر مظہر (امریکہ سے)

سورج کی روشنی ربِ لم یزل کی عطا کردہ لاتعداد نعمتوں میں سے ایک ہے۔ یہ نعمت صرف انسانوں ہی نہیں بلکہ حیوانات و نباتات کی زندگی کے لیے بھی اشد ضروری ہے۔ صحت کے حوالے سے دیکھا جائے تو سورج انسانوں کو بے شمار بیماریوں سے بچاتا ہے اور اس کی روشنی وٹامن ڈی بنا کر ہڈیوں کی تکلیف سے بھی نجات دلاتی ہے۔ یہی روشنی نومولود بچوں میں ”یرقان“ کی تکلیف دور کرنے میں بھی مددگار ثابت ہوتی ہے لیکن ذہن نشیں رہے کہ کسی بھی شے کی زیادتی ہمیشہ تکلیف کا باعث بنتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ یہ نعمت یعنی دھوپ جب حد سے تجاوز کر جاتی ہے تو نقصان کا باعث بن جاتی ہے۔

موسمِ گرما ہو یا سرما، بہار ہو یا خزاں، سورج کی الٹراوائلٹ (Ultraviolet) شعاعیں ہر موسم میں انسانی جلد پر مضر اثرات مرتب کرتی ہیں۔ یہ شعاعیں بیرونی حصّے سے گزر کر اندرونی حصّے میں پہنچتی ہیں اور وہاں جلد کے خلیوں کے نقصان کا باعث بنتی ہیں اس لیے اِن الٹراوائلٹ (Ultraviolet) شعاعوں سے بچاؤ بے حد ضروری ہے کیونکہ دھوپ سردیوں کی ہو یا گرمیوں کی، جلد پر اس کے درج ذیل منفی اثرات مرتب ہو سکتے ہیں:

۱۔ جلد کے اندر موجود رنگ دینے والے پگمنٹ (Pigment) مُیلانن نامی مادے کی مقدار بڑھا کر رنگت کو کالا کرتے ہیں۔

۲۔ دھوپ جلد میں موجود کولاجن (Collagen) نامی پروٹین کی کمی کا باعث بنتی ہے جس کی وجہ سے جلد پر جھریاں اور بڑھاپے کے اثرات جلد نمودار ہونا شروع ہو جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جو لوگ دھوپ سے بچتے ہیں اُن پر بڑھاپا دیر سے ظاہر ہوتا ہے۔ جدید ترین تحقیق کے مطابق جو لوگ دھوپ میں زیادہ نکلتے ہیں اُن میں ۲۰ فیصد تک کولاجن کم پائی جاتی ہے اور میلانن (Melanin) کی مقدار بھی بڑھ جاتی ہے۔

۳۔ جلد پر چھائیاں، تِل اور بھورے نشان نمودار ہو جاتے ہیں اور اگر دھوپ سے بچاؤ کے طریقے استعمال نہ کیے جائیں تو بعض اوقات اِن نشانات میں اضافہ بھی ہو جاتا ہے۔

۴۔ دھوپ کی زیادتی کی بنا پر جلد جَل جاتی ہے جسے ”سَن بَرن“ کہا جاتا ہے۔ جن لوگوں میں قدرتی طور پر میلانن کم ہوتا ہے، جیسے زیادہ گورے لوگ اور برص کے مریض، اُن میں جلد جھلسنے کا چانس بھی بڑھ جاتا ہے۔

۵۔ زیادہ دھوپ جلد کی ساخت میں تبدیلی کا موجب بنتی ہے جس کی وجہ سے جلد پر نیل اور چھالے جلدی نمودار ہونا شروع ہو جاتے ہیں۔

۶۔ جلد پر مختلف قسم کے Sun-Spots بھی بن جاتے ہیں اور زیادہ لمبے عرصے تک دھوپ میں رہنے سے یہ سن سپاٹس جلد کے کینسر کا موجب بھی بن سکتے ہیں۔

۷۔ سورج کی الٹراوائلٹ شعاعیں آنکھوں میں جذب ہو کر بہت برے اثرات مرتب کرتی ہیں جن میں سرِفہرست موتیا ہے۔

جلد کی دھوپ سے حفاظت

یہاں ایک اہم سوال یہ ہے کہ اِن تمام بیماریوں سے جلد کی حفاظت کیسے کی جائے؟ یہ تو طے ہے کہ ملازمت پیشہ اور کاروبار سے منسلک لوگ یقیناً گھروں میں نظربند نہیں ہو سکے

اور نہ ہی گھریلو خواتین مہینوں تک گھر کی چاردیواری میں اپنے آپ کو قید رکھ سکتی ہیں کیونکہ اُنہیں بھی امورِ خانہ داری نبھانے کے لیے گھروں سے نکلنا ہی پڑتا ہے۔ اسی طرح مختلف تعلیمی اداروں میں تعلیم حاصل کرنے والے طلباء و طالبات کو بھی حصولِ علم کے لیے گھروں سے نکلنا ہی پڑتا ہے۔ ہمارا مطمحِ نظر ہرگز یہ نہیں کہ لوگ اپنے آپ کو گھروں میں بند کرلیں، خیال تو صرف اِس امر کا رکھنا ہے کہ گھروں سے نکلتے وقت کچھ حفاظتی تدابیر اختیار کرلی جائیں۔ یاد رکھنا چاہیے کہ سورج کی شعاعوں سے بچاؤ نہ صرف دھوپ بلکہ ابر آلود موسم میں بھی ضروری ہے۔ یہاں کچھ حفاظتی تدابیر درج کی جارہی ہیں جن پر عمل کرکے جلدی بیماریوں سے بچا جاسکتا ہے۔

۱۔ دھوپ میں نکلنے سے آدھ گھنٹہ قبل چہرے، گردن، ہاتھوں اور جسم کے اُن حصّوں پر جہاں دھوپ پڑتی ہے، اچھی طرح سے کوئی سَن بلاک کریم لگالیں۔ پاکستان میں چونکہ سورج کی شعاعیں اور دھوپ کافی تیز پڑتی ہے اس لیے جو بھی سَن بلاک استعمال کریں، اچھی طرح سے تسلّی کرلیں کہ اُس کا SPF یعنی Sun protection factor کم از کم ۵۰ ہونا چاہیے۔ اگر پسینہ زیادہ آرہا ہو تو سَن بلاک کا ہر دو، تین گھنٹے بعد استعمال ضروری ہوجاتا ہے۔

۲۔ جلد کو دھوپ سے بچانے کے لیے چھتری، ہیٹ، چادر اور گاڑیوں میں بلائینڈز وغیرہ کا استعمال کیا جاسکتا ہے۔

۳۔ آنکھوں کی حفاظت کے لیے دھوپ میں نکلنے سے پہلے الٹراوائلٹ شعاعوں سے بچاؤ کے حفاظتی چشمے لگا لیے جائیں۔ یہ چشمے بازار میں آسانی سے دستیاب ہیں۔

۴۔ صبح ۱۰ بجے سے شام ۴ بجے تک بغیر کسی کام کے دھوپ میں نکلنے سے گریز کیا جائے کیونکہ اِن اوقات میں سورج کی شعاعوں میں زیادہ شدت ہوتی ہے۔

دھوپ کے نقصانات کا علاج اور ڈاکٹر سے رجوع

۱۔ سَن بَرن کی صورت میں دھوپ میں نکلنے سے مکمّل گریز کیا جائے، ٹھنڈے پانی سے چہرہ بار بار دھویا جائے اور ایسی کریمیں استعمال کی جائیں جن میں Mild topical steroids موجود ہوں۔ اگر فرق محسوس نہ ہو تو جلد کے ڈاکٹر سے رجوع کیا جائے۔

۲۔ یوں تو دھوپ سے بچنے سے ہی چہرے پر جھریوں میں کافی حد تک کمی کی جاسکتی ہے۔ انہیں مزید کم کرنے کے لیے ڈاکٹر کے مشورے سے لیزر اور مختلف قسم کی ادویات کا استعمال کیا جاسکتا ہے۔

۳۔ چہرے پر خشکی ختم کرنے والی کریمیں یعنی Moisturizers کا استعمال زیادہ کیا جائے۔

۴۔ چھائیوں کو ختم کرنے کے لیے مختلف قسم کی سکِن بلیچنگ کریمز یا لوشنز کا استعمال کیا جاسکتا ہے۔

۵۔ کولیجن (Collagen) کی کمی کے باعث جو جھریاں نمودار ہوتی ہیں اُن کے لیے ایک تو سورج کی دھوپ سے مزید بچنے کی اشد ضرورت ہے۔ اِس کے علاوہ چہرے پر لگانے کے لیے کچھ ادویات ہیں جن میں Tretinoin سرِفہرست ہے۔

۶۔ اگر جلد کے کینسر کا خدشہ ہو تو فوراً ڈاکٹر سے رجوع کیا جائے۔ اِس کی مندرجہ ذیل علامات ہوسکتی ہیں۔

الف۔ ایسے السر جو لمبے عرصے سے ہوں اور خود بخود ٹھیک نہ ہو رہے ہوں۔

ب۔ ایسے تِل جن کا سائز اچانک بڑھنا شروع ہو جائے یا رنگت تبدیل ہونا شروع ہوجائے۔

ج۔ ایسے کالے نشان جو بے ترتیب (irregular) ہوں اور تیزی سے بڑھ رہے ہوں۔

د۔ ایسے نشانات جن میں سے خون رستا رہتا ہو۔

اِن علامات کی صورت میں فوراً ڈاکٹر سے رجوع کیا جائے تاکہ جلد کے کینسر کی بروقت شناخت کرکے علاج کیا جاسکے۔

◆◆◆

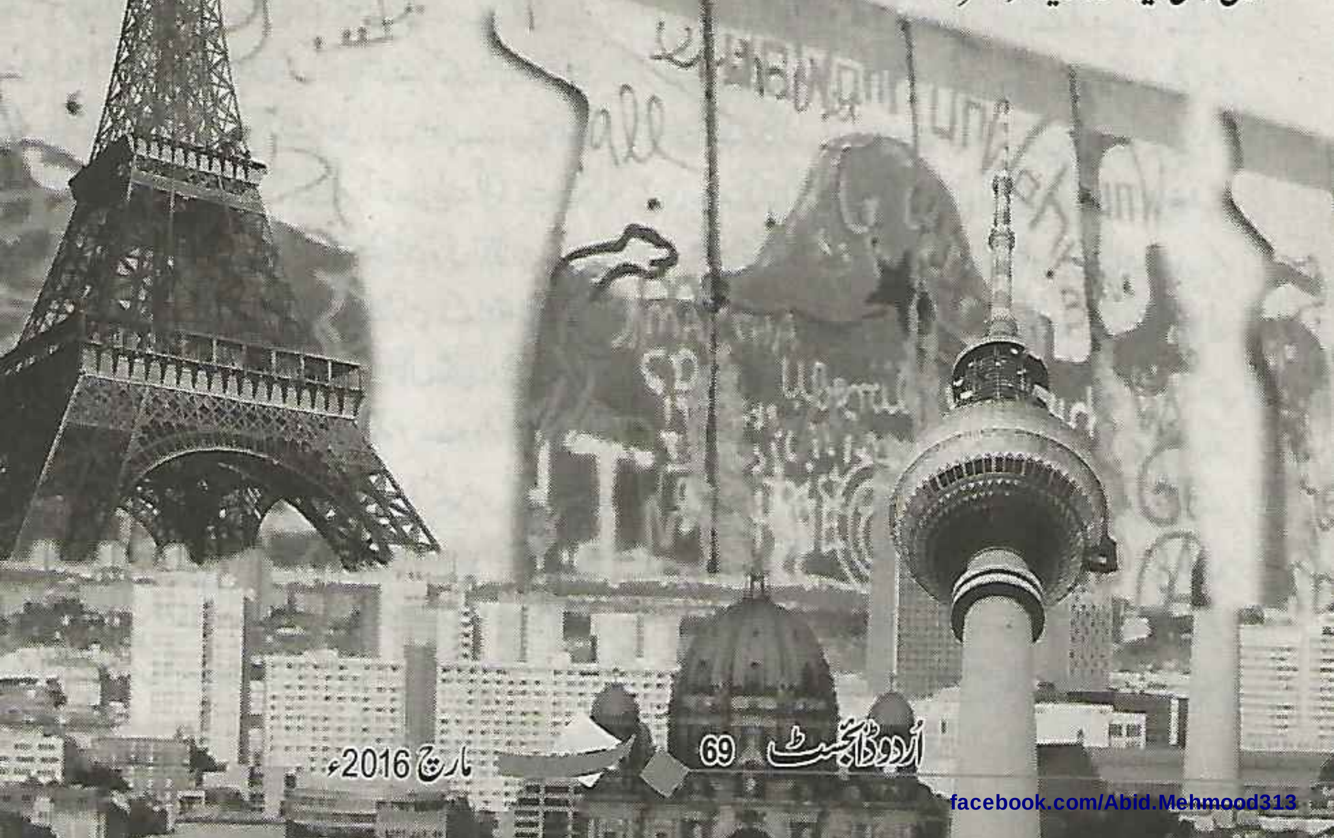
جرمنی سے پیرس تک

جہاں خوبیوں اور خامیوں کی انتہا نظر آتی ہے

ڈاکٹر ثاقب ریاض

ہمارا جہاز فرینکفرٹ ہوائی اڈے پر اُترنے کے قریب ہوا، تو ایک خوبصورت دنیا آنکھوں کے سامنے تھی۔ حد نظر تک پھیلا سبزہ ہی سبزہ، بلند وبالا فلک بوس عمارات، وسیع و عریض جنگل، خوبصورت دریا کی صاف اور شفاف لہریں.....اور سب سے بڑھ کر خوبصورت جفاکش اور دیانتدار لوگ جنھوں نے جنگ عظیم دوم کی راکھ پر بیٹھ کر اپنے ملک کو دنیا کا عظیم ملک بنانے کی قسم کھائی تھی اور ۷۰ سالوں میں واقعی ایسا کر دکھایا۔ فرینکفرٹ ہوائی اڈا اتنا بڑا ہے کہ آپ پیدل چل کر ایک ٹرمینل سے دوسرے ٹرمینل تک نہیں جا سکتے بلکہ ریل پر بیٹھنا پڑتا ہے۔ یہاں پر مختصر قیام کے بعد ہم دوسرے جہاز پر اپنی اصل منزل برلن کی طرف روانہ ہوئے۔ فرینکفرٹ سے ایک گھنٹے کی ہوائی مسافت کے بعد ہم جرمنی کے دارالحکومت برلن پہنچے، تو ہوائی اڈے پر میزبان پرنس فلپ ہمارا منتظر تھا جو ہمیں گاڑی میں بٹھا کر ہماری سرکاری رہائش گاہ پر لے گیا۔

ہمارا جرمنی کا یہ دورہ انٹرنیشنل انسٹی ٹیوٹ آف جرنلزم برلن کی خصوصی دعوت پر ہوا جو کہ بنیادی طور پر دو ماہ کے تربیتی کورس پر مبنی تھا۔ صحافت سے متعلق اس اعلیٰ تربیتی کورس میں ایشیا اور افریقا کے ترقی پذیر ممالک سے تعلق رکھنے والے ابلاغ عامہ اور شعبہ صحافت کے ۱۵ یونیورسٹی



اساتذہ کو مدعو کیا گیا تھا۔ یہ شرکا یوگنڈا، کینیا، زمبیا، ملاوی، گھانا، نائیجیریا، کمبوڈیا، نیپال، افغانستان، بنگلہ دیش اور پاکستان سے تعلق رکھتے تھے۔ وطن عزیز پاکستان سے اس کورس کے لیے دو یونیورسٹی اساتذہ کا اِنتخاب کیا گیا۔ علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی سے اس خاکسار کو جبکہ پشاور یونیورسٹی سے پروفیسر گل وہاب کو اس میں شمولیت کا اعزاز حاصل ہوا۔ دو ماہ کے عرصے میں ہمارا زیادہ تر قیام برلن میں رہا لیکن جولائی کے پہلے عشرے میں ہمارے میزبان ادارے کی طرف سے جرمنی کے چھ بڑے شہروں کے تعلیمی اور تفریحی دورے کا اہتمام کیا گیا جبکہ اپنے طور پر ہم نے پیرس کا دورہ بھی کیا اور برلن سے پیرس جاتے ہوئے بیلجیئم کے دارالحکومت برسلز میں مختصر قیام کیا۔

اہل یورپ میں بالعموم اور اہل جرمنی میں بالخصوص، خوبیاں اور خرابیاں دونوں اِنتہا درجے کی پائی جاتی ہیں۔ خوبیاں ایسی کہ ہمارے جیسے ممالک میں ان کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا اور خامیاں ایسی کہ ہزارہا برائیوں کے باوجود ان کے مقابلے میں اپنا ملک جنت لگتا ہے۔ محنت اور دیانت ان کی ایسی خوبیاں ہیں جنھیں دیکھ کر ہماری عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ ہفتے میں پانچ دن کام کرتے ہیں، تو جنوں کی طرح۔ ان کے سرکاری دفاتر میں وہ کام لمحوں میں ہو جاتا ہے جنھیں انجام دینے کے لیے یہاں مہینوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ اوپر سے نیچے تک کرپشن کا کہیں نشان تک نہیں نظر آتا۔ ایسے لگتا ہے کہ دیانتداری ان کی گھٹی میں پڑی ہے۔ وزرا دفتری اوقات میں سرکاری گاڑی استعمال کرتے ہیں جبکہ شام کے اوقات اور چھٹی کے روز اپنی ذاتی گاڑی ان کے استعمال میں ہوتی ہے۔ قانون کی عملداری ایسی کہ شاید ہمارے نزدیک وہ لوگ احمق قرار پائیں جو رات کے بارہ بجے بھی ٹریفک سگنل سرخ ہونے پر گاڑی روک لیتے ہیں۔ مطالعے کا جنون حد سے زیادہ، ہر شخص نے اپنی بغل میں کوئی نہ کوئی کتاب، رسالہ یا اخبار ضرور دبایا ہوتا ہے اور جونہی موقع ملتا ہے فوراً اسے کھول کر پڑھنا شروع کر دیتا ہے۔ زیرزمین ریلوں اور بسوں کے اندر بہت کم لوگ ایسے نظر آتے ہیں جو مصروف مطالعہ نہ ہوں۔ خواتین کے پرسوں میں اہم ترین چیز ''کتاب'' ہی ہوتی ہے۔ ہے کوئی ایسی خوبی جنوبی ایشیا کے اس خطہ جانثاران میں؟

اب آئیے چند خرابیوں کی طرف جن کا تصور ہی ہمارے رونگٹے کھڑے کرنے کے لیے کافی ہے۔ شراب کی مستیوں میں دُھت۔ شرم و حیا نامی چیزوں سے اجنبی، رشتوں کے احترام سے عاری۔ والدین اولاد سے، اولاد والدین سے بے نیاز۔ غرض ایسی ہزاروں خامیاں مغربی تہذیب کے ماتھے پر ایسا بدنما داغ ہیں جنھیں دیکھیں تو اپنا ملک واقعی جنت لگتا ہے۔

ہمارے میزبان ادارے نے ہماری راہنمائی اور مدد کے لیے کل وقتی طور پر دو مقامی معاونین کا تقرر کیا تھا۔ یہ تھے پرنس فلپ اور مس کیٹرین۔ دونوں برلن کے مقامی باشندے اور انھیں انگریزی پر عبور تھا جو کہ جرمنی میں خال خال ہی نظر آتی ہے۔ اچھے خاصے عہدوں پر براجمان اور تعلیم یافتہ لوگوں کی انگریزی بس ''گزارا'' ہی ہوتی ہے۔ طویل بین البراعظمی سفر کی تکان ابھی ختم نہیں ہوئی تھی کہ اگلے روز صبح سویرے ہمارے مقامی معاونین آگئے اور پورے گروپ کو لے کر زیرزمین ٹرین کے ذریعے شہر کے مرکزی علاقے ''زولوجسٹر گارٹن'' لے گئے۔ اس علاقے کی اہم ترین عمارت قیصر ولہیلم چرچ ہے جو کہ انیسویں صدی میں بنایا گیا تھا اور جسے دوسری جنگ عظیم میں اتحادی فوجوں نے خاص طور پر نشانہ بنایا۔ بم گرنے سے چرچ کی عمارت مکمل طور پر گری تو نہیں تاہم کافی حصہ نیست و نابود ہو گیا۔ اس تباہ شدہ سیاہ عمارت کو جنگ عظیم کی یادگار کے طور پر محفوظ کر لیا گیا ہے جو آنے والی نسلوں کو عالمی جنگوں کی تباہ کاریوں کی یاد دلاتی رہے گی۔ چرچ کے اردگرد ہزاروں سیاح ہر وقت موجود رہتے ہیں اور ان عالمی طاقتوں کی دہشت گردی کی ایک جھلک کا نظارہ کرتے ہیں جو آج دوسروں پر دہشت گردی کا الزام لگاتی ہیں اور اپنے سیاہ

ترین ماضی پر انھیں ذرا بھی شرم نہیں آتی۔

قریب ہی برلن کا چڑیا گھر ہے جو وسیع و عریض رقبے پر پھیلا ہوا ہے۔ اس چڑیا گھر میں ہزاروں کی تعداد میں نایاب جنگلی جانور اور پرندے سیاحوں کی توجہ کا مرکز بنتے ہیں۔ زیرِ زمین غار نما پنجروں میں بند بعض جانور حقیقی ماحول کا منظر پیش کرتے ہیں۔ بڑے جانوروں کے لیے وسیع جگہ مختص کی گئی ہے اور ان کی حفاظت اور خوراک کا زبردست انتظام ہے۔ چڑیا گھر کے اندر ایک بہت بڑا مچھلی گھر (Equarium) ہے جہاں مچھلیوں کی بے شمار اقسام پانی میں تیرتی دیکھ کر انسانی عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ اس عمارت کے عین وسط میں مگرمچھ کے لیے سایہ دار جگہ مخصوص کی گئی ہے۔ یہ مگرمچھ چڑیا گھر والوں کے لیے اضافی آمدنی کا ذریعہ بن چکا ہے کیونکہ بہت سے شائقین اس پر سینٹ (سکے) پھینکنا اپنے لیے اعزاز سمجھتے ہیں۔

تھک ہار کر گھر پہنچے، تو استقبالیہ عشائیے کے لیے تیار ہونے کا حکم مل گیا جس کا اہتمام برلن کے ایک بڑے ہوٹل میں کیا گیا تھا۔ ہوٹل پہنچے تو انٹرنیشنل انسٹی ٹیوٹ آف جرنلزم کے ڈائریکٹر ہنس بوسل اور پروفیسر ہائیڈی ہمارے استقبال کے لیے موجود تھیں۔ کھانے کے میز پر بیٹھے، تو گپ شپ اور تعارف کا سلسلہ شروع ہوا اور ساتھ ہی سورج غروب ہونے کا انتظار۔ لیکن سورج تھا کہ غروب ہونے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔ معلوم ہوا کہ یہاں سورج کا دستور بھی نرالہ ہے یہ سب لوگوں کو میٹھی نیند سُلا کر یا کم از کم رات کا کھانا کھلا کر ہی غروب ہوتا ہے اور اکثر لوگ رات کا کھانا سورج کی روشنی میں ہی کھا لیتے ہیں۔

انسان برلن جائے اور دیوار برلن نہ دیکھے ایسا ہو ہی نہیں سکتا۔ اگلے روز ہمارے پورے گروپ کو اس مشہور تاریخی دیوار کی سیر کرائی گئی۔ مشرقی اور مغربی جرمنی کو الگ کرنے والی یہ دیوار اب عہدِ رفتہ کا حصہ بن چکی ہے۔ جنگ عظیم دوم کے بعد مشرقی جرمنی سوویت یونین کے قبضے میں چلا گیا جبکہ مغربی جرمنی پر اتحادی فوجوں کا قبضہ ہو گیا۔ دونوں حصوں میں حالات کشیدہ ہوئے تو مشرقی جرمنی کی حکومت نے برلن کے درمیان ایک مضبوط دیوار بنانے کا فیصلہ کیا۔ اس دیوار کی تعمیر ۱۳؍اگست ۱۹۶۱ء کو شروع ہوئی۔ دیوار برلن کی تعمیر سے جرمنی کے دونوں حصوں میں رابطے ختم ہو گئے۔ جو لوگ دیوار پھلانگ کر مغربی جرمنی میں داخل ہونے کی کوشش کرتے انھیں خودکار مشین گنوں کے ذریعے ہلاک کر دیا جاتا۔ دیوار برلن کی کل لمبائی ۱۶۶ کلومیٹر تھی جبکہ اس کی اونچائی چار میٹر رکھی گئی اور یہ کنکریٹ سے بنائی گئی تھی۔ سینکڑوں لوگ دیوار پار کرنے کی کوشش میں اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ بالآخر دونوں جانب کے عوام کے پرزور مطالبے پر ۱۹۹۰ء میں یہ دیوار گرا دی گئی اور یوں مشرقی اور مغربی جرمنی پھر ایک ہو گئے۔ دیوار برلن کے بعض حصوں کو تاریخی یادگار کے طور پر محفوظ کر لیا گیا ہے جبکہ گرائی جانے والی جگہ پر سرخ رنگ کا نشان لگا دیا گیا ہے جو اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ کبھی یہاں دیوار برلن ہوا کرتی تھی۔ اوست بانوف ریلوے اسٹیشن کے نزدیک دیوار برلن کے ایک کلومیٹر کے حصے کو محفوظ کر کے اس پر خوبصورت رنگ و روغن کر دیا گیا ہے۔ دیوار کے اس حصے کو ''ایسٹ سائیڈ گیلری'' کا نام دیا گیا ہے۔

بریڈن برگ گیٹ برلن کا ایک اہم تاریخی مقام ہے جو کہ پارلیمنٹ ہاؤس کے قریب مشرقی اور مغربی جرمنی کے سنگم پر واقع ہے اور اس کے اوپر چار گھوڑوں کا مجسّمہ ہٹلر کے فاتحانہ انداز کی غمازی کرتا ہے۔ اِس عظیم پرشکوہ عمارت کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ یہاں کوئی بھی شخص کسی بھی وقت داخل ہو سکتا ہے۔ پارلیمنٹ کی عمارت ہر خاص و عام کے لیے کھلی ہے کوئی بھی شخص چاہے وہ جرمن ہو یا غیر ملکی دن کے کسی بھی وقت اس عمارت میں داخل ہو سکتا اور پارلیمنٹ کی کارروائی براہ راست دیکھ سکتا ہے۔ ترقی پذیر ممالک میں اس کا تصور کرنا بھی مشکل کہ خواص کے سوا کوئی پارلیمنٹ کی عمارت میں داخل ہو

سکے۔ پارلیمنٹ ہاؤس کی چھت پر ایک اِنتہائی خوبصورت گنبد نما عمارت ہے جس کے اندر دائرہ نما راستہ اس کی چھت تک لے جاتا ہے جہاں سے پورا برلن شہر اپنی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ نظر آتا ہے۔ یہاں پہنچ کر ہمیں ایسے لگا جیسے بالکل کسی نئی دنیا میں آگئے ہوں۔

جرمن پارلیمنٹ کے بالکل سامنے جرمنی کی چانسلر کی سرکاری رہائش گاہ ہے جو ہمارے غریب اور پسماندہ ملک کے ایوان صدر کے جاہ و جلال اور ایوان وزیراعظم کی شان و شوکت کے سامنے ہیچ نظر آتی ہے۔ اس میں کچھ مبالغہ آرائی نہیں کیونکہ مجھے اپنے ملک کے ایوان صدر اور ایوان وزیراعظم اندر سے دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے تا حد نظر وسیع و عریض رقبے پر پھیلی ان عالیشان عمارات کے مقابلے میں جرمن چانسلر کی سرکاری رہائش گاہ کی کچھ حیثیت نہیں ہے اور عجیب بات یہ کہ سیکیورٹی والے بھی وہاں نظر نہیں آئے۔ بس چار یا پانچ کنال پر مشتمل ایک گھر ہے جہاں جرمنی والوں کی ہر دلعزیز ''ماسی'' رہتی ہے۔ یہ ماسی انجیلا مارکل ہے جو اپنی پھرتیوں کی وجہ سے پوری دنیا میں جانی پہچانی جاتی ہے۔ گھر سے باہر نکلتی ہے، تو اس کی گاڑی کے آگے پیچھے پروٹوکول گاڑیاں نہیں ہوتیں اور نہ ہی راستے بند کیے جاتے ہیں۔

پارلیمنٹ ہاؤس کے بعد ہماری اگلی منزل برلن کا ٹی وی ٹاور تھا جس کی اونچائی ۲۲۰ میٹر ہے اور یہ برلن کی سب سے بلند عمارت ہے۔ ہر روز ہزاروں سیاح لفٹ کے ذریعے اس ٹاور کی چوٹی تک جاتے ہیں اور وہاں سے جرمنی کے خوبصورت دارالحکومت کا نظارہ کرتے ہیں۔ ہم لوگ بھی ٹی وی ٹاور کی چوٹی پر واقع فٹ بال نما بارہ دری میں پہنچے، تو ایک بار پھر جرمنی کا خوبصورت دارالحکومت ہمارے سامنے تھا بالخصوص دریائے سپری کا نیلگوں پانی شہر کے حسن اور دلکشی میں اضافہ کر رہا تھا۔

قریب ہی واقع ہمیں وہ جگہ بھی دکھائی گئی جہاں ہٹلر کے حکم پر نازی پارٹی کے کارکنوں نے کتب خانوں کی لاکھوں تاریخی کتابیں جلا کر راکھ کر دی تھیں۔ اِس افسوسناک واقعے کی یاد دلانے کے لیے زیرزمین تہ خانے میں خالی الماریاں رکھی گئی ہیں جنھیں سطح زمین سے دیکھا جاسکتا ہے۔ کتابوں کے یہ خالی شیلفیں مرثیہ خواں ہیں کہ نازیوں نے ان میں رکھی کتابیں اپنی ''علم دشمنی'' میں جلا کر راکھ کر دی تھیں۔ ہٹلر نے جنگ عظیم دوم کے دوران پورے شہر برلن کو تانبے کی چھت سے ڈھانک کر بریڈن برگ کو شہر کا صرف ایک راستہ بنانے کا منصوبہ بنایا تھا لیکن قدرت نے اسے اس منصوبے کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کی مہلت نہ دی۔ جرمن ہٹلر سے نفرت کرتے ہیں اور اسے اپنی بربادی کا ذمے دار قرار دیتے ہیں۔ لیکن میرے خیال میں ہٹلر نے ایک کام ضرور اچھا کیا اور وہ تھا یہودیوں کی بیخ کنی۔ اس نے اپنی دوراندیش نگاہوں سے اس مکار قوم کی چالبازیوں کو دیکھ لیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے اپنے دور میں پہلے ان کا حقہ پانی بند کیا اور پھر لاکھوں یہودیوں کو مروا دیا۔ لیکن آج کے جرمن باشندے یہودیوں سے محبّت کرتے ہیں۔ ان پر ہونے والے مظالم پر روتے ہیں اور جگہ جگہ مقتول یہودیوں کی یاد میں یادگاریں تعمیر کر رہے ہیں۔ ایسی ہی ایک یادگار ''ہولوکاسٹ میموریل'' ہے جو کہ بین الاقوامی سیاحوں کی توجہ کا مرکز ہے۔ یہاں پہنچے تو مقامی گائیڈ نے بڑی عقیدت اور جذباتیت کے ساتھ نازیوں کے ہاتھوں مرنے والے یہودیوں کی قربانیوں کا ذکر کیا۔ بار بار وہ فرط جذبات سے آبدیدہ ہو جاتا تھا لیکن ہمارے اس سوال کا وہ کوئی جواب نہ دے سکا کہ ''یہودی، ہٹلر کے مظالم کا بدلہ آج فلسطینی مسلمانوں سے کیوں لے رہے ہیں؟

برلن میں یہودیوں کی دوسری بڑی یادگار جیوئش عجائب گھر ہے جو بہت بڑے رقبے پر پھیلا ہوا ہے۔ عجائب گھر کی عمارت کا شمار دنیا کے بہترین تعمیراتی نمونوں میں ہوتا ہے۔ یہاں پر زمانہ قدیم کے یہودیوں کے تاریخی نوادرات، ان کی مذہبی کتابیں اور

جنگ عظیم کے دوران ہونے والے مظالم کی تصاویر رکھی گئی ہیں۔
صدر دروازے کے نزدیک ہمیں مہمانوں کے تاثرات کی کتاب نظر آئی جس میں عجائب گھر کی سیر کرنے والے اپنے تاثرات درج کررہے تھے۔ موقع ملا تو ہم نے اپنے دل کی بھڑاس یہ دو جملے لکھ کر نکال لی۔ ترجمہ "آپ کے عجائب گھر کی عمارت تو بہت عالیشان ہے لیکن مجھے یہاں پر مظلوم فلسطینی بچوں کی سسکیوں کی آواز سنائی دے رہی ہے۔" درجنوں یہودیوں کی موجودگی میں ایسی بات لکھنا آسان کام نہ تھا لیکن اللہ تعالیٰ نے ہمت دی، تو ہم نے یہ کام کردیا۔
جرمنی کے لوگ اپنے عظیم سائنس دان آئن سٹائن پر فخر کرتے ہیں۔ اس کی تصویریں اور اقوال جگہ جگہ نظر آتے ہیں۔ زندہ قومیں اپنے مشاہیر کو ہمیشہ خراج تحسین پیش کرتی ہیں۔ جرمن لوگ جانتے ہیں کہ آئن سٹائن ایک بڑا انسان تھا جس نے روشنی کی رفتار کا فارمولا دے کر دنیا کی موجودہ ترقی کی بنیاد رکھ دی۔
برلن میں قیام کے دوران سیر و تفریح کا سلسلہ جاری رہا۔ ہفتے کے پانچ دن صبح سے شام تک انسٹی ٹیوٹ میں کلاسوں کا اہتمام سرکاری طور پر ہی ہوتا تھا۔ "برلن بائی بوٹ" اور برلن بائی بائیک" دو زبردست تفریحی پروگرام تھے۔ اوّل الذکر میں ہمیں پورے شہر کا دورہ چھوٹے بحری جہاز کے ذریعے کرایا گیا جس نے دریائے سپری میں برلن شہر کا چکر تین گھنٹے میں مکمل کیا۔ یہ اپنی نوعیت کا ایک پرلطف پروگرام تھا۔ اسی طرح "برلن بائی بائیک" بھی اچھا پروگرام تھا لیکن یہ ان لوگوں کے لیے مشکل تھا جنھیں سائیکل چلانے کا زیادہ تجربہ نہیں تھا۔ اس پروگرام میں ایک سیاحتی کمپنی ہر سیاح کو ایک سائیکل فراہم کرتی ہے اور گروپ کی صورت میں ایک گائیڈ کے ساتھ برلن کے مختلف حصوں کی سیر کرائی جاتی ہے۔
"فیوٹا ڈیلا میوزک میلا" جرمنی کا معروف ترین موسیقی میلا

یورپ اور پناہ گزین

یورپ میں پناہ گزینوں کی آمد کا سلسلہ ۲۰۱۵ء میں شروع ہوا۔ جنوری ۲۰۱۵ء تا فروری ۲۰۱۶ء تک ان کی تعداد ایک ملین سے بڑھ گئی جن میں شامی لوگ ۴۸ فیصد، افغانی ۲۱ فیصد اور عراقی ۹ فیصد ہیں۔ ان میں ۴۶ فیصد جوان مردوں کی تعداد ہے، ۲۰ فیصد عورتیں اور ۳۴ فیصد بچے شامل ہیں۔ مؤرخین کے مطابق جنگ عظیم دوم کے بعد پہلی بار یورپ میں اتنے وسیع پیمانے پر پناہ گزینوں کی نقل و حرکت دیکھنے میں آئی ہے۔ اس تعداد میں ۹۰ فیصد لوگ مسلمان ہیں اور ان کا تعلّق ان ممالک سے ہے جہاں طویل عرصے سے جنگیں یا خانہ جنگی جاری ہے۔ پناہ گزینوں کی اکثریت سمندری راستے سے یورپ پہنچی جبکہ ۳۴ ہزار کے قریب لوگ ترکی سے ہوتے ہوئے یورپ کی سرزمین میں داخل ہوئے۔ شدید سردی کے باوجود ۸ ہزار لوگ سمندر سے ہوتے ہوئے یورپ پہنچ گئے۔ ۲۰۱۴ء کے آخر میں پوری دنیا میں مہاجرین یا پناہ گزینوں کی کل تعداد ۶۰ ملین کے قریب تھی۔ اس وقت دنیا میں سب سے زیادہ پناہ گزین ترکی میں موجود ہیں جن کی تعداد پچیس لاکھ کے قریب ہے جبکہ دوسرا نمبر پاکستان کا ہے جہاں ایک بہت بڑی تعداد افغانی مہاجرین کی مقیم ہے۔
پناہ گزینوں کے لیے سرحدیں کھول دینے میں جرمنی تمام یورپی ممالک میں بازی لے گیا۔ اس سلسلے میں جرمن حکمران انجیلا مرکل کا کہنا ہے: "اگر یورپ پناہ گزینوں کا مسئلہ حل نہ کرسکا تو شہریوں کے عالمی حقوق سے اس کی دیرینہ وابستگی کو نقصان پہنچے گا۔" یورپ تاحال پناہ گزینوں کے معاملے میں دو حصوں میں تقسیم ہے۔ یورپی عوام کا ایک حصہ خاص طور پر مسلمان تارکین وطن کی آمد روکنا چاہتا ہے جبکہ دوسرے حصے سے منسلک یورپیوں کا کہنا ہے کہ یہ پناہ گزین ہمدردی اور رحم کے مستحق ہیں۔

ہے جو موسم گرما کی آمد پر پورے جوش و خروش سے منایا جاتا ہے۔ ملک بھر کے میوزک گروپ اپنے سازینوں کے ساتھ ایک مخصوص علاقے میں جمع ہوتے ہیں اور جی بھر کر گاتے ہیں۔ ایسے لگ رہا تھا جیسے پورا شہر میلے میں اُمڈ آیا ہو تمام مرد و زن ''حسب توفیق'' ناچ گانے میں مصروف تھے۔ بہت سے نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں نے اپنے بال عجیب و غریب طریقے سے کٹوا کر ان پر سبز، نیلا اور پیلا رنگ کرایا ہوا تھا۔ ان کے جسموں پر ٹیٹو پینٹنگ اِنتہائی بدنما محسوس ہو رہی تھی۔

برلن کا نیشنل عجائب گھر بھی دیکھنے کی جگہ ہے جہاں ہزاروں کی تعداد میں دنیا بھر سے حاصل کیے گئے قدیم مجسمے اور مورتیاں رکھی گئی ہیں۔ اس عجائب گھر کی قابل دید جگہ اس کا اسلامک کلچر کا گوشہ ہے جہاں اندلس میں اسلامی تہذیب کی بعض نشانیاں موجود ہیں بالخصوص صلاح الدین ایوبی کے دور کی ایک مسجد کی محراب اہل ایمان کو خون کے آنسو رُلا دیتی ہے۔ مختلف ہتھیار، تلواریں اور نیزے بھی موجود ہیں جن کی مدد سے اہل ایمان نے مے خانہ یورپ کو فتح کیا اور یہاں ایمان کی شمع روشن کی تھی۔ یورپ کے بہت سے دانشور آج بھی تسلیم کرتے ہیں کہ اندلس میں مسلمانوں کا دور حکومت تعمیر و ترقی اور امن و امان کے لحاظ سے تاریخ کا بہترین دور تھا۔ اس عجائب گھر میں خاندان بنوامیہ کے زیر استعمال بعض ہتھیار اور کھانے کے برتن بھی ان شائقین کی توجہ کا مرکز ہیں جن کی رگوں میں محمد عربی ﷺ کی اطاعت کا خون دوڑتا ہے۔

ایک ڈیپارٹمنٹل سٹور میں ہماری ملاقات عبد الرزاق صاحب سے ہوئی جن کا تعلق بھارت سے ہے اور گزشتہ تیس سالوں سے برلن میں مقیم ہیں۔ یہ برلن کی اسلامی تحریک کے صدر ہیں اور اسلام کی ترویج و اشاعت کے سلسلے میں خاصا کام کر رہے ہیں۔ عبدالرزاق ہمیں اپنے گھر لے گئے خاصی خاطر مدارت کی اور پھر ہماری خواہش پر وہ ہمیں مسجد لے گئے جہاں بہت سے پاکستانی احباب سے ملاقات ہوگئی۔ وہاں جا کر معلوم ہوا کہ برلن میں مسلمانوں کی ساٹھ کے قریب مساجد ہیں جن میں اکثریت عربوں اور ترکوں کی بنائی ہوئی مساجد کی ہے۔ یہاں جمعہ کا خطبہ انگریزی، اُردو اور جرمن تین زبانوں میں ہوتا ہے اور جرمنی کے بعض غیر مسلم بھی یہ خطبہ سننے آتے اور بعض تو اسلام بھی قبول کر لیتے ہیں۔

چارلوٹنبرگ قلعہ بھی برلن کی مشہور تاریخی جگہ ہے جو اٹھارہویں صدی میں جرمنوں کے جدامجد فریڈرک دی گریٹ کے زیر استعمال رہا۔ وسیع و عریض رقبے پر پھیلے ہوئے قلعے کے عقب میں ایک بہت بڑا باغ اور جھیل واقع ہے جہاں سیاحوں کی بڑی تعداد ہر وقت موجود ہوتی ہے۔ شام ہوتے ہی یہاں میموں کے جھرمٹ اُمڈ آتے ہیں اور بہت سی جرمن بوڑھیاں ایک دوسرے کو اپنے ماضی کے قصے سنا کر دل بہلاتی ہیں۔

شہر کے مرکزی وکٹری چوک کے نزدیک ہم نے وہ جگہ بھی دیکھی جہاں ایک زیر زمین بنکر میں ہٹلر نے خودکشی کی تھی۔ مرنے سے ایک روز قبل اس نے بران نامی لڑکی سے شادی کی اور اگلے ہی روز دونوں نے خودکشی کر لی۔ ہٹلر کی وصیت کے مطابق ان دونوں کو وہیں دفن کیا گیا اور یوں اس کے مرنے کے ساتھ ہی جنگ عظیم دوم اپنے اختتام کو پہنچی۔ برلن میں قیام کے دوران ہم جنس پرستوں کا بہت بڑا مظاہرہ دیکھنے کا بھی اتفاق ہوا جس میں پورے یورپ سے لاکھوں لوگ شریک تھے۔ جلوس کے شرکا کو برلن کے مئیر کا تعاون بھی حاصل تھا جو خود بھی اسی قبیل سے تعلق رکھتا ہے۔ یورپ کے دو ملک نیدرلینڈ اور بیلجیئم پہلے ہی انھیں قانونی طور پر شادی کا حق دے چکے ہیں۔ اب برلن میں ہونے والے عظیم الشان مظاہرے کے بعد اسپین کی حکومت نے بھی انھیں یہ حق دے دیا جبکہ جرمنی کی حکومت ابھی اس سلسلے میں قانونی تقاضوں کا جائزہ لے رہی ہے۔

جرمنی میں ''دعوت اڑانے'' کے دو لوازمات ہیں ایک یہ کہ اپنا کھانا اپنے ساتھ لائیں اور دوسرا یہ کہ واپس جانے سے پہلے اپنے برتن دھو کر جائیں۔ ہمارے لیے یہ ایک تلخ تجربہ تھا

لیکن مجبوراً کرنا پڑا۔ برلن میں قیام کے دوران دو ایسی ہی دعوتوں کا اہتمام کیا گیا تھا۔ پہلی میں تو ہم نے شرکت کی لیکن دوسری پارٹی کے موقع پر ہم نے پیرس جانے کا پروگرام بنا لیا اور یوں پروفیسر ہائیڈی کی دعوت شیراز میں شرکت کرنے سے بچ گئے۔ واضح رہے کہ ہائیڈی فری یونیورسٹی آف برلن میں پروفیسر ہے اور جزوقتی طور پر ہمیں بھی پڑھاتی رہی۔ وہ اکثر کہا کرتی ''مجھے اپنی طلاق ہونے کا اتنا افسوس نہیں جتنا افسوس مجھے میرے کتے کے مرنے کا ہے۔''

ہمارے لیے جرمنی کے مختلف شہروں کے نو روزہ دورے کا اہتمام کیا گیا جس میں مختلف یونیورسٹیوں اور ذرائع ابلاغ کے اداروں میں جانے اور متعلقہ لوگوں اور جرمن صحافیوں سے ملاقات کا موقع ملا۔ یہ تمام سفر بذریعہ بس کیا گیا۔ یوں ہمیں جرمنی کے زیادہ تر علاقے دیکھنے کا موقع ملا۔ برلن سے ۱۸۰ کلومیٹر کے فاصلے پر ہماری پہلی منزل لائپزگ شہر تھا جو کہ جرمنی کے ادغام سے پہلے مشرقی جرمنی کا حصہ تھا۔ برلن سے لائپزگ تک کا علاقہ انتہائی خوبصورت سرسبز و شاداب زرعی رقبے پر محیط ہے جہاں ایک ایک کھیت کا رقبہ کئی کئی سو کنال پر مشتمل ہے۔ گھنے وسیع جنگل، تاحد نظر لہلہاتی فصلیں اور خوبصورت فضا سارے منظر کو دلکش بنا رہی تھی۔ گندم کی فصل جولائی کے مہینے میں کاٹی جا رہی تھی جس کی وجہ یہ ہے دھوپ کم لگنے سے وہاں فصلیں ہمارے ممالک کی نسبت دیر سے پکتی ہیں۔ لائپزگ پہنچنے پر ہوٹل میں سامان رکھا اور فوراً ہی لائپزگ یونیورسٹی چل دیے۔ یونیورسٹی پہنچنے پر سب سے پہلے کیفے ٹیریا میں دوپہر کا کھانا تناول کیا۔ نو روزہ دورے میں حلال کھانے کا حصول ہمارے لیے بڑا مسئلہ تھا۔ ہمارے گروپ میں شریک چھ میں سے دو بنگلہ دیشی مسلمانوں نے تو پہلے دن ہی اعلان کر دیا تھا کہ ہم صرف پیدائشی مسلمان ہیں عقیدے کے لحاظ سے بالکل نہیں لہٰذا ہم سب کچھ کھا لیں گے اور ''پئیں'' گے بھی۔ افغانستان کے دو مسلمانوں نے بھی اپنی روشن خیال اعتدال پسندی کا اعلان کر دیا اور یوں ہر قسم کا کھانا پینا ان کے لیے بھی جائز ہو گیا۔ آخر میں ہم دو پاکستانی مسلمان رہ گئے۔ حلال کھانے کی تلاش میں مشکل بہت ہوئی لیکن ہماری زبانیں ''لذت حرام'' سے محفوظ رہیں۔ کھانے سے فارغ ہو کر ہم نے یونیورسٹی کے شعبہ صحافت کا رخ کیا جہاں پروفیسر ویلکر مارٹن نے ہمارا استقبال کیا اور اپنے شعبے کے بارے میں تفصیل سے بتایا۔ اس شعبے کے ہزاروں فارغ التحصیل طلبہ و طالبات نہ صرف جرمنی بلکہ یورپ کے مختلف ممالک میں ذرائع ابلاغ کے اداروں سے منسلک ہیں۔ یونیورسٹی کا دورہ ختم ہوا، تو شہر کا تفریحی دورہ شروع ہو گیا۔ لائپزگ کو موسیقی کا شہر بھی کہا جاتا ہے۔ سینٹ تھامس چرچ کے باہر اسکول کی بچیوں کا ایک گروہ اپنی استانی کی راہنمائی میں مذہبی نغموں کی دُھنیں پیش کر رہا تھا۔ اس شہر کو کھیلوں اور تجارتی میلوں کا شہر بھی کہا جاتا ہے۔ یہاں کا افریقی چڑیا گھر سیاحوں اور خاص طور پر بچوں کے لیے خصوصی توجہ کا مرکز ہے۔ لائپزگ کے بارے میں یہ جاننا بھی دلچسپی سے خالی نہیں کہ یہ وہ شہر ہے جہاں اکتوبر ۱۸۱۳ء میں نپولین بوناپارٹ کو شکست ہوئی اور اس جنگ میں ایک لاکھ سے زائد افراد لقمہ اجل بنے تھے۔

اگلے روز ہم نے نورن برگ کے لیے رخت سفر باندھا جو کہ لائپزگ سے ۲۷۰ کلومیٹر کے فاصلے پر ہے یہ جرمنی کا ایک قدیم تاریخی شہر ہے۔ زمانہ قدیم میں یہ شاہی قلعہ تھا اور پرانے زمانے کے بادشاہ سال میں کچھ عرصہ یہاں ضرور گزارتے۔ ایک ہزار سال پرانے اس شہر کو یہ اعزاز بھی حاصل ہے کہ دنیا کا پہلا گلوب ۱۴۹۲ء میں یہیں ایجاد ہوا اور آج بھی یہاں کے نیشنل عجائب گھر میں محفوظ ہے۔ دوسرا گلوب چند ماہ بعد امریکا میں بنایا گیا۔ نورن برگ سطح سمندر سے ۳۰۰ میٹر بلند ہے۔ دوسری جنگ عظیم میں اس شہر کو بری طرح تباہ و برباد کیا گیا۔ قبل ازیں ۱۸۰۶ء میں نپولین بوناپارٹ نے اس شہر کو فتح کر کے اپنی سلطنت ''بویریا'' میں شامل کر لیا تھا۔ یہ شہر ہٹلر کے دور

میں نازی پارٹی کا مرکز رہا۔ ہم نے وہ وسیع و عریض میدان بھی دیکھا جہاں ہٹلر اپنی پارٹی کے جلسے منعقد کیا کرتا تھا اور اس کا وزیر پروپیگنڈا گوئبلز اس کے ساتھ ساتھ ہوتا۔ نورن برگ میں انسانی حقوق اسٹریٹ'' خصوصی توجہ کی حامل ہے جہاں انسانی حقوق کے علمبردار کبھی کبھار جمع ہوتے ہیں۔ اس شہر میں بغیر ڈرائیور کے زیرِ زمین ریل چلتی ہے جو کہ موجودہ دور کی ٹیکنالوجی کی دنیا میں ایک نئی پیش رفت ہے اور ہم جیسے لوگوں کے لیے کسی عجوبے سے کم نہیں۔

اگلے روز ہم نے یہاں کے ایک بڑے اخبار ''نورن برگر'' کے دفتر اور پریس کا دورہ کیا۔ اخبار کے چیف ایڈیٹر اور ایڈیٹر نے ہمارے وفد کو خوش آمدید کہا اور اپنے اخبار کے بارے میں تفصیلی بریفنگ دی۔ گزشتہ ساٹھ برس سے شائع ہونے والا یہ اخبار ریاست بویریا کا سب سے بڑا اخبار ہے جس کے دس لاکھ سے زائد قارئین ہیں۔ یہ اخبار دنیا کی جدید ترین پرنٹنگ پریس مشینوں پر چھپتا ہے۔ روزنامہ نورن برگر کا اپنا تربیتی مرکز بھی ہے جہاں نئے آنے والے اخبار نویسوں کو صحافت کی باقاعدہ تربیت دی جاتی ہے۔

تاریخی شہر نورن برگ کا دورہ اختتام کو پہنچا، تو ہم اپنی اگلی منزل کی طرف روانہ ہوئے اور یہ منزل تھی یورپ کا خوبصورت ترین شہر فرینکفرٹ۔ ۲۳۰ کلومیٹر کا فاصلہ طے کر کے فرینکفرٹ پہنچے، تو شام کے سائے ڈھل رہے تھے اور سورج کی سنہری کرنیں دریائے مائین کی لہروں میں آخری ہچکیاں لے رہی تھیں۔ فرینکفرٹ کو جرمنی کا اقتصادی دارالخلافہ بھی کہا جاتا ہے کیونکہ دنیا بھر کے بینکوں اور کاروباری اداروں نے اس شہر کو اپنی اقتصادی سرگرمیوں کا مرکز بنا رکھا ہے۔ فرینکفرٹ میں ہمارا قیام صرف ایک رات تک محدود تھا اور اگلی صبح ہمارا ڈرائیور ہلمی اگلے سفر کے لیے ہمارا انتظار کر رہا تھا۔ ہماری اگلی منزل ڈوزلڈورف تھی جو کہ معاشی ترقی کے لحاظ سے جرمنی کا ایک اہم شہر ہے۔ یہ شہر جرمنی کے سابق دارالخلافہ بون اور خوشبوؤں کے شہر کولون کے بالکل قریب واقع ہے۔ سہ پہر کے وقت ڈوزلڈورف پہنچے، تو سیدھے ہولٹز برنک اسکول آف جرنلزم چلے گئے جہاں متعلقہ افسران ہمارے منتظر تھے۔ انھوں نے ہمیں اپنے ادارے کے تربیتی پروگراموں کے بارے میں آگاہ کیا۔ یہ ادارہ معاشی اور تجارتی یعنی کامرس رپورٹنگ کے حوالے سے دنیا بھر کے اخبار نویسوں کو تربیت فراہم کرتا ہے اور دنیا کے مختلف نشریاتی اور طباعتی ادارے اپنے کامرس رپورٹرز کو یہاں تربیت کے لیے بھیجتے ہیں۔

ڈوزلڈورف میں بہنے والا دریا رائین جرمنی کا مشہور دریا ہے۔ ایک ہزار کلومیٹر لمبا یہ دریا اٹلی سے جرمنی میں داخل ہوتا ہے اور نیدرلینڈ کے قریب سمندر میں جا گرتا ہے۔ ہماری اگلی منزل جرمنی کا شہر ایسن تھا جو صرف ۴۰ کلومیٹر کے فاصلے پر واقع تھا۔ یہاں ہم نے واض میڈیا گروپ کے دفاتر، پریس اور جرنلزم اسکول کا دورہ کرنا تھا۔ یہ میڈیا گروپ یورپ کے بڑے میڈیا گروپس میں شمار ہوتا ہے جو بیک وقت کئی اخبارات شائع کرنے کے علاوہ ریڈیو اسٹیشن اور ٹی وی چینل چلا رہا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ اس میڈیا گروپ نے بہت بڑا جرنلزم اسکول قائم کر رکھا ہے جہاں سینئر اخبار نویس اور شعبہ صحافت کے اساتذہ نئے آنے والے صحافیوں کو عملی صحافت کی تربیت دیتے ہیں۔ یہ ادارہ اخبارات کے ایڈیٹرز اور میڈیا منیجرز کے لیے جدید میڈیا ٹریننگ کا بھی اہتمام کرتا ہے۔ ۱۹۸۸ء سے لے کر اب تک یہ جرنلزم اسکول دنیا بھر کے ۳۰۰ صحافیوں اور مدیران کو صحافت کی اعلیٰ پیشہ ورانہ تربیت فراہم کر چکا ہے۔

ہوٹل پہنچے تو ہمارے دوست عبدالسّلام منتظر تھے جو ایسن کی یونیورسٹی میں کیمسٹری میں پی ایچ ڈی کر رہے ہیں۔ دیارِ غیر میں کسی اپنے سے مل کر جو خوشی اور مسرت ہوتی ہے وہ الفاظ میں بیان نہیں کی جا سکتی۔ یہ نوجوان کبھی پنجاب یونیورسٹی لاہور کے ہوسٹل میں میرے ساتھ رہائش پذیر رہا۔ ایک عرصے بعد ملاقات ہوئی تو پنجاب یونیورسٹی کی یادوں کو

تازہ کرنے کا موقع ملا۔ عبدالسّلام مجھے اور گل وہاب کو اپنے ساتھ گھر لے گیا جہاں اس کی بیگم نے ہمارے لیے پرتکلّف دعوت کا اہتمام کر رکھا تھا۔ چناں چہ جی بھر کر کھایا اور رات گئے ان کی فیملی کو الوداع کہا۔

ایسن سے ہماری اگلی منزل بریمن تھی جو کہ ناروے کی سرحد کے نزدیک جرمنی کا ایک قدیم شہر ہے۔ یہاں ہمارا قیام دو روز کا تھا اس لیے تسلّی سے سیر و سیاحت کا لطف اٹھایا۔ بریمن کے سٹی ہال کے باہر دھات سے بنا ہوا ایک مجسّمہ نصب ہے جس میں ایک گدھے پر کتا، کتے پر بلی اور بلی پر مرغا کھڑا ہے۔ بریمن کے لوگ اس مجسمے سے اتنی عقیدت اور محبّت رکھتے ہیں کہ اسے انھوں نے اپنا قومی نشان بنا رکھا ہے اور ان کے در و دیوار پر ہر جگہ اس مجسمے کی تصویر نمایاں نظر آتی ہے۔ یہ مجسّمہ ۱۸۲۷ء میں نصب کیا گیا تھا۔ بعض لوگوں کے خیال میں اِس گدھے کی ٹانگیں پکڑ کر جو بھی دعا مانگی جائے پوری ہوتی ہے لیکن اس کے لیے گدھے کی دونوں ٹانگوں کا پکڑنا ضروری ہے۔ اگر کسی نے صرف ایک ٹانگ پکڑ رکھی ہو تو لوگ کہتے ہیں ایک گدھے نے دوسرے گدھے کی ٹانگ پکڑ رکھی ہے، لہٰذا آپ کا کبھی بریمن جانا ہو، تو اس گدھے کی ایک ٹانگ ہرگز نہ پکڑیں بلکہ ہمارا مشورہ تو یہ ہے کہ گدھے کی ٹانگیں پکڑنے کے شغل سے محفوظ ہی رہیں، تو بہتر ہے۔ یورپ والوں کو یہ شوق پورا کر لینے دیں۔

بریمن کو بجا طور پر سیاحوں کا شہر کہا جاتا ہے کیونکہ یہاں بڑی تعداد میں غیر ملکی سیاح ہر وقت موجود ہوتے ہیں۔ ساڑھے پانچ لاکھ باشندوں کا یہ شہر بیک وقت شہر بھی ہے اور ریاست (سٹیٹ) بھی۔ تین سو سال پہلے شہر کے گرد ایک دیوار تعمیر کی گئی تھی جس کے بعض حصے آج بھی موجود ہیں یہاں تین یونیورسٹیاں ہیں جن میں ایک پرائیوٹ یونیورسٹی بھی شامل ہے۔ بریمن شہر کا ۶۰ فیصد حصہ جنگ عظیم دوم میں تباہ ہو گیا تھا لیکن جو ۴۰ فیصد بچا ہے اس میں بعض ایسے مکان بھی ہیں جو آج سے چھ سو یا سات سو سال پہلے بنائے گئے تھے اور ان میں آج بھی لوگ رہائش پذیر ہیں۔ یہاں کی ۹۰ فیصد آبادی پروٹسٹنٹ اور ۱۰ فیصد کیتھولک فرقے سے تعلّق رکھتی ہے۔ جبکہ دو فیصد یہودی اور ایک فیصد مسلم بھی یہاں رہائش پذیر ہیں۔

اگلی صبح ہوٹل میں ناشتے کی میز پر ہمارے میزبان سینئر پراجیکٹ منیجر ہنس جرگن بوسل نے انکشاف کیا کہ وہ جلد ہی نانا بننے والے ہیں۔ بنگلہ دیشی مندوب نے پوچھا آپ کے داماد کیا کرتے ہیں؟ بولے ''ابھی تک تو بیٹی کو کوئی مستقل بوائے فرینڈ بھی نہیں ملا۔'' ہم نے استفسار کیا'' آپ کو بغیر داماد کے نانا بننے پر کوئی پریشانی نہیں؟'' اس نے کہا'' یہ تو یہاں کا معمول ہے۔'' تھوڑی دیر بعد ہنس بوسل لندن بم دھماکوں کا ذکر کرتے ہوئے انتہائی رنجیدہ ہو گیا۔ ہمارے ایک ساتھی نے فوراً تبصرہ کیا'' اِس شخص کو لندن کے دھماکوں کی بہت فکر ہے۔ اس کے اپنے گھر میں کیا ہو رہا ہے اس کی اسے کوئی پرواہ نہیں۔''

ناشتے سے فارغ ہوئے، تو بریمن یونیورسٹی کی طرف عازم سفر ہوئے۔ یونیورسٹی کے شعبہ صحافت پہنچنے پر ان کے وائس چانسلر اور شعبے کے اساتذہ نے ہمیں خوش آمدید کہا۔ پروفیسر مس روسالی نے اپنے شعبے کے بارے میں بریفنگ دیتے ہوئے بتایا کہ وہ اپنے طلبہ کو ایک سمیسٹر کے لیے کسی دوسرے ملک بھیجتے ہیں اور اس سلسلے میں یورپی یونین انھیں فنڈز فراہم کرتی ہے۔ دنیا کی ۲۵۰ یونیورسٹیوں کے ساتھ انھوں نے طلبہ کے تبادلے کے معاہدے کر رکھے ہیں جن میں بھارت کی بعض یونیورسٹیاں بھی شامل ہیں۔

بریمن یونیورسٹی سے فارغ ہوئے، تو ہمبرگ جانے کا پروگرام بن گیا۔ طے پایا کہ شام کو واپس بریمن آ جائیں گے۔ ہمبرگ جرمنی کا دوسرا بڑا شہر ہے جس کا شمار دنیا کے بڑے صنعتی شہروں میں ہوتا ہے۔ دنیا بھر میں نیویا کریم یہیں سے بن کر جاتی ہے۔ میلوں پھیلے کارخانوں کو صرف مشینیں اور روبوٹ چلا رہے ہیں۔ صرف چند انسان دیکھ بھال کے لیے موجود ہوتے

ہیں۔ یہاں پر بہنے والے دریا البر پر بہت بڑی بندرگاہ ہے۔ جرمنی کی تمام مصنوعات یہیں سے بحری جہازوں میں پیک ہونے کے بعد دنیا کے گوشے گوشے کی طرف درآمد کردی جاتی ہیں۔شہر میں داخل ہوں تو دنیا کا ایک بڑا عجوبہ دیکھنے کوملتا ہے۔ دریائے البر کے اوپر کا پل سطح زمین سے انتہائی بلندی پر واقع ہے لیکن دریا کے نیچے بھی ایک راستہ ہے جو ساڑھے تین کلومیٹر کی سرنگ پر محیط ہے۔ یہ شہر جہاز سازی کی صنعت کے حوالے سے بھی شہرت رکھتا ہے۔۴۰ لاکھ باسیوں کے اس شہر کو ہر وقت سیلاب اور طوفان کا خطرہ رہتا ہے جس سے حفاظت کے لیے دریا کے ساتھ ساتھ بڑی بڑی دیواریں اور دروازے لگائے گئے ہیں۔ ہمبرگ کو پلوں کا شہر بھی کہا جاتا ہے کیونکہ یہاں پر چھوٹے بڑے سب ملا کر ۲۴۴۰ پل واقع ہیں جن میں سب سے بڑے پل کی لمبائی ساڑھے تین کلومیٹر ہے جبکہ چار زیر دریا سرنگیں بھی موجود ہیں۔

بریمن سے برلن کا سفر چار سو کلومیٹر ہے جو طے کرنے میں تقریباً پورا دن لگ گیا۔ راستے میں انسانوں کا بنایا ہوا دریا (Man-Made River) بھی ہے جو سطح زمین سے کافی بلندی پر بنایا گیا ہے اور اس ایک کلومیٹر کے دریا پر جرمن حکومت نے پچاس ارب یورو خرچ کر دیے۔ بنیادی طور پر یہ دریا دو دوسرے دریاؤں کو آپس میں ملانے کے لیے بنایا گیا ہے اور اس کی تعمیر سے بحری جہازوں کا راستہ ۱۲ کلومیٹر کم گیا ہے۔۱۹۹۸ء میں شروع ہونے والا یہ منصوبہ ۲۰۰۳ء میں پایہ تکمیل کو پہنچا۔ اس دریا میں داخل ہونے کے لیے بحری جہاز کو ۸۰ میٹر لمبی لفٹ میں داخل ہونا پڑتا ہے۔ یہ لفٹ جہاز کو اٹھا کر اوپر والے دریا میں ڈالتی ہے پھر اسی طرح اس دریا سے نکل کر دوسرے دریا میں جانے کے لیے نیچے اتارا جاتا ہے۔ دریا کے قریب ہی ریاست سیکسونی کی میلوں پھیلی نمک کی کانیں ہیں لیکن یہاں سے نمک بہت کم نکالا جاتا ہے کیونکہ ایٹمی سائنس دانوں کے خیال میں زیرزمین نمک کی کانیں کیمیائی لہروں کو پھیلنے سے روکتی ہیں۔

میرنبورن میں ہم نے جرمنی کی تقسیم کی یادگار دیکھی جہاں چھوٹی سی عجائب گھر نما عمارت میں تقسیم شدہ جرمنی کی بعض یادگاریں محفوظ کی گئی ہیں۔ یہاں پر ایک بہت بڑی چیک پوسٹ واقع ہے جہاں مشرقی جرمنی سے مغربی جرمنی میں داخل ہونے والوں کی تلاشی لی جاتی تھی تاکہ مشرقی جرمنی کا کوئی شہری مغربی جرمنی میں داخل نہ ہو سکے۔ یوں مختلف شہروں کا نوروزہ دورہ اپنے اختتام کو پہنچا اور ہم برلن میں اپنی رہائش گاہ اوسنابروکر میں پہنچ گئے۔

نو روز کا مسلسل سفر یقیناً تھکا دینے والا تھا لیکن یورپ کے خوبصورت اور سر سبز و شاداب مناظر نے تھکاوٹ کا احساس نہیں ہونے دیا۔ ہوا سے بجلی پیدا کرنے والے پنکھے (Wind Mills) دیہی علاقوں کی خوبصورتی میں بے پناہ اضافہ کرتے ہیں۔ جرمنی کا کوئی علاقہ ایسا نہیں جہاں بلندوبالا کھمبوں پر لگے ہوئے پنکھے ہوا کے رخ پر گھوم کر قدرتی مناظر کو حسین سے حسین تر نہ بنا رہے ہوں۔ واضح رہے کہ جرمنی میں بڑے پیمانے پر ہوا کے ذریعے بجلی پیدا کی جاتی ہے ہے۔

ہمارے میزبان ادارے نے ایک مذاکرے کا اہتمام کیا جس کا عنوان تھا "مغربی ذرائع ابلاغ کا ترقی پذیر ممالک سے سلوک" مذاکرے میں بعض سینئر اخبار نویسوں کو بھی مدعو کیا گیا تھا۔ ہمارے پاس اپنے دل کی بھڑاس نکالنے کا یہ بہترین موقع تھا اور ہم نے اپنا یہ قومی فرض پورا کیا۔ اتفاق سے اسی روز یورپ اور امریکا کے سب بڑے اخبار "ہیرالڈ ٹریبون" نے ایک تصویر شائع کی جس میں لاہور میں دینی مدارس کے طلبہ حکومتی اقدامات اور پولیس کے چھاپوں کے خلاف مظاہرہ کر رہے تھے۔ تصویر کے نیچے کیپشن تھا "پاکستان کے شہر لاہور میں مدارس کے طلبہ حکومت کے خلاف مظاہرہ کر رہے ہیں واضح رہے کہ یہ ملک دہشت گردی کا اڈا بن چکا ہے۔"

ہم نے تمام شرکا مذاکرہ سے پوچھا کہ پہلا جملہ تو تصویر کا

کیپشن ہے لیکن دوسرا جملہ کیا ہے؟ صحافت کا کون سا اصول اخبار کے ادارتی عملے کو اتنا بڑا فیصلہ صادر کرنے کا اختیار عطا کرتا ہے؟ ہمارے سوال کا اہل مغرب کے پاس سوائے معذرت کے کوئی جواب نہیں تھا۔

جولائی کے آخری ہفتے میں ہم نے پیرس کے لیے رخت سفر باندھنے کا عزم مصمّم کیا۔ گروپ کے ساتھیوں کو اپنی خواہش کے بارے میں بتایا، تو چار دوست اور تیار ہو گئے۔ یوں پانچ افراد کے مختصر گروپ کے ساتھ ۲۹ جولائی کی شام بذریعہ بس برلن سے پیرس روانہ ہوئے۔

پیرس رنگوں، خوشبوؤں، خوشیوں، بہاروں اور جھلمل جھلمل کرتی کہکشاؤں کا شہر۔ کرۂ ارض کا خوبصورت ترین شہر جسے دیکھنے کی تمنا زندہ دلوں میں ہمیشہ رہتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ہمیں اپنی یہ خوبصورت سرزمین دکھانے کا موقع دیا، تو ہم نے اس سے فائدہ اٹھایا اور بذریعہ بس پیرس جانے کا فیصلہ کیا تاکہ سرزمین یورپ کا زیادہ سے زیادہ حصہ اپنی آنکھوں سے دیکھ اور یورپ کے لہلاتے سبزہ زاروں کے نظاروں کا لطف اٹھا سکیں۔ برلن سے پیرس تک بذریعہ بس سفر ۱۴ گھنٹے کا ہے۔ نو گھنٹے جرمنی کی سرزمین پر اڑھائی گھنٹے بیلجیم میں سے گزر کر اور پھر اڑھائی گھنٹے فرانس کی حدود شروع ہونے سے لے کر پیرس پہنچنے تک لگتے ہیں یوں راستے میں ہمیں بیلجیم دیکھنے کا موقع بھی ملا اور یہاں کے دارالحکومت برسلز میں آتے جاتے مختصر قیام بھی کیا۔ برسلز کے بس اسٹاپ پر لندن، ایمسٹرڈم اور سوئٹزرلینڈ جانے والی بسیں بھی کھڑی تھیں ایسے لگ رہا تھا جیسے پورا یورپ ایک ہی ملک ہے جہاں لوگ اتنی آسانی سے سفر کر رہے ہیں۔ برسلز کی ٹھٹھرتی ہواؤں میں چند لمحات گزارنے کے بعد ہم پھر پیرس کی طرف عازم سفر ہوئے۔ فرانس کی حدود میں داخل ہوئے تو سورج کی کرنیں سیاہ رات کی تاریکی میں اپنا راستہ نکالنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ فرانس کے لہلہاتے سبزہ زاروں میں طلوع آفتاب کا منظر انتہائی دلکش لگ رہا تھا۔ پیرس کے اِنٹرنیشنل بس سٹاپ پر پہنچے، تو ہمارے افغان دوست اور یوگنڈان کورس فیلو کے دوست استقبال کے لیے موجود تھے۔ ان کی مدد سے ہوٹل تلاش کیا اور تھوڑا سا آرام کرنے کے بعد ایفل ٹاور کی طرف روانہ ہوئے۔

دنیا کا بلند ترین ٹاور ''ایفل ٹاور'' پیرس کی علامت بن چکا ہے۔ پیرس جانے والے ہر شخص کی پہلی خواہش ہوتی ہے کہ کسی طرح وہ ایفل ٹاور کی چوٹی تک پہنچ جائے۔ سبز رنگ کی ایک لوکل بس کے ذریعے ٹاور کی طرف روانہ ہوئے۔ آخری سٹاپ پر اُترے، تھوڑا سا پیدل چلے، تو دنیا کا یہ بلند ترین منار ہمارے سامنے تھا۔ ایفل ٹاور کا نام میں نے پہلی بار ۱۹۷۹ء میں اپنے والد صاحب سے سُنا تھا جو ائیر فورس کے ایک کورس کے سلسلے میں فرانس گئے تھے اور پیرس میں قیام ہونے کی وجہ سے انھوں نے ایفل ٹاور بھی دیکھا تھا۔ دنیا کے ہر رنگ، نسل، مذہب اور ملک کے ہزاروں سیاح مرد وزن ایفل ٹاور کے وسیع احاطے میں اپنی مسرتوں اور شادمانیوں کو سمیٹ رہے تھے۔ ایسے لگ رہا تھا جیسے ایفل ٹاور تک پہنچنا ان کی زندگی کا ایک بڑا مشن تھا جو آج پورا ہو گیا۔ منار کے اوپر جانے کے لیے ٹکٹ حاصل کرنا ضروری تھا اور تقریباً پانچ سو لوگ قطار میں کھڑے تھے۔ ٹکٹ (۱۱) یورو یعنی ۱۳۰۰ روپے کا ہے۔ خدا خدا کر کے ٹکٹ ملا، تو بے تابی کے ساتھ لفٹ میں داخل ہوئے۔ لفٹ نے منار کی درمیانی منزل پر اتارا۔ جہاں سے دوسری لفٹ میں منار کی چوٹی کی طرف روانہ ہوئے۔ لفٹ سے باہر نکلے، تو پیرس نامی دنیا کا خوبصورت ترین شہر ہماری نظروں کے سامنے تھا۔

جولائی کے مہینے میں شدید سرد ہوا چل رہی تھی۔ منار کے ساتھ بہتا دریا پیرس کی خوبصورتی کو چار چاند لگا رہا تھا۔ منار کی بلندی پر واقع ایک کمرے میں ایفل نامی سائنس دان کا مجسّمہ رکھا گیا ہے جس نے یہ منار آج سے ۱۲۶ سال پہلے ۱۸۸۹ء میں بنایا تھا۔ انسانی عقل دنگ رہ جاتی ہے کہ ۳۲۰ میٹر بلند دنیا کا یہ عظیم ترین منار آج سے ۱۲۶ سال پہلے کے لوگوں نے کیسے بنایا

ہو گا کیونکہ اس وقت سائنس نے بھی اتنی ترقی نہیں کی تھی۔ ایفل ٹاور نے ٹیلی ویژن کی ایجاد میں بھی اہم کردار ادا کیا کیونکہ اس منار سے ٹی وی سگنل بھیجنے کے کامیاب تجربے کیے گئے۔ ۱۲۶سال پرانا ٹاور آج بھی پوری دنیا کی توجہ کا مرکز ہے اور بڑی حد تک پیرس کی وجہ شہرت بھی۔ پیرس میں شام ڈھلنے کا منظر ہم نے ایفل ٹاور کی بلندی سے دیکھا اور پھر ہوٹل واپسی کا ارادہ کیا۔
اگلے روز صبح سویرے ہمارے افغان کورس فیلو کے دوست بشیر ہمارے پاس آگئے اور آج کے دن کے لیے گائیڈ کے طور پر اپنی خدمات پیش کیں جو ہم نے بخوشی قبول کر لیں۔ چناں چہ ان کے ساتھ لوری عجائب گھر کی طرف روانہ ہوئے جو دنیا کا سب سے بڑا عجائب گھر ہے۔ ہم نے دنیا کی سب سے بڑی نیوز ایجنسی اژانس فرانس پریس یعنی اے ایف پی کا مرکزی دفتر بھی دیکھا۔ اسی راستے میں فرانس کا شاہی محل اور شاہی باغ بھی دیکھے جو خوبصورتی اور دلکشی کا حسین منظر پیش کر رہے تھے۔ کافی دیر پیدل چلنے کے بعد لوری عجائب گھر ہمارے سامنے تھا۔ کسی زمانے میں یہ وسیع و عریض عمارت فرانس کا شاہی محل ہوا کرتی تھی لیکن اب یہ عجائب گھر میں تبدیل ہو چکی ہے۔ جہاں ہزاروں سال پرانے نوادرات اور مجسمے سیاحوں کی توجہ کا مرکز بنے ہوئے ہیں۔ اس عجائب گھر کا اہم ترین ورثہ لیونارڈو کی بنائی ہوئی مونا لیزا کی تصویر ہے جسے دنیا کی بہترین پینٹنگ اور مصوری کا شاہکار قرار دیا جا چکا ہے۔
لوری عجائب گھر میں داخل ہونے والا ہر شخص مونا لیزا کی تصویر دیکھنے کے لیے بے تاب نظر آتا ہے۔ سب سے زیادہ ہجوم اسی گیلری میں ہوتا ہے جہاں یہ تصویر لگائی گئی ہے۔ اٹلی کے معروف مصور لیونارڈو نے ۱۵۰۳ میں مونا لیزا کی تصویر بنانا شروع کی جو ۱۴سال بعد ۱۵۱۷ میں مکمل ہوئی۔ اس کے مرنے کے بعد مونا لیزا کی تصویر اس کے شاگرد سلائی کو ورثے میں ملی جسے فرانس کے بادشاہ فرانکس نے خرید لیا۔ اس وقت سے لے کر آج تک یہ تصویر حکومت فرانس کی ملکیت ہے۔
لوری میوزیم میں آج سے تین ہزار سال پہلے ایک شخص کی حنوط شدہ لاش بھی محفوظ ہے۔ میوزیم کے زیادہ تر مجسمے اور نوادرات دنیا بھر سے لوٹے ہوئے مال پر مشتمل ہیں جو مختلف ادوار میں فرانس کے حکمران اپنی محکوم سلطنتوں سے لوٹ کر یہاں پہنچاتے رہے۔ یہ حال صرف لوری عجائب گھر کا نہیں بلکہ یورپ کے تمام عجائب گھر محکوم ممالک سے لوٹے ہوئے مال سے بھرے پڑے ہیں۔ انصاف کی کوئی عالمی عدالت اگر یہ لوٹے ہوئے نوادرات ان کے اصل مالکوں کو واپس کرنے کا حکم صادر فرما دے، تو شاید یورپ کے عجائب گھر خالی ہو جائیں اور ان کو تالے لگانے پڑ جائیں۔ یورپ کی نوجوان نسل تسلیم کرتی ہے کہ ان کے عجائب گھروں کی رونق اور کشش لوٹے ہوئے مال کے سبب ہے۔
پیرس کا لوری عجائب گھر اتنا بڑا ہے کہ اس کے مخصوص حصے دیکھنے میں ہمارے پانچ گھنٹے صرف ہو گئے ورگرنہ تفصیلی طور پر یہ عجائب گھر دیکھنے کے لیے کئی دن درکار ہیں۔ پیرس کے ایک علاقے میں ہم نے عجیب منظر دیکھا۔ ہزاروں افراد قطار بنا کر کھڑے تھے۔ معلوم ہوا یہ سب تصویروں کی کسی نمائش کا ٹکٹ لے رہے ہیں جو پچھلے کئی دنوں سے جاری تھی۔ یقین کیجیے واقعی یہ ہزاروں لوگ کسی تصویری نمائش میں داخل ہونے کے لیے ٹکٹ حاصل کر رہے تھے۔ ہمارے ملک میں ایسا نہیں ہوتا۔
شام کو پیرس سے واپسی کا سفر شروع ہوا اور بس کے بالائی حصے میں چودہ گھنٹے کا طویل سفر کرنے کے بعد اگلی صبح برلن واپس پہنچ گئے۔ چند روز بعد برلن کے بدھا ریستوران میں ہمارا الوداعی عشائیہ تھا۔ اس موقع پر ہمیں کورس میں شرکت اور کامیاب تکمیل کے سرٹیفکیٹ دیے گئے۔ پھر ہم نے واپسی کے لیے رخت سفر باندھا اور موسم سرما کی اس سرد شام ہم نے یورپ کی سرزمین کو الوداع کہہ دیا۔ تھوڑی دیر بعد ہمارا جہاز ہوا کے دوش پر فراٹے بھرتا یورپ سے ایشیا کی جانب مائل بہ پرواز تھا۔

کافر بند

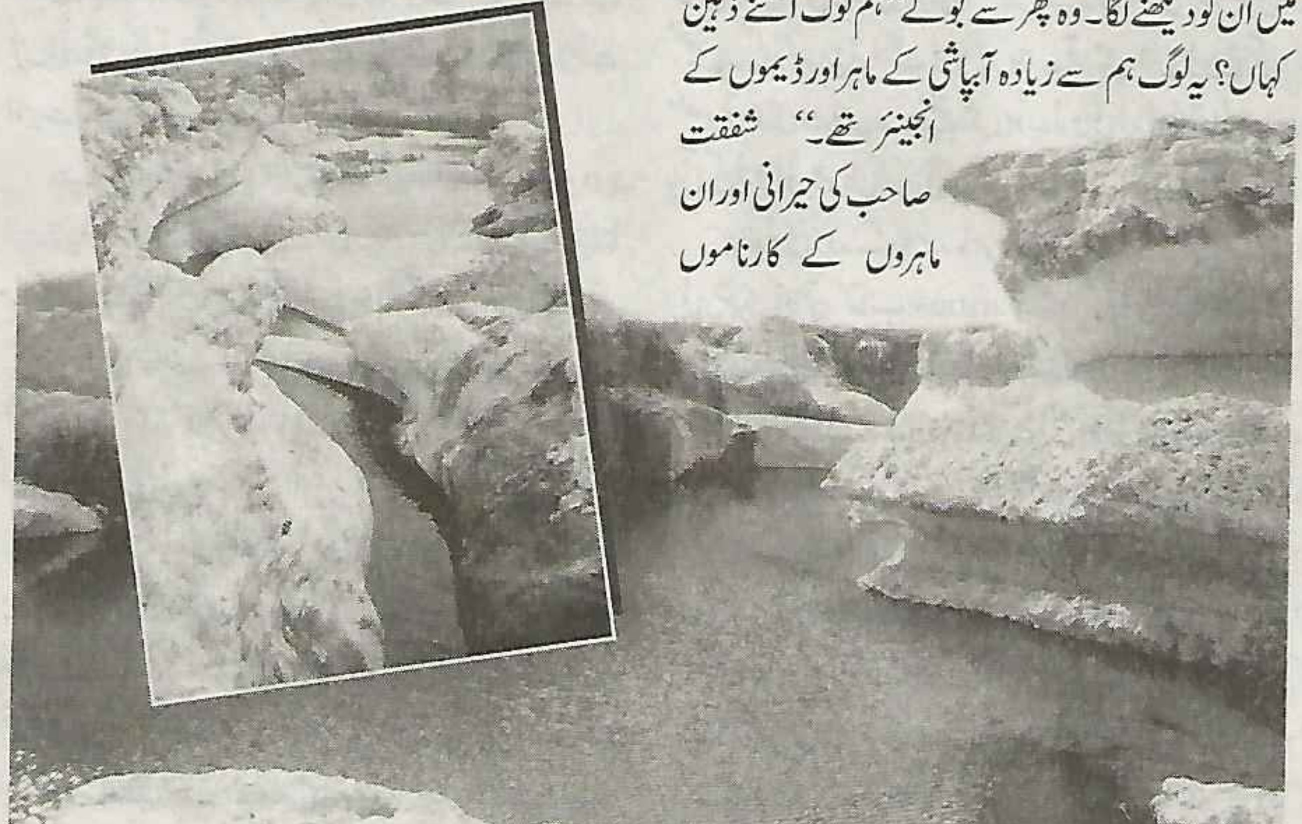
سندھ کا قدیم حیرت انگیز آب پاشی نظام جو صناعی میں اپنی مثال آپ ہے

غلام مصطفیٰ سولنگی

"یا خدا! یہ کیسے لوگ تھے، اتنے ذہین، ان کی مہارت اور ذہانت کو سلام ہے بھائی! میں تو حیران ہو گیا ہوں۔ ان کے ذہن تو کرشماتی طاقت رکھتے تھے۔" امن کوٹ کے قریب دھات اور پتھر کے دور کے انسانوں کے بنائے ہوئے ایک قدیم اور عالی شان ڈیم (بند) کو دیکھ کر میرے دوست اور ملک کے نامور ماہر آبپاشی انجینئر شفقت حسین ودھو کی کیفیت عجیب سی ہو گئی۔ میں ان کو دیکھنے لگا۔ وہ پھر سے بولے "ہم لوگ اتنے ذہین کہاں؟ یہ لوگ ہم سے زیادہ آبپاشی کے ماہر اور ڈیموں کے انجینئر تھے۔" شفقت صاحب کی حیرانی اور ان ماہروں کے کارناموں نے مجھے بھی حیرت میں ڈال دیا۔ کئی دنوں کی تلاش و جستجو کے بعد کھیرتھر پہاڑوں میں کئی ایسے ڈیم مل گئے، جنھیں مقامی لوگ گبر بند، کہتے ہیں۔ ان گبر بندوں کو اگر آبپاشی کا ایک مکمل نظام کہا جائے، تو غلط نہ ہوگا۔

سندھ کے پہاڑی علاقوں کاچھو اور کوہستان میں گبر بند کافی تعداد میں پائے جاتے ہیں۔ تاریخ سے پہلے دور کا ایک بند دیہہ تونگ (تھانہ بولا خان) میں موجود ہے، جسے کھکھر وارو گبر بند بھی کہا جاتا ہے۔ اس گبر بند کی لمبائی ۱۲۰ میٹر ہے، جبکہ اونچائی سات میٹر ہے۔ اسی علاقے میں 'گز گبر بند' نامی ایک اور ڈیم بھی موجود ہے۔ گز گبر بند ایک سو میٹر لمبا اور سات میٹر اونچا بند ہے۔ اس بند کے قریب اور بھی کئی چھوٹے چھوٹے گبر بند موجود ہیں۔

پتھر اور دھات کے دور کا ایک اور شاندار گبر بند رنی کوٹ کے قریب واقع ہے جسے 'رنی کوٹ گبر بند' کہا جاتا ہے۔ لگتا ہے



کہ یہ بند برساتی نالوں کے پانی کا رخ موڑنے کے لیے تعمیر کیا گیا ہے۔ یہ گبر بند ۱۳۰ فٹ لمبا اور ۵۰ فٹ اونچا ہے۔ اس کی بنیادیں ۷۰ فٹ کے قریب ہیں، جبکہ اس کی چوٹی صرف ۱۳ فٹ کشادہ ہے۔ یہ بند اتنا مضبوط ہے کہ اب بھی برساتی پانی کے تیز دھارے کو آسانی سے روک سکتا ہے۔ اس طرح کا ایک اور گبر بند، جسے 'گورمیر' کہا جاتا ہے۔ رنی کوٹ کے موہن گیٹ اور برج کے درمیان واقع ہے۔ اس کی بنیادیں ۵۷ فٹ کشادہ ہیں۔ یہ بھی آہستہ آہستہ کم ہو کر چوٹی پر صرف ۱۳ فٹ رہ جاتا ہے۔ یہ بند بھی پانی روکنے کے لیے تعمیر کیا گیا تھا۔ موہن گیٹ سے تقریباً سات کلومیٹر دور ڈاپھرے پہاڑ کے شمال میں 'گوری گبر بند' بھی موجود ہے۔ اس کی لمبائی ۱۳۰ فٹ، اونچائی ۵۰ فٹ جبکہ اس کی بنیادیں ۷۰ فٹ کشادہ ہیں۔

اس طرح کھیر تھر سلسلۂ کوہ میں پھیلے ہوئے درجنوں بندوں نے ماہرین آثارِ قدیمہ، تاریخ دانوں اور آبپاشی کے ماہروں کو ایک عرصے سے حیرت میں مبتلا رکھا ہے۔ یہ بند پتھر دھات کے دور کے ماہر انجینئروں کی طرف سے بنائے گئے ہیں اور جن کی آبپاشی اور زراعت کے حوالے سے زبردست اہمیت رہی ہے۔

یہ بند (Dams) یونان میں موجود سائیکوپیائی دیواروں سے زیادہ مماثلت رکھتے ہیں۔ ان دیواروں کے متعلّق کہا جاتا ہے کہ یہ ایک مبہم جُو قوم، پلاسجی، نے بنوائی تھیں۔ پلاسجی قوم کے کارناموں، مہارت اور ذہانت کا تذکرہ یونان کے عالمی شہرت یافتہ شاعر 'ہومر' اور بابائے تاریخ 'ہیروڈوٹس' نے بھی اپنی تحاریر میں کیا ہے۔

گبر بند بنیادی طور پر بہت بڑی دیواریں ہیں جو کہ پہاڑی نالوں اور ندیوں کے دہانوں کے درمیان اور ڈھلوانی علاقوں میں بنائے گئے ہیں۔ ان کے سائز اور ان کے تعمیراتی خواص ہر جگہ پر مختلف ہیں۔ کچھ تو ۵۰ فٹ سے زیادہ اونچے اور آٹھ سے دس فٹ چوڑے ہیں۔ ایک بند کی طوالت تو ایک کلومیٹر سے بھی زیادہ ہے۔ یہ بند عام طور پر دو اقسام کے ہیں۔ ایک قسم کے بند بڑے پتھروں سے بنائے گئے ہیں: جہاں پتھر ناہموار ہیں، وہاں چھوٹے ہموار پتھر لگا کر ان کو متوازن کیا گیا ہے تاکہ پانی باہر نکل کر ضائع نہ ہو جائے۔ دوسرے بند وہ ہیں جو نسبتاً چھوٹے ہموار پتھروں سے بنائے گئے ہیں۔ ان کی نفاست دیکھ کر اس دور کے انجینئروں کی مہارت کی داد دینا پڑتی ہے۔

کچھ عرصے تک یہ تصور عام تھا کہ یہ گبر بند دفاعی مقاصد کے لیے بنائے گئے، لیکن آثارِ قدیمہ کے ماہروں نے اس تصور کو یکسر رد کر دیا اور کہا کہ یہ بند خالصتاً بارش کا پانی محفوظ کرنے کے لیے بنائے گئے تھے تاکہ یہ پانی خشک موسم میں زرعی مقاصد کے لیے استعمال میں لایا جاسکے۔ کچھ بند تو پانچ یا چھ سیڑھیوں کی صورت میں بنے ہوئے ہیں تاکہ پہاڑوں سے آنے والے تیز پانی کو فوراً روکا جائے۔ چوں کہ یہ پانی پہاڑوں سے آتا تھا، لہٰذا اس میں معدنیات کی کافی مقدار بھی شامل ہوتی تھی۔ اس طرح فصلیں بے حد اچھی ہوا کرتی تھیں۔ کھیر تھر جیسے خشک اور بنجر علاقے میں اس طرح کی منصوبہ بندی اور اس کے نتیجے میں ہونے والی زرعی خوشحالی اور پانی کی فراوانی حیران کر دیتی ہے۔

برطانوی دور کے نامور ماہر آثارِ قدیمہ چارلس میسن نے اپنی شہرۂ آفاق کتاب "Narratives of various journeys in Balochistan, Afghanistan and Punjab" جو کہ ۱۸۴۴ء میں شائع ہوئی تھی، میں سندھ میں پائے جانے والے گبر بندوں کا تذکرہ کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''سندھ میں جتنے بھی قدیم آثار ہیں، ان کی اہمیت اپنی جگہ، لیکن وہاں کے پہاڑی علاقوں میں موجود پتھر کی دیواریں کسی عجوبے سے ہرگز کم نہیں۔ مقامی لوگ ان کو ''کافر بند'' کہتے ہیں۔ یہ بند تقریباً پورے پہاڑی علاقے میں پائے جاتے ہیں۔''

میسن نے یہ بھی لکھا ہے کہ یہ بند دفاعی مقاصد کے لیے تعمیر کیے گئے تھے، لیکن انگریز دور کے ایک اور اسکالر ڈاکٹر کوکس، جس نے دعویٰ کیا تھا کہ وہ سارے گبر بند دیکھ چکے ہیں، نے میسن کی رائے سے اختلاف کیا ہے۔ انھوں نے لکھا ہے کہ ''یہ بند کھیتوں کو پانی فراہم کرنے کی غرض سے بنائے گئے تھے۔''

۱۹ویں صدی کے اواخر میں گبر بندوں پر کافی تحقیقی کام ہوا، لیکن جب بیسویں صدی کے اوائل میں آر۔ہگ ٹبلر کی رپورٹ ''گبر بند'' شائع ہوئی، تو ایک تہلکہ مچ گیا۔ یہ رپورٹ آرکیالوجیکل سروے آف انڈیا (۱۹۰۳-۴۰ء) میں شائع ہوئی تھی۔ اس رپورٹ کی اشاعت کے بعد 'گبر بند' بڑی اہمیت حاصل کر گئے اور اس طرح کافی مغربی اسکالرز نے ان پر تحقیقی کام شروع کر دیا۔ ان اسکالرز میں سر اورئیل اسٹائن کا نام بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ انھوں نے اپنی کتاب "An Archaeological tour of Gedrosia" (شائع شدہ ۱۹۳۱ء) میں لکھا ہے کہ 'گبر بند' مقامی پتھروں سے بنائی گئی عالیشان دیواریں ہیں جو کہ کئی فٹ اونچی اور کئی فٹ چوڑی ہیں۔ یہ دیواریں آبپاشی کے ایک زبردست نظام کی حیثیت رکھتی ہیں اور اس دور کے انجینئرز کا ایک شاندار کارنامہ ہیں۔'' ان بندوں کی تعمیر کے مقصد کے متعلق وہ لکھتے ہیں کہ یہ دیواریں پانی محفوظ کرنے کے حوالے سے اپنی مثال آپ ہیں۔ ان دیواروں کے ذریعے بارش کا پانی اور پہاڑوں سے پگھلتی برف کا پانی جمع کرنے کا بندوبست کیا جاتا تھا۔ یہ بند آبپاشی کے ایک منفرد نظام کا پتا دیتے ہیں۔

عالمی شہرت یافتہ ماہر آثار قدیمہ سر مارٹیمر ویلر، جو سندھ میں قدیم آثاروں کی دریافت اور کھدائی کی سرگرمیوں میں پیش پیش رہے، نے اپنی کتاب "The Indus Civilization" (شائع شدہ ۱۹۶۰ء) میں لکھا ہے: ''سندھ کے پہاڑی علاقوں میں کئی جگہوں پر بہت سارے ڈیم یا گبر بند موجود ہیں۔ یہ پتھروں سے تعمیر کیے گئے ہیں۔ ان بندوں کی موجودگی سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان دنوں بہت زیادہ بارشیں ہوا کرتی تھیں اس لیے ان کی تعمیر کی ضرورت شدت سے محسوس کی گئی اور دوسرا یہ کہ یہاں زراعت کا ایک مستحکم سرشتہ موجود تھا۔ اس لیے پانی کو ضابطے میں رکھنا اور اسے محفوظ کرنا ازحد ضروری سمجھا جاتا ہے۔''

لہٰذا آثار قدیمہ کے ماہرین اس بات پر متفق ہیں کہ گبر بند، ڈیم ہیں اور ان کے ذریعے پانی جمع کیا جاتا تھا۔ تاہم برطانوی دور کے ایک ماہر آبپاشی اور انجینئر رابرٹ ایل ریکس اس رائے سے کم ہی متفق نظر آتے ہیں۔ انھوں نے ان گبر بندوں کا ایک طویل عرصے تک مطالعہ کیا اور پھر روم (اٹلی) سے شائع ہونے والے ایک تحقیقی جرنل "The East and the West" (جنوری ۱۹۶۴ء تا مارچ ۱۹۶۵ء) میں اپنی ایک رپورٹ شائع کرائی۔ وہ لکھتے ہیں: ''گبر بند کچھ بھی ہوں، لیکن یہ صحیح معنوں میں ڈیم کہلانے کے مستحق نہیں ہیں کیوں کہ ان کی تعمیر ڈیموں جیسی نہیں ہے۔ ان کا مقصد بارش کا پانی جمع کرنا نہیں تھا بلکہ برسات کے پانی کا رخ ڈھلوانی علاقوں کی طرف موڑنا تھا۔'' تاہم ریکس نے ان ڈیموں کے معماروں کو زبردست خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ''ماضی کے یہ نامعلوم لوگ بڑے عقل مند اور منصوبہ بندی کے ماہر تھے۔ انھوں نے ان ڈیموں کا سوچا ہوگا اور پھر ان کو عملی صورت دی ہوگی۔ سچ تو یہ ہے کہ یہ لوگ دنیا میں آبپاشی کے اوّلین ماہر کہلانے کا حق رکھتے ہیں۔''

لیکن یہ لوگ کون تھے؟ اس سوال کا جواب آج تک کوئی بھی نہیں دے سکا ہے۔ مقامی لوگ جن کی معلومات بے حد محدود اور روایات پر مبنی ہیں، کہتے ہیں کہ یہ بند کافروں نے تعمیر کیے تھے۔ یہ کافر لوگ شمالی علاقوں سے آئے اور یہاں انھوں نے یہ بند تعمیر کیے تھے۔ "Encyclopedia of Ethics and Regligion" کے مطابق الفاظ 'گبر،

گابر، اور گوئبر کی اصلیت غیر یقینی ہے، لیکن فارسی لغت نویسوں نے ان تینوں الفاظ کو عربی لفظ 'کافر' سے ملا دیا ہے۔ عربی زبان میں کافر کے دو معنی لیے جاتے ہیں۔ ایک خدا کو نہ ماننے والا اور دوسرا زرتشت کے ہیں۔''

لفظ 'گبر' سندھ، بلوچستان، ایرانی اور ترکی میں بھی مروج ہے، لیکن اس کے تلفظ میں تھوڑا بہت فرق ضرور موجود ہے۔ ترکی میں لفظ 'گیابر' مستعمل ہے، جس کی بنیاد 'گبر' ہی ہے اور اس کے معنی بھی 'کافر' ہیں۔ فارسی زبان میں کافر کو 'گوز' اور 'گوَز' بولا جاتا ہے۔ گبر اور گور سندھی، بلوچی اور لاسی زبانوں میں 'کافر' اور 'ہندو' کو کہا جاتا ہے۔ اس کے دوسرے معنی زرتشتی یا آگ کا پجاری بھی ہیں۔ سندھی زبان میں خوشحال یا مالدار آدمی کو بھی گبر کہا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ کردش زبان میں 'گیبر' آرمینیائی اور روسی لوگوں کو کہتے ہیں۔

اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ سارے بند اس خطے میں اسلام کی آمد سے پہلے تعمیر کیے گئے تھے۔ اس سلسلے میں نامور انگریز تاریخ دان H.T Lambrick کی رائے ان کی کتاب "General introduction to the History of Sindh" جو کہ سندھی، ادبی بورڈ جامشورو سے شائع ہوئی ہے، میں دیکھنا ضروری ہے۔ وہ لکھتے ہیں ''یہ بات خارج از امکان نہیں کہ فارس کے آرکمینائی حکمرانوں (۲۳۰۔۵۵۰ قبل مسیح) یا پھر ساسانی حکمرانوں (۶۴۰۔۲۱۱ عیسوی) سے فلاحی کاموں کے طور پر ان بندوں کو تعمیر کرایا ہو، کیوں کہ یہاں قدرت کچھ کم ہی مہربان تھی۔ اس لیے پانی کے ڈیم بنانا از حد ضروری تھا۔''

اس ضمن میں ایچ ٹی لیمبرک نے آر۔ ہوگس بُلر کی رائے کا بھی حوالہ دیا ہے۔ بُلر وہ پہلے ماہر تھے جس نے سب سے پہلے گبر بندوں کے متعلق لکھا تھا۔ اس نے کہا کہ قدیم ایرانیوں نے مغربی فارس میں موجود قارون اور شستر ندیوں پر اور ان کے آس پاس اس طرح کے بند بنائے تھے تاکہ پانی ذخیرہ کیا جا سکے۔ لہٰذا کہا جا سکتا ہے کہ سندھ میں بھی ایرانیوں نے ہی یہ بند بنائے ہوں گے۔ بُلر کا جھکاؤ ایک اور نظریے کی طرف بھی زیادہ محسوس ہوتا ہے۔ وہ یہ کہ ممکن ہے کہ یہ گبر بند زرتشتیوں نے تعمیر کیے ہوں، کیوں کہ ان گبر بندوں کے آس پاس اسے کئی قبریں بھی نظر آئی تھیں جو کہ اس کے خیال میں ان لوگوں کی ہو سکتی ہیں، جنھوں نے یہ گبر بند بنائے تھے۔ یہ قبریں یقیناً اسلامی دور سے پہلے کی ہیں۔

بُلر کی اس رائے سے اتفاق نہیں کیا جا سکتا۔ سندھ کے پہاڑی علاقوں میں پھیلے ہوئے گبر بند زرتشتیوں کی یہاں آمد سے پہلے کے ہیں۔ زرتشت کی پیدائش کے متعلق یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہا جا سکتا، تاہم "Encyclopedia Britannica" میں لکھا ہے کہ ''سترہویں صدی قبل مسیح کے اواخر اور سولہویں صدی قبل مسیح کے شروع میں زرتشت نے قدیم ایرانیوں کے مذہب کی اصلاح کی اور پھر ۱۵۰۰ قبل مسیح سے پہلے یہ مذہب ہند، ایرانی علاقوں میں پھیل گیا تھا۔''

اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ان گبر بندوں کی زرتشتیوں کے ہاتھوں تعمیر کا کوئی امکان ہی نہیں۔ ان بندوں کے معمار زرتشتیوں سے پہلے کے کوئی لوگ تھے۔ بُلر نے ان بندوں کے قریب قبریں دیکھی ہیں، لیکن زرتشتی تو مردوں کو دفن کرتے یا جلاتے نہیں ہیں۔ آگ ان کے نزدیک ایک مقدس چیز ہے۔ وہ اپنے مردوں کو ''خاموشی کا منار'' (Tower of Silence) میں رکھتے ہیں۔ اب ہمیں ان لوگوں کو دیکھنا ہے جو زرتشتیوں سے پہلے یہاں آئے تھے اور مردوں کو دفناتے تھے اور یہ بھی دیکھنا ہے کہ آیا وہ آگ کو ایک مقدس علامت کے طور لیتے تھے یا اس کی پوجا کرتے تھے۔

کراچی کی نامور پارسی شخصیت مسٹر سہراب کٹرک نے اپنی کتاب "Who are the Parsees" میں لکھا ہے: ''پارسیوں نے تدفین کی رسومات زرتشت سے قبل کے لوگوں

سے اخذ کی ہیں۔ میگی لوگ اپنے مردوں کو دفن کرنے کے بجائے ایک گول جگہ پر رکھتے تھے۔ یہ رسم ان کے ہاں تین ہزار سال تک رہی۔"

گبر بندوں کو سوچتے ہوئے پلاسجی لوگ بھی ذہن میں آتے ہیں۔ یہ مہم جو اور موقع پرست لوگ تھے۔ ایک جگہ رکتے نہیں تھے اور غائب ہونے کے لیے ہی ظاہر ہوتے تھے۔ یہ ۱۸۰۰ قبل مسیح یونان میں آئے اور ہیلینز (Hellenes) لوگوں کے پیش رو تھے۔ وہ کون سی زبان بولتے تھے؟ کچھ معلوم نہیں ہوسکا ہے۔ لیکن یہ طے ہے کہ وہ جو زبان بھی بولتے تھے، وہ یونانی ہرگز نہیں تھی۔

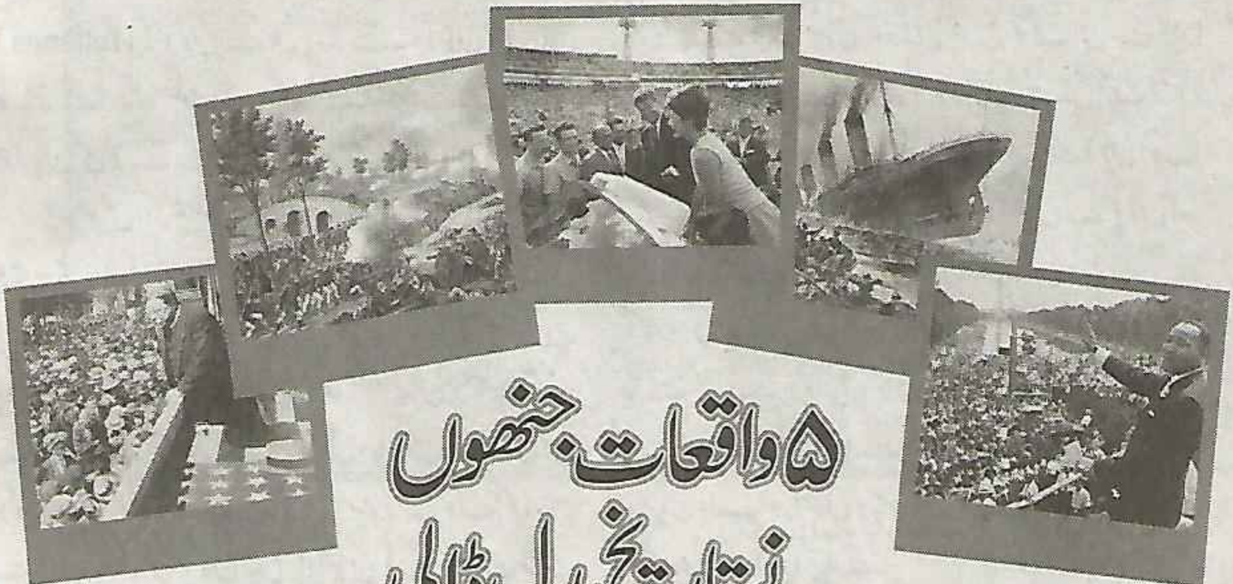
چودھویں اور تیرھویں صدی قبل مسیح میں جنوبی اور مرکزی یونان میں بہت ہی طاقتور ریاستیں تھیں جو کہ بہت ہی ترقی یافتہ تہذیب کی مالک بھی تھیں۔ ان میں سے کچھ ریاستوں پر پلاسجی، قبائل کی حکومت قائم تھی۔ بعدازاں ان کو ہیلینز قبائل نے حکمرانی سے محروم کر کے باہر دھکیل دیا۔ اس بحث میں ان لوگوں کو بھی لانا ضروری ہے جنھیں 'سمندر کے لوگ' کہا جاتا ہے۔ ان سمندری لوگوں میں پلاسجیوں کی خصوصیات شامل تھیں۔ یہ لوگ کئی مرتبہ مصر پر حملے کر چکے تھے۔ بالآخر مصر کی تاریخ کے ایک نامور اور بہادر حکمران رامیسس دوم (۱۲۳۴۔۱۳۰۱ قبل مسیح) نے ان کی کمر توڑ دی۔

"Cambridge Ancient History" کے مطابق یہ لوگ نہ صرف آبادیوں پر حملے کرتے تھے، بلکہ وہ اپنے سازوسامان اور بیوی بچوں سمیت مختلف علاقوں میں مسلسل ہجرت کرتے رہتے تھے۔ انھوں نے زیادہ تر حملے یورپ اور ایشیا کی آبادیوں پر کیے تھے۔ یہ لوگ کون سی زبان بولتے تھے؟ وہ کہاں سے آئے اور کہاں گئے؟ یہ ایک سوالیہ نشان ہے۔ قدیم اور جدید دور کے خانہ بدوشوں کی طرح وہ جگہ جگہ پھرتے رہتے تھے۔ ان کی ایک نسل تھی اور نہ ہی ایک زبان۔ عظیم کرناک نامی مخطوطات میں مصریوں نے ان کے متعلق لکھا ہے کہ یہ وہ لوگ تھے جو ہر علاقے سے آتے رہتے تھے۔

یونان کی تاریخ کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ پلاسجی لوگ آگ کے پجاری اور ہیفائسٹس دیوتا کے پیروکار تھے۔ ہیفائسٹس ہیلیمنیائی دور سے پہلے کا آگ کا دیوتا تھا اور ایشیا مائنر کے علاقے لائسیا میں موجود اولمپس پہاڑ کے قریب رہتا تھا۔ بعدازاں لائسیا کے لوگ (لائسیائی) لیمنوز کی طرف ہجرت کر کے چلے گئے۔ وہاں وہ پلاسجی کہلائے۔ انھوں نے پتھروں سے آگ جلائی اور اس طرح آگ ان کے دیوتا ہیفائسٹس کی علامت بن گئی۔ لیمنوز ایشیا مائنر میں ایک جزیرہ ہے جو کہ یونان اور اٹلی سے ملحق ہے۔ پلاسجی بہت ذہین ہونے کے ساتھ ساتھ ماہر تعمیرات بھی تھے اور انھوں نے یونان اور اٹلی میں سائیکوپیائی دیواریں تعمیر کی تھیں۔ ان دیواروں کے آثار ابھی تک ترائین، ارگوس اور مائسیناٸی علاقوں میں دیکھے جاسکتے ہیں۔ یہ دیواریں کافی موٹی ہیں اور پتھر کے بہت بڑے اور بھاری بلاکوں سے بنائی گئی ہیں۔ ان پتھروں کے درمیان والے سوراخوں کو چھوٹے چھوٹے پتھروں سے بھر کر دیواروں کو ہموار کیا گیا ہے۔

لہٰذا کہا جاسکتا ہے کہ کسی زمانے میں پلاسجی یہاں آئے ہوں، انھوں نے سندھ کے پہاڑی علاقوں میں رہائش رکھی ہو اور اس طرح یہ گبر بند تعمیر کیے ہوں۔ کھیرتھر کے کئی ایک علاقوں میں پھیلے ہوئے گبر بند ان کے تعمیر اور آبپاشی کے ماہر ہونے کا ثبوت ہیں۔

یہ محض ایک رائے ہے، لیکن ٹھوس شواہد کی عدم دستیابی کے باعث گبر بندوں کے معماروں اور ان کے دور تعمیر کا معاملہ ایک کھلا سوال بن جاتا ہے۔ اس سوال کا جواب عین ممکن ہے کہ ان لاکھوں ٹن پتھر کے ڈھیروں میں دفن ہو، جو دامن کھیرتھر میں جا بجا موجود ہیں۔ لہٰذا ضرورت اس امر کی ہے کہ پتھر اور دھات کے اس دور کے ٹیلوں میں منظم تحقیق کر کے نتائج برآمد کیے جائیں۔



۵ واقعات جنھوں نے تاریخ بدل ڈالی

بعض اوقات انسان کو معمولی بھول چوک کا بھی خمیازہ بھگتنا پڑتا ہے...... خصوصی رپورٹ

قطب الدین

یہ ۲۸؍اگست ۱۹۶۳ء کی دوپہر تھی جب مارٹن لوتھر کنگ جونیئر تقریر کرنے مائیک پر آئے۔ ان کے سامنے ڈھائی لاکھ انسانوں کا سمندر ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ یہ لوگ نسلی تعصّب کے خلاف احتجاج کرنے امریکی دارالحکومت، واشنگٹن میں جمع ہوئے تھے۔ مارٹن لوتھر سیاہ فام راہنما تھے، ان سیاہ رنگ انسانوں کے قائد جنھیں سفید فام امریکیوں نے اپنا غلام بنا رکھا تھا۔ یہ متکبّر سفید فام سیاہ رنگ انسانوں کو پاؤں کی جوتی سمجھتے اور ان پر ظلم وستم ڈھاتے تھے۔ حالانکہ ٹھیک ایک سو برس پہلے ۱۸۶۳ء میں لیجنڈری امریکی صدر، ابراہام لنکن نے سیاہ فاموں کو غلامی سے آزاد کردیا تھا۔ تاہم وہ سفید فاموں کی متکبّرانہ ذہنیت تبدیل نہ کرسکے۔

بیسویں صدی میں جب انسانی حقوق کا بول بالا ہوا، تو پابندیوں میں جکڑے امریکی سیاہ فاموں نے بھی تحریک آزادی کا آغاز کیا۔ مارٹن لوتھر اسی تحریک کے سرگرم راہنما تھے۔ انھوں نے سفید فام اکثریت کی آمریت کے خلاف زوردار مہم شروع کردی۔ اس دوران سیاہ فاموں اور سفید فاموں کے مابین فساد بھی ہوا جس کی بنا پر سفید فام امریکی حکومت نے مارٹن لوتھر کو ''دہشت گرد'' قرار دے دیا۔

سیاہ فام لیڈر اور امریکی حکومت کے درمیان تعاون جاری تھا کہ ایک نوجوان سفید فام، جان کینیڈی برسرِاقتدار آگیا۔ یہ نوجوان اکثر سفید فاموں کے برعکس نسلی تعصّب کو ذہنی مرض سمجھتا تھا۔ اس لیے وہ سعی کرنے لگا کہ سیاہ فام امریکیوں کو ان کے حقوق مل جائیں۔ اس سلسلے میں صدر کینیڈی نے جون ۱۹۶۳ء میں شہری حقوق (سول رائٹس) کے قوانین کا ایک مجموعہ پیش کردیا۔

یہ سیاہ فاموں کو بنیادی شہری حقوق عطا کرتے تھے، اسی

لیے انھوں نے سول رائٹس قوانین کا خیر مقدم کیا۔ تاہم بنیاد پرست سفید فام شہری سیاہ فاموں کی حمایت کرنے پر صدر کینیڈی کو نشانہ بنانے لگے۔ تب مارٹن لوتھر کنگ نے فیصلہ کیا کہ قوانین کی حمایت کے واسطے ملک بھر میں جلسے منعقد کیے جائیں اور جلوس بھی نکلیں۔

اس ضمن میں ۲۸ راگست کو واشنگٹن میں ایک بہت بڑا جلوس نکالا گیا جو ''مارچ آن واشنگٹن'' کے نام سے مشہور ہوا۔ اس میں امریکا بھر سے ڈھائی لاکھ امریکی شریک ہوئے۔ شرکا میں ۸۰ فی صد سیاہ فام تھے جنھیں سنہرے مستقبل کی آس جلوس میں کھینچ لائی۔ بعدازاں امریکا کی سول رائٹس تحریک میں اسے سب سے بڑا جلوس قرار دیا گیا۔

مارٹن لوتھر کنگ نے جلوس سے خطاب کے لیے خصوصی تقریر تیار کی تھی۔ اسی لیے جب وہ نوٹس سنبھالتے ڈائس پر آئے، تو لوگوں نے انھیں تعجّب سے دیکھا۔ دراصل مارٹن لوتھر عموماً فی البدیہہ تقریر کرتے تھے۔ امریکی سیاہ فاموں کے بڑے لیڈر کا خطاب شروع ہوا۔ انھوں نے تقریر میں امریکی اعلان آزادی، امریکی آئین اور اس اعلان کا ذکر کیا جس کے ذریعے صدر ابرہام لنکن نے سیاہ فام غلاموں کو آزادی دی تھی۔

تقریر اختتامی مرحلے میں تھی کہ اچانک مشہور سیاہ فام گلوکارہ، ملیحہ جیکسن کھڑی ہوئی۔ اس نے چیخ کر مارٹن لوتھر سے کہا ''مارٹن! انھیں اپنے خواب کے بارے میں تو بتاؤ۔''

مارٹن لوتھر اکثر اپنی تقریروں میں ''اپنے خواب'' کا ذکر کرتے تھے۔ خواب یہ تھا کہ مستقبل میں امریکا کو کیسا ہونا چاہیے۔ مارٹن لوتھر نے ملیحہ جیکسن کی بات سنی، تو کچھ دیر خاموش رہے۔ پھر ہاتھ میں پکڑے نوٹس ایک طرف رکھے اور فی البدیہہ تقریر کرنے لگے۔ تب مارٹن نے اپنی خطیبانہ صلاحیتوں کا بھرپور مظاہرہ کیا اور اپنے نظریے کا نچوڑ تقریر میں بیان کر ڈالا۔

اس تقریر کا کمال تھا کہ کئی سفید فام بھی سیاہ فاموں کی سول رائٹس موومنٹ کے حامی بن گئے۔ یوں صدر کینیڈی کے لیے نئے قوانین متعارف کرانا آسان ہو گیا۔ اسی تقریر کی بنیاد پر مشہور رسالے، ٹائم نے مارٹن لوتھر کو مسلسل دو سال (۱۹۶۳ء اور ۱۹۶۴ء) ''سال کی بہترین شخصیت'' قرار دیا۔ مزید برآں اسی تقریر نے انھیں امن کا نوبل انعام بھی دلوایا۔

دلچسپ بات یہ کہ مارٹن لوتھر کی تقریر کا اصل نام ''نارملیسی، نیور اگین'' (Normalcy, Never again) تھا۔ مگر جب مارٹن لوتھر نے ''اپنے خواب'' کی تشریح کی، تو وہ ''آئی ہیو اے ڈریم'' (I have a Dream) کہلائی۔ امریکی عوام اسے بیسویں صدی کی عظیم ترین ملکی تقریر قرار دیتے ہیں۔ اس تقریر نے امریکا میں سفید فاموں کا ذہنی رویہ بدلنے میں اہم کردار ادا کیا۔

گو امریکا میں اب ایک سیاہ فام صدر بن چکے، مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ آج بھی امریکی معاشرے میں نسلی تعصّب موجود ہے۔ خاص طور پر گورے پولیس والے سیاہ فام نوجوانوں پر تشدد کرنا اپنا حق سمجھتے ہیں۔ امریکی سفید فام پولیس میں یہ خیال عام ہے کہ تمام سیاہ فام جرائم پیشہ ہوتے ہیں۔

مارٹن لوتھر کنگ کی انقلابی تقریر کے بعض جملے درج ذیل ہیں:

۱۔ ''میں نے یہ خواب دیکھا ہے کہ میرے چاروں ننھّے بچے ایک دن ایسی قوم کے باسی ہوں گے جہاں انھیں رنگ و نسل نہیں کردار کی پختگی کے اعتبار سے جانچا جائے گا۔ میں آج یہ خواب دیکھ رہا ہوں۔''

۲۔ ''میں نے ایک اور خواب دیکھا ہے۔ یہ کہ ایک دن ساری امریکی قوم مل کر یہ سچائی بیان کرے گی کہ تمام انسانوں

کو برابری کے ساتھ تخلیق کیا گیا ہے۔"

۳۔ بھائیو اور دوستو! ہم بے انتہا مشکلات برداشت کر رہے ہیں اور آنے والے دنوں میں بھی دکھ اٹھائیں گے۔ مگر میں اب بھی ایک خواب دیکھ رہا ہوں.....

ایک غلطی جو نہایت مہنگی ثابت ہوئی

آج کی سپر پاور، امریکا اپریل ۱۸۶۱ء تا مئی ۱۸۶۵ء زبردست خانہ جنگی کا شکار رہا۔ اس کی اصل وجہ یہ تھی کہ امریکا کی سات جنوبی ریاستیں سیاہ فام باشندوں کو غلام کے روپ میں دیکھنے کی خواہش مند تھیں۔ جبکہ بقیہ ریاستوں نے غلامی ختم کرنے کا تہیہ کر لیا۔ جب ان ریاستوں کے نمائندے، ابرہام لنکن صدر بنے، تو جنوبی ریاستوں نے بغاوت کر دی۔ ان ریاستوں کو کنفیڈریٹ (Conferderate) ریاستیں کہا گیا۔

ان ریاستوں کی فوج میں تقریباً دس لاکھ سپاہی شامل تھے۔ جنرل رابرٹ لی اس فوج کا قابل ترین جرنیل تھا۔ اس نے مشرقی محاذ جنگ پر امریکی افواج کو کئی شکستیں دیں۔ ۴ ستمبر ۱۸۶۲ء کو اس نے شمالی امریکا کی سمت حملہ کر دیا تا کہ دارالحکومت واشنگٹن پر قبضہ کر سکے۔ اگر یہ مہم کامیاب رہتی، تو امریکی افواج کا حوصلہ پست ہو جاتا۔ تب ممکن تھا کہ کنفیڈریٹ فوج جیتنے میں کامیاب رہتی۔

جنرل رابرٹ لی کی فوج میں انتہائی تجربے کار ساٹھ ہزار فوجی شامل تھے۔ ۹ ستمبر کو جنرل رابرٹ نے اپنی فوج کے اعلیٰ افسروں کے نام ایک خفیہ پیغام جاری کیا۔ اس میں عسکری مہم کی تمام تفصیلات درج تھیں۔ جنرل رابرٹ نے اپنی فوج کو پانچ حصوں میں تقسیم کر دیا تھا۔ ہر حصے نے تزویراتی لحاظ سے اہم مقام پر قبضہ کرنا تھا۔ آخر میں واشنگٹن کے نزدیک تمام حصے یکجا ہو جاتے۔ پیغام میں راستوں کی تفصیل بھی درج تھی۔

امریکی تاریخ میں یہ پیغام "اسپیشل آرڈر ۱۹۱" کہلاتا ہے۔ جنرل رابرٹ نے پیغام کی پانچ نقول تیار کرائیں اور فوج کے پانچوں جرنیلوں کو بھجوا دیں۔ ایک نقل میجر جنرل ڈی ایچ ہل کو بھجوائی گئی۔ اس جرنیل کی فوج نے پیچھے رہ کر بقیہ حصوں کی چوکیداری کے فرائض نبھانے تھے۔

۱۲ ستمبر کو منصوبے کے مطابق میجر جنرل ہل اپنی فوج کو لیے پیچھے کوچ کر گیا۔ مگر اس سے ایک فاش غلطی سرزد ہوئی۔ جنرل رابرٹ کا اسپیشل آرڈر ۱۹۱ اس نے ایک لفافے میں رکھا تھا۔ اس لفافے میں میجر جنرل ہل کے تین سگار بھی موجود تھے۔ وہ یہ لفافہ مستقر کے میدان ہی میں بھول گیا۔

۱۳ ستمبر کو امریکی فوج کے چند فوجی اسی مستقر کا جائزہ لینے آئے۔ ان میں کارپورل بارٹن مچل بھی شامل تھا۔ اس کو میدان میں پڑا وہ لفافہ مل گیا۔ جب اس نے اسپیشل آرڈر ۱۹۱ کا مطالعہ کیا، تو اسے احساس ہو گیا کہ یہ نہایت قیمتی دستاویز ہے۔ بارٹن نے وہ پیغام اپنے افسر، سارجنٹ جان بلوس کے سپرد کیا۔ وہ پھر "چین آف کمانڈ" سے ہوتا ہوا شمالی امریکا میں موجود امریکی فوج کے کمانڈر، جنرل جارج میکلن تک پہنچ گیا۔ بتایا جاتا ہے، جب جنرل جارج نے اسپیشل آرڈر ۱۹۱ پڑھا، تو خوشی کے مارے اچھل پڑا۔ تب اسی نے اپنے ساتھیوں سے کہا "اب میں بوبی لی (جنرل رابرٹ) کو ایسا مزہ چکھاؤں گا کہ وہ ساری عمر یاد رکھے گا۔

یوں کنفیڈریٹ فوج کا جنگی پلان امریکی فوج کے ہاتھ لگ گیا۔ جنرل جارج نے پھر ۱۴ ستمبر کو ایک جغرافیائی مقام، جنوبی پہاڑی درے پر حملہ کر دیا۔ اس درے پر قبضے سے وہ جنرل رابرٹ کی منقسم فوج کو یکجا نہ ہونے دیتا۔ زبردست لڑائی کے بعد امریکی فوج اس درے پر قبضہ کرنے میں کامیاب رہی۔

تاہم جنرل رابرٹ لی انتہائی تجربے کار اور زیرک جرنیل

تھا۔ اس نے جنگی چالیں اتنی کامیابی سے چلیں کہ اپنی بکھری فوج کو شارپس برگ نامی مقام پر جمع کر لیا۔ جنرل جارج بھی اپنی فوج کے ساتھ وہاں پہنچ گیا۔ چناں چہ ۱۷ ستمبر کو شارپس برگ کے نزدیک زبردست جنگ ہوئی۔ یہ جنگ انٹیٹم (Antietam) بھی کہلاتی ہے۔

اس جنگ میں امریکی فوج کی تعداد ۷۵ ہزار تھی۔ جبکہ کنفیڈریٹ فوج میں ۳۸ ہزار فوجی شامل تھے۔ یہ امریکی خانہ جنگی کی سب سے خونی ایک روزہ جنگ ثابت ہوئی۔ اس مجادلے میں طرفین کے ۱۷،۲۲ فوجی مارے گئے یا زخمی ہوئے۔ یہ جنگ ہار جیت کا فیصلہ کیے بغیر ختم ہوئی تاہم امریکی فوج نے باغیوں کو پسپا ہونے پر مجبور کر دیا۔ جنرل رابرٹ لی باقی ماندہ فوج کو لیے واپس ورجینیا چلا گیا۔ اسی لیے امریکا بھر میں یہی چرچا ہوا کہ یونین (وفاقی امریکی) فوج جنگ جیت گئی۔

جنرل رابرٹ لی کی پسپائی امریکی خانہ جنگی کا نقطۂ تبدیلی ثابت ہوئی۔ امریکی صدر ابرہام لنکن نے دشمن کی ہار پر ازحد مسرت کا اظہار کیا۔ انھیں اتنی زیادہ توانائی ملی کہ انھوں نے سیاہ فام غلاموں کی آزادی کا اعلان کر دیا۔ اسی اعلان کے باعث برطانیہ اور فرانس نے کنفیڈریٹ ریاستوں کی مالی و عسکری امداد کا ارادہ ملتوی کر دیا۔

یوں جنرل ڈی ایچ ہل کی بے پروائی کے باعث جنرل رابرٹ لی کا خفیہ منصوبہ ناکام ہو گیا۔ سوچنے کی بات یہ ہے کہ منصوبہ طشت ازبام نہ ہوتا، تو ممکن ہے، جنرل رابرٹ لی واشنگٹن پہنچنے میں کامیاب رہتا۔ یوں آج کے امریکا کی تاریخ مختلف ہوتی کیونکہ کنفیڈریٹ ریاستوں کی جیت سے دو امریکا وجود میں آجاتے۔ گویا امریکا پھر شاید آج کی طاقتور اکلوتی سپر پاور نہ ہوتا۔

جب امریکیوں کو خفت اٹھانا پڑی

۱۹۵۹ء میں کمیونسٹ راہنما، فیدل کاسترو نے کیوبا کی حکومت پر قبضہ کر لیا۔ سابقہ حکمران امریکا کا ہمدرد تھا۔ مگر کاسترو نے امریکی کارپوریشنوں اور کمپنیوں کی جائدادوں پر قبضہ کر لیا اور بہت سے امریکیوں کو کیوبا سے نکال دیا۔ مزید برآں وہ سوویت یونین سے تعلّقات بڑھانے لگا جس سے امریکا کی سرد جنگ زوروں پر تھی۔

کیوبا کی صورت حال دیکھ کر امریکی صدر، آئزن ہاور نے فیصلہ کیا کہ بزور کاسترو حکومت ختم کر دی جائے۔ یہ کام امریکی خفیہ ایجنسی، سی آئی اے کے سپرد ہوا۔ سی آئی اے نے گوئٹے مالا میں کاسترو کے مخالفین کو جمع کیا، انھیں عسکری تربیت دی اور بریگیڈ ۲۵۰۶ کے نام سے ایک فوج کھڑی کر لی۔

اس فوج نے خلیج پگز کے ایک کیوبن مقام، پلایا گیرون سے کیوبا پر حملہ کرنا تھا۔ یہ حملہ ۱۷ اپریل ۱۹۶۱ء کو شروع ہوا۔ تب تک امریکا میں صدر جان کینیڈی برسراقتدار آ چکے تھے۔ وہ کیوبا پر حملے کے مخالف تھے، مگر امریکی فوج نے انھیں یہ اقدام کرنے پر مجبور کر دیا۔

منصوبے کے مطابق امریکی طیاروں نے بریگیڈ ۲۵۰۶ سے مقابلہ کرنے والی کیوبن فوج پر بمباری کرنا تھی تاکہ حملہ آوروں کو دارالحکومت ہوانا تک پہنچنے میں دشواری نہ ہو۔ مگر جن امریکی طیاروں نے اڑان بھری، ان کے ہواباز اپنی گھڑیوں کو کیوبا کے وقت سے ہم آہنگ کرنا بھول گئے۔ یہ چھوٹی سی کوتاہی بہت بھاری ثابت ہوئی۔

امریکی طیارے ایک گھنٹا دیر سے بمباری کے مقام پر پہنچے۔ تب تک کیوبن فوج بریگیڈ ۲۵۰۶ کے بیشتر فوجیوں کو ہلاک، زخمی یا گرفتار کر چکی تھی۔ چناں چہ امریکیوں کا بنایا گیا منصوبہ ناکام ثابت ہوا اور امریکی حکومت کو بہت خفت اٹھانا پڑی۔ یہ ناکام حملہ امریکی تاریخ میں ''بے آف پگز اٹیک'' کہلاتا ہے۔

ٹائی ٹینک نہ ڈوبتا اگر.....

برطانیہ سے چلنے والا اپنے زمانے کا سب سے بڑا مسافر

بردار بحری جہاز، ٹائی ٹینک امریکا کی جانب رواں دواں تھا۔ ۱۴/۱۴اپریل ۱۹۱۲ء کی رات وہ بحر اوقیانوس میں برفانی تودے سے ٹکرا گیا۔ اسی تودے نے دیوہیکل جہاز کے پیندے کی فولادی چادر پھاڑ ڈالی۔ چناں چہ جہاز میں تیزی سے پانی بھرا اور چند گھنٹے میں ٹائی ٹینک ڈوب گیا۔ اس حادثے میں ڈیڑھ ہزار سے زائد مسافر مارے گئے۔

خاص بات یہ ہے کہ اگر ٹائی ٹینک میں دوربین موجود ہوتی، تو یقیناً یہ بدقسمت بحری جہاز خوف ناک حادثے سے بچ جاتا۔ دراصل جب ۹ اپریل کو جہاز برطانیہ سے روانہ ہونے والا تھا، تو کچھ عرصہ قبل کمپنی نے ٹائی ٹینک کے سیکنڈ آفیسر، ڈیوڈ بلیئر کو تبدیل کر دیا۔ اس کی جگہ چارلس لائٹ رولر نیا سیکنڈ آفیسر مقرر ہوا۔

ڈیوڈ بلیئر نے جلدی جلدی چارلس لائٹ رولر کو چارج دیا اور کمپنی کے صدر دفتر کی طرف روانہ ہو گیا۔ اس عجلت میں وہ چارلس کو اس لاکر کی چابی دینا بھول گیا جس میں دوربین موجود تھی۔ جب ٹائی ٹینک روانہ ہوا، تو کئی گھنٹے بعد عرشے پر متعین اہلکار کو دوربین کی ضرورت محسوس ہوئی تاکہ دور تک سمندر کا نظارہ کر سکے۔ تبھی انکشاف ہوا کہ دوربین تو فولادی لاکر میں بند ہے اور اس کی چابی موجود نہیں۔ چناں چہ اہل کار رات کے اندھیرے میں برفانی تودے کو نہیں دیکھ سکا اور بحری جہاز اس سے ٹکرا گیا۔

یہ حقیقت ہے کہ بعض اوقات معمولی سمجھی جانے والی غلطی بھی زبردست نقصان پہنچانے کا سبب بن جاتی ہے۔ اگر اس رات ٹائی ٹینک پر دوربین ہوتی، تو وہ بخیر و عافیت امریکا پہنچ سکتا تھا۔

کاغذات نے سابق صدر کی جان بچالی

۱۴/۱۴اکتوبر ۱۹۱۲ء کی شام ہے۔ تھیوڈور روز ویلیٹ اپنی انتخابی مہم کے سلسلے میں امریکی شہر ملواکی آئے ہوئے ہیں۔ تھیوڈور روز ویلیٹ ۱۹۰۱ء تا ۱۹۰۹ء امریکا کے صدر رہے۔ اس دوران انھوں نے عوام کی ترقی کے لیے کئی اقدامات کیے اور ان کا معیار زندگی بلند کر دیا۔ اسی لیے امریکا کے عظیم ترین صدور میں ان کا شمار ہوتا ہے۔

تھیوڈر روزویلیٹ آنے والے امریکی صدور کی جنگجویانہ پالیسیوں سے خوش نہیں تھے۔ اسی لیے ۱۹۱۲ء کے انتخاب میں انھوں نے حصہ لینے کا فیصلہ کیا۔ اب وہ ملواکی شہر میں ایک انتخابی جلسے سے خطاب کرنے آئے تھے۔ ہوٹل گل پیٹرک سے نکلتے ہوئے انھوں نے ۵۰ صفحات پر مشتمل اپنی تقریر کو تہ کیا اور اسے اپنے فوجی کوٹ کی بالائی جیب میں اڑس لیا۔ تب ان کے وہم و گمان میں نہ تھا کہ یہ کاغذات ان کی جان بچالیں گے۔

جب وہ جلسہ گاہ میں پہنچے، تو حاضرین انھیں دیکھ کر تالیاں بجانے لگے۔ ان میں ایک نیم دیوانہ شخص، جان شرینک بھی شامل تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ سابق صدر کو تیسرا انتخاب نہیں لڑنا چاہیے۔ یہ خیال اس کے دل و دماغ پر کچھ ایسا حاوی ہوا کہ اسی نے تھیوڈور روزویلیٹ کی جان لینے کا فیصلہ کر لیا۔ چناں چہ وہ پستول لیے جلسے میں پہنچ گیا۔

جب سابق صدر اس کے عین سامنے آئے، تو شرینک نے جیب میں چھپائی پستول نکالی اور ان کے سینے پر گولی چلا دی۔ آس پاس کھڑے لوگوں نے فوراً اسے دبوچ لیا اور شرینک کو دوسری گولی چلانے کا موقع نہ ملا۔

گولی سیدھی اس جیب سے ٹکرائی جس میں تقریر کے کاغذات موجود تھے۔ کاغذات نے گولی کی تیزی ختم کر ڈالی۔ چناں چہ وہ سابق صدر کے سینے پر محض خراش ہی ڈال سکی۔ تھیوڈور روزویلیٹ نے اسی حالت میں ایک گھنٹا حاضرین سے خطاب کیا۔ جب جلسہ ختم ہوا، تو وہ اسپتال پہنچے جہاں ان کی مرہم پٹی کی گئی۔

ہندوستان میں جنم لینے کے باوجود

میں ہندو کیوں نہیں ہوا؟

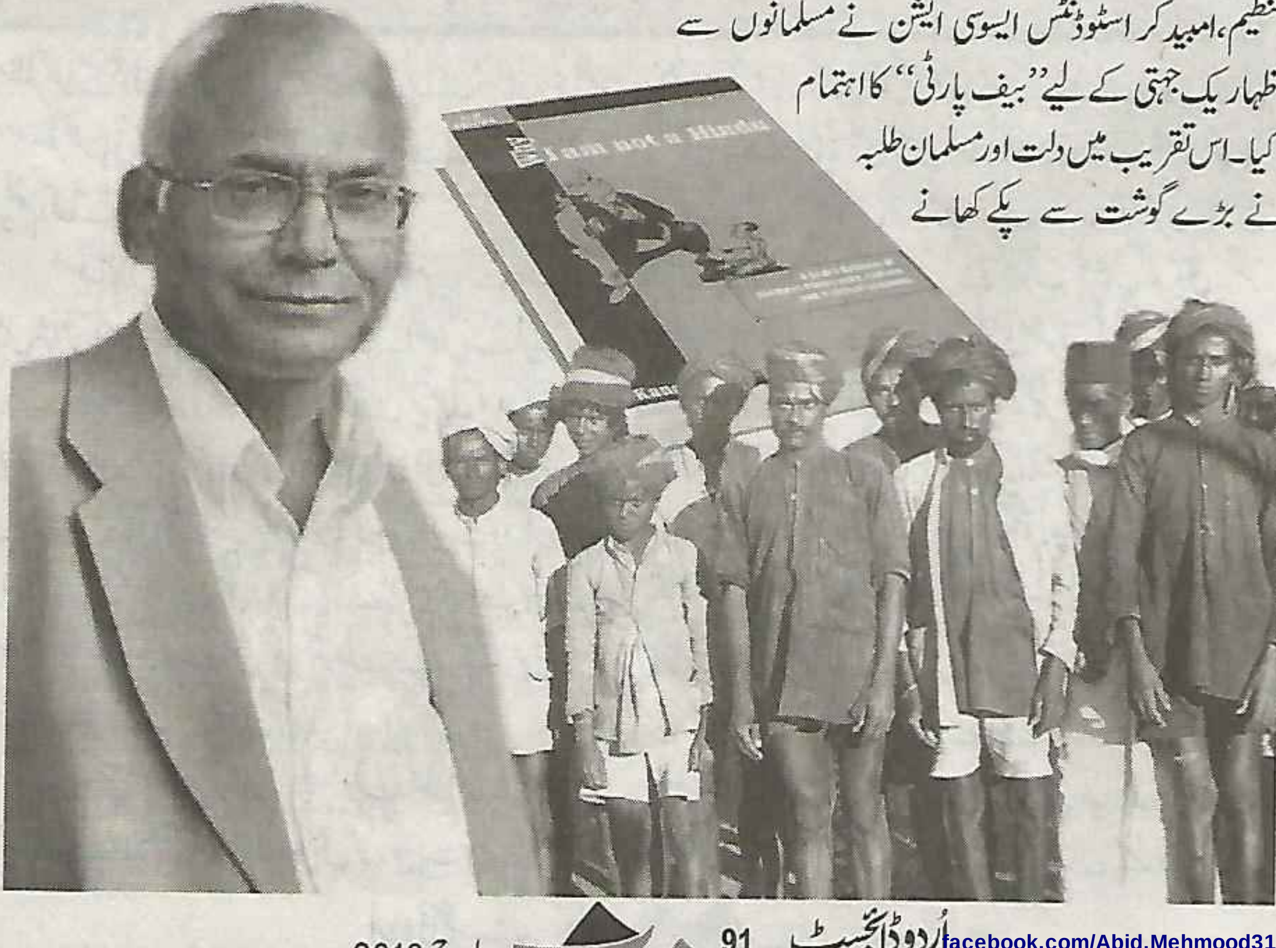
ہندومت کی خامیاں اور پچھلے تین ہزار برس کے دوران آمرانہ برہمن طبقے کی چیرہ دستیاں آشکار کرتی ایک دلت پروفیسر کی چشم کشا آپ بیتی

پروفیسر کانچا الیہا/سیّد عاصم محمود

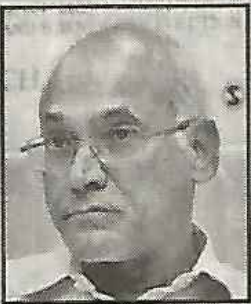
چند ماہ قبل قوم پرست ہندوؤں نے بھارت میں گائے کے گوشت کو متنازع بنا دیا اور مسلمانوں کے خلاف شرانگیز پروپیگنڈا کرنے لگے۔ اس موقع پر حیدرآباد دکن کی سرکاری یونیورسٹی میں دلت طلبہ کی تنظیم، امبیدکر اسٹوڈنٹس ایسوسی ایشن نے مسلمانوں سے اظہار یک جہتی کے لیے ''بیف پارٹی'' کا اہتمام کیا۔ اس تقریب میں دلت اور مسلمان طلبہ نے بڑے گوشت سے پکے کھانے کھائے۔ کم ہی لوگ جانتے ہیں کہ گائے کا گوشت بہت سے دلتوں کا من بھاتا کھاجا ہے۔

اس بیف پارٹی نے حکمران جماعت، بی جے پی اور آر ایس ایس سے وابستہ قوم پرست ہندوؤں کو متوحش کر دیا۔ انھوں نے دلت طلبہ پر زور دیا کہ وہ ہندو ہونے کے ناتے مسلمانوں کی طرف داری نہ کریں۔ مگر دلت طلبہ نے ''ہندتوا'' یا ہندومت کے انتہاپسندانہ روپ کا ساتھ دینے سے انکار کر دیا۔ ہندتوا کی مخالفت میں یونیورسٹی آف حیدرآباد میں زیرِتعلیم ایک چھبّیس سالہ دلت پی ایچ ڈی اسکالر، روہیت ویمولا بڑا سرگرم تھا۔

آنے والے دنوں میں قوم پرست ہندوؤں اور دلت طلبہ کے مابین اختلافات بڑھتے چلے گئے۔ ۱۹۹۳ء کے ممبئی حملوں میں مجرم قرار دیے جانے والے اقبال میمن کو پھانسی ہوئی، تو اسی کے خلاف دلت طلبہ نے احتجاج کیا۔ اسی دوران



مصنّف کا تعارف



معلمّ، محقق، دانشور اور دلتوں کے راہنما، پروفیسر کانچا الیہا ۵/ اکتوبر ۱۹۵۲ء کو ریاست آندھرا پردیش کے ایک غریب گھرانے میں پیدا ہوئے۔ لکھنے پڑھنے کا شوق تھا، اس لیے اپنی صلاحیتوں کے بل بوتے پر اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ انھوں نے حیدر آباد یونیورسٹی سے سیاسیات میں ایم فل کر رکھا ہے۔

تعلیم مکمل کرنے کے بعد حیدر آباد دکن کی مشہور عثمانیہ یونیورسٹی سے بہ حیثیت ایسوسی ایٹ پروفیسر منسلک ہو گئے۔ وہاں طویل عرصہ طلبہ کو سیاسیات کی تعلیم دی۔ آج کل حیدر آباد شہر ہی میں مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کے سینئر فار سوشل ایکسکلوشن اینڈ انکلوسیو پالیسی (Centre for Social Exclusion and Invlusive Policy) سے منسلک ہیں۔

پروفیسر کانچا الیہا اب تک سات کتب تحریر کر چکے ہیں۔ چھ کتابیں انگریزی اور ایک تلیگو زبان میں ہے۔ ان کتب میں انھوں نے تاریخی حقائق دے کر ہندومت کی خامیاں و خرابیاں نہایت عمدگی سے عیاں کی ہیں۔ زیرِ نظر مضمون اُن کی پہلی کتاب "Why I Am Not a Hindu" سے اخذ کیا گیا ہے۔ اس کتاب میں حقیقی ہندوؤں یعنی برہمن و کھشتری اور دلتوں کی سماجی، معاشی، سیاسی، تہذیبی اور ثقافتی زندگیوں کا جائزہ لے کر ان کے مابین اختلافات بیان کیے گئے ہیں۔ کتاب یہ امر بھی عیاں کرتی ہے کہ برہمنوں نے اب تک بھارت میں اپنی حکمرانی کیونکر قائم کر رکھی ہے۔ یاد رہے کہ یہ کتاب تحریر کرنے کے دوران ہی پروفیسر کانچا نے عیسائیت اختیار کر لی تھی۔

مظفّر نگر کے خوف ناک ہندو مسلم فسادات پر ایک دستاویزی فلم ''مظفّر نگر باقی ہے'' سامنے آ گئی۔ دلت طلبہ نے یونیورسٹی میں یہ فلم دکھانے کا اہتمام کیا۔

مسلمانوں کی کھلی حمایت کرنے پر قوم پرست ہندوؤں میں شامل انتہا پسند لڑکے غصے میں آ گئے۔ انھوں نے ایک دن روہیت ویمولا اور دیگر دلت راہنماؤں پر حملہ کر دیا۔ تاہم دلت لڑکوں نے حملہ آوروں کی دھنائی کر ڈالی۔ حملہ آور لڑکوں نے پھر یونیورسٹی انتظامیہ پر زور دیا کہ وہ روہیت و دیگر دلت راہنماؤں کے خلاف کارروائی کرے۔ چونکہ اب بھارت میں قوم پرست ہندوؤں کی حکومت ہے۔ لہٰذا یونیورسٹی انتظامیہ ان کے سامنے جھک گئی۔

یونیورسٹی انتظامیہ نے پھر دلت طلبہ راہنماؤں کا ''معاشرتی مقاطع'' کر ڈالا۔ وہ یوں کہ روہیت وغیرہ کا خرچہ پانی بند کر دیا۔ انھیں ہوسٹل بھی چھوڑنا پڑا۔ اب وہ یونیورسٹی کینٹین سے کھانا بھی نہیں کھا سکتے تھے۔ مجبوراً وہ احاطہ یونیورسٹی میں خیمے ڈال کر رہنے لگے۔ جب معاشرتی مقاطع وبالِ جاں بن گیا، تو انھوں نے بھوک ہڑتال کر دی۔ مگر یونیورسٹی انتظامیہ نے ان کے مسئلے کی طرف کوئی توجہ نہ دی۔ آخر کار روہیت ویمولا کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا اور اس نے ۳۰/ جنوری ۲۰۱۶ء کو خودکشی کر لی۔ یوں بھارت کے انسان دشمن ذات پات والے نظام نے ایک اور قیمتی جان لے ڈالی۔ ایک جوہرِ قابل ظالمانہ معاشرتی نظام کی بھینٹ چڑھ گیا۔

بھارتی تاریخ ایک نظر میں

ہزاروں برس قبل افریقا سے آئے ہوئے باشندوں نے برصغیر ہندو پاک میں پہلی بستیاں بسائیں۔ یہ لوگ امن پسند تھے جنھیں ''دراوڑ'' کہا گیا۔ پانچ چھ ہزار سال پہلے وسطی ایشیا

کے لڑاکا قبائل نے ہندو پاک کے علاقوں پر دھاوا بول دیا۔ انھوں نے مقامی باشندوں کو جنوبی بھارت کی سمت دھکیلا اور وسیع علاقے پر قابض ہو گئے۔ دور جدید کے مؤرخین نے ان قبائلی حملہ آوروں کو ''آریا'' کا نام دیا۔ انھی آریاؤں نے بھارت میں ذات پات کا نظام متعارف کرایا جو پانچ طبقوں..... برہمن، کھشتری، ویش، شودر اور اچھوت پر مشتمل تھا۔ اس نظام میں مقامی آبادی کو شودر اور اچھوت قرار دے کر انھیں پست بنا دیا گیا۔ ان طبقوں پر کئی معاشرتی، معاشی اور مذہبی پابندیاں عائد ہو گئیں جو آج بھی برقرار ہیں۔

ماضی میں طویل عرصہ برہمن و کھشتری مل کر ہندوستان پر حکومت کرتے رہے۔ گوتم بدھ پہلا راہنما ہے جس نے برہمنی و کھشتری آمرانہ نظام کے خلاف آواز اٹھائی۔ ان کا وضع کردہ مذہب، بدھ مت برہمنوں کو شکست دینے میں کامیاب رہا۔ لیکن برہمن و کھشتری دوبارہ عوام پر حاوی ہو گئے اور ان پر مظالم ڈھانے لگے۔ جب ہندوستان پر انگریزوں کا قبضہ ہوا، تو انھوں نے اپنے مفادات کی خاطر برہمنوں کی حمایت کی اور وہ پہلے سے زیادہ بااثر و طاقتور ہو گئے۔ چناں چہ انگریز رخصت ہوئے، تو اقتدار پھر ہندوؤں کی اعلیٰ ذاتوں نے سنبھال لیا۔ مگر بیسویں صدی میں انسانی حقوق کا چرچا پھیلا تو وہ بھارتی حکومت شودر اور اچھوت طبقوں کو مراعات دینے پر مجبور ہو گئی۔ آج اچھوت ''دلت'' کے نام سے زیادہ مشہور ہیں۔

بھارت میں اب دلتوں کی تمام ذاتیں ایک کیٹیگری ''شیڈولڈ کاسٹس'' (Scheduled Castes) میں جمع ہیں۔ بھارتی آبادی میں ان کا حصہ تقریباً ''۱۷ فی صد'' ہے۔ جبکہ شودروں کی اور دیگر نچلی ذاتیں جمع کر دی گئی ہیں۔ یہ بھارتی آبادی کا ''۵۰ فی صد حصہ'' ہیں۔ بھارت میں قبائلی بھی آباد ہیں جنھیں ''آدیواسی'' کہا جاتا ہے۔ ان کی ذاتیں شیڈولڈ ٹرائبز'' میں جمع ہیں۔ یہ بھارتی آبادی کا تقریباً ''۹ فی صد'' ہیں۔ گویا بھارت میں آبادی کا صرف ''۲۴ فی صد'' حصہ برہمنی و کھشتریوں پر مشتمل ہے۔ لیکن یہی طبقہ دولت، عزت اور شہرت کا مالک ہے۔ انھوں نے ہی افسر شاہی، عدلیہ، فوج اور معیشت پر قبضہ کر رکھا ہے۔ یہ نچلی ذاتوں کے ہندوؤں کا استحصال کر کے پرآسائش زندگی بسر کرتا ہے۔ مگر اب برہمن و کھشتری آمریت کے خلاف نچلا طبقہ آواز بلند کرنے لگا ہے۔

پچھلے سال قوم پرست ہندوؤں نے ہندومت پر تنقید کرنے والے ایک دانشور کو قتل کر دیا تھا۔ اس پر بیسیوں بھارتی ادبا و شعرا نے اپنے سرکاری ایوارڈ واپس کر دیے۔ اسی دوران اعلیٰ ذات کے ہندو نچلی ذاتوں پر ظلم و ستم کرنے لگے۔ حتیٰ کہ بھارتی برہمن وزیر دفاع نے انھیں ''کتوں'' سے تشبیہہ دے ڈالی۔ اس پر بھارتی میڈیا میں خاصا ہنگامہ ہوا جس نے غریب و پست طبقے کی بے چارگی و احساس محرومی کو نمایاں کر دیا۔

ناواقفیت کی بنا پر بیشتر پاکستانی بھارت کے غریب طبقے میں شامل ذاتوں کو ہندو سمجھتے ہیں، حالانکہ یہ حقیقت نہیں۔ خاص طور پر جو غریب غربا دلت کہلاتے ہیں، ان کی اکثریت عام ہندوؤں سے خاصی مختلف ہے۔

ہندوؤں اور بیس کروڑ دلتوں کے مابین اختلافات کو جنوبی بھارت کے مشہور دلت محقق، پروفیسر کانچا الھیا نے اپنی انگریزی کتاب "Why I am not a Hindu" میں نہایت عمدگی اور زیرکی سے اجاگر کیا ہے۔ خاص طور پر ''میں ہندو کیوں نہیں'' یہ عیاں کرتی ہے کہ ہندوؤں نے دلتوں پر کس قسم کے ظلم ڈھائے اور ان سے حیوانوں جیسا سلوک کرتے رہے۔ اس معلومات افروز اور چشم کشا کتاب کے چیدہ چیدہ حصے پیش خدمت ہیں۔

ایک عجوبے کا ظہور

میں ریاست تلنگانہ کے ایک چھوٹے سے گاؤں میں پیدا ہوا۔ جب میرے شعور کی آنکھ کھلی، تو تلنگانہ ریاست بنانے کے لیے مسلح جدوجہد جاری تھی۔ میں پچاس سال قبل کے دیہی

ماحول میں پلا بڑھا۔ بھارت میں دیہی زندگی زیادہ تبدیل نہیں ہوئی۔ جبکہ شہری زندگی میں بھی وسیع پیمانے پر تبدیلیاں نہیں آئیں۔ بھارتی دیہی اور شہری زندگی میں خاصا تال میل ہے۔

میری زندگی میں ہلچل ۱۹۸۰ء کے بعد آئی جب قوم پرست ہندو اپنے نظریہ ہندتوا کا پرچار کرنے لگے۔ ان کے پروپیگنڈے سے یہ محسوس ہونے لگا کہ بھارت میں جو شخص مسلمان، سکھ یا عیسائی نہیں، وہ ہندو کہلائے گا۔ چناں چہ اچانک مجھ پر افشا ہوا کہ میں بھی ہندو ہوں۔ مجھے یہ بھی بتایا گیا کہ میرے والدین، رشتے دار اور ذات بھی ہندوانہ ہے۔

رات دن اخبارات اور ٹیلی ویژن کے ذریعے باور کرایا جانے لگا کہ میں ہندو ہوں۔ اگر میں یہ بات نہ مانتا تو معاشرتی مقاطع میرا مقدر بن جاتا۔ میں کوروما (Kurumaa) ذات سے تعلّق رکھتا ہوں۔ اس ذات کے لوگ مویشی چراتے ہیں۔ مگر میں اس ہندوانہ تہذیب و تمدن سے اپنا رشتہ نہ جوڑ سکا جس کی تشہیر بڑے پیمانے پر جاری تھی۔ یہ تشہیر کرتے ہوئے وفاقی اور ریاستی حکومتیں بھی ایڈورٹائزنگ کمپنیاں بن گئیں۔ مگر ''سنگھ پریوار'' (قوم پرست ہندو جماعتوں) کے کارکن مجھے زرد لباس میں ملبوس دکھائی دیتے، تو میرا دل کھٹا ہو جاتا۔ یہ کارکن مجھ پر زور دیتے کہ میں مسلمان، عیسائی اور سکھ کو اپنا دشمن سمجھنے لگوں۔ جبکہ میں یہ سوچنے لگا کہ آخر دلتوں اور اچھوتوں کا ہندومت سے کیا واسطہ ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ مجھ سمیت میرے تمام دوستوں نے بچپن میں ''ہندو'' لفظ نہیں سنا تھا۔ ہم نہیں جانتے تھے کہ یہ کوئی مذہب ہے، تہذیب یا معاشرت!

بچپن میں البتہ ہم ترکولو (مسلمان)، کرسٹانو پولو (عیسائی)، باپن کولو (برہمن) اور کوماتولو (بنیے یا کھشتری) سے ضرور واقف تھے۔ یہ سبھی کسی نہ کسی طرح ہم سے مختلف تھے۔ تاہم روزمرہ زندگی میں ہم ترکولو اور کرسٹانو پولو سے ملتے ملاتے۔ وہ ہمارے ساتھ اٹھتے بیٹھتے تھے۔ مگر باپن کولو اور کوماتولو ہم سے دور دور رہتے۔ ان کے ساتھ ہمارے کسی قسم کے تعلّقات نہ تھے۔ لیکن آج اچانک دلتوں کو بتایا جانے لگا کہ وہ باپن کولو اور کوماتولو کے ساتھ مذہبی اور ثقافتی رشتے رکھتے ہیں۔ یہ بات حیرت انگیز ہی نہیں صدمہ پہنچانے والی تھی۔ سچ یہ ہے کہ دلتوں اور برہمنوں، کھشتریوں و بنیوں کے مابین کئی ثقافتی و معاشرتی اختلافات موجود ہیں۔ یہ اختلافات بچپن، خاندانی زندگی، سماجی تعلّقات اور اپنے اپنے دیوی دیوتاؤں سے لے کر موت تک پھیلے ہوئے ہیں۔ ان تضادات کو پہلے پہل دلت راہنماؤں، مہاتما جیوتی راؤ پھولے، ڈاکٹر امبیدکر، پریار رامسے وغیرہ نے واضح کیا۔ جبکہ میرے تجربات زندگی سے بھی وہ افشا ہوئے۔



خودکشی کرنے والا دلت نوجوان، روہیت ویمولا

میرے گاؤں میں دلت ذاتوں کے علاوہ ہندو ذات والے (برہمنی، کھشتری، بنیے) بھی مقیم تھے۔ مگر ان کی تہذیب، تمدن اور ماحول ہم سے بالکل مختلف تھا۔ جب میں عثمانیہ یونیورسٹی میں پڑھانے لگا، تو وہاں میری ملاقات برہمن و کھشتری ذات سے تعلّق رکھنے والے اساتذہ اور طلبہ وطالبات سے ہوئی۔ میں دلتوں اور ہندوؤں کے اختلافات پر ان سے طویل بحث ومباحثہ کرتا۔ یوں مجھے موضوع کی گہرائی تک پہنچنے میں مدد ملی۔ مجھے احساس ہوا کہ تین چار ہزار برس سے برہمن و کھشتری دلت سمیت بھی نچلی ذاتوں کے باشندوں کو اشاروں پر چلاتے اور احکامات دیتے چلے آرہے ہیں۔ اب میں اپنے

برہمن و کھشتری دوستوں سے کہنا چاہتا ہوں کہ دلتوں کی بھی سنیے کہ وہ کیا چاہتے ہیں۔ جو لوگ نئے سوال جواب سننے سے انکار کریں، وہ جلد یا بدیر مٹ جاتے ہیں۔

میرے بچپن کے دن

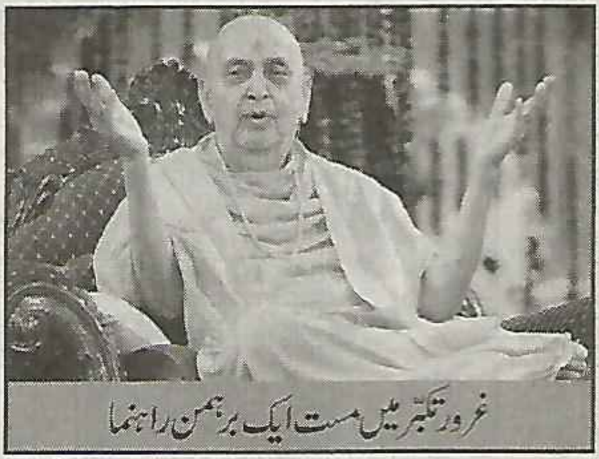
میرے ناخواندہ والدین کا کوئی مذہب نہ تھا۔ ایک انسان کا مذہب تب ہوتا ہے جب وہ عبادت گاہ جائے اور دوسرے لوگوں کے ساتھ مل کر مذہبی رسوم ادا کرے۔ میرے والدین کی صرف ایک شناخت تھی یعنی ان کی کورو ما ذات! ان کے میلے ٹھیلے اور دیوتا سبھی مقامی تھے۔ اکثر اوقات یہ ایک گاؤں تک ہی محدود ہوتے۔ ہمارے گاؤں کی مختلف نچلی ذاتوں میں کوئی مذہبی رسم مشترکہ نہ تھی۔ تاہم میرے والدین قبائلی نہیں تھے۔ دراصل پانچ سو برس قبل ہمارے اجداد گاؤں میں آ بسے۔ وہ پھر دیہی معاشرے میں جذب ہو کر انتظامیہ کو ٹیکس دینے لگے۔ تب مویشی پالنا ان کا پیشہ تھا۔ جب میں پیدا ہوا، تو وہ کاشت کار بن چکے تھے۔ اب وہ مقامی زمین دار اور تحصیل دار کو ٹیکس دیتے تھے۔ مگر انھوں نے کبھی مندر نہیں دیکھا..... گاؤں میں مندر ہی نہیں تھا۔ گاؤں میں کوروما کے علاوہ گولاس، گوڈز، کاپوس، سلاس، چاکلی، منگالی اور مداگی ذاتیں بھی بستی تھیں اور ان میں سے کسی کا فرد مندر نہیں جاتا تھا۔

گولاس اور کاپوس معاشی لحاظ سے نسبتاً خوشحال تھے۔ جب سے کوئی گولاس لڑکا میرے گھر آتا، وہ ہمارے ساتھ کھانا تو کھا لیتا، مگر ہٹ کر بیٹھتا۔ اسی طرح میں کسی کاپوس دوست کے گھر جاتا، تو اس کے والدین ہمیں کھانا دیتے مگر میرے زیادہ قریب نہ آتے۔

ہمارے دیوی دیوتا

ہم روحانیت کے معاملے میں بھی ہندومت سے مختلف تھے۔ ہماری ذات کے بچوں کو بتایا جاتا ہے کہ ''جیجا'' (چاند) ہمارا خدا ہے۔ جب بچہ پلتا بڑھتا، تو وہ نئے دیوی دیوتاؤں مثلاً پوچما، پولیمراما، کٹیما، کٹامارا جو، پوٹارا جو غیرہ سے واقف ہوتا۔ دلت مذہب میں مندر کا کوئی تصور نہیں کیونکہ دلتوں کے نزدیک دیوی دیوتا مختلف اشکال میں ہر جگہ موجود رہتے ہیں۔

دلت روح پر یقین رکھتے ہیں۔ یہ مانتے ہیں کہ اگر زندگی میں کوئی انسان بھوکا پیاسا رہے، تو مرنے پر اس کی روح بھوت بن جاتی ہے۔ تاہم دلت مذہب میں جنت اور جہنّم کا کوئی تصور نہیں، بس یہ سمجھا جاتا ہے کہ تمام مرنے والے آسمان پر کسی جگہ اکٹھے رہتے ہیں۔ غرض دلتوں کا مذہب عملی طور پر ہندومت سے بہت مختلف ہے۔ جب دلت بچے اسکول داخل ہوں تب انھیں برہمنوں کے دیوی دیوتاؤں مثلاً وشنو، برہما، ایشور وغیرہ کا علم ہوتا ہے۔ جب ہم پہلی بار یہ نام سنیں، تو وہ یہودا، اللہ یا عیسیٰؑ کی طرح ہمارے لیے اجنبی ہوتے ہیں۔ حتیٰ کہ ہم گوتم بدھ کے نام سے بھی واقف نہیں تھے جنھوں نے برہمن راج کے خلاف دلتوں کو متحد کر دیا تھا۔



غرور تکبّر میں مست ایک برہمن راہنما

برہمنوں کی زبان، رسوم و رواج، اقدار غرض ہر شے ہمارے لیے اجنبی تھی۔ میں نے دیکھا کہ برہمنوں کے بچے کھیتوں میں نہیں جاتے اور نہ ہی مویشی چراتے ہیں۔ وہ گھر بیٹھے رہتے یا پھر مکتب چلے جاتے۔ مجھے کئی برہمن دوستوں سے پتا چلا کہ ایک روایتی برہمن باپ اپنے بچوں کی پرورش پر

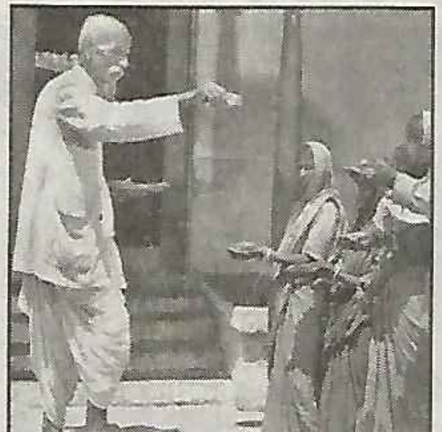
توجہ نہیں دیتا، یہ ذمے داری ماں کی ہے۔ برہمن مرد پاک صاف رہنے کی خاطر بچوں کو نہیں چھوتے اور نہ ہی باورچی خانے جاتے ہیں کہ وہ گندی جگہ سمجھی جاتی ہے۔

دلت بچے تو ہزاروں عملی کام سیکھتے ہیں، جبکہ برہمنی بچوں کو الفاظ یعنی وید، رامائن، مہابھارت وغیرہ پڑھنے پڑتے ہیں۔ ان کے نام بھی مذہبی ہوتے ہیں۔ مثلاً رام، کرشن، سیتا، لکشمی وغیرہ۔ برہمن بچے اپنے بڑوں سے روایتی کہانیاں سنتے ہیں جن میں عموماً قتل و غارت کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ جبکہ عورت کو مرد کی باندی بنا کر پیش کیا جاتا ہے۔

برہمنی دلتوں کے دیوی دیوتاؤں کو گھٹیا سمجھتے اور ان کی تحقیر کرتے ہیں جبکہ دلت گھرانوں میں انھیں عزت و احترام حاصل ہے۔ برہمنوں کا دعویٰ ہے کہ دلتوں کی دیویاں..... پوچما اور پولیمراما آوارہ اور نیچ ہیں کیونکہ ان کا کوئی خاوند نہیں۔ جبکہ لکشمی اور سرسوتی ان سے بلندتر ہیں کیونکہ مثالی شوہروں کی آئیڈیل بیویاں ہیں۔ لیکن دلت اپنی دیویوں کو پوری عزت دیتے ہیں۔ انھیں یہ خیال نہیں آتا کہ ان کا کوئی خاوند نہیں لہٰذا دیویوں کو تحقیر کی نگاہ سے دیکھا جائے۔ وجہ یہ کہ دلت معاشرے میں بیوہ کو بھی قابل احترام مقام حاصل ہے۔

دلت مذہب میں دیوتاؤں اور انسانوں کے مابین کوئی پروہت یا پجاری نہیں کیونکہ کبھی اس کی ضرورت ہی نہیں رہی۔ مثال کے طور پر جب میں بچہ تھا، تو براہ راست پوچما سے التجا کرلیا کرتا کہ وہ مجھے چیچک کا شکار نہ بنائے۔ جب ہم براہ راست اپنے دیوتاؤں سے گفتگو کر سکتے ہیں، تو کسی پروہت کی کیا ضرورت؟

ایک ہندو گھرانے میں قوانین اٹل اور مردانہ حاکمیت کے آئینہ دار ہوتے ہیں۔ مثلاً لڑکی پر فرض ہے کہ وہ لڑکوں کا کہنا مانے۔ برہمنی گھرانے میں بچوں کو چھوٹے موٹے کام نہیں کرنے دیے جاتے کیونکہ وہ شودر یا اچھوت انجام دیتے ہیں۔ اسی طرح وہ دلت بچوں سے دوستی نہیں کر سکتے۔ ہندوؤں کی اعلیٰ ذات میں شودر گالی سمجھی جاتی ہے۔ ''چنڈالا'' مزید تحقیر آمیز اصطلاح ہے۔ چناں چہ ایک ہندو بچہ بچپن ہی میں دوسرے انسانوں (دلتوں) سے نفرت کرنے کے باعث انسان دوست نہیں رہتا۔ دلتوں سے نفرت کرنا اس کے شعور کا حصہ بن جاتا ہے۔ ہندو گھرانے میں مرد آمر جیسی حیثیت رکھتا ہے۔ وہ بیوی پر جتنا مرضی ظلم و ستم کرے، وہ بے چاری خاموشی سے مظالم سہتی ہے۔ تبھی اسے تابع دار اور فرماں بردار سمجھا جاتا ہے۔ لیکن دلت گھرانے میں مرد ڈکٹیٹر نہیں بن سکتا، اگر وہ بیوی پر ظلم ڈھائے، تو اسے بھی جواب دینے کا حق حاصل ہے۔ چناں چہ دلت گھرانے میں ہندو گھر کی نسبت زیادہ مساوات اور عدل کا رواج ہے۔



گاؤں کا بنیا۔ وہ ملازم اچھوت عورتوں کو پتے میں تنخواہ بند کر کے دور سے دے رہا ہے

خوف کی علامت

قارئین کو یہ پڑھ کر حیرانی ہوگی، ہمارے گاؤں میں بچوں کو یہ تربیت دی جاتی تھی کہ وہ برہمن، کھشتریوں اور بنیوں کے سامنے انتہائی ادب سے پیش آئیں بلکہ تھر تھر کانپنے لگیں۔ برہمنوں کو یہ ادب اور عزت اُنھیں خوف کی وجہ سے ملتا تھا۔ وجہ یہ کہ سبھی دیہات میں دلتوں کی اکثریت برہمن زمین داروں کی پر ملازم تھی۔ لہٰذا زمین دار معمولی بات پر بھی ناراض ہو جاتا، تو دلت اپنا روزگار کھو بیٹھتا۔ لیکن دلتوں کی حد سے زیادہ فرماں برداری نے اعلیٰ ذات کے ہندوؤں کو زمینی خدا بنا دیا اور وہ جو چاہے کرنے

لگے۔

برہمنوں اور کھشتریوں کو چھوڑ کر ہمارے گاؤں میں سبھی ذاتوں کے باشندے محنت کرتے تھے۔ جس دن انھیں پیٹ بھر کھانا مل جاتا، وہ ان کے لیے مثلِ جنت ہوتا۔ جس روز کھانا نہ ملتا، وہ مثلِ دوزخ ہو جاتا۔ گاؤں اور اردگرد کے دیہات میں بسنے والے صرف برہمنی و کھشتری ہی مندر جاتے، بھجن گاتے، صبح شام عبادت کرتے اور مذہبی کتابیں پڑھتے۔ ''بھگوت گیتا'' ہندوؤں کی مذہبی کتاب ہے..... مگر ہمارے گھروں میں اس کا داخلہ ممنوع ہے۔ یہی نہیں، ہندومت اور برہمن نے دلتوں کے پڑھنے لکھنے پر پابندی لگا دی۔ دورِ جدید میں ڈاکٹر امبیدکر اور دیگر راہنماؤں کی کوششوں سے دلت بچوں پر اسکولوں کے دروازے کھلے ورنہ پہلے کوئی بچہ مکتب میں داخل نہیں ہو سکتا تھا۔ مدعا یہی تھا کہ دلت پڑھ لکھ کر برہمنوں کے برابر نہ آ جائیں۔ اسی طرح دلتوں کے لیے ممنوع تھا کہ وہ مندر جا کر مورتیوں کے سامنے پوجا کریں۔ اب بعض نچلی ذاتوں کو مندر جانے کی اجازت مل چکی مگر وہ ہندوؤں کے دیوی دیوتاؤں کو اپنا نہیں بنا سکتے۔



برہمنوں کی باندی بھارتی پولیس دلتوں پر ظلم ڈھاتے ہوئے

دلتوں کی تعلیم

میں اس پہلی دلت نسل میں شامل ہوں جس نے سلیٹ، چاک اور پنسل تھامی۔ یوں سمجھیے کہ ہم جنگل سے نکل کر اسکول پہنچ گئے۔ مگر وہاں بھی ہمارے اور ہندو طلبہ کے مابین کوئی مشترک بات نہ تھی۔ انھیں ہر قسم کی آسائشیں میسر تھیں۔ وہ اچھے کھانے کھاتے اور اچھے کپڑے پہن کر آتے۔ ایک ہی گاؤں سے تعلق رکھنے کے باوجود دلت اور برہمنی بچوں کے رہن سہن اور طرزِ معاشرت میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ مثال کے طور پر دلتوں کے لیے اچھے کھانے سے مراد گوشت اور مچھلی تھا۔ مگر برہمن گوشت کا نام سنتے ہی یوں بدکتے جیسے کوئی سانپ آ گیا۔ اسکول میں ہر استاد ذات پات کے مطابق اپنا رویہ اختیار کرتا۔ اگر وہ برہمن ہوتا، تو اکثر یہی کہتا ''ہائے ایشور، کیا کل یگ آ گیا کہ مجھے ان نیچ لڑکوں کو پڑھانا پڑ رہا ہے۔'' اس کی نظروں میں ہم حیوان سے بھی بدتر ہوتے۔ صرف استاد ہی نہیں اعلیٰ ذاتوں کے ہندو بچے بھی ہمارے ساتھ ذلت آمیز سلوک کرتے۔ جب ہم اگلی جماعتوں میں پہنچے، تو ہمیں اجنبی کہانیوں والی درسی کتب پڑھائی جانے لگیں۔ رام اور کرشن کی کہانی، پرانوں سے نظمیں اور رامائن و مہابھارت کے اقتباس! اسکول سے لے کر کالج تک ہماری تلیگو درسی کتابیں، ہندوؤں کی کہانیوں اور داستانوں سے بھری پڑی ہیں۔ برہمن، کھشتری اور بنیا بچوں کے لیے تو یہ کہانیاں اجنبی نہیں، وہ بچپن سے انھیں سن رہے ہوتے ہیں۔ مگر یہ کہانیاں ہمارے سروں کے اوپر سے گزر جاتیں۔

حقیقت یہ ہے کہ تلیگو کی تمام درسی کتب برہمنی تلیگو میں ہیں۔ برہمنی تلیگو عام بول چال کی تلیگو سے مختلف ہے۔ اسی طرح درسی کتب میں دلتوں کے دیوی دیوتاؤں اور رسوم رواج کا بھی کوئی ذکر نہیں۔ بیسویں صدی میں کمیونسٹ دانشوروں نے ہندومت کو تنقید کا نشانہ بنایا لیکن وہ بھی برہمنی زبان میں لکھتے اور بولتے رہے۔ دلتوں کی روح کو کسی نے نہیں جانا کہ وہ بھی اپنا وجود رکھتی ہے۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ صدیوں سے برہمنوں اور ہندوؤں کی دیگر اعلیٰ ذاتوں نے بھارتی معاشرے پر غلبہ حاصل کر رکھا ہے۔

ستم ظریفی یہ ہے کہ دلت، اچھوت، بہوجن وغیرہ بھارت میں اکثریت رکھتے ہیں۔ مگر اعلیٰ جاتی ہندو طاقت کے بل بوتے پر ان پر حاوی ہیں۔ صدیوں کے جبر کی وجہ سے دلت بھی احتجاج کرنے کی ہمت کھو بیٹھے اور خاموش رہنے پر مجبور ہو گئے۔ حتیٰ کہ آزادی کے بعد بھی تعلیمی اداروں میں اعلیٰ جاتی ہندوؤں کا پلہ بھاری رہا اور وہاں انھوں نے اپنی زبان، تہذیب اور ثقافت متعارف کرا دی۔

زمانہ قدیم میں برہمنی و کھشتری اپنے بچوں کو برہمنی مکاتب (گوروکل) بھجوایا کرتے تھے۔ بیسویں صدی میں انگلش میڈیم اسکول ان کے پسندیدہ تعلیمی ادارے بن چکے تھے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ قوم پسند ہندو انگلش میڈیم اسکولوں کے خلاف ہیں، مگر وہ اپنی اولاد کو وہیں پڑھاتے ہیں۔ یہ ان کی کھلی منافقت ہے۔

ہم نے کتب میں پڑھا کہ ہندوؤں میں رواج ہے کہ لڑکے لڑکیوں کی شادیاں چھوٹی عمر میں ہو جاتی ہیں۔ یہی رواج دلتوں میں بھی مستعمل ہے لہٰذا ہمیں حیرت نہیں ہوئی۔ مگر یہ پڑھ کر ضرور تعجّب ہوا کہ جب کسی ہندو لڑکی کا خاوند مر جائے، تو پھر وہ زندگی بھر دوسری شادی نہیں کرتی۔ اس کے سر پر استرا پھیرا جاتا ہے۔ پھر وہ تاعمر سفید کپڑے زیب تن کرتی ہے۔ دلتوں میں جب کسی لڑکی کو طلاق ہو جائے یا اس کا شوہر چل بسے، تو اسے بہت جلد دوسرا خاوند مل جاتا ہے۔

مجھے درسی کتب میں یہ جان کر بہت حیرانی ہوئی کہ زمانہ قریب میں یہ عام رواج تھا کہ جب ہندو بیوی کا خاوند مر جاتا، تو وہ ستی ہو جاتی یعنی اسے بھی پتی کے ساتھ جلا دیا جاتا۔ مجھے خوشی ہے کہ میرا ایسے ظالمانہ مذہب سے کوئی تعلق نہیں۔ میرے والد اچانک چل بسے تھے۔ اگر ہم ہندو ہوتے، تو ہمیں اپنی والدہ سے بھی جدا ہونا پڑتا۔ ان تلیگو درسی کتب میں ایسی ہزارہا دلت خواتین کا تذکرہ نہیں ملتا جو خاوند کی موت کے بعد ملازمت کر کے بڑی جدوجہد سے اپنے بچوں کی پرورش کرتی ہیں۔

دلتوں کی روزمرہ زندگی اور درسی کتب میں بتائے گئے ماحول میں بہت فرق ہے۔ ہندوؤں کی مذہبی کتب مثلاً وید کے مطابق وہ انسان بہت بہادر ہے جو دشمنوں کو قتل کرتا پھرے..... چاہے وہ دشمن اس کے عزیز و اقارب ہی ہوں۔ رامائن اور مہابھارت میں بھی علم اور بہادری اسی خصوصیت سے وابستہ ہے۔ لیکن دلتوں کے نزدیک عالم اور بہادر وہ ہے جو دوسروں کی عملی مدد کرے، کوئی ہنر سیکھے اور شاگردوں کو بھی سکھائے، کٹھن حالات کا مقابلہ دلیری سے کرے۔ کمزوروں اور لاچاروں کے ساتھ ہمدردی سے پیش آئے۔ ان کی ہر ممکن مدد کرے۔ دلت ایسے مرد یا عورت کو اپنا ہیرو سمجھتے ہیں۔ مگر ہندوؤں کی مذہبی کتب میں قتل و غارت گری کرنے والا ہیرو قرار پاتا ہے۔

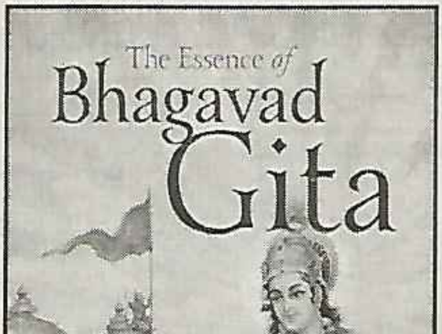
ہندو آئیڈیل اور ہمارے آئیڈیل

برہمنوں و کھشتریوں اور دلتوں و اچھوتوں کی معاشرتی و تہذیبی زندگی میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ اسی لیے ہندوؤں کے ہیرو ہیروئن بھی بہت مختلف ہیں۔ برہمنوں میں وہ شخص قابل ترین مانا جاتا ہے جو مکمّل بھگوت گیتا، رامائن اور مہابھارت یاد کر لے۔ یہ حقیقت ہے کہ برہمنی مذہب منفی کردار ادا کرنے والے ہیرو رکھتا ہے۔ مثال کے طور پر کرشن جو دوسروں کے عزیز و اقارب کے قتل پر ابھارتا ہے۔ اسی طرح ہندوؤں کا ہیرو ارجن اپنے پیارے مار ڈالتا ہے۔ ان کی مذہبی کتب میں دوسروں کی زمین ہتھیا لینا جائز مانا گیا ہے۔ مگر دلتوں کی روایات و اقدار بالکل مختلف ہیں۔ ہمارے ہاں جو شخص کسی کو بھی قتل کرے یا کوئی اور گناہ کرے تو وہ مجرم قرار پاتا ہے۔ جو دیوی یا دیوتا انسانوں کو دوسروں کا قتل کرنے پر ابھارے وہ پالن ہار نہیں شیطان ہوتا ہے۔

ہماری دیوی، پوچما اس لیے ہماری ہیروئن نہیں بنی کہ وہ قاتل ہے۔ اسی لیے بیرا ہمارا ہیرو نہیں بنا کہ وہ کسی کو قتل کر چکا۔ یہ اس لیے ہمارے دیوی دیوتا بنے کہ ہمیں بیماریوں سے

بچاتے اور آفات سے تحفّظ فراہم کرتے ہیں۔ ہندو کی اخلاقیات ہماری اخلاقی اقدار سے بالکل مختلف ہے۔

ہندتوا کے پرچارک آج ہمیں ہندو بنانا چاہتے ہیں۔ لیکن پہلے انھیں اس سوال کا جواب دینا چاہیے کہ ہندو اخلاقیات کیا ہے؟ کیا ہے جس کی رو سے دلت واچھوت نیچ اور گھٹیا ہوتے ہیں؟ ہندو اخلاقیات میں ہیرو وہ نہیں جو شیروں سے مقابلہ کرے اور فصلیں اگائے بلکہ وہ ہے جو رشتے داروں اور دوستوں کو قتل کرتا پھرے۔ ہندوؤں کا دھرم انھیں یہی سکھاتا ہے۔



بھگوت گیتا... ہندوؤں کی اچھوت دشمن مذہبی کتاب

برہمنوں کے دل و دماغ میں یہ نظریہ راسخ ہو چکا کہ ان کی غیر مفید روایتی زندگی عظیم ہے، جبکہ وہ دلتوں کی عملی زندگی کو گھٹیا سمجھتے ہیں۔ اسی لیے برہمن بچے کے ذہن میں بچپن سے یہ بات بیٹھ جاتی ہے کہ ان کا تعلّق برتر و اعلیٰ نسل سے ہے۔ اسی نظریے کا پروپیگنڈا اتنی شدت کے ساتھ ہوتا ہے کہ دلت بھی اسے تسلیم کر چکے۔ یہی وجہ ہے، ایک دلت کتنی ہی شاندار صلاحیتیں رکھے، وہ بھارتی معاشرے میں نیچ ہی کہلائے گا۔ اس حقیقت سے عیاں ہے کہ ہندومت میں انسانوں کو صلاحیتوں نہیں ذات پات کے لحاظ سے پرکھا و جانچا جاتا ہے۔ اس مذہب نے بہترین صلاحیتیں رکھنے والے دلتوں کو کمتر درجے کا بنا ڈالا۔

برہمنوں و کھشتریوں کے مندر ہمارے گھروں سے زیادہ دور نہیں..... مگر ان میں بیٹھے دیوی دیوتا دلتوں سے نفرت کرتے ہیں۔ اسی لیے طاقتور برہمنوں نے دلتوں کو معاشی و معاشرتی طور پر پس ماندہ کر ڈالا۔ انھیں غلام بنا لیا اپنے اشاروں پر چلانے لگے۔

شادی اور موت

بیشتر اقدار کی طرح دلتوں اور ہندوؤں میں شادی اور موت کی رسوم بھی جداگانہ ہیں۔ ہندومت میں لڑکے لڑکی کی قیمت مقرر ہے..... جبکہ دلت جوڑے عموماً محبّت کے بعد شادی کرتے ہیں۔ وقت کے ساتھ ساتھ دلتوں میں شادی بیاہ کی رسومات بھی قباحتوں کا نشانہ بن چکیں، مگر آج بھی روپیا پیسا ان میں زیادہ اہمیت نہیں رکھتا۔ یہ شادی اور موت کی رسومات ہی ہیں جب دلتوں کا ہندو پروہت سے واسطہ پڑتا ہے۔ مگر اس دوران وہ جو منتر و اشلوک وغیرہ پڑھتا ہے، کسی کی سمجھ میں نہیں آتے۔ پروہت بولے گئے جملوں کے معانی نہیں بتاتا، بس وہ کسی روبوٹ کی طرح انھیں دہراتا اور دلتوں سے گھلے ملے بغیر واپس مندر چلا جاتا ہے۔ وہ یہ نہیں بتاتا کہ انسان اور دیوتا کے مابین کس قسم کا روحانی تعلّق ہے اور یہ تعلّق کس قسم کے فوائد بخشتا ہے۔

دلتوں اور پروہت کی اس نایاب ملاقات کا قطعی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ وہ امیر تر ہو جاتا ہے۔ ہر شادی پر پروہت مختلف مادی مطالبات کرتا ہے۔ بعض اوقات مطالبوں پر جھگڑا بھی ہو جاتا ہے۔ پروہت اپنی خدمات کا معاوضہ غریبوں سے بھی کاجو، چلغوزے اور کشمش لے کر وصول کرتا ہے۔ اکثر غربا نے ساری زندگی یہ بیش قیمت میوے نہیں کھائے ہوتے۔

پروہت کو مقررہ رقم دینا بھی لازم ہے۔ اس دوران وہ قطعاً نہیں دیکھتا کہ دلت غریب ہے یا کھاتے پیتے خاندان والا! اس کے برعکس وہ اپنے مطالبات تسلیم نہ ہونے تک شادی یا موت کی رسوم ادا نہیں کرتا۔ اسی لیے دلتوں کے ہاں جب بھی شادی کا موقع آئے، تو وہ جہیز کے بجائے پروہت کی

وجہ سے پریشان رہتے ہیں.....

پروہت کی ظالمانہ اور غیر انسانی روش کی وجہ یہ ہے کہ وہ دلتوں کو ''دیوی دیوتا کے بچے'' نہیں اجنبی سمجھتا ہے۔ اس کی نظر میں دلت جانور جیسے ہیں۔ لہٰذا انھیں ڈانٹنا اور پھٹکارنا جائز ہے۔ وہ کراہت لیے دلتوں کی تقاریب میں شریک ہوتا اور جیسے تیسے اپنی ذمے داری انجام دے کر بھاگ اٹھتا ہے۔ اسی لیے دلتوں اور پروہتوں کے تعلّقات میں اخلاقیات اور روحانیت کا کوئی وجود نہیں..... یہ تعلق خالصتاً مشینی ہے۔

دلتوں کی روزمرہ زندگی

اعلیٰ ذات کے ہندوؤں اور دلتوں کی معاشرتی و معاشی زندگیاں بہت مختلف ہیں۔ ایک دلت گھرانے میں ماں باپ صبح اٹھتے ہی اپنے اپنے کاموں میں لگ جاتے ہیں۔ لیکن برہمنوں کا کام صرف بھگوت گیتا پڑھنا ہے۔ انھیں یقین ہے کہ ان کے دیوی دیوتا سبھی کام کر دیں گے۔ دلت اس غیر عملی زندگی کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔

دلت معاشرے میں مرد اور عورت مل جل کر تمام کام کرتے ہیں۔ ان کے مابین اونچ نیچ کا کوئی تصور نہیں۔ مگر ہندو معاشرے میں مردانہ حاکمیت کا رواج ہے۔ اس معاشرے میں عورت مردوں کے احکامات پر عمل کرتی اور اس کی اپنی حیثیت نچلے درجے کی ہے۔ ہندو معاشرے میں مرد غیر معمولی طور پر طاقتور ہے اور عورت بہت کمزور۔

مثال کے طور پر دلت عورت چاہے، تو کسان، چرواہی، کاروباری اور موچی تک بن سکتی ہے۔ مگر برہمن عورت پروہت نہیں بن سکتی۔ غرض دلت عورت اپنے معاشرے میں بہ حیثیت معاشرتی، معاشی اور سیاسی انسان ہندو عورت کے مقابلے میں بلند مقام رکھتی ہے۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ دلتوں کا نظریہ حیات عملی ہے، جبکہ ہندوؤں کا فلسفیانہ اور غیر عملی! مگر یہ آسمانی نہیں انسانی فلسفہ ہے جو آریاؤں نے ایجاد کیا اور جسے ہندوؤں کے حکمران طبقے نے اپنا کر سبھی پر لاگو کر دیا۔

دلتوں کا نظریہ حیات ایک جملے..... ریکا دیتی غنی بکا دادو میں پوشیدہ ہے۔ تلیگو کے اس جملے کا مطلب ہے ''جب تک ہاتھ حرکت نہیں کرتا، منہ بھی نہیں کھا سکتا۔'' مگر ہاتھوں کی یہ حرکت رام، وشنو یا کرشن والی نہیں جو ہاتھ میں تیر کمان اور تلوار تھامے رکھتے ہیں۔ اس حرکت کے معنی ہیں کہ ہاتھ کھیت میں بیج بکھیریں، ہل چلائیں اور کوئی بھی ایسا مفید کام کریں جس سے اپنے آپ اور دوسروں کو بھی فائدہ پہنچے۔

کم ہی لوگوں کو معلوم ہے کہ بھگوت گیتا میں درج بالا نظریہ حیات کے بالکل برعکس نظریہ پیش ہوا ہے۔ ایک شعر میں بیان کردہ یہی نظریہ حیات ہندو برہمن و کھشتری اپنا چکے۔ شعر یہ ہے: تم کام کرنے کا حق رکھتے ہو مگر پھل نہیں پا سکتے۔'' دلت اور ہندوستان کے دیگر عام لوگ اسی شعر کے مطابق ہیں۔

بھارت کے کروڑوں عوام کی بدقسمتی ہے کہ ان سے رقم گانٹھنے والا پروہت انھیں بھگوت گیتا کے مندرجہ بالا شعر کی بابت کبھی نہیں بتاتا جس پر وہ جی جان سے عمل کرتا ہے۔ اسی شعر سے ہندوؤں کے اس فلسفے نے جنم لیا کہ عوام کو ضرور کام کرنا چاہیے مگر وہ اپنے کام کے میٹھے پھل سے لطف اندوز نہ ہو سکیں۔ یہ پھل صرف حکمران ہندو طبقے کا پیٹ بھرنے میں کام آئیں گے۔ اس مقصد کے لیے ہندو حکمران طبقے نے ایک نظام بنا دیا جو کام کرنے کو گھٹیا اور پوچ حرکت سمجھتا ہے۔ پروہت بھی حکمران ہندو طبقے کے وضع کردہ نظام کا حصہ ہیں اور سیاست داں، جرنیل، کاروباری شخصیات بھی! یہ لوگ عوام کی محنت کا پھل کھانے میں مصروف ہیں اور طرفہ تماشا یہ کہ انھیں اپنے دیوی دیوتاؤں سے قریب بھی نہیں ہونے دیتے۔

بنیا معیشت

ماضی قریب میں بھارت کے ہر گاؤں میں بنیے بستے تھے۔ ان کا رہن سہن برہمنوں جیسا تھا۔ ان کی بڑی تعداد اب بھی بھارتی دیہات میں بستی ہے۔ دیہات میں مشہور تھا

کہ بنیے دولت جمع کرنے کے شوقین ہیں۔ کنجوس ہیں اور کھانے پینے کے دلدادہ۔ روپے پیسے کے لین دین میں طاق ہیں۔ بنیے کے بچوں کو بچپن سے یہ فن سکھایا جاتا۔ ایک بھارتی گاؤں میں بنیا خاصی اہمیت رکھتا تھا۔ وہ لوگوں سے اناج، سبزیاں، دالیں وغیرہ خریدتا جبکہ انھیں کپڑے، مسالے، تیل اور اناج بھی فروخت کرتا۔ گویا وہ گاؤں میں اناج، سبزی، مسالوں وغیرہ کا تقسیم کنندہ یا ڈسٹری بیوٹر تھا۔ پروہت کے برعکس بنیا دلتوں اور اچھوتوں سے مل لیتا کیونکہ یہ اس کے کاروبار کا تقاضا تھا۔ بنیا اور اس کی بیوی دونوں شاطر وعیار اور جھوٹ بولنے میں طاق ہوتے۔ وہ چکنی چپڑی باتوں سے سیدھے سادھے دلتوں کو الو بناتے اور اپنے مفادات حاصل کر لیتے۔

بنیوں کی زندگی کا مقصد یہی ہوتا کہ ان کا کاروبار پھلتا پھولتا رہے چاہے انھیں ناجائز ہتھکنڈے استعمال کرنا پڑیں۔ بنیا دراصل جھوٹ ومکاری کو ازروئے ہندومذہب جائز سمجھتا ہے۔ بنیا ہی ذات پات کے ہندوانہ نظام کا مخصوص نمائندہ بھی تھا۔ گاہک کی ذات جتنی اعلیٰ ہوتی، وہ اسے اتنا ہی سستا سودا دیتا۔ جبکہ دلت اور اچھوت اُس سے مہنگا سودا خریدنے پر مجبور تھے۔ اسی طرح وہ دلتوں سے بہت کم داموں پر مال خریدتا جبکہ برہمنوں کو منہ مانگے دام ادا کیے جاتے۔ مگر غریب عوام بے بس تھے کیونکہ گاؤں کی معیشت پر بنیے ہی قابض تھے۔

ازدواجی تعلّقات

ہندومت اور دلتوں کے مذہب میں میاں بیوی کے تعلّقات کا بیان بھی بہت مختلف ہے۔ دلتوں کے ہاں فحاشی مفقود ہے۔ جبکہ ہندومت میں فحاشی کو آرٹ کا درجہ حاصل ہے۔ آپ ہندوؤں کی مذہبی کتب پڑھیے، وہ دیوی دیوتاؤں کے فحش قصوں سے بھری پڑی ہیں۔ جبکہ دلت اپنے دیوی دیوتا کی نجی زندگیوں کے متعلّق کچھ نہیں جانتے۔

برہمن و کھشتری عام طور پر اپنی عورتوں کو سات پردوں کے پیچھے رکھتے ہیں۔ مگر ان کے دیوی دیوتا کھلے عام عشق لڑاتے ہیں۔ اس ضمن میں رادھا اور کرشن کا عشق مشہور ہے۔ یہ ہندومت کا بہت بڑا تناقص ہے۔ ایک طرف یہ مذہب عورت کو پوشیدہ رکھتا ہے اور دوسری جانب اسے فحاشی کا مرکز بھی بنا دیا گیا۔

دلتوں کی نظر میں مرد اور عورت برابر ہیں۔ بس قدرت الٰہی نے انھیں علیحدہ حقوق وفرائض تفویض کر دیے۔ دلتوں میں یہ رواج نہیں کہ بیوی اپنا خلوص اور فرماں برداری دکھانے کے لیے شوہر کے پیر پکڑ ان کی عبادت کرے۔ ایسا صرف ہندوؤں میں ہوتا ہے۔ درست کہ دلت معاشرے میں بھی مرد کو کچھ فوقیت حاصل ہے مگر وہ جمہوری معاشرہ زیادہ ہے۔



برہمنوں کے خلاف احتجاج کرتی ایک دلت لڑکی

’’نئے کھشتریوں‘‘ کا ظہور

بیسویں صدی میں جمہوریت اور انسانی حقوق کا بول بالا ہوا۔ سائنس وٹیکنالوجی کی ایجادات گھر گھر پہنچ گئیں۔ غریب کو بھی اخبار، ٹی وی اور کتابیں میسر آنے لگیں۔ میڈیا کے پھیلاؤ اور فراوانی نے عام آدمی کو شعور دیا اور وہ اپنے حقوق سے آگاہ ہوا۔ اس روش نے بھارت میں ذات پات کے نظام کو بھی خاصی حد تک متاثر کیا اور برہمنوں کو پہلے جیسا آمرانہ مقام حاصل نہیں رہا۔ اس دوران بھارت میں ایک عجوبے نے جنم لیا۔ وہ یہ کہ شودر طبقے کی جوذاتیں معاشی طور پر مضبوط ہو گئیں، وہ خود کو ’’کھشتری‘‘ کہلانے لگیں۔ ان

ذاتوں میں مرہٹہ، پٹیل، جاٹ، راجپوت، ریڈی، ٹھاکر، کاما، ویلماس، وغیرہ شامل ہیں۔

ماضی میں برہمنوں اور کھشتریوں کے مابین یہ معاہدہ طے پایا تھا کہ کھشتری مملکت کا انتظام سنبھالیں گے۔ جبکہ برہمن ملک چلانے میں ان کی مدد کریں گے۔ بھارت کی آزادی کے بعد کچھ عرصہ اسی معاہدے کے مطابق کاروبار حکومت چلتا رہا مگر پھر جدیدیت کی لہر نے اس نظام میں دراڑیں ڈال دیں۔ اب شودر جیسے نچلے طبقے کی بااثر اور طاقتور ذاتیں بھی حکومت میں شامل ہونے کے لیے زور مارنے لگیں۔ میں نے ان ذاتوں کے لوگوں کو ''نئے کھشتری'' کا نام دیا جن کا تذکرہ درج بالا آچکا۔ افسوس ناک بات یہ ہے کہ یہ نئے کھشتری اپنی روایات و اقدار چھوڑ کر نہ صرف ہندومت کی جانب راغب ہوئے بلکہ اب ''نظریہ ہندتوا'' بھی اپنا چکے۔ ان نئے کھشتریوں کی وجہ سے قوم پرست ہندو سیاسی جماعتوں کو بہت تقویت ملی۔ اسی لیے ۱۹۸۵ء کے بعد اچانک وہ بڑی سیاسی قوت بن کر ابھر آئیں۔ قوم پرست ہندو جماعتوں کے برہمن و کھشتری قائدین کو محسوس ہو گیا کہ اب نئے کھشتریوں کو اقتدار میں شریک کرنا پڑے گا۔ ان کی شراکت ہی سے وہ بھارتی حکومت پر قبضہ کر سکتے تھے۔ چناں چہ بی جے پی اور آر ایس ایس شودر ذاتوں کے افراد کو اپنی صفوں میں شامل کرنے لگیں۔ اس نئی حکمت عملی نے اسی لیے جنم لیا کہ اقتدار تک پہنچا جا سکے۔ یہ نئی حکمت عملی بی جے پی کے لیے کامیاب ترین ثابت ہوئی۔ ۱۹۸۴ء کے عام انتخابات میں پارٹی کو صرف ''۲'' نشستیں ملی تھیں۔ مگر جب اس نے نئے کھشتریوں اور بعض بااثر دلت راہنماؤں کو بھی ''پاور شیئرنگ'' میں شریک کر لیا، تو ۱۹۸۹ء کے الیکشن میں اس نے ''۸۵'' نشستیں حاصل کر لیں۔ اس کے بعد آنے والے انتخابات میں بی جے پی کی نشستوں کی تعداد بڑھتی چلی گئی۔ یہاں تک کہ اس نے ۱۹۹۹ء میں اپنی حکومت قائم کر لی۔ نئے کھشتری اب بی جے پی میں اہم مقام حاصل کر چکے۔ اس امر کا ثبوت الیکشن ۲۰۰۴ء میں سامنے آیا۔ تب نئے کھشتری وزیراعظم واجپائی کی پالیسیوں سے خوش نہیں تھے۔ لہٰذا انھوں نے کم تعداد میں بی جے پی کو ووٹ دیا۔ نتیجتاً کانگریس مع اتحادیوں کے جیت گئی اور اسی نے اپنی حکومت بنائی۔

ماضی سے سبق سیکھتے ہوئے الیکشن ۲۰۱۴ء میں بی جے پی اور آر ایس ایس نے ایک شودر، نریندر مودی کو اپنا امیدوار بنا دیا۔ یوں برہمنوں و کھشتریوں کی یہ جماعتیں زیادہ سے زیادہ شودر ووٹ حاصل کرنا چاہتی تھیں۔ یہ حکمت عملی پھر کامیاب ترین ثابت ہوئی اور الیکشن بی جے پی نے بھاری اکثریت سے جیت لیا۔ یہ نئے کھشتری اب مذہبی، تہذیبی، ثقافتی اور معاشی لحاظ سے برہمنوں اور کھشتریوں کے رنگ میں رنگ رہے ہیں۔ ان میں بھی وہ برائیاں جنم لے چکیں جو برہمن ازم کا طرہ امتیاز ہیں۔ یعنی غریبوں پر مظالم ڈھانا، عورت کو کمتر سمجھنا اور عوام کی محنت کا پھل خود کھا جانا۔ اسی لیے دلت ان نئے کھشتریوں کو اچھی نظر سے نہیں دیکھتے اور اپنا نیا دشمن سمجھتے ہیں۔

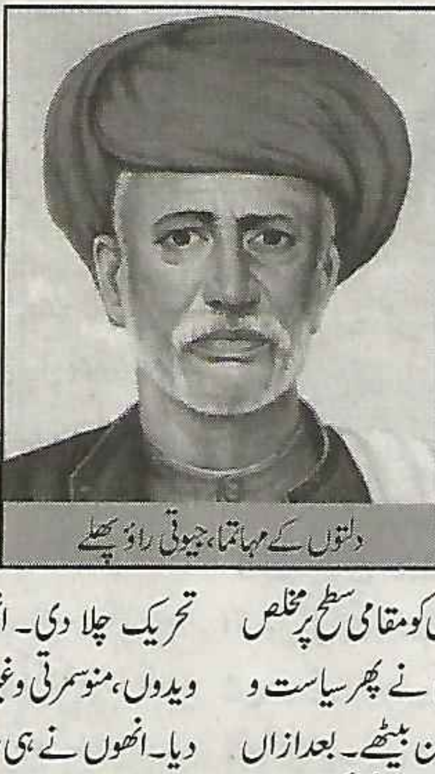
ہندو سیاسی ادارے اور دلت

ہندوانہ ذات پات کے نظام میں مذہبی فرائض برہمنوں کے ذمے تھے۔ کھشتری حکومت کرتے اور ویش یا بنیے کاروبار و تجارت۔ لیکن تاریخ میں ایسے ادوار آچکے جب برہمن حکومت کرنے لگے اور تاجر و کاروباری بھی بن گئے۔ مثال کے طور پر بیسویں صدی میں ہندوستان کی تقریباً تمام ہندو سیاسی جماعتوں کے قائدین برہمن تھے۔ نیز یہ برہمن ہی ہیں جنھوں نے انیسویں اور بیسویں صدی میں انگریز دانشوروں کے تعاون سے ''ہندومت'' کی بہ حیثیت مذہب بنیاد رکھی۔ اور اب برہمن، کھشتری، ویش اور نئے کھشتری (شودروں کی اعلیٰ ذاتیں) مل کر حکومت کر رہی ہیں۔

مغلوں اور انگریزوں کے زمانے میں گاؤں میں پولیس، پٹیل (انتظامی سربراہ) اور پٹواری (ٹیکس افسر) تین اہم

سرکاری ادارے تھے۔ ہندوؤں کے علاقے میں ان تینوں اہم عہدوں پر برہمن یا کھشتری فائز ہوتے..... شودر یا اچھوت کو یہ عہدہ سنبھالنے کی اجازت نہیں تھی۔ آزادی بھارت کے بعد حکومت نے دیہات میں پنچایتیں متعارف کرائیں۔ بدقسمتی سے ان پنچایتوں میں بھی اپنے اثرورسوخ اور طاقت کی وجہ سے برہمن و کھشتری طاقتیں بن بیٹھے۔ یوں وہ اپنے مفادات پورے کرتے رہے، جبکہ دلتوں کو ان کے حقوق سے محروم رکھا۔

غرض آزادی کے اس دور میں بھی بھارتی دیہات میں برہمنوں وغیرہ کی آمریت برقرار ہے۔ ایک گاؤں میں پٹواری کا عہدہ صرف برہمن کو ملتا ہے۔ جبکہ پولیس کا نظام نئے کھشتریوں کے سپرد ہو چکا۔ اس امر نے انھیں مزید طاقتور بنا دیا اور وہ دلتوں سے حقارت آمیز سلوک کرنے لگے۔ یہ نئے کھشتری معاشرتی، سیاسی اور معاشی لحاظ سے برہمنوں کی حاکمیت قبول کر چکے۔



دلتوں کے مہاتما، جیوتی راؤ پھلے

تاریخ کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ انگریز ہیں جنھوں نے برہمنوں اور کھشتریوں کو مراعات دیں اور اہم سرکاری عہدوں پر فائز کیا۔ یوں انگریزوں کو مقامی سطح پر مخلص مددگار مل گئے۔ ان برہمنوں و کھشتریوں نے پھر سیاست و معیشت پر قبضہ کر لیا اور ''کالے حاکم'' بن بیٹھے۔ بعدازاں انھوں نے انگریز حکومت کے خلاف تحریک چلائی، مگر یوں وہ ہندوستان پر اپنا اقتدار قائم کرنا چاہتے تھے۔ اس ضمن میں درپردہ انگریزوں کی بھرپور مدد حاصل رہی۔ کتب تاریخ پڑھیے، آپ پر منکشف ہو گا کہ عیاں یا خفیہ انداز میں انگریزوں نے برہمن و کھشتری راہنماؤں مثلاً راجا رام موہن رائے، رابندر ناتھ ٹیگور، گاندھی اور پنڈت نہرو کو آگے بڑھنے میں مدد دی اور یوں بھارت میں اعلیٰ ہندو ذاتوں کے راج کی بنیاد رکھی۔

دلتوں کا احتجاج

یہ بھی حقیقت ہے کہ انگریزوں نے ان دلت راہنماؤں کا راستہ نہیں روکا جو برہمنوں مت کے خلاف اٹھے اور اس کی اصلیت آشکار کر دی۔ ان میں سرفہرست مہاتما جیوتی راؤ پھلے (۱۸۲۷ء۔۱۸۹۰ء) ہیں۔ جیوتی راؤ مہاراشٹر کے ضلع ستارہ میں پیدا ہوئے۔ سبزی فروش کے بیٹے تھے، مگر خداداد صلاحیتوں کے بل پر انگلش میڈیم اسکول میں تعلیم پائی۔

اسکول میں ایک برہمن لڑکا ان کا دوست بن گیا۔ جب برہمن دوست کی شادی ہوئی، تو اس نے جیوتی راؤ کو بھی بلوالیا۔ مگر برہمن کے والدین اور رشتے داروں کو ایک اچھوت کا تقریب عروسی میں آنا بہت ناگوار گزرا۔ انھوں نے جیوتی راؤ کی تذلیل کر کے تقریب سے نکال دیا۔ یوں وہ ذات پات کے نظام سے بڑے تلخ انداز میں آشنا ہوئے۔ جیوتی راؤ نے اس نظام کے خلاف تحریک چلا دی۔ انھوں نے ہندوؤں کی مذہبی کتب مثلاً ویدوں، منوسمرتی وغیرہ کو من گھڑت قصے کہانیوں کا مجموعہ قرار دیا۔ انھوں نے ہی سب سے پہلے اچھوتوں کو ''دلت'' کہہ کر پکارا۔ مرہٹی زبان کے اس لفظ کا مطلب ہے: ٹوٹا پھوٹا، پچکایا ہوا۔

دور جدید میں دلتوں کے دوسرے بڑے راہنما ڈاکٹر امبیدکر (۱۸۹۱ء۔۱۹۵۶ء) کا تعلق بھی مہاراشٹر سے تھا۔ انھوں نے دلتوں کے حقوق کی خاطر زبردست تحریک چلائی اور برہمنوں کی آمریت کمزور کر ڈالی۔ ان کا تعلق مہر ذات

سے تھا۔ وہ ہندومت کے شدید مخالف تھے اور انھوں نے اس مذہب کی بنیادیں ہلا ڈالیں۔ ڈاکٹر امبیدکر عام انتخابات میں دلتوں کی جداگانہ نمائندگی چاہتے تھے تاکہ ان کا تشخّص قائم ہو سکے۔ لیکن گاندھی جی، پنڈت نہرو اور دیگر برہمن لیڈروں کو یہ فکر لاحق ہوگئی کہ اگر دلت خودمختار اور آزاد ہوئے، تو وہ ہندومت کی گرفت سے نکل جائیں گے۔ یوں ہندوستان میں ہندو اکثریت خاصی کم رہ جاتی۔ چناں چہ گاندھی جی نے ڈاکٹر امبیدکر کو ناکام بنانے کے لیے ۱۹۳۲ء میں بھوک ہڑتال کا ڈھونگ رچا دیا۔ وہ چاہتے تھے کہ ڈاکٹر امبیدکر دلتوں کی جداگانہ نمائندگی کا مطالبہ ترک کردیں۔ کانگریس نے گاندھی جی کی بھوک ہڑتال کا بہت پروپیگنڈا کیا اور ہندو لیڈر یوں ظاہر کرنے لگے جیسے وہ عنقریب چل بسیں گے۔ اس طرح ڈاکٹر امبیدکر پر شدید نفسیاتی دباؤ ڈالا گیا۔ وہ اسے برداشت نہ کرسکے اور اپنے مطالبے سے دستبردار ہوگئے۔ یوں دلتوں کی شناخت جنم نہ لے سکی۔

بیسویں صدی میں جب مارکسزم اور کمیونزم ہندوستان پہنچے، تو خیال تھا کہ وہ ہندوستانی معاشرے سے اعلیٰ جاتی ہندوؤں کی آمریت ختم کریں گے۔ لیکن جلد ہی برہمنوں نے کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا پر قبضہ کرلیا۔ یہ برہمن لیڈر انگریز حکومت کے خلاف تو کارروائیاں کرتے رہے مگر انھوں نے ذات پات کا نظام مٹانے کے لیے ٹھوس اقدامات نہیں کیے۔ چناں چہ بھارت کی کمیونسٹ پارٹیاں بورژوائی طبقے کی آماجگاہ بن گئیں جس میں برہمن، کھشتری اور نئے کھشتری شامل ہیں۔

منڈل کمیشن کے فسادات

جنوری ۱۹۷۹ء میں وزیراعظم مرارجی ڈیسائی نے بہار کے سابق وزیراعلیٰ، بی پی منڈل کی سربراہی میں ایک کمیشن قائم کیا۔ کمیشن کی ذمے داری تھی کہ وہ ایسی تجاویز دے جن کے ذریعے غریب ولاچار ذاتوں کی حالت زار سنواری جا سکے۔ مرارجی ڈیسائی ایک مخلص سماجی راہنما تھے۔ اسی لیے برہمن ہونے کے باوجود وہ غریبوں کے لیے نرم گوشہ رکھتے تھے۔ (ڈیسائی ”نشان پاکستان“ کا اعزاز حاصل کرنے والے واحد بھارتی ہیں۔ مترجم)

منڈل کمیشن نے دو سال بعد حکومت کو سفارشات پیش کیں۔ مگر تب تک حکومت بدل چکی تھی لہٰذا کمیشن کی رپورٹ سردخانے پہنچ گئی۔ رپورٹ پھر ۹ راگست ۱۹۹۰ء کو کہیں جا کر تازہ ہوا میں آئی۔ اس دن وزیراعظم وی پی سنگھ نے اعلان کیا کہ وہ منڈل کمیشن کی سفارشات پر عملدرآمد کرنا چاہتے ہیں۔ کھشتری وی پی سنگھ بھی مرارجی ڈیسائی کی طرح سماجی کارکن اور اچھوتوں کے بُرے حالات بدلنے کی تمنا رکھتے تھے۔

لیکن یہ اعلان برہمن و کھشتری پر بم بن کر گرا۔ دراصل منڈل کمیشن نے سفارش کی تھی کہ ۵۰ فی صد سرکاری ملازمتیں شودر ذاتوں کو دی جائیں۔ اس سفارش پر عملدرآمد ہوتا، تو مستقبل میں افسر شاہی پر نچلی ذاتوں کے لوگ اکثریت میں آجاتے۔ برہمن طبقہ یہی نہیں چاہتا تھا کیونکہ یوں بھارتی معاشرے پر اس کی سیاسی، معاشرتی، مذہبی اور معاشی گرفت کمزور ہو جاتی۔ چناں چہ شمالی بھارت کے شہروں میں برہمن وی پی سنگھ حکومت کے خلاف احتجاج کرنے لگے۔ اس وقت بی جے پی حکومت کی اتحادی تھی۔ مگر جب وی پی سنگھ کھلم کھلا نچلی ذاتوں کے حق میں ہوگئے، تو اس کے برہمن لیڈروں نے حمایت سے ہاتھ کھینچ لیا۔ یوں چند ہی ماہ بعد وی پی سنگھ حکومت کا خاتمہ ہوگیا۔ اس طرح برہمنی طبقے نے کم تر ذاتوں تک معاشی و معاشرتی فوائد پہنچنے نہیں دیے۔

۱۹۹۰ء کے درج بالا فسادات میں پہلی بار نئے کھشتریوں نے بی جے پی کا ساتھ دیا اور حکومت مخالف جلوس نکالے۔ ان کی حمایت پا کر بی جے پی قائدین خوشی سے پھولے نہ سمائے۔ انھوں نے پھر طے کیا کہ مسلمانوں کے

خلاف شودروں اور دلتوں کے مذہبی جذبات بھڑکائے جائیں تاکہ ان کی اکثریت بی جے پی میں شامل ہوسکے۔ چناں چہ اواخر ۱۹۹۰ء میں بی جے پی راہنما، ایل کے ایڈوانی نے رام مندر کی تعمیر کے لیے ''رتھ یاترا'' شروع کردی۔ انھوں نے بھارت بھر کا چکر لگایا اور اپنی تقاریر میں مسلمانوں کے خلاف زہر اگلتے رہے۔ بہرحال وہ لاکھوں شودروں یعنی نئے کھشتریوں کو بی جے پی کا حامی بنانے میں کامیاب رہے۔

لیکن منڈل کمیشن کے فسادات نے بہت سے دلتوں اور شودروں کو برہمن و کھشتری حکمران طبقے کے خلاف متحد بھی کردیا۔ انھیں احساس ہوگیا کہ جب تک وہ متحد نہیں ہوتے، یہ طاقتور طبقہ ان کا استحصال کرتا رہے گا۔

دلت و شودر ایکا کا بہترین مظاہرہ ریاست اترپردیش کے الیکشن ۱۹۹۳ء میں دیکھنے کو ملا۔

اس الیکشن میں بی جے پی نے ۲۲۱ نشستیں جیتی تھیں۔ اس بار دلت راہنما، مایاوتی اور شودروں کے راہنما، ملائم سنگھ یادو نے بی جے پی کے خلاف اتحاد کرلیا۔ چناں چہ ریاست سے برہمن پرست بی جے پی کا صفایا ہوگیا اور تاریخ میں پہلی بار اچھوت ایک ہندو ریاست کے حکمران بن گئے۔

نئے کھشتریوں کی بڑھتی طاقت

معاشرے میں بڑھتی آزادی اظہار رائے کی وجہ سے برہمن و کھشتریوں پر مشتمل آمرانہ طبقے کی طاقت کم ہونے لگی۔ لیکن نئے کھشتری اس فرسودہ نظام کو تقویت پہنچانے کا سبب بن گئے۔ یہ نئے کھشتری طاقت، عزت و شہرت پانے کے خواہش مند تھے اور ان کا خیال تھا کہ برہمنوں و کھشتریوں کے آشیرباد ہی سے وہ اپنی منزل تک پہنچ سکتے ہیں۔ لاکھوں نئے کھشتریوں کی مدد پاکر ''سنگھ پریوار'' (ہندو قوم پرست جماعتوں کے اتحاد) کو یہ حوصلہ ہوا کہ وہ بابری مسجد شہید کرسکے۔ اس واقعے کے بعد سنگھ پریوار طاقت پکڑتا چلا گیا۔ یوں نئے کھشتریوں نے اس لحاظ سے نہایت خطرناک کردار ادا کیا کہ وہ دم توڑتے برہمن و کھشتری ظالمانہ نظام کو نئی زندگی دینے کا سبب بن گئے۔

ان نئے کھشتریوں کو یہ احساس نہیں کہ وہ برہمنوں و کھشتریوں کا ساتھ دے کر سیاسی طاقت تو پالیں گے، مگر نظریاتی طور پر ان کے غلام ہی رہیں گے۔ وجہ یہ کہ مذہب، فلسفہ اور نظریات پر اب بھی برہمن طبقہ ہی قابض ہے۔ اسی لیے نئے کھشتری مندر میں پروہت نہیں بن سکتے۔ مزید برآں حکمت عملی طے کرنے والے سرکاری و نجی اداروں میں بھی نئے کھشتری بہت کم نظر آتے ہیں۔



ڈاکٹر امبیدکر جنھوں نے دلتوں کو حقوق دلوانے کے لیے ہندوؤں سے جنگ لڑی

برہمنوں و کھشتریوں کی سازش یہ ہے کہ نئے کھشتریوں کو قربانی کا بکرا بنا کر اپنے مفادات حاصل کیے جائیں۔

حقیقت یہ ہے کہ جو دلت اور شودر برہمن و کھشتری آمریت سے نبرد آزما تھے، ان کی جدوجہد کو نئے کھشتریوں نے نقصان پہنچایا۔ ان کی وجہ سے سنگھ پریوار اقتدار حاصل کرنے میں کامیاب رہا اور اب وہ اپنے مذہب، ہندو مت کو تمام بھارتیوں پر ٹھونسنا چاہتا ہے۔ ان ہندو قوم پرستوں کی آمریت کا مقابلہ صرف اسی صورت ممکن ہے کہ شودر، دلت، قبائلی اور اقلیتیں آپس میں اتحاد کرلیں۔ یوں وہ بھارت میں صحیح جمہوریت لاسکتے ہیں جو معاشرے کے سبھی طبقوں کو فائدہ پہنچائے۔

سندھی کہانی

مٹی کا آدمی

''معاشرے میں ذہین آدمی کے لیے موت اور ملامت کے سوا کچھ نہیں؟''

سندھی: امر جلیل

اردو ترجمہ: فیاض اعوان

جمعہ کا دن تھا۔ صبح کا وقت تھا۔ میں خالی دماغ سے اخبارات کے صفحات دیکھ رہا تھا۔ ساری رات میں نے خواب میں خود کو اڑتے دیکھا تھا۔ صبح اٹھا تو دماغ اپنی جگہ پر نہیں تھا۔ اخبارات کے رنگین صفحات پر خوف ناک مسٹنڈے پہلوانوں، بدمعاشوں، چوروں، اچکوں، قاتلوں، ڈاکوؤں، دانشوروں اور سیاست دانوں اور انڈر ٹریننگ سیاست دانوں کے رنگین فوٹو دیکھ کر میں اللہ تعالیٰ کی قدرت کا قائل ہو رہا تھا۔ جب سے عورتوں کی تصویروں سے اخبارات کو پاک کیا گیا ہے، تب سے خوبصورت اور ہیبت ناک مردوں کے رنگین فوٹو، اخبارات کے حسن میں برابر اضافہ کر رہے ہیں۔

میں غور سے ایک نہایت ہی خوف ناک اور خبیث قسم کے بوڑھے کی تصویر دیکھ رہا تھا جس نے اسّی سال کی عمر میں ایک سولہ سالہ لڑکی سے شادی کی تھی۔ اخبار کے صفحے پر سے لڑکی کی تصویر غائب تھی اور اس بوڑھے دولھے کی تصویر نمایاں تھی جس نے اپنی داڑھی کے بال اور گنج پر بچے کھچے بالوں کو کسی ظالم کے دل کی طرح خضاب سے کالا کر رکھا تھا .....اسی وقت اچانک باہر کا دروازہ کھٹکا۔

میں نے چینے سے کہا: ''یار چینے! میرا خیال ہے کرایہ دار قرض کی وصولی کرنے آئے ہیں۔''

چینا مٹی سے آدمی بنا رہا تھا۔ پوچھا ''دروازہ کھولوں کیا؟''

''ایک ٹیلی ویژن ڈرامے سے پیسے ملے ہیں۔'' میں نے کہا ''دروازہ کھول دو۔ آج اپنا قرض اتاریں گے اور کچھ یاروں کو قرض میں مبتلا کریں گے۔''

چینے نے کہا ''آدمی کے چہرے پر ناک لگا کر ایک منٹ میں دروازہ کھولتا ہوں۔''

چینا میرا چھوٹا بھائی ہے۔ وہ دس سال کا ہے۔ بے حد ذہین ہے۔ دُکھ سُکھ میں میرا ساتھی ہے۔ مجھے دُکھی نہیں ہونے دیتا۔ میں کبھی کبھی چینے کے لیے بڑا اداس ہو جاتا ہوں۔ مجھے معلوم ہے کہ چینا ایک نہ ایک دن اپنی ذہانت کے سبب مارا جائے گا۔ ہمارا معاشرہ سطحی سوچ رکھنے والوں کے لیے نہایت موزوں اور مناسب معاشرہ ہے۔ مگر ہمارے معاشرے میں ذہین آدمی کے لیے ملامت اور موت کے سوا کچھ نہیں ہے.....کچھ عرصے سے چینا، مٹی سے آدمی بنانے لگا ہے لیکن اس کے بنائے ہوئے آدمی مائیکل اینجلو اور شاکر علی کے بنائے ہوئے آدمیوں سے مختلف ہوتے ہیں۔



دروازہ دوبارہ کھڑکا!

چینے نے آدمی کا چہرہ ناک کے بغیر چھوڑ دیا۔ اس کے دونوں ہاتھ مٹی سے بھرے ہوئے تھے۔ باہر دروازے کی طرف جاتے ہوئے بولا ''ٹینا کا باپ ہوگا۔ رات کی پارٹی سے بچے ہوئے کیک کا ٹکڑا لے کر آیا ہوگا۔''

ٹینا اور اس کا باپ ہمارے پڑوسی ہیں۔

ٹینا ایک پرائیویٹ فرم میں اسٹینو گرافر ہے اور وہ بہت اچھی آواز اور انداز سے باتیں کرتی ہے۔ اور اس کا باپ وِکٹر ڈی سُوزا ریٹائرڈ ریلوے گارڈ ہے۔ وہ اپنے وقت کا مشہور کرکٹر ہے۔ جوانی میں کرسچن کرکٹ کی طرف سے کھیلتا تھا اور بہت تیز بالنگ کیا کرتا تھا۔ اس کے گھر پر کبھی کبھی پارٹیاں بھی ہوتی ہیں، جس میں ٹینا کی فرم کے ملازم شامل ہوتے ہیں۔ وہ لوگ رات دیر تک ہنگامہ برپا رکھتے ہیں۔ صبح کو اکثر یہ ہوتا کہ ٹینا کا باپ وکٹر ڈی سوزا، رات کی پارٹی سے بچا ہوا کیک اٹھائے ہمارے پاس آتا اور رات بھر کی ہنگامہ آرائیوں پر معذرت کرتا اور پھر صبح کی چائے ہمارے ساتھ پیتا۔ وکٹر ڈی سوزا کی چینے سے پکی دوستی ہے۔ وہ چینے کو مٹی سے آدمی بنانے کے لیے طرح طرح کی ہدایتیں اور مشورے دیتا ہے۔ وہ چینے سے کہتا ہے ''کبھی کبھی ایسا آدمی بھی بنایا کرو جس کے چہرے پر کانوں کے بجائے کھن (سور کے کان) ہوں۔''

چینے نے دروازہ کھولا۔ دروازے کے باہر وکٹر ڈی سوزا کے بجائے ہمارا دوسرا پڑوسی سومار چانڈیو کھڑا تھا..... دروازے سے اس نے مجھے آنگن میں اخبار پڑھتے دیکھا، تو ایک دم اندر چلا آیا۔ اس سے پہلے کہ میں اس سے حال احوال پوچھتا، اس نے کہا ''میرے بیٹے وَلو کا دماغ پھر خراب ہو گیا ہے۔ میں اسے چارپائی کے ساتھ باندھ کر آرہا ہوں۔''

میں نے پوچھا ''دورہ پڑا ہے کیا؟''

رونے کی سی آواز میں کہا ''ہاں۔''

سومار چانڈیو ایک سرکاری آفس میں پٹے والا ہے۔ اس کا بیٹا وَلو میٹرک میں پڑھتا ہے۔ صبح وہ اسکول جاتا ہے اور رات کو دھوبی کی دکان پر کپڑے استری کرتا ہے۔ لوگوں کا خیال ہے کہ چانڈیو کا بیٹا وَلو یا تو آدھا پاگل ہے یا پھر اس پر جن بھوتوں کا اثر ہے۔ لیکن وَلو ہمیں کبھی پاگل نہیں لگا۔ وہ اپنے اسکول کا ایک اچھا شاگرد ہے۔ اور اسکول کی والی بال ٹیم کا ایک ممبر ہے۔ بس کبھی کبھی اس پر دورہ پڑتا ہے۔ تب اس کا سارا جسم پہلے کانپنے لگتا ہے اور پھر پسینے میں تر ہو جاتا ہے۔ ایسی کیفیت میں وہ گھر سے بھاگنے کی کوشش کرتا ہے اور صرف ایک ہی جملہ بار بار منہ سے نکالتا ہے۔ ''میں سب سمجھتا ہوں، میں سب سمجھتا ہوں، میں چوک پر کھڑا ہو کر سچ بولوں گا۔''

رشتہ دار، عزیز سب اسے سمجھاتے ہیں کہ ''بیٹے! سچ بولنے کا رواج ختم ہو چکا ہے۔ اور ویسے بھی ہم مسکین لوگوں کا بھلا سچ سے کیا واسطہ.....! کیوں سچ کا نام لے کر ہم سب کو مصیبت میں ڈالتے ہو!''

لیکن دورے کے دوران وَلو کو کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ ایک ہی بات بس اس کے منہ پر ہوتی ہے کہ ''میں سب سمجھتا ہوں، میں سب سمجھتا ہوں، میں چوک پر کھڑا ہو کر سچ بولوں گا!''

سُومار چانڈیو کو کچھ سیانوں نے مشورہ دیا تھا کہ اپنے بیٹے کا علاج ملک کے مشہور ڈاکٹر اور سرجن جمعہ خان سے کراؤ۔ وہ دماغ کا بڑا ماہر ڈاکٹر ہے۔ اور اگر دماغ میں کسی طرح کا خلل ہو تو وہ نکال دیتا ہے۔ سومار چانڈیو نے حامی بھر لی تھی۔ لیکن جب اسے ڈاکٹر جمعہ خان کی فیس اور جناح اسپتال کے گردن توڑ خرچ کا علم ہوا، تو اس نے ایک ٹھنڈا سانس لیتے ہوئے کہا ''آئندہ ایک صدی میں بھی، مَیں اپنے بیٹے کا علاج کسی اسپیشلسٹ سے نہیں کرا سکوں گا۔''

وَلو اور محلے کے دوسرے بچوں کا مجھ سے بھائی چارہ ہے۔ وہ میری بات سمجھ سکتے ہیں اور میں ان کی بات سمجھ سکتا ہوں۔ اگر میری شادی ہوئی ہوتی اور میرے بچے ہوتے، تو محلے کے کتنے ہی بچوں سے عمر میں بڑے ہوتے۔ اس کے باوجود کہ میری شادی نہیں ہوئی، بچے مجھے ''اداوڈا (بڑا بھائی)'' کہہ کر بلاتے ہیں۔ وَلو میری بہت عزت کرتا ہے اور میری بات کبھی نہیں ٹالتا۔ وہ چینے سے بھی بہت محبّت کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسے جب بھی دورہ پڑتا ہے اس کا باپ سومار چانڈیو دوڑتا ہوا آتا ہے۔ میں ہوتا ہوں تو مجھے ورنہ چینے کو اپنے گھر لے جاتا ہے۔ ہم وَلو کو راضی کرتے ہیں، سمجھاتے ہیں اور پھر اسے اپنے گھر لے آتے ہیں۔ پھر جب وہ ٹھیک ہو جاتا ہے، تب اسے اس کے گھر چھوڑ آتے ہیں۔

یہ جس جمعہ کی بات ہے، سومار چانڈیو ہمیں بہت پریشان نظر آیا۔ وہ آتے ہی بولا ''وَلو نے چارپائی کے پائے سے اپنا

ماتھا مار کر پھاڑ ڈالا ہے۔ خون بری طرح سے بہ رہا ہے۔ مگر وہ پٹی باندھنے نہیں دیتا۔"

ہٹے کٹے، مسٹنڈے مردوں کی ہیبت ناک تصویروں سے مرصّع اخبار چارپائی پر رکھ کر میں سومار چانڈیو کے ساتھ اس کے گھر گیا۔

وَلو چارپائی سے بندھا ہوا تھا۔ اس کی ناک سے خون بہ رہا تھا۔ اس نے دیکھا تو تڑپتے ہوئے چیخ کر کہا "میں سب سمجھتا ہوں، میں سب سمجھتا ہوں، میں چوک پر کھڑا ہو کر سچ بولوں گا۔"

مجھ پر نظر پڑی تو خاموش ہو گیا۔ میں ذرا دوسروں سے ہٹ کر اس کے قریب بیٹھ گیا۔ وہ روہانسی آواز میں بولا "دیکھ رہے ہو اَداوڈا! مجھے چارپائی سے باندھ دیا ہے۔"

میں نے رسّیاں کھولتے ہوئے کہا "غلط کیا ہے میرے بیٹے، میرے بچے۔"

میں نے وَلو کو رسیوں سے آزاد کیا۔ وہ اپنے خون آلودہ منہ کو میرے سینے میں چھپائے رونے لگا اور کہنے لگا۔ "میں چوک پر کھڑا ہو کر سچ بولوں گا۔"

پھر میں نے اس کے چہرے سے خون صاف کرتے ہوئے کہا "اس بار ہم چل کر چینے سے مشورہ کریں گے۔ اگر چینے نے مشورہ دیا، تو تمھیں چوک پر کھڑا ہو کر سچ بولنے میں پوری مدد دی جائے گی اور پھر تمھیں سچ بولنے سے کوئی بھی نہیں روک سکے گا۔"

وَلو کو ماتھے پر پٹی باندھ کر میں اسے اپنے گھر لے آیا۔ چینا آدمی کے منہ پر ناک لگانے میں ابھی کامیاب نہیں ہوا تھا..... وَلو کے ماتھے پر پٹی بندھے دیکھ کر اس سے پوچھنے لگا "سَر میں سے دماغ نکالنے کی کوشش کی تھی کیا؟"

وَلو کے خشک ہونٹوں کے مُرک گیلے ہو گئے۔

میں نے چینے سے کہا "یہ ہمارا ساتھی وَلو، چوک پر کھڑا ہو کر سچ بولنے کے موڈ میں ہے، تمھاری کیا صلاح ہے؟"

چینا ایک دم سنجیدہ ہو گیا۔ سوچ میں گُم ہو گیا۔ ہم سب نے محسوس کیا چینا اپنی طبعی عمر سے کہیں ذہین ہے۔ سندھو (دریائے سندھ) نے ایک بار کہا تھا "چینے کے روپ میں کسی ذہین یونانی دیوتا نے دوبارہ جنم لیا ہے۔"

چینے نے ٹھک کر کے کہا "میں وَتائی فقیر کا وارث ہوں۔"

سندھو نے پھر اٹھ کر اسے پیار کیا۔ اور جب وہ چلی گئی، تب چینے نے مجھ سے کہا تھا "سندھو، تمھاری میری ہیکل ہے اور وہ تمھاری ایک ایک تحریر پر حاوی رہے گی۔ لیکن خلیل جبران اور میری ہیکل کی طرح تم دونوں کی بھی آپس میں شادی نہیں ہو سکے گی۔"

مجھے لگتا ہے کہ چینا اَن لکھی تاریخ کے آئینے میں دیکھ سکتا ہے۔ وہ آنے والے دور کا امین ہے۔ اس نے ایک دفعہ وَلو سے کہا تھا "تم کس کے بارے میں چوک پر کھڑے ہو کر سچ بولو گے؟ کیا دھرتی کے بارے میں، آسمان کے بارے میں، انسان کے بارے میں، عقیدے کے بارے میں، محبّت کے بارے میں، زندگی کے بارے میں، موت کے بارے میں؟ تم کس کے بارے میں چوک پر کھڑے ہو کر سچ بولو گے؟"

تب وَلو میرے پیچھے کھڑا تھا۔ وہ پاگل سا ہو گیا۔

پچھلے جمعہ کو چینا ایک دم سنجیدہ ہو گیا۔ وہ کچھ دیر وَلو کی طرف دیکھتا رہا۔

"چینے کیا دیکھ رہے ہو؟" وہ بولا "وَلو چوک پر کھڑے ہو کر سچ بولنے کے موڈ میں ہے۔"

چینا گوندھی ہوئی مٹی اور نامکمّل مجسموں کی طرف چلا گیا۔ اور ناک بِنا آدمی کا مجسّمہ لے آیا۔ ناک کے بغیر آدمی بہت عجیب لگ رہا تھا۔

"تم، مَیں اور اَداوڈا، چوک پر کھڑے ہو کر سچ نہیں بول سکیں گے۔ ہمارے لیے سچ بولنے کا وقت گزر چکا ہے۔" چینے نے مٹی کے آدمی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "اس آدمی کے منہ پر جب ناک لگ جائے گی، تب یہ آدمی چوک پر کھڑا ہو کر ہم سب کے بارے میں سچ بول سکے گا۔"

چینے کا آخری جملہ سن کر مجھے اپنے بدن میں کپکپی محسوس ہوئی۔ میں نے ڈرتے ڈرتے اپنے عکس کی طرف دیکھا..... یہ یقین کرنے کے لیے کہ میرے منہ پر ناک ہے یا نہیں ہے۔

کنکشن

میرے ہر طرف اندھیرا تھا اب ماں جی کے بتائے ہوئے "کنکشن" کا مطلب سمجھ میں آ گیا

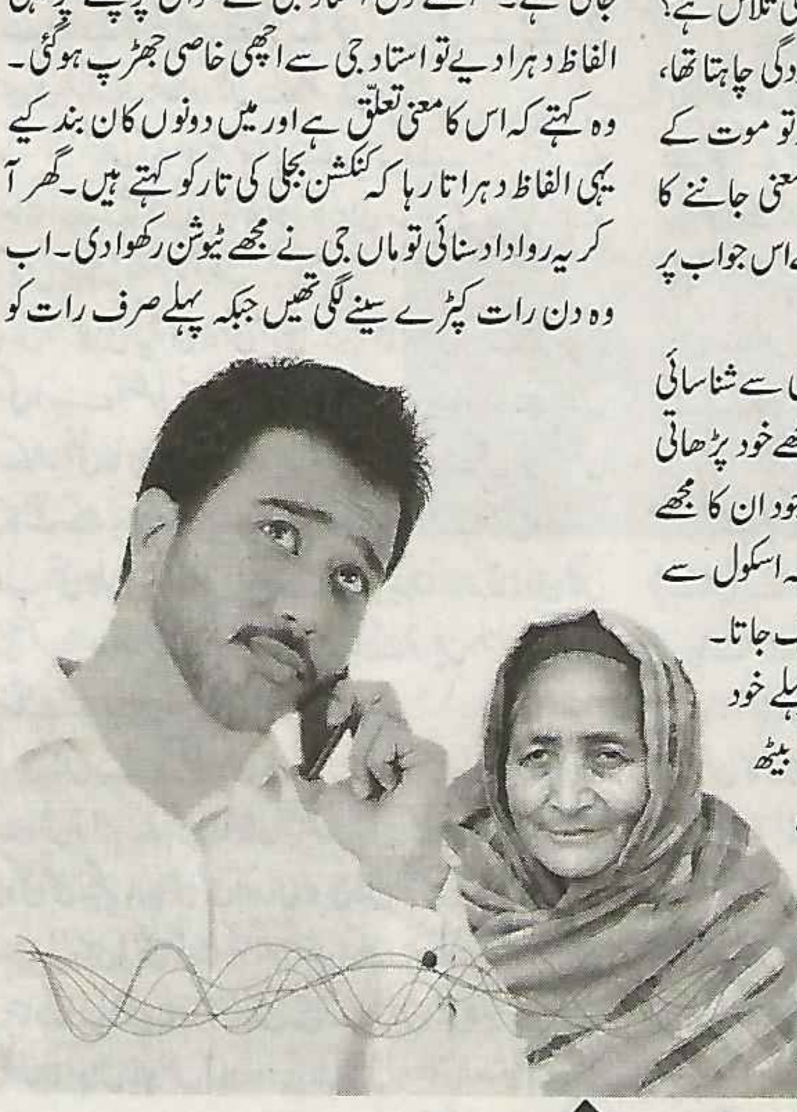
محمد عمر حبیب

میرے جواب پر کوئی تالی نہ بجی، بجتی بھی کیوں؟ اس پہیلی نما جواب کی حقیقت کا علم تو صرف مجھے اور ماں جی کو ہی تھا۔

سوال یہ تھا کہ آپ کو زندگی میں کس چیز کی تلاش ہے؟ کسی نے نوکری کی بات کی تو کوئی معاشی آسودگی چاہتا تھا، اکثر نوجوان ہمسفر کے متمنّی تھے۔ ایک بزرگوار تو موت کے متلاشی بھی نظر آئے۔ "میں فقط ایک لفظ کا معنی جاننے کا خواہش مند ہوں۔" "کیا؟" "کنکشن" میرے اس جواب پر سبھی نے ناسمجھی میں سر ہلا دیا۔

ماں جی پڑھی لکھی تھیں مگر ان کی انگریزی سے شناسائی ابجد تک محدود تھی۔ وہ تیسری جماعت تک مجھے خود پڑھاتی رہیں۔ انگریزی پر گرفت نہ ہونے کے باوجود ان کا مجھے انگریزی پڑھانا کوئی تعجّب خیز بات نہیں کیونکہ اسکول سے واپسی پر میں ان کو اپنا اسکول کا کام بتا کر کھیلنے لگ جاتا۔ وہ سارا دن ڈکشنریز اور کتابیں کھول کر پہلے خود پڑھتیں پھر مغرب کے بعد مجھے پڑھانے بیٹھ جاتیں۔ ماں جی سے انگریزی پڑھنے کا وہ آخری دن تھا کہ جب میں نے اسکول سے آتے ہی ان سے پوچھا کہ کنکشن کیا ہوتا ہے۔ ماں جی نے بلا توقف کہا:

"کنکشن دراصل ایسی چیز ہے کہ جس کے کٹ جانے سے چہار سو تاریکی ہی تاریکی پھیل جاتی ہے۔" "کیا؟" میں نے استفہامیہ انداز میں ماں کی طرف دیکھا "تمھیں یاد ہوگا کہ پچھلے سال جب تمھارے بابا دنیا سے چلے گئے تھے تو ہم نے تین ماہ بجلی کا بل نہیں ادا کیا تھا۔" ماں جی نے آنکھوں میں چمکتے موتیوں کو چھپانے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے کہا محکمے والے ہمارا میٹر اُتار کے لے گئے تھے اور گھر پیغام کہلا بھیجا کہ آپ کا کنکشن کٹ گیا ہے۔" "پھر کنکشن بجلی ہوا کہ بجلی کا میٹر؟" میں نے سوال کیا "یہ بجلی کی تار کو کہتے ہوں گے کیونکہ کاٹی تو تار ہی جاتی ہے۔" اگلے دن استاد جی کے سوال پوچھنے پر یہی الفاظ دہرا دیے تو استاد جی سے اچھی خاصی جھڑپ ہو گئی۔ وہ کہتے کہ اس کا معنی تعلق ہے اور میں دونوں کان بند کیے یہی الفاظ دہراتا رہا کہ کنکشن بجلی کی تار کو کہتے ہیں۔ گھر آ کر یہ روداد سنائی تو ماں جی نے مجھے ٹیوشن رکھوا دی۔ اب وہ دن رات کپڑے سینے لگی تھیں جبکہ پہلے صرف رات کو



سلائی کیا کرتی تھیں۔

دن مہینوں میں اور مہینے سالوں میں ڈھلتے چلے گئے۔ مگر کنکشن کا معما حل نہ ہو سکا۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب میں قرآن حفظ کر رہا تھا۔ جاڑا شدت سے پڑ رہا تھا مگر مجھے سردی کم ہی لگا کرتی تھی۔ ماں جی روزانہ مجھے سوئیٹر اور ٹوپی پہنا کر بھیجا کرتی تھیں مگر میں باہر نکلتے ہی سوئیٹر اتار کر بستے میں ٹھونس لیا کرتا۔ ایک دن اسی حالت میں ہمسائی نے دیکھ لیا اور پکڑ کر ماں جی کے پاس لے آئی۔ ''بہن اسے ایک جیکٹ لے دو یا خود سوئیٹر بن دو۔ پیسے نہیں ہیں تو یہ میری طرف سے دو سو رکھ لو بعد میں کپڑوں کی سلائی سے کاٹ لینا مگر اس کو اس طرح نہ بھیجا کرو۔ بیمار ہو گیا تو بستر کا ہو کے رہ جائے گا'' اس نے دوپٹے کا پلو کھولتے ہوئے کہا۔ ماں جی نے غصے سے میری طرف دیکھا اور میں نے نظریں چرا لیں۔

''نہیں آپا سوئیٹر تو اس کے پاس ہے۔ روز پہن کے جاتا ہے۔ پتا نہیں آج جوانی کا کون سا نشہ چڑھ گیا ہے جو نہیں پہنا۔''

''لو جی یہ کیسی جوانی ہوئی۔ میرا شاکر بھی تو ہے جو سردی کی وجہ سے اسکول نہیں جاتا اور رضائی میں گھسا رہتا ہے۔ اس کے ابا بجلی کا ہیٹر لائے تھے مگر منحوس واپڈا والے کل ہی کنکشن کاٹ گئے۔ کہتے کہ چھ ماہ کا بل نہیں بھرا، بھرا ہے تو بل دکھاؤ۔ اب اتنی جلدی کون بل ڈھونڈے۔ شاید شاکر نے ردی میں بیچ کر پتیسہ کھا لیا ہو۔ آج اس کے ابا گئے تو ہیں دفتر۔ دیکھو کیا بنتا ہے'' وہ روانی میں بولتی چلی گئی۔

میں نے چور نظروں سے ماں جی کو دیکھا کیونکہ چھ ماہ سے بل تو ہم نے بھی ادا نہیں کیا تھا۔ شاید محکمے والوں سے غلطی ہو گئی تھی۔ مگر ماں جی کسی اور ہی سوچ میں گم تھیں۔

''بہن! بجلی کی تار کو اگر کنکشن کہتے ہیں تو میرے بچے کا استاد کیوں نہیں مانتا؟'' ماں جی کے ذہن میں برسوں سے کلبلاتا سوال باہر نکل آیا۔

''کنکشن! اس کا مطلب تعلق ہوتا ہے۔ جیسے آپ کی بجلی گھر تک رسائی ہو، تو گویا کنکشن ہے مگر جیسے ہی انھوں نے میٹر اتارا تو گھر میں اندھیرا راج کرنے لگتا ہے اور ہیٹر استعمال کرنے والوں کے لیے تو ٹھنڈی قیامت آ جاتی ہے۔'' وہ بات سے بات نکالنے کی ماہر معلوم ہوتی تھی، ''ایک کنکشن دل کا بھی تو ہوتا ہے، جیسے ہی دلوں کا تعلق ختم ہوتا ہے تو سب کچھ ختم ہو جاتا ہے۔'' ''دل کا کنکشن'' ماں جی نے زیر لب دہرایا۔

''بیٹا تمھاری شادی ہو جائے، تو تین سے زیادہ بچے نہ ہونے پائیں تمھارے'' یہ بات ماں جی نے میری پیشانی چومتے ہوئے اس دن کہی جب میرا حفظ قرآن مکمّل ہوا تھا۔

''کیونکہ تم سات لوگوں کو جنت میں لے جا سکتے ہو اور اگر تمھارے بچے چار ہو گئے تو تمھارے، ابا، بیوی اور مجھے ملا کے نفوس سات سے بڑھ جاتے ہیں۔ اور اگر خدانخواستہ میں جنت نہ جا سکی، تو تم سے کنکشن ٹوٹ جائے گا۔'' ''آپ فکر نہ کریں میرے تین سے زائد جتنے بچے ہوں گے ان سب کو حافظ بناؤں گا اور آپ کو تو سب سے پہلے لے جاؤں گا۔''

☆☆

جب یونیورسٹی میں داخلہ ملا تو کراچی جانا پڑا۔ جانے سے پہلے میں نے دو سستے موبائل سیٹ خریدے۔ ایک ماں جی کو دیا اور جانے سے پہلے ان کو سارا طریقہ سمجھاتا رہا۔ ''جب بات مکمّل ہو جائے تو یہ سرخ بٹن دبانا ہوتا ہے'' ''کیوں؟'' ''کنکشن کاٹنے کے لیے'' ''لیکن میں تم سے کنکشن کیوں توڑوں گی؟'' ماں جی کے استفسار پر میں گڑبڑا گیا۔

اور پھر یہی ہوا۔ کال چاہے میں کروں یا ماں جی، سرخ بٹن مجھے ہی دبانا پڑتا تھا۔ کبھی کبھار میں ان کی ضد پر جھنجھلا اٹھتا مگر حسنِ اتفاق یہ کہ ان کی کال نیٹ ورک پرابلم یا کمزور سگنلز کی وجہ سے کبھی نہ کٹی تھی اور نہ کبھی ان کے موبائل میں بیلنس ختم

ہوا۔ خدا جانے ماں جی نے کیا دم درود پھونک رکھا تھا کہ کنکشن کٹنے پہ نہ آتا اور بالآخر یہ کڑوا گھونٹ مجھے ہی بھرنا پڑتا۔

''میری تعلیمی قابلیت کو دیکھتے ہوئے میرے لیے وظیفہ منظور ہوا چاہتا تھا'' میں نے جب فون پر یہ اطلاع دی تو مارے خوشی کے ماں جی کا موبائل گر گیا۔ یہ پہلا موقع تھا جب مجھے کنکشن کاٹنے کی ضرورت پیش نہ آئی۔ تھوڑی دیر بعد ماں جی کی کال دوبارہ آ گئی۔ ڈھیر ساری بلائیں لینے کے بعد انھوں نے پوچھا:

''بیٹا یہ وظیفہ کس کی طرف سے ملے گا؟'' ''مجھے بیک وقت پاکستانی حکومت اور ایک غیر ملکی این جی او نے اسکالرشپ کے لیے منتخب کر لیا ہے۔ اب مجھے اختیار دیا گیا ہے کہ میں ان میں سے ایک کو چن لوں۔''

''تو تم کس کا انتخاب کر رہے ہو؟'' ماں جی نے سوال کیا ''این جی او کی طرف سے ملنے والی اسکالرشپ کی رقم دوسری سے چند ہزار زیادہ ہے۔''

دوسری طرف چھائی ہوئی خاموشی طوالت پکڑ گئی۔ ''ہیلو'' میں سمجھا کہ شاید کنکشن کٹ چکا ہے۔

''بیٹا چند ہزار کے لیے تم اپنوں کی پیشکش ٹھکرا کر غیروں سے بھیک مانگو گے؟ اپنوں سے کنکشن اس قدر کمزور ہے تمھارا؟'' تب میں نے فیصلہ کر لیا کہ این جی او کا اسکالرشپ قبول نہیں کروں گا۔ این جی او سے اسکالرشپ نہ لینے کے فیصلے پر شدید ردعمل کا سامنا کرنا پڑا۔ میں ناقدین کے ملامت سے بھرپور تحیر آمیز کلمات کے جواب میں ماں جی کا مؤقف اسی بے باکی کے ساتھ پیش کرتا جس بے باکی سے کبھی استاد صاحب کو کنکشن کا معنی بتایا تھا۔ چند سال بعد فل برائٹ اسکالرشپ پر مجھے ہارورڈ یونیورسٹی میں داخلہ ملا اور میں نے جھجکتے ہوئے ماں جی کو بتایا، تو ان کا چہرہ ایک بار پھر خوشی سے دمک اٹھا۔

''ضرور جاؤ'' ماں جی نے کہا اور زمین سے مٹھی بھر مٹی اٹھا کر اسے سونگھا اور پھر ایک ڈبیا میں ڈال کر مجھے دیتے ہوئے گویا ہوئیں: ''پردیس جا کر وقتاً فوقتاً اس مٹی کو سونگھ لیا کرنا تاکہ تمھاری مادر وطن سے انسیت برقرار رہے اور کنکشن ٹوٹنے نہ پائے۔ اور ہاں گوروں سے دب کر نہ رہنا، وہ اسکالرشپ دے کر تم پر کوئی احسان نہیں کر رہے بلکہ تم ان پر احسان کرنے جا رہے ہو کہ اپنی زندگی کے دو قیمتی سال ان کے لیے وقف کر رہے ہو'' ماں جی کی منطق میں سمجھ نہ پایا۔

ہارورڈ میں میرے قیام کا آخری مہینا تھا۔ جب ایک دن ماں جی نے بتایا کہ ان کی طبیعت خراب رہنے لگی ہے اور دواؤں کا بھی اثر نہیں ہو رہا۔ اگلے دن بات کرتے ہوئے یکا یک کال کٹ گئی اور اس کے بعد بار بار کال کرنے پر بھی رابطہ نہ ہو پایا۔ ایسا پہلی بار ہوا تھا۔ پتا نہیں کہاں کہاں سے وسوسے ذہن میں آنے لگے۔ میرا وہ موبائل پچھلے دنوں گم ہو گیا تھا جس میں رشتہ داروں اور دوستوں کے نمبر محفوظ تھے۔ فیس بک، اور اسکائپ پر آن لائن فرینڈز کو چیک کیا مگر کوئی نہ ملا۔ ایک گھنٹے بعد موبائل بول اٹھا۔ کال ماں جی کی نہ تھی لیکن نمبر پاکستانی تھا۔ تو کیا واقعی؟ اور پھر وہ خیال سچ نکلا جس سے پچھلا پورا گھنٹا اللہ کی پناہ مانگتا رہا تھا۔ میرے ہاتھ سے موبائل گر گیا۔

اب کی بار موبائل گرنے سے کنکشن نہیں ٹوٹا تھا کیونکہ کنکشن تو گھنٹا پہلے ہی ٹوٹ چکا تھا۔ شاید اب کی بار موبائل خود ہی ٹوٹ گیا تھا۔ اگر ٹوٹ گیا تو اچھا ہی ہوا کہ کنکشن کی تار ٹوٹ جائے، تو میٹر بے کار ہو جاتا ہے۔ لیکن کیا کنکشن واقعی ٹوٹ چکا تھا؟ ماں جی کی کہی ایک بات مجھے یاد آ گئی کہ میرے مر جانے کے بعد بھی مجھے یاد رکھنا۔ میں تم سے خوابوں میں ملتی رہوں گی اور ہمارا کنکشن کبھی نہیں ٹوٹے گا۔ مگر دل کی ہر دھڑکن پکار رہی تھی کہ کنکشن ٹوٹ چکا۔ میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھایا ہوا تھا اور ماں جی نے خود بتایا تھا کہ کنکشن ٹوٹنے کی نشانی ہی یہ ہے کہ ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا چھا جاتا ہے۔

وطن واپسی

اپنی زمین اور مٹی کی محبّت اسے واپس کھینچ لائی تھی

ام ایمان

برف باری اچانک شروع ہوئی۔ آسمان سے سفید پھول برسنے لگے۔ ہلکے پھلکے لیکن تسلسل سے برستے یہ پھول سب طرف سفید چادر بچھاتے چلے جا رہے تھے۔ سردی زیادہ نہ تھی لیکن ہمت خان جانتا تھا کہ جلد ہی یہ سردی بہت زیادہ ہو جائے گی۔ اسے اپنے دونوں بیٹوں کے ساتھ مہاجر کیمپ سے نکلے دس دن ہو گئے۔ ان دس دنوں میں اس نے ایک لمبا سفر طے کیا تھا۔ فاصلہ زیادہ تھا لیکن اس قدر بھی نہیں کہ دس دن لگ جاتے۔ پہلے کبھی یہ سفر چار دن کا بھی نہیں ہوتا تھا۔

اتنا وقت سفر میں لگنے کا سبب جگہ جگہ فوجی چوکیاں تھیں۔ اگرچہ حکومت کی طرف سے افغانستان واپس آنے والوں کو خوش آمدید کہا جا رہا تھا لیکن عملی طور پر معاملہ الٹا تھا۔

آنے والوں کی ایک طرح سے حوصلہ شکنی ہی کی جا رہی تھی۔ اوّل دستاویزات کی پڑتال کے بہانے۔ چوکیوں پر کافی دیر روک لیا جاتا۔ پھر کچھ دے دلا کر معاملہ طے کرنا پڑتا پھر یہ بھی صاف صاف جتا دیا جاتا کہ حالات اب بھی ٹھیک نہیں.....

آپ اپنے گاؤں جانا چاہتے ہیں تو اپنی ذمے داری پر جائیں۔

یہ باتیں ہمت خان کے لیے نئی نہیں تھیں۔ کیمپ میں رہتے لوگ ایسی ہی باتیں کرتے تھے۔ ہمت خان کبھی ایسی باتوں پر کان نہیں دھرتا تھا اس کو یقین تھا۔ ایک دن ایسا ضرور آئے گا کہ جب وہ اپنے گاؤں جائے گا۔ ہمیشہ وہاں رہنے کے لیے.....

بس اس سامنے والے پہاڑ کو عبور کرتے ہی ہم اپنے گاؤں کو دیکھ سکیں گے۔

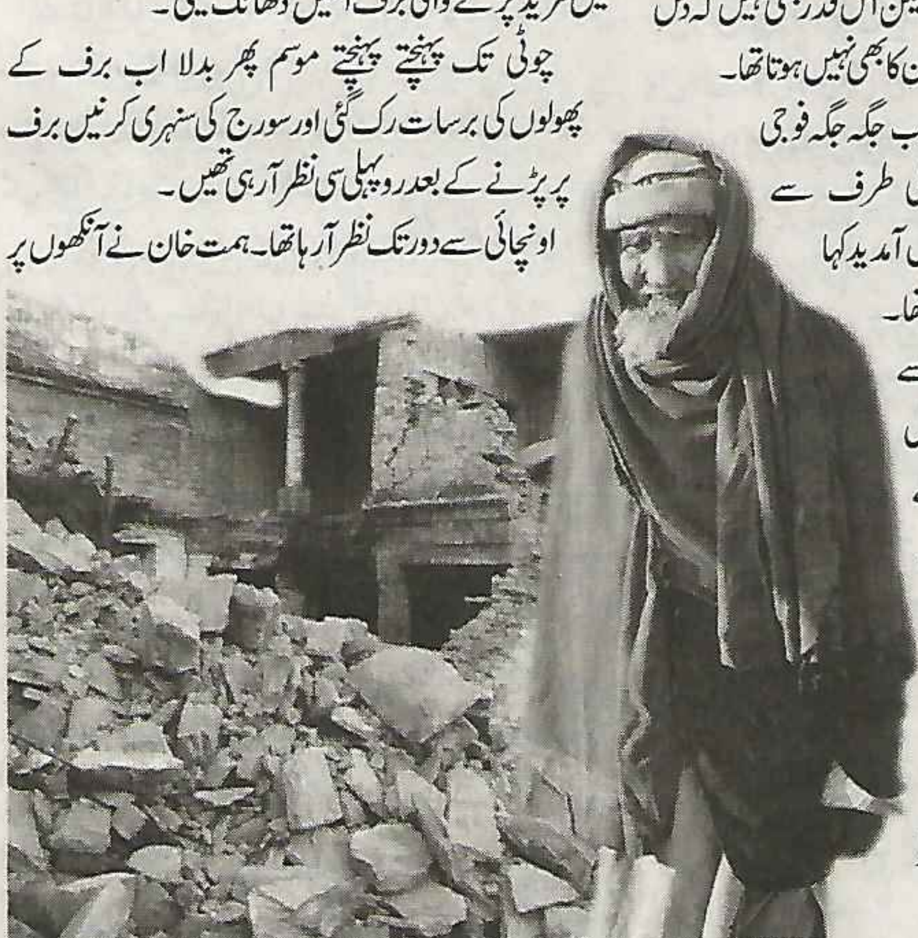
ہمت خان نے اپنے بیٹے شمروز خان سے کہا۔ شمروز نے سر ہلایا۔ اس کے ماتھے پر پریشانی کی لکیریں تھیں۔ لیکن وہ اپنے بابا کے لیے اپنے چہرے پر بشاشت لانا چاہتا تھا۔

پیچھے زوار خان عورتوں اور بچوں کے ساتھ تھا۔

خچروں پر سامان لدا تھا۔ برف کی چادر بچھتے ہی سب کے قدموں کے نشان اس پر واضح ہونے لگتے لیکن کچھ ہی دیر میں مزید پڑنے والی برف انھیں ڈھانک لیتی۔

چوٹی تک پہنچتے پہنچتے موسم پھر بدلا اب برف کے پھولوں کی برسات رک گئی اور سورج کی سنہری کرنیں برف پر پڑنے کے بعد روپہلی سی نظر آ رہی تھیں۔

اونچائی سے دور تک نظر آ رہا تھا۔ ہمت خان نے آنکھوں پر



ہاتھ رکھ کر سب طرف نظر ڈالی۔ ایک سا منظر تھا۔ کہیں کسی گاؤں کے آثار نظر نہیں آرہے تھے۔ ہاں البتہ ایک طرف ٹوٹی ہوئی دیواروں اور چھتوں کا ملبہ سا تھا۔ ورنہ سب طرف تباہی اور ویرانی تھی۔ گہرے گڑھے جو بموں کے گرنے کے باعث بنے تھے۔ کہیں تباہ شدہ فوجی گاڑیوں کے ٹکڑے، جلے ہوئے درخت..... سبزے کا ایک احساس سا تھا۔ کہیں کہیں سبز رنگ کی صورت میں..... کچھ درخت بھی تھے جو اپنی سخت جانی کے باعث بچ گئے تھے۔

ہمت خان کا چہرہ خوشی سے تمتما رہا تھا۔ اس کا گاؤں اس کی زمین اس کا گھر آنکھوں کے سامنے تھا۔

برسوں کا خواب پورا ہونے میں دیر ہی کتنی تھی۔ بس پہاڑ کی ڈھلان عبور کرتے ہی وہ اپنے گاؤں میں ہوں گے۔

اتنا سا فاصلہ تو وہ بچپن میں قلانچیں بھرتا طے کر لیا کرتا تھا۔ یہ بھی بھلا کوئی فاصلہ ہے۔ بس کچھ دیر کے بعد وہ ہوگا اور اس کا گاؤں..... اس کا گھر جہاں وہ پچاس سال تک رہا تھا۔ اپنی شرمینہ کے ساتھ..... بیاہ کر آئی تھی تو ایسے جیسے انار کی کلی..... سارے گاؤں میں دھوم تھی۔ ہمت خان کی بیوی کو دیکھنے کے لیے گاؤں کی ہر عورت آئی تھی۔ صبح سے شام تک عورتوں اور لڑکیوں سے گھر بھرا رہا تھا۔ لڈوؤں کے تھال پہ تھال ختم ہو رہے تھے مہمانوں کی خاطر داری کے لیے۔

بے ساختہ مسکراہٹ ہمت خان کے چہرے پر آئی تو شہروز حیران سا ہو گیا۔

گاؤں کی تباہی کو دیکھ کر بابا مسکرا رہے تھے۔ لیکن اسے کیا پتا کہ اس کے باپ کی آنکھیں کیا دیکھ رہی تھیں۔

ثمر خان، ہادی خان پھر لالہ جان معصوم پھول اس کے گلشن کے حسین اور نوخیز جو شہروز اور شمروز کے بعد پیدا ہوئے تھے۔ گھر کی رونق تھے۔ ان کی شرارتوں پر شرمینہ انھیں ڈانٹتی تو ہمت خان منع کرتا۔

یارا! یہ میرے گھر کی رونق ہیں۔ دیکھو شہروز اور شمروز بڑے ہو گئے ہیں۔ یہ ابھی معصوم ہیں، ان کو کھیلنے دو۔

مرغی کے چوزوں کے پیچھے بھاگتے ثمر، ہادی اور لالہ پورے صحن میں دوڑتے پھرتے۔ شرمینہ انھیں باہر باغیچے میں بھیج دیتی۔

"جاؤ باہر جاؤ اور جب تک صحن کی صفائی نہ ہو اندر نہ آنا۔"

ہمت خان کی آنکھوں کے سامنے اس دن کا منظر گھوم گیا۔ جب شرمینہ انھیں باہر بھیج رہی تھی۔ لیکن لالہ نے گڑ کے لڈو کی ضد کی شرمینہ کے پیچھے پیچھے تینوں کمرے میں داخل ہو گئے۔ لڈو جو لینے تھے۔ ہمت خان نے گھر کے دروازے کے اندر جانے کے لیے قدم بڑھایا ہی تھا کہ زور کا دھماکا ہوا۔ بم عین گھر کی چھت پر گرا تھا۔ دھول مٹی کا ایک غبار تھا جس نے ہر چیز کو چھپا لیا تھا۔ ہمت خان لپکا۔

میرے بچے میرے معصوم پھول میری بیوی شرمینہ.....

چھوٹے سے گاؤں کی ہر گلی کا یہ ہی عالم تھا۔ کتنے گھر تباہ ہوئے، کتنے گھر والے بچوں سمیت چھتوں کے نیچے دفن ہو گئے۔ لوگ جان بچا کر بھاگ رہے تھے۔ فوج گاؤں میں داخل ہونے والی ہے۔ جو زندہ بچ گئے ہیں ان کی زندگی بچاؤ..... کوئی زور سے چیختا ہوا گزرا۔

ہمت خان کو بڑے بیٹوں شمروز اور شہروز کا دھیان آیا۔

پھر دھماکے پہ دھماکہ بمباری تسلسل سے ہونے لگی، ہمت خان بھاگا۔ گاؤں سے باہر کی طرف..... گلی عبور کرتے ہی اسے شمروز اور شہروز نظر آگئے۔

لیکن پھر دوبارہ گاؤں میں داخل ہونا نصیب نہیں ہوا۔ وہ بیٹوں کے ساتھ پاکستان ہجرت کر گیا۔ مہاجر کیمپ میں اپنے دونوں بیٹوں کے ساتھ سالوں گزار دیے یہیں ان دونوں کی شادیاں کر دیں۔

بہویں اس کے چچازاد بھائی کی بیٹیاں تھیں۔ زرگل جو گاؤں سے زخمی حالت میں صرف دو بیٹیوں کو بچا کر لا سکا تھا۔ اس کی ایک ٹانگ کاٹنی پڑی تھی۔ اس کے لیے دو بچیوں کے

ساتھ معذوری کی زندگی ایک عذاب تھی۔
کیمپ میں ہمت خان جب اس سے ملنے گیا، تو اس کا دکھ جان گیا۔ اس نے ہاجرہ اور زرمینہ کو اپنے بیٹوں کے لیے مانگ لیا۔ اس کو وہ خوشی یاد آگئی جو اس نے زرگل کی آنکھوں میں دیکھی تھی۔ ہاجرہ اور زرمینہ دونوں اچھی بہویں تھیں۔ ہمت خان کا باپ کی طرح خیال رکھتی تھیں۔ بیٹیوں کی شادی کے دو ماہ بعد ہی زرگل کا انتقال ہو گیا تھا۔ ان کے لیے تو بس اب ہمت خان ہی باپ تھا۔
ہمت خان نے پیچھے مڑ کر دیکھا عورتیں اور بھی تھیں جو واپس گاؤں جانا چاہتی تھیں۔ ان کے بچے اور ہمت کے پوتے پوتیاں ایک چھوٹا سا قافلہ تھا۔
ہمت خان مسکرایا۔ بس اب گاؤں دوبارہ بس جائے گا۔
گاؤں کے گھر ان سے اٹھتی دھوئیں کی لکیر، کھیتوں کے سبز جا بجا ٹکڑے..... پھلدار درخت، لکڑی کی جالیوں پر چڑھی انگوروں کی بل کھاتی بیلیں..... تصور کی آنکھ نہ جانے کیا کیا کچھ دیکھ رہی تھی۔
شمروز اور شہروز باپ کے مسکراتے چہرے کو خاموشی سے دیکھ رہے تھے۔ وہ، وہ کچھ کہاں دیکھ سکتے تھے جو ہمت خان دیکھ رہا تھا۔ لہٰذا متعجّب تھے۔ لیکن باادب خاموش کھڑے تھے۔ باپ کے حکم کے انتظار میں..... ہم سورج ڈھلنے سے قبل اپنے گاؤں کو چھولیں او خانان! کہاں جاتے ہو؟؟
پانچ افغان طالبان نہ جانے کس جانب سے آئے تھے۔ رائفلیں تھامے..... بھاری ہتھیاریوں اٹھائے تھے جیسے کھلونے ہوں۔
ہمت خان نے انھیں پلٹ کر غور سے دیکھا۔
ہم اپنے گاؤں جا رہے ہیں۔
کون سے گاؤں؟؟
وہ سامنے..... وہاں..... وہ دیکھو۔
سپاہی جو آگے تھا طنزیہ مسکرایا۔
اویارا! وہاں اب کوئی گاؤں نہیں..... بس تباہی ہے..... تباہی۔
یہ دیکھو..... ان پانچوں نے ایک ایک پتھر ڈھلان پر لڑھکا دیا۔ پانچ پتھروں کے جواب میں تین دھماکے ہوئے۔
یہ بارودی سرنگیں تھیں۔
جو غاصب فوجیوں نے جاتے ہوئے بچھائیں تھیں۔
دیکھو ابھی سورج نہیں ڈھلا واپس نکل جاؤ۔
گاؤں کو جب بسنا ہو گا بس جائے گا ابھی تم اپنے لوگوں کی جانوں کو خطرے میں نہ ڈالو۔
ہمت خان کا ہنستا مسکراتا چہرہ بجھ گیا تھا۔ امید اور خوشی کی چمک غائب ہو گئی تھی۔ آنکھوں کو نظر آتا خوش کن منظر تحلیل ہو گیا تھا۔
پھر واپس وہی کیمپ کی زندگی..... یہ میدان، کوہستان، وادی اور پہاڑ کیسی وسعت ہے..... کتنی فراخی ہے۔ اس نے ایک گہرا سانس لیا۔ وطن کی فضا کیسی معطّر ہے۔ پھر واپسی.....؟؟
ہمت خان نے رات یہاں گزارنے پر بیٹوں کو آمادہ کر لیا۔ وہ اپنے باپ کی خواہش کو حکم سمجھ کر وہیں کوئی مناسب جگہ دیکھنے لگے تاکہ خیمے گاڑ سکیں ہوا اور ٹھنڈک تھی رات میں برف بھی گر سکتی ہے۔ ان کے پاس خیمے کمبل اور راشن موجود تھا۔
عورتوں نے کھانے کی تیاری کی اور مردوں نے خیمے لگا دیے۔
رات ہوتے ہوتے سردی کی شدت بہت بڑھ گئی تھی۔ سب کمبلوں میں گھس گئے تھے۔
ہمت خان کو نیند نہیں آرہی تھی۔ کروٹیں بدلتے ہوئے آخر وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ خیمے سے نکل کر دیکھا۔ چاند پورا نکلا ہوا تھا۔ روپہلی روشنی میں ہر چیز نہائی ہوئی تھی۔
گھنٹے آدھ گھنٹے کا فاصلہ ہے گاؤں کا..... کیا پھر دوبارہ اس سے دور بہت دور چلا جاؤں گا۔ سب سو رہے ہیں۔ میں ان کے جاگنے تک واپس بھی آجاؤں گا۔ زندگی رہی تو بچ کر..... ایک عزم کے ساتھ اس نے اپنا مضبوط عصا اٹھایا اور بے آواز نیچے کی طرف چلتا گیا۔
اس کے کان کس دھماکے کے منتظر تھے۔ ہر آہٹ پر وہ

چونکتا..... آہستہ کبھی تیز پوری احتیاط سے چلتا گیا۔ ہونٹوں پر تسبیح کا ورد کرتا وہ ہر جانب غور سے دیکھ رہا تھا۔

چاندنی کی روشنی میں وہ گاؤں تک پہنچ گیا۔ جلدی جلدی اب اس کے قدم تیز اٹھ رہے تھے۔

گھر کے گرے ہوئے در و دیوار کے قریب آ کر وہ ٹھٹک گیا۔ وہ کونے والا کمرا تھا۔ شرمینہ اور بچے اب تک یہاں بے کفن پڑے ہیں۔

اس کے ہاتھوں میں نہ جانے کیسے طاقت آ گئی۔ پتھروں کو ہٹایا چھت کے شہتیر کھسکائے..... لیکن چاند کی روشنی میں اتنا نظر نہیں آ رہا تھا۔ چلو صبح کا انتظار کر لیتا ہوں۔

آہٹ پر پیچھے مڑ کر دیکھا دونوں بیٹے اس کے پیچھے پیچھے آ گئے تھے۔ برف پر اس کے قدموں اور عصا کے نشانات کو دیکھتے دیکھتے.....

ہمت خان نے بیٹوں کو دیکھا اور ایک اطمینان کا سانس لیا۔

کچھ دیر میں پو پھٹ گئی۔ تینوں نے تیمّم کر کے باپ کی امامت میں فجر کی نماز ادا کی۔

ہمت خان نے اشارہ کیا۔ تینوں نے مل کر شہتیر ہٹائے۔ کچھ بڑی اور چھوٹی انسانی ہڈیاں نظر آنے لگیں..... ہمت خان نے اپنی چادر بچھا کر انھیں سمیٹ لیا۔ اجڑے ہوئے باغیچے میں ایک گڑھا شمروز نے دیکھ لیا تھا۔ کسی بم کے نتیجے میں ہی ہوا ہوگا۔

چادر میں لپٹی ہڈیوں کو ہمت خان نے بڑے احتیاط سے بڑے پیار سے گڑھے میں اتار دیا۔

دونوں بیٹوں نے مٹی ڈالنی شروع کی تو ہمت خان بھی آگے بڑھا۔ مٹی کو ہاتھوں سے یوں تھپانے لگا گویا رخصتی کے لیے دلاسا دے رہا ہو۔

دیکھو! اب نہ گھبرانا ہم پھر آئیں گے۔ تمھارے آس پاس رہیں گے۔ گاؤں کو آباد کریں گے۔

ہمت خان نے فاتحہ کے لیے ہاتھ اٹھائے۔ دونوں بیٹوں نے بھی اس کے ساتھ فاتحہ پڑھی اور واپسی کے لیے قدم بڑھا دیے۔

نشانات پر چلتے واپس آئے تو خیمے میں عورتیں اٹھ گئی تھیں۔ روٹی کی خوشبو پھیلی تھی۔ سبز قہوہ اور گڑ کے ٹکڑے..... مزیدار ناشتا تیار تھا۔

ہمت خان گاؤ تکیہ سے ٹیک لگا کر قہوے کی پیالی کی چسکیاں لے رہا تھا۔ ساتھ ہی سوچ رہا تھا۔ گاؤں نہ سہی گاؤں کے قریب تو بسا جا سکتا ہے۔ یہ اپنی زمین ہے۔ میری نسل اپنی زمین اپنے پہاڑوں پر پروان چڑھے..... پھر جب بارودی سرنگیں صاف کر لی جائیں تو ہم اپنے گاؤں چلے جائیں۔ وہ مسکرایا۔ ہمت خان کا چہرہ مستقبل کے حسین خوابوں کی روشنی سے چمکنے لگا۔ مسکراہٹ اس کے چہرے کی ہر سلوٹ پر جھری میں جگہ بنانے لگی۔

شمروز کی آنکھ سردی سے کھلی تھی آگ کا وہ چھوٹا سا الاؤ جو رات کو سلگایا تھا۔ بجھ چکا تھا۔ اس نے اٹھ کر باپ کے اوپر کمبل ٹھیک کیا۔

''بابا کوئی بہت اچھا خواب دیکھ رہے ہیں۔''

شہروز نے باپ کے چہرے پر خوبصورت مسکراہٹ دیکھ کر سوچا۔ اچھی طرح کمبل اڑھاتے ہوئے اس نے پیار سے باپ کا ہاتھ اندر کیا۔

انتہائی سرد ہاتھ تھا۔

اس نے گھبرا کر باپ کو پکارا۔ بابا..... بابا!!

لیکن اس کی پکار کے جواب میں خاموشی تھی۔ مکمّل خاموشی نہ جسم میں کوئی حرکت تھی۔

شہروز نے گھبرا کر بھائی کو آواز دی۔

رات کے نہ جانے کس لمحے وہ رخصت ہو کر گاؤں کی جانب اتر گئے تھے..... ہمیشہ کے لیے..... یہ تو خالی جسم تھا..... گاؤں کی جانب چہرہ کیے ادھ کھلی آنکھوں سے وہ کوئی بہت ہی پیارا خواب دیکھ رہے تھے۔ جب ہی تو اتنی پیاری مسکراہٹ چہرے پر منجمد ہو گئی تھی۔

◆◆◆

اس نے کمال کر دیا

ناکام شادی زندگی کا اختتام نہیں ہے جس کے لیے اپنی ذات، انا اور خودداری کو داؤ پر لگا دیا جائے

صالحہ محبوب

مبارک ہو بنّو! تاریخ مقرر ہو گئی ہے۔ اب تو ہم شادی کی تیاریاں کریں گے اور آپ آرام۔ ابھی سے چھٹیوں کے لیے درخواست دے دو تاکہ چہرے کا رنگ روپ کچھ نکھر سکے۔ اتنے عرصے بعد ہمارے گھر میں شادی ہوگی کتنا مزہ آئے گا۔ اپیا طلوعِ سحر کو پیار کرتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

"اپیا! ابھی سے چھٹیوں کا کیا ذکر..... آپ کی تان تو بس انہی چھٹیوں پر ہی ٹوٹتی ہے۔" طلوعِ سحر شرما کر بولی۔

"دیکھنا شادی کی تیاریوں میں پتا بھی نہیں چلے گا..... جہیز تو تقریباً مکمل ہے۔ مگر ہم سب گھر والوں کی تیاریاں اور تمھارے سسرال والوں کی پہناؤنی دولہا میاں کی تیاری..... سب کام کرنے ہیں....." اپیا نے مسکراتے ہوئے امی جان کو بھی ساتھ شامل کرلیا.....



"بٹیا! یہ پہناؤنی بھی جہیز جتنا ہی کام ہے۔ سارے سسرال کے جوڑے، سوئیٹر، شالیں اور اس کی ساس اور نندوں کے لیے بھی ہلکا پھلکا زیور..... بہت خریداری کرنی پڑے گی....." امی اپیا سے بولیں.....

"امی اس کے سسرال کے ساتھ ساتھ میرے میاں اور بچوں کی تیاری بھی تو آپ ہی کریں گی..... یہی رواج ہے نا" اپیا فوراً بولیں۔

"تمھیں کیسے بھول سکتی ہوں؟ سب یاد ہے..... تم اپنی شاپنگ اپنی پسند سے کرنا بلکہ آج بھی سسرال جاتے ہوئے مٹھائی لے کر جانا۔ ہماری طلوعِ سحر کی تاریخ مقرر ہوئی ہے۔" اس خوشی میں امی اپنی بڑی بیٹی کی طرف دیکھ کر مسکرائیں۔

"یہ ڈاکٹر صاحبہ کے منہ پہ بارہ کیوں بج رہے ہیں؟ خوشی کا موقع ہے اور ان کا منہ سوجا ہوا ہے۔ خیر تو ہے....." اپیا کی نگاہ سحر پر پڑی تو وہ چونکیں.....

"یہ تمام رواج ہم لڑکی والوں ہی کے لیے کیوں ہیں؟ بیٹی کو پڑھایا، ڈاکٹر بنایا اور اچھا مسلمان بنایا، اب والدین لڑکی کو اس کے پورے گھر کا سامان دیں۔ سوئی سے لے کر فریج، ٹی وی، کارتک پھر اس کے سارے گھر والوں کے قیمتی جوڑے اور سونے کے زیورات۔ کیا ان رسموں کی کہیں کوئی حد بھی ہے؟"

"میں تو اپنے بچپن سے یہی دیکھتی آرہی ہوں۔ آپ اور ابو ہمیشہ ہم دونوں بہنوں کے جہیز کے لیے فکرمند رہے ہیں۔ ہماری پڑھائی ڈگری، تربیت سب پر ہمیشہ آپ نے ہمارے جہیز کو مقدم رکھا، اپیا کی شادی کے بعد اب تک ہر تہوار، موقع کی مناسبت سے ان کے پورے گھر کا سارا خرچہ۔ ان رسموں رواجوں کو کیوں آپ لوگوں نے اپنے گلے کا پھندا بنالیا ہے۔ بے شمار لڑکیوں کی شادی آپ لوگوں کی بنائی ہوئی رسموں کی وجہ سے نہیں ہو پاتی....." سحر ہمیشہ کی طرح اس موضوع پر جذباتی انداز میں بولی۔

"بیٹا! یہ تو ہمارے پیارے نبی پاک ﷺ کی مبارک سنت ہے۔ ہم بھی اس سنت ہی کو پورا کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔" امی اپنا موقف جھٹ سامنے لے آئیں۔

امی آپ کو بس ہمارے نبی پاک ﷺ کی یہی سنت یاد ہے سادگی، توکل اور قناعت ان سب کے بارے میں کبھی کچھ جاننے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔

والدین یہ سب کر کے پریشان اور زیر بار ہوتے ہیں ابا نے اپیا کی شادی پر کتنا قرض لیا تھا پھر میری اور بھائیوں کی تعلیم مکمّل کروا کر انھیں سیٹ ہونے میں مدد دی۔ ابھی ان کے پرانے قرض ادا نہیں ہوئے اور میرے لیے اتنے بڑے خرچے سوچ رہی ہیں۔ امی یہ قرض سادگی سے بھی تو ادا ہو سکتا ہے۔'' طلوع سحر نے امی کو سمجھانے کی کوشش کی۔

بہنا کل جب تمھارے سسرال والے تم سے جہیز کے بارے میں سوال کریں گے، تو پھر میں پوچھوں گی کہ تمھاری کتنی عزت ہوئی ہے؟ اپیا چمک کر بولیں۔

''ہاں بیٹا! ماں باپ یہ سب بیٹیوں کے محفوظ مستقبل کے لیے کرتے ہیں۔'' امی پیار سے بولیں۔

میرا مستقبل اس طرح سے محفوظ بنانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ آپ نے مجھے اچھی تعلیم دی ہے اچھی تربیت کی ہے بس یہی کافی ہے۔ اگر یہ ڈھیروں چیزیں ہی خوشی کی ضمانت ہیں، تو اپیا کیوں خوش نہیں ہیں؟ ہر دو ماہ بعد زاہد بھائی کسی نہ کسی وجہ سے انھیں یہاں ہمارے پاس بھیج دیتے ہیں۔ کبھی کاروبار کے لیے پیسے تو کبھی نند کی شادی، کبھی پلاٹ کی قسط تو کبھی گاڑی کا ماڈل بدلنے کے لیے پیسے۔ امی یہ محفوظ مستقبل تو نہ ہوا ایک مستقل بلیک میلنگ ہوگئی۔'' طلوع سحر بولتی ہی چلی گئی۔

''مجھے بیچ میں مت گھسیٹو، زاہد اور میں بہت خوش ہیں یہ کبھی کبھار کے جھگڑے تو ہر گھر میں ہو جاتے ہیں۔'' اپیا فوراً بولیں

''جی ہاں! یہ کبھی کبھار کے جھگڑے، وہ آپ کو خالی ہاتھ گھر سے نکال دیتے ہیں اور پھر ہر مرتبہ ابو کو بھاری تاوان ادا کرنا پڑتا ہے۔ اور اس دوران میں آپ کے منہ سے اپنے سسرال کے بارے میں کیسے کیسے پھول جھڑتے ہیں۔ اللہ نے تو میاں بیوی کو ایک دوسرے کا لباس بنایا ہے۔ لباس کا مقصد جسم کے عیب چھپا کر خوبصورتی پیدا کرنا ہوتا ہے بھلا آپ دونوں کیسے لباس ہیں کہ جب باہمی چپقلش ہوئی آپ یہاں اپنے میکے آ کر ہمارے سامنے کس طرح ان کی عزت افزائی کرتی ہیں اور اب آپ کہہ رہی ہیں کہ اس کے ساتھ بہت خوش ہوں۔'' سحر چمک کر بولی۔

اچھا میں بھی دیکھتی ہوں کس طرح یہ تمام خیالات، فلسفے، اصول اور کہاوتیں قائم رہتی ہیں۔ تالی ہمیشہ دونوں ہاتھوں سے بجتی ہے۔ یہ شادی شدہ زندگی بیماری کے علاج کی طرح نہیں کہ یہ گولی، کیپسول کھا لو، سیرپ پی لو یا ڈرپ لگوا لو تو ٹھیک ہو جاؤ گے۔ یہ تو بغیر کسی اصول، فلسفے اور نسخے کے سرپٹ دوڑنے کا نام ہے۔ آپ شوہر کو لباس سمجھتی ہیں اور شوہر سسرال آپ کو پاؤں کی جوتی سمجھتا ہے۔ زندگی کے امتحان اور سسرال والے پرچے میں تمھاری ایم بی بی ایس کی ڈگری بھی اعلیٰ مقام نہیں دلوائے گی۔'' اپیا بولتی گئیں۔

میرا دل جلتا ہے، تو زاہد کے خلاف بولتی ہوں۔ مجھے بھی روز روز یہاں ہاتھ پھیلانا پسند نہیں ہے مگر یہ پورے معاشرے کی ملامتیں، پھٹکاریں اور رسوائیاں عورتوں ہی کے حصے میں آتی ہیں۔ اپیا ٹھیک ٹھاک برا مان چکی تھیں۔ طلوع سحر ایک افسوس بھری نگاہ والدہ اور بڑی بہن پر ڈال کر اپنے کمرے میں چل دی۔

یہ گھرانا ایک روایتی مگر پڑھا لکھا خاندان تھا۔ شکیل صاحب کی دو بیٹیاں دو بیٹے تھے۔ وہ اپنی بڑی بیٹی کی شادی اپنے بھتیجے سے کر چکے تھے۔ دونوں بیٹے تعلیم مکمّل کر کے اپنی زندگیوں کا آغاز کر چکے تھے۔ اب طلوع سحر کی تعلیم مکمّل ہونے اور نوکری میں سیٹ ہونے کے بعد عدیل سے اس کی شادی طے ہوئی تھی۔ جو سرکاری اسپتال میں ڈاکٹر ہونے کے ساتھ ساتھ شام میں کلینک بھی چلاتے تھے۔ ان کی برادری میں بے تحاشا جہیز دینے کا رواج تھا۔

اسی طرح بحث و مباحثے کے ساتھ ساتھ ڈھیروں خریداری کے بعد سحر کی شادی بے حد دھوم دھام سے ہوئی اور وہ بیاہ کر عدیل رضا کے ساتھ ایک نئے گھر آن پہنچیں۔ یہ گھر چند ہفتے

پہلے ہی کرائے پر لیا گیا تھا۔ پورا گھر ڈاکٹر صاحبہ کے جہیز سے سجا تھا۔ ڈرائنگ روم، ڈائننگ روم، گیسٹ روم، ٹی وی لاؤنج، بیڈروم اور یہاں تک کہ باورچی خانے کی بھی ہر ایک شے اس جہیز کا حصہ تھی۔ گیراج میں کھڑی نئی چمکتی کار، ڈاکٹر عدیل رضا کے ہاتھ پہ بندھی قیمتی گھڑی، جدید آئی فون، ان کے کپڑے، جوتے، غرض ہر چیز قیمتی اور نئی ہونے کا اعلان کر رہی تھی۔ شادی کے بعد ہر طرف سے دعوتوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ ایک ماہ کی چھٹی جیسے پل بھر میں ختم ہو گئی۔ عدیل کے ساتھ ساتھ سحر بھی اپنے اسپتال روانہ ہوئی۔ گو اس کا خیال تھا کہ عدیل ایک دفعہ مروتاً ہی اسے گھر بیٹھنے اور کچھ عرصہ نئے ماحول میں ڈھلنے کے لیے گھر میں وقت گزارنے کا کہیں گے۔ مگر یہاں تو جیسے ہر ایک کو اس کی نوکری کی اس سے زیادہ فکر تھی۔ یہ گھر اس کے سسرال کے قریب ہی کرائے پر حاصل کیا گیا تھا۔ سحر کی ساس خاصے تواتر سے وہاں چکر لگاتی اور اس کے سلیقے اور سگھڑ پن کا جائزہ باریک بینی سے لیتی رہتی۔

سحر کے لیے گھر کے کام سیکھنا ایک نیا تجربہ تھا۔ رفیقِ حیات اگر ہر قدم پر حوصلہ افزائی کرے، تو کام بآسانی سیکھا جا سکتا تھا۔ مگر زندگی کے ساتھی ہی سب سے بڑے نقاد بن جائیں، تو یہ سیکھنے کا عمل رک جاتا ہے۔ وہ کچن کے کاموں میں سرخرو ہوتی تو صفائی کے معیار میں کمی رہ جاتی اور صفائی پر توجہ دیتی تو وقت اور توانائیاں دونوں ہی ہاتھ میں نہ رہتے۔ گھر بھی ایک مکمل اور مسلسل کام اور توجہ مانگتا ہے۔ اسے یہ عملی زندگی کا پہلا تجربہ ہوا مگر وہ سسرال سے الگ رہتے ہوئے بھی ان کے تبصروں کی زد میں تھی۔ عدیل رضا کے ساتھ اب ہلکی پھلکی جھڑپیں بڑھنے لگیں اور وجہ نوکری اور گھر میں توازن رکھنے میں ناکامی ہی تھی۔ اس کی معمولی شکل، سانولی رنگت اور فربہی مائل سراپے کی بدصورتی کا احساس صبح شام دلایا جانے لگا۔ عزت نفس کو روز کچلا جاتا وہ خود کو بہلا کر نئے امتحان کے لیے تیار کرتی اور وہاں ایک نیا وار سامنے آ جاتا۔ پڑھے لکھے، سمجھ دار شوہر یقیناً لازباں اور بداخلاق نہیں ہوتے مگر ان کی خاموشی ہر جذبے کا کھلم کھلا اظہار کر دیا کرتی کہ وہ ایک ناکام بیوی ہے۔

''بیگم تم بھی میرے ساتھ کلینک پر بیٹھنا شروع کر دو۔ عورتیں لیڈی ڈاکٹر ہی سے علاج کرانا چاہتی ہیں۔ ہمارے کلینک کی آمدنی بہت بڑھ جائے گی۔'' شادی کے ایک سال بعد ہی یہ فرمائش کی گئی۔ ''لیکن میرے خیال میں سارا دن اسپتال ہی میں اس قدر کام ہوتا ہے کہ پوری شام کلینک پر لگانا میرے لیے ممکن نہیں۔ اس طرح گھر تو پوری طرح نظرانداز ہو جائے گا اور گھر والوں کی غیر موجودگی میں پورا گھر کسی نوکر کے سر پر چھوڑا بھی نہیں جا سکتا۔ سحر نے خاصا معقول جواب دیا۔''

''گھر کا کام تمہارے بس کا ہے ہی نہیں۔ کھانا تم سے نہیں بنتا، صفائی، برتن، ترتیب سلیقہ کچھ تم میں ہے نہیں، کلینک بیٹھنے سے کم از کم آمدنی میں تو اضافہ ہو جائے گا، میں تو اب نئی اور ماڈرن مشینیں بھی لینے کا سوچ رہا ہوں بلکہ تم ایسا کرو کہ جدید الٹرا ساؤنڈ مشین کے لیے اپنے ابو سے کہہ دو بس ایک مشین ہی ہمارے قدم جما دے گی۔'' عدیل رضا کی منصوبہ بندی مکمل تھی.....

طلوع سحر حیران رہ گئی۔ کم از کم پچاس لاکھ کی مشین تھی جس کا نام ڈاکٹر عدیل لے رہے تھے۔

دو ہم پیشہ افراد کی باہمی شادی میں بہت سی آسانیاں ہوتی ہیں۔ مگر سب سے بڑا المیہ باہمی تعلق، دوستی اور رشتہ کو استوار کرنے کے لیے وقت ہی نہیں ہوتا۔ اسی وقت کی کمی نے ان دونوں کے درمیان فاصلے پیدا کر دیے تھے۔ ڈاکٹر طلوع سحر کی مضبوط شخصیت اس کا ضبط، حوصلہ اور صبر ڈاکٹر عدیل کو الجھا دیتا۔ الجھاؤ غصے کی صورت میں باہر آتا۔

''یہ درمیان میں میرے ابا کہاں سے آ گئے؟ کلینک آپ کا، آمدنی میں اضافہ آپ کو، ترقی آپ کی اور مشین وہ خرید کر دیں۔ حد ہوتی ہے لالچ کی۔ آئندہ ایسی بات مت کیجیے گا۔'' وہ سختی سے بولی ''وہ زاہد بھائی جو اپنے پلاٹ کی ہر قسط انکل سے

لیتے ہیں وہ..؟ میں تو صرف ایک مشین مانگ رہا ہوں۔" عدیل اس کے خاندان کو خاصی حد تک جان چکا تھا۔

"نہ وہ صحیح ہیں نہ آپ۔ جب آپ کے پاس پیسے ہوں، تو اپنا کلینک بڑھا لیجیے گا۔ نہ تو میں وہاں آپ کے ساتھ بیٹھوں گی اور نہ ہی اپنے ابا سے کوئی بھی فرمائش کروں گی۔"

اور پھر اس رات زبردست معرکہ ہوا۔ عدیل نے پہلے خوب زبانی کلامی اپنا غصہ نکالا اور پھر اسے خوب مارا۔ آخر میں صبح ہوتے ہی اسے گھر سے دفع ہو جانے کا حکم دے دیا۔

ڈاکٹر سحر کو اپنے حواسوں میں آنے میں خاصا وقت لگا..... تکلیف اس کے جسم کو بھی تھی مگر روح پہ لگے گھاؤ زیادہ تکلیف دہ تھے۔ وہ وضو کر کے اپنے رب کے سامنے جھک گئی..... بھلا اس سے بہتر سننے والا، جاننے والا، رحم والا، کرم والا کون تھا.....اور صبر اور نماز سے کام لینے کا اس سے بہتر موقع اور کب آتا۔ ظالم کے ظلم کو برداشت کرنا درحقیقت اس کا ساتھ دینا ہوتا ہے۔ سحر نے اس رات صدیوں کا فاصلہ طے کر لیا اور پھر فیصلہ کر کے اپنے رب سے مدد مانگ کر وہ کمر سیدھی کرنے کو لیٹ گئی۔

اگلی صبح طلوع سحر اپنے اسپتال جانے کے لیے حسب معمول تیار ہوئی۔ آج اُس نے بڑے شوخ رنگ کی لپ اسٹک لگائی اور آنکھوں میں خاصی فرصت سے مسکارا اور آئی لائنر لگائے تھے۔ تاکہ اس کے چہرے پہ موجود نشانات کسی نہ کسی حد تک چھپائے جاسکیں۔ وہ ایک چھوٹا سا سوٹ کیس لیے باہر آئی، اپنے لیے ناشتا بنایا اسی دوران عدیل بھی تیار ہو کر آن پہنچا۔ ناراضگی کے اظہار کے طور پر انھوں نے میز پر بیٹھنا بھی گوارا نہ کیا اور اسے گھر سے دفع ہونے کا پھر سے حکم دیا۔ وہ آرام سے فارغ ہو کر اٹھی میز سے اپنی کار کی چابی اٹھائی اور گھر کو لگانے کے لیے تالا بھی عدیل سے لے لیا۔ آج پورے ایک سال بعد طلوع سحر ڈاکٹر عدیل کے سامنے مضبوطی سے کھڑی تھی۔

"ڈاکٹر صاحب! یہ بیگ اٹھائیں کیونکہ اس گھر سے میں نہیں آپ جا رہے ہیں۔ اس گھر کی ایک ایک چیز میری ہے۔ اس گھر کا کرایہ خرچہ سب میں ادا کرتی ہوں۔ میں آپ کو اپنے گھر سے نکال رہی ہوں۔ اگر آپ نے یہ شادی اتنی ہی احسان سمجھ کر کی تھی تو شکریہ مگر میں وہ کمزور، مظلوم اور مجبور لڑکی نہیں جسے آپ برا بھلا کہیں، ماریں پیٹیں گھر سے نکال دیں اور وہ روتی دھوتی اپنے ماں باپ کے در پر چلی جائے۔ یہ شادی میری زندگی کا اختتام نہیں ہے جس کے لیے اپنی ذات، انا، خودداری کو داؤ پر لگا دیا جائے، مجھے دیر ہو رہی ہے۔ آپ یہ بیگ اٹھائیں اور جائیں۔"

اب حیرت کا جھٹکا ڈاکٹر عدیل کو لگا تھا۔ عرش سے فرش پر گرنا، خودداری اور انا کی تذلیل کیا ہوتی ہے۔ اسے اب اندازہ ہو چکا تھا۔ اس کے جانے کے بعد سحر نے تالا لگایا اور اسپتال اپنی گاڑی لیے روانہ ہوگئی۔

جس طرح کچھ گاڑیوں میں فور وہیل گیئر ہوتا ہے جو گاڑی کو مشکل راستوں، گڑھوں سے نکالنے میں مددگار ہوتا ہے۔ تعلیم، دین کا علم اور اعتماد اس کا چوتھا گیئر بنا تھا۔ اس کے پاؤں مضبوط اور نیچے کی مٹی نہ چھوڑنے والے تھے۔ آگے پیچھے دیکھنے کی تیز نگاہ، آنکھوں میں فاضل پانی کی ٹینکیاں، اللہ کے خوف کا ایندھن، اور ازل و ابد کی جانب سے رجوع کے اسپیشل گیئر نے اسے صبر و جبر کے دشت، تحمل، بربادی کے صحراؤں، حق و حقانیت کے اونچے پہاڑوں اور غم و اندوہ مصائب و آلام، طعنے و تشنیع کی دلدل سے سرخروئی کے ساتھ گزرنے کی ہمت عطا کی گئی تھی۔

ڈاکٹر عدیل اپنا بیگ اٹھائے پیدل سڑک پر رواں دواں تھا۔ روایتی مردانگی کا دبدبہ سر جھکائے اپنے سود و زیاں کے حساب کتاب میں مصروف وہ سوچ رہا تھا کہ کس طرح اس رشتے کو دوبارہ سے بحال کیا جاسکے .....شاید .....اسے اپنی لالچ، خود غرضی اور ظلم کا احساس ہو چکا تھا.....طلوع سحر کی گاڑی کب کی وہاں سے جاچکی تھی.....گاڑی کا غبار رفتہ رفتہ بیٹھ رہا تھا.....شاید دونوں کے درمیان موجود اس رنجش کا ملال بھی بیٹھ جاتا.....؏

ممکنہ فیصلوں میں ایک، ہجر کا فیصلہ بھی تھا
ہم نے تو ایک بات کی، اُس نے کمال کر دیا

کچھ بیماری کا اثر اس سے زیادہ شرمندگی کا احساس۔ اسی وجہ سے صحیح الفاظ ادا نہیں ہو رہے تھے۔ ٹوٹے پھوٹے بلکہ کٹے پھٹے الفاظ میں شفیع الدین معافی کے طلبگار تھے۔ آنسو بہ رہے تھے۔ چھوٹی بھاوج سے نظریں ملانا آسان نہیں تھا۔ احساس جرم نے ان کی حالت عجیب سی کردی تھی۔ نظریں اٹھا کر فریدہ بیگم کی طرف دیکھتے اور نظریں خود ہی نیچی ہو جاتیں۔ گاؤ تکیے کے سہارے بیٹھے بلکہ بیٹھے بھی کیا نیم دراز تھے۔ فریدہ بیگم کا پُرنور چہرہ عاجزی کے تاثرات لیے ان کے سامنے تھا۔ نظریں جھکائے سوتی دوپٹہ سر پہ نماز کی طرح لپیٹے وہ بار بار یہی کہہ رہی تھیں ''نہیں بھائی جان...... نہیں ایسے نہ کہیں...... یہ میرا فرض ہے، احسان نہیں ہے...... بھائی جان آپ...... آپ بس دعا دیا کریں اور بس!''

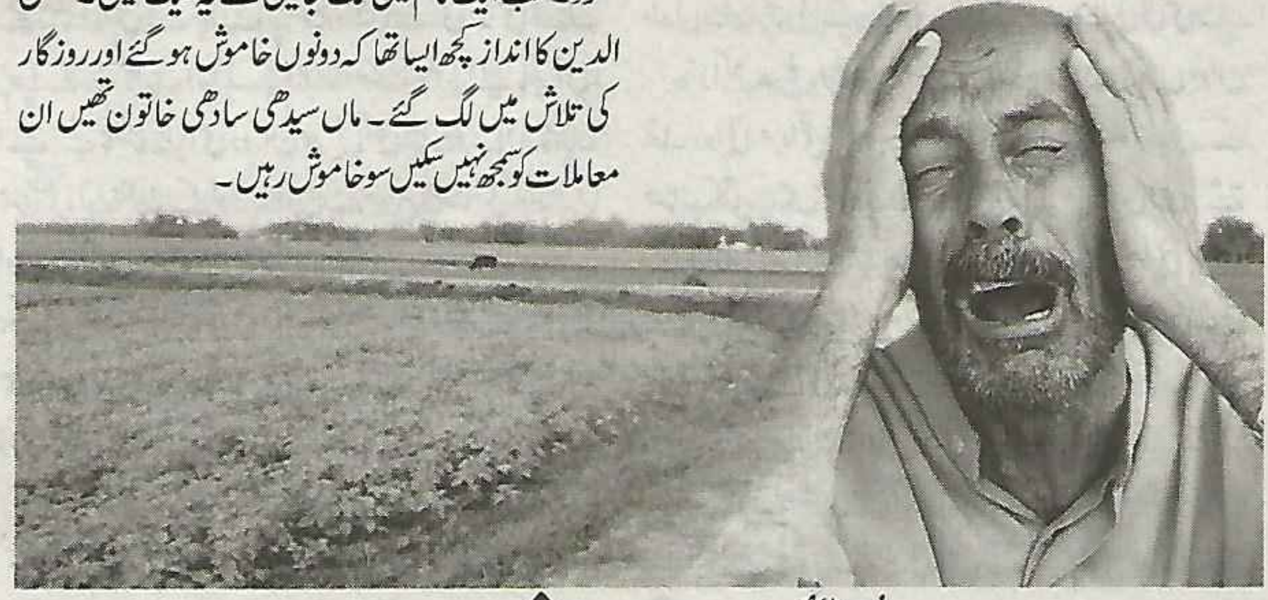
مجھے معاف کردو

جس دولت کے لیے تمام عمر دوسروں کے حقوق سلب کیے، وہ بھی کام نہ آئی

فاطمہ زہرہ

''اللہ پاک تمھیں دنیا جہان کی خوشیاں عطا فرمائے۔ زندگی کی ہر ہر خوشی بخشے، تم پر اللہ کی رحمت ہو فریدہ! مگر ایک بار کہہ دو تم نے مجھے معاف کیا۔ خدارا مجھے معاف کردو......''

وقت کا دھارا کیا کیا بہا لے جاتا ہے، کیسے کیسے گوہر گہرائی سے اوپر آجاتے ہیں۔ شفیع الدین چار بھائیوں میں سب سے بڑے تھے۔ پیسے کی افراط نے مزاج خاصا بگاڑ دیا تھا۔ ایف۔ اے کے بعد پڑھائی سے دلچسپی نہ ہونے کی وجہ سے تعلیم کا سلسلہ رک گیا۔ البتہ زمینداری کے کاموں میں خوب دماغ چلتا تھا۔ لہٰذا باپ کے معاون بنے رہے۔ زمینداری کے تمام گُر سیکھ لیے اور باپ کے انتقال کے بعد کل جائداد کے مالک بن بیٹھے۔ کُل کاروبار اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔ تینوں بھائی تعلیم میں مشغول رہے، دو کی تعلیم تقریباً مکمل ہو چکی تھی۔ چھوٹا بھائی ان سے دس سال چھوٹا تھا۔ گریجوایشن کر رہا تھا، وکالت پڑھنے کا ارادہ تھا۔ والد کے انتقال کے بعد درمیان والے دونوں بھائی جائداد کی طرف متوجہ ہوئے، تو بڑے بھائی کی طرف سے حکم ہوا'' جائداد کی دیکھ بھال میری ذمہ داری ہے تمھارے بس کی بات نہیں، تم ملازمت تلاش کرو۔ سب ایک کام میں لگ جائیں گے یہ ٹھیک نہیں۔'' شفیع الدین کا انداز کچھ ایسا تھا کہ دونوں خاموش ہو گئے اور روزگار کی تلاش میں لگ گئے۔ ماں سیدھی سادھی خاتون تھیں ان معاملات کو سمجھ نہیں سکیں سو خاموش رہیں۔



معیز الدین سب سے چھوٹے اور لاڈلے ہونے کے باوجود فطرتاً بہت نیک طبیعت اور غریب پرور تھے۔ ماہانہ تعلیمی اخراجات کے لیے معیز کو ان کے والد کچھ رقم علیحدہ سے دیتے تھے اور معیز کا حال یہ تھا کہ اپنی ضروریات پوری ہونے کے بعد جو رقم بچ جاتی کسی ضرورت مند کو دے دیتے۔ کبھی کسی غریب ساتھی کی فیس ادا کر دی، کبھی کسی کے گھر راشن ڈلوا دیا، کسی بیمار کا پتا چلتا، تو علاج کے لیے رقم دے جاتے۔ ان کے اس مزاج سے سب ہی واقف تھے۔ ان کے برعکس بڑے بھائی شفیع الدین جو شادی شدہ اور تین بچوں کے باپ تھے جائداد کا نظام ہاتھ میں آتے ہی لالچ میں مبتلا ہو گئے۔ جب آمدنی آتی آدھی تو گھرانے کے لیے ہوتی اور آدھی رقم ان کے اکاؤنٹ میں جمع ہو جاتی۔ بھائیوں نے اندھا اعتماد کیا اور اس بات پر بالکل توجہ نہیں دی۔ معیز الدین تو سب سے چھوٹے تھے لہٰذا اماں انھیں بالکل بچہ ہی سمجھتی رہیں۔

محلے میں ایک گھر کسی خاتون نے کرائے پر لیا۔ ان کے ساتھ دو لڑکیاں بھی تھیں۔ تینوں سخت پردہ میں رہتیں، صرف وہ خاتون کبھی کبھی ایک دکان پر خورونوش کا سامان خریدنے جاتیں۔ اس کے علاوہ ان کو گھر سے باہر کسی نے نہیں دیکھا۔ محلے والے حیران تھے کہ یہ خواتین کہاں سے آئی ہیں اور کون ہیں؟ صرف ایک آدمی مہینے ڈیڑھ مہینے کے بعد آتا، ایک گٹھڑی پہنچا جاتا اور ایک لے جاتا۔ رفتہ رفتہ لوگوں پر یہ عقدہ کھلا کہ یہ ماں بیٹیاں کپڑوں پر کڑھائی کا کام کرتی ہیں۔ کوئی گھر پر ہی کام دے جاتا ہے، تیار مال لے جاتا ہے۔

کچھ عرصہ بعد معیز کو کسی دوست نے بتایا کہ وہ برقع والی خاتون دکان سے گھر کا راشن لے گئی ہیں اور ادھار کے رجسٹر میں اندراج کرا گئی ہیں۔ محلّہ میں خاتون کا کسی سے ملنا جلنا نہیں تھا شاید اسی وجہ سے ہر ایک ہی ان کی ٹوہ میں لگا ہوا تھا۔ دوسرے مہینے پھر دکاندار سے سامان لیا مگر مکمّل ادائیگی نہ کر سکیں۔ دکاندار نے احسان جتانے والے انداز میں سامان تو دیا، مگر یہ نوٹس بھی دے دیا کہ اگلے مہینے پچھلی رقم جمع کرائے بنا سامان نہیں ملے گا۔ یہ خبر بھی معیز کے کسی دوست نے دی۔

معیز نے گلی سنسان دیکھی، تو ان کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ دروازہ خاتون نے کھولا معیز نے بڑی تیزی سے ایک لفافہ ان کے ہاتھ میں پکڑایا اور تیزی سے پلٹ گیا۔ خاتون نے آواز دی ''بیٹا! رک جاؤ کون ہو؟'' مگر وہ ان سنی کر کے نکل گیا۔

دوسرے مہینے پھر وہ ان کے دروازہ پر کھڑا تھا۔ خاتون نے دروازہ کھولتے ہی سوال کر ڈالا ''کون ہو بیٹا! کس نے بھیجا ہے تمھیں؟''

''مجھے کسی نے نہیں بھیجا۔ آپ کا محلے دار ہوں۔ پڑوسیوں کا بڑا حق ہے اس لیے آیا ہوں۔'' ساتھ ہی لفافہ ان کی طرف بڑھا دیا۔ وہ ناں ناں کرتی رہ گئیں۔ مگر معیز لفافہ ان کی طرف اچھال کر تیزی سے پلٹ گیا۔ تقریباً پانچ ماہ یہ سلسلہ جاری رہا۔ پھر ایک روز اس خاتون نے رقم لینے سے انکار کر دیا اور بتایا ''ہمیں پھر سے کام ملنا شروع ہو گیا ہے جو کام لاتا تھا وہ بیماری کی وجہ سے اس عرصہ میں نہیں آسکا۔ اب اللہ کے فضل سے وہ ٹھیک ہو گیا ہے۔''

مگر اتنا ہوا کہ انھیں اس عرصہ میں معیز کا نام معلوم ہو چکا تھا اور معیز کو بھی ان کے متعلق کچھ معلومات مل چکی تھیں۔ وہ خاتون دراصل بازار حسن سے اپنا پیشہ چھوڑ کر نکل آئی تھیں۔ شریفانہ زندگی گزارنا چاہتی تھیں۔ نام ریحانہ تھا، دونوں بیٹیوں کو اس غلاظت سے بچا کر نکلی تھیں اور چاہتی تھیں وہ دونوں ہمیشہ اچھی اور صاف ستھری زندگی گزاریں۔ ایک رات خاموشی سے اپنی بیٹیاں اور جمع پونجی لے کر فرار ہو گئیں۔ اسٹیشن پہنچیں، ریل میں سوار ہوئیں، ٹکٹ کہیں اور کے لیے اور درمیان میں کسی دوسرے شہر اتر گئیں۔ یہی شہر تھا جس میں اب رہائش تھی۔

شفیع الدین وہ رقم بھی بچانا چاہتے تھے جو معیز پر خرچ ہو رہی تھی۔ معیز قانون کی تعلیم حاصل کر رہے تھے دوسرا سال تھا۔ شفیع الدین کو ایک موقع مل ہی گیا۔ کسی نے انھیں بتایا کہ کرائے پر جو عورتیں رہ رہی ہیں معیز کا وہاں آنا جانا ہے، بس

پھر کیا تھا۔ یہ چھان بین کی گئی کہ یہ کون عورتیں ہیں جن کا کوئی آگے ہے نہ پیچھے اور شفیع الدین نے ہنگامہ کھڑا کر دیا۔ معیز پر بدکرداری کا الزام لگایا گیا۔ رقم کے ''بے جا'' استعمال پر لعن طعن کی گئی اور آخری حربہ یہ تھا کہ معیز کو گھر سے نکل جانے کا کہہ دیا گیا کیونکہ بھتیجوں کے بگڑ جانے کا خدشہ تھا۔ ماں کو معیز کے متعلق ایسی شرمناک کہانی سنائی گئی کہ وہ دل پکڑ کر بیٹھ گئیں اتنا صدمہ ہوا کہ جان لے گیا۔

معیز ان دنوں لا کالج کے آخری سال میں تھا۔ اخراجات کے لیے دی جانے والی رقم بند کر دی گئی۔ چند جوڑے کپڑے اور کتابیں یہ کل اثاثہ تھا جو لے کر وہ گھر سے باہر کر دیے گئے۔ ایک دوست نے ساتھ دیا، رہنے کو ٹھکانہ فراہم کیا اپنے گھر میں ایک کمرا خالی کر دیا، ساتھ ہی کھانے پینے کی پریشانی کا مسئلہ بھی حل کر دیا۔ مگر تعلیمی اخراجات کیسے پورے ہوں گے یہ تلوار ان کے سر پہ لٹک رہی تھی۔ نوکری کی تلاش شروع کر دی مگر ایسی ملازمت نہیں ملی کہ ساتھ پڑھائی کے لیے وقت مل سکے۔ ایک روز مغرب کی نماز کے بعد مسجد سے باہر نکلا، تو ایک بچہ چھوٹا سا ایک پرچہ پکڑا کر چلا گیا۔ ریحانہ بیگم نے انھیں اپنے گھر بلایا تھا۔ پہلے تو شش و پنج میں رہا جائے نہ جائے مگر دوسرے روز ان کے دروازے پہ جا پہنچے اور ریحانہ بیگم نے خلاف معمول انھیں اپنے گھر کے اندر بلا لیا۔ صحن میں دو چارپائیاں پڑی تھیں۔ معیز حیران حیران ایک پر جا بیٹھا۔ ریحانہ کو شاید ان کے ساتھ گزرنے والا سارا واقعہ معلوم ہو چکا تھا۔

''معیز بیٹا! تم نے جو احسان ہم پر کیا ہے اس کا بدلہ کرنے کی تو ہماری اوقات نہیں۔ اگر میرا کوئی بیٹا ہوتا، تو یقیناً تمھاری عمر ہی کا ہوتا۔ تم سے یہ درخواست ہے کہ تم مجھے یہ حق دے دو کہ میں تمھیں بیٹا سمجھ سکوں۔''

''اس میں اجازت کی کیا بات ہے آپ ایسے کیوں کہہ رہی ہیں؟'' معیز الدین کچھ نہ سمجھتے ہوئے بے ساختہ بولا۔

''تو پھر میں ماں ہونے کا حق رکھتی ہوں نا؟'' ریحانہ بیگم مسکرائیں۔

''جی بالکل آپ میرے لیے ماں جیسی ہی ہیں۔''

ریحانہ نے ایک تھیلی معیز کی طرف بڑھائی اور کہا ''مجھے معلوم ہے تمھاری تعلیم جاری ہے، تمھیں رقم کی ضرورت ہے۔ یہ قرض حسنہ سمجھ کر رکھ لو جب کمانے لگو تو آہستہ آہستہ واپس کر دینا۔''

معیز دم بخود بیٹھے ریحانہ بیگم کا منہ تک رہے تھے۔

''لے لو بیٹا!''

''نہیں...... نہیں میں نوکری ڈھونڈ رہا ہوں ہو جائے گا بندوبست۔''

''میں جو کہہ رہی ہوں ماں ہونے کا حق لیا ہے میں نے تم سے اب انکار نہ کرنا۔''

معیز آنکھوں میں آنسو بھرے مگر بہنے سے روکنے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے سر جھکائے بیٹھا تھا۔ آنسو ٹپ ٹپ گود میں گرے۔ ریحانہ بیگم تڑپ کر آگے بڑھیں، معیز کے سر پر پیار سے ہاتھ رکھا اسے تھپکتے ہوئے بولیں ''معیز یاد کرو بیٹا، جب تم مجھے رقم پہنچانے آیا کرتے تھے اور میں نے انکار کیا تھا، تو تم نے کیا کہا تھا...... تم نے کہا تھا یہ میں نہیں لا رہا ہوں اللہ پاک بھیج رہا ہے۔ میں تو صرف وسیلہ ہوں، تو بیٹا آج بھی یہی سمجھو تمھیں مجھ سے کوئی طلب نہیں تھی اور مجھے تم سے نہیں ہے۔ یہ تو حقوق العباد کا معاملہ ہے۔ انسانیت کا تقاضا ہے انکار نہ کرو میرے بچے۔''

معیز نے وہ تھیلی لی، خاموشی سے گھر سے باہر آ گیا۔ تھیلی میں زیور تھے، زیور زیادہ تھے رقم کم مطلوب تھی۔ لہٰذا اپنی ضرورت پوری کر کے باقی زیور اپنے پاس محفوظ کر لیے۔

سال گزر گیا گھر سے رابطہ صرف اتنا رہا جب بھی اس سے بڑے دونوں بھائی گھر آتے اس سے ملنے ضرور آتے۔ دونوں ہی مختلف شہروں میں ملازمت کر رہے تھے۔ نتیجہ آیا، معیز کی ایل ایل بی کی تعلیم مکمل ہوئی۔ عدالت سے ناتا جوڑا، تو

اللہ پاک نے جیسے ہاتھ پکڑ لیا۔ پچھلی محرومی کا ازالہ اللہ نے ایسا کیا کہ ہر ہر قدم پر کامیابی ملی۔

دو سال بعد وہ ریحانہ بیگم کا بچا ہوا زیور اور جتنا بیچا تھا اس سے زیادہ وزن کا نیا زیور بنوا کر ایک بار پھر ریحانہ بیگم کے دروازے پر جا پہنچا۔ دوپٹہ میں چہرہ چھپائے ایک لڑکی نے دروازہ کھولا اس کو معیز نے پہلے نہیں دیکھا تھا۔ چہرہ تو اب بھی نہیں دیکھا دوپٹہ میں چھپا ہوا تھا، بلانے پر اندر گیا۔ ریحانہ بیگم چارپائی پر لیٹی تھیں۔ طبیعت بہت خراب تھی، معیز کو دیکھا، تو بہت خوش ہوئیں۔ خیر و عافیت دریافت کی۔ معیز نے اس دوران نہ آنے پر شرمندگی کا اظہار کیا نہ آنے کی وجہ بھی بتائی ''میں مقروض تھا آپ کے سامنے سر اٹھانے کی ہمت نہیں ہوتی تھی۔ آج وہ قرض حسنہ جو آپ نے مجھے بن مانگے دیا تھا لوٹانے آیا ہوں۔'' یہ کہہ کر زیور کی وہی پوٹلی جو کبھی لے گئے تھے ان کے سرہانے پر رکھ دی۔ پھر جھجکتے ہوئے بولا ''ایک درخواست ہے۔''

''بولو بیٹے بولو۔''

''آپ نے مجھے بیٹا کہا تھا۔ آج میں چاہتا ہوں آپ میری ماں بن جائیں۔''

ریحانہ بیگم کی آنکھیں ان کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ وہ پھر بولا ''میری سمجھ میں نہیں آتا کیسے وضاحت کروں؟ آپ...... آپ...... آپ اپنی بیٹی کا نکاح مجھ سے کر دیں۔'' یہ جملہ اتنی جلدی میں کہا کہ حیران ہوتی ریحانہ بے اختیار ہنس پڑیں اور پھر ایک دم خاموش ہو کر معیز کا چہرہ تکنے لگیں۔ کچھ دیر تو بالکل گم صم رہیں۔ پھر اچانک ہی رو پڑیں۔ ان کے ہونٹ دھیرے دھیرے ہل رہے تھے جیسے کچھ کہنا چاہتی ہوں اور آواز نہ نکل رہی ہو۔ پھر آخر جو دل میں تھا زبان پر آ ہی گیا ''تم اعلیٰ نسب ہو بیٹے اور میں گندی نالی کا حقیر کیڑا، تمہارے خاندان کے ہم پلہ نہیں ہیں ہم لوگ۔''

''آپ بہت محترم ہیں میرے لیے۔ پاکیزگی کی زندگی گزارنے کے لیے آپ نے ہر آرام تج دیا، ہر تکلیف برداشت کی مگر ثابت قدم رہیں۔ آپ کسی سے کم نہیں۔''

یوں معیز الدین کا نکاح فریدہ سے ہو گیا۔ ان کی خوش نصیبی تھی کہ فریدہ شکل کی تو اچھی تھی کردار و عمل کی بھی خوبصورت نکلی۔ معیز کے قریبی دوست نے بھی فریدہ کی چھوٹی بہن سے شادی کی اور یوں ریحانہ اپنے فرض سے سبکدوش ہوئیں۔

شادی کے بعد معیز الدین باپ کے جانشین شفیع الدین کے گھر اپنی بیوی کو ملوانے لے گئے۔ مگر...... بھابی نے ان کی بیوی کو دیکھ کر جو جملہ کہا وہ تن بدن میں آگ لگانے کو کافی تھا ''موری کی اینٹ چوبارے پہ لگا دی، اسے تو کسی ''کوٹھے'' پہ لگاتے۔'' اسی وقت اندر سے بڑے بھائی کی آواز آئی ''بیگم اس سے کہہ غلاظت کا ڈھیر یہاں سے لے جائے۔ ہم باعزت لوگ ہیں، یہ شاید بھول گیا کہ یہاں اس کی جگہ نہیں۔'' معیز الدین نم آنکھوں سے بیوی کو لیے گھر لوٹ آئے۔
شفیع الدین نے تینوں بھائیوں سے قطع تعلق کر لیا تھا کہیں جائیداد کا حساب نہ مانگ لیں۔ دو بیٹوں اور دو بیٹیوں کے ماں باپ بن کر معیز اور فریدہ نے ان کی بہت اچھی تعلیم و تربیت کی۔

☆

اور آج تئیس سال بعد شفیع الدین اسی چھوٹی بھاوج جسے ذلیل کر کے گھر سے نکالا تھا کے سامنے معافی کے طلبگار تھے۔ اپنی غلطیاں اپنی زیادتیاں سب خود ہی یاد آ گئیں۔ وجہ...... وہی مکافاتِ عمل!

پیسے پر نازاں تھے۔ بیوی کے حسن اور اعلیٰ خاندان کا ہونے پر فخر تھا۔ نوکروں کی فوج تھی گھر میں ہر چیز کی فراوانی، مگر اس فراوانی نے دل محبت سے خالی کر دیے۔ محبّت کی جگہ دل میں پیسا آن بسا۔ بیگم آرام طلب اور شوقین مزاج تھیں۔ خدمت گزاری ان کے نزدیک صرف نوکروں کا فرض تھا۔ شوہر بیمار ہوئے، جگر خراب ہوا اور حالت بگڑتی چلی گئی۔ پرہیز

تھا نہیں صرف دوا کیا کرتی۔ مہینا دو مہینے تو اچھی دیکھ بھال ہوئی بیماری نے مزاج میں چڑچڑاپن پیدا کر دیا۔ سب ان سے دور بھاگتے گئے بلکہ اکتانے لگے۔ بیگم نے کمرا الگ کر دیا پھر بڑے پوتے کو الگ کمرا کی ضرورت پڑ گئی، تو شفیع الدین کو سرونٹ کوارٹر میں منتقل کر دیا گیا۔ کیونکہ بچے ان کے ''شور'' سے ''تنگ'' ہونے لگے تھے۔

گھر والے دلچسپی نہ لیں، تو نوکروں کو کیا پڑی تھی کہ ان کا خیال رکھتے۔ وہ بالکل تنہا رہ گئے۔ کمزوری اتنی بڑھی کہ اٹھنا محال ہو گیا نہ کسی کو دوا کا خیال نہ وقت پر کھانا، حالت بگڑتی چلی گئی۔ غلاظت میں لتھڑے پڑے رہتے موت کی دعا مانگتے وہ بھی دور بھاگتی۔ اپنی بے بسی پہ روتے رہتے۔

ایک دن کسی ملنے والے نے تذکرہ کیا کہ شفیع الدین جیسا امیر آدمی آج کل سرونٹ کوارٹر میں پڑا رہتا ہے بہت بیمار ہے۔ بیوی بچے کوئی بھی خیال رکھنے والا نہیں۔ فریدہ بیگم نے سنا، تو لرز کر رہ گئیں۔ دل کی نیکی نے مجبور کیا، تو خاموشی سے کسی کو بتائے بنا ان کے گھر جا پہنچیں۔ دن کے دس بجے تھے گھر کے لوگ ابھی تک بیدار نہیں ہوئے تھے۔ ایک نوکر کو دیکھا، تو اس سے پوچھ کر سرونٹ کوارٹر میں چلی گئیں۔ ان کا حال دیکھا، تو حیرت میں رہ گئیں۔ ''یا اللہ! ایسی شان والے آدمی کا یہ حال۔''

ملازم سے کہہ کر پائپ لیا کمرا دھویا، بستر بدلا، چائے بنوائی انھیں کچھ کھلایا پلایا۔ دوائیں دیکھیں، ملازم سے ان کا طریقہ سمجھا اور گھر آ گئیں۔ پھر وہ ہر روز اس وقت گھر سے نکلتیں اور وہاں پہنچ جاتیں تاکہ گھر والوں کے سوتے سوتے سب کام کر کے واپس آ سکیں۔ کچھ نہ کچھ پکا کر لے جاتیں انھیں اپنے ہاتھ سے کھلاتیں۔ مناسب غذا ملی، تو صحت پر کچھ بہتری کے آثار پیدا ہوئے۔ ہفتہ بعد ایک روز شفیع الدین صاحب نے فریدہ سے پوچھا کہ تم کون ہو کیا بیگم صاحبہ نے تمھیں ملازم رکھا ہے، مگر وہ اس سوال کا جواب مسکرا کر ٹال گئیں۔ کچھ نہ بولیں۔ اپنے کام میں لگی رہیں۔ ان کے جانے کے بعد ملازم نے بتایا کہ یہ ملازمہ نہیں ہیں۔ بیگم صاحبہ نے تو انھیں دیکھا ہی نہیں ہے۔ یہ روز ایک گاڑی میں آتی ہیں۔ ڈرائیور واپس چلا جاتا ہے دو گھنٹے بعد وہی گاڑی انھیں واپس لے جاتی ہے۔ یہ سن کر وہ سوچ میں پڑ گئے کہ آخر یہ کون ہے گاڑی میں آتی ہے، تو یقیناً غریب گھر کی نہیں ہے...... کون ہے......؟

اگلے روز فریدہ وہاں پہنچیں، تو شفیع صاحب نے پہلی بات یہ کی ''کون ہو تم کیوں میری خدمت کر رہی ہو؟ آج سچ سچ بتا دو...... میں کل سے سو نہیں سکا۔ گاڑی میں آتی ہو اس کا مطلب ہے کہ اچھے گھر سے تعلق ہے جب تک تم بتاؤ گی نہیں میں کچھ نہیں کھاؤں گا۔'' پھر وہ سچ مچ کسی ضدی بچے کی طرح منہ بند کر کے بیٹھ گئے۔

''میں خدمت کیوں کر رہی ہوں اس کا جواب تو یہ ہے کہ یہ میرا امیرے اللہ سے معاملہ ہے۔ دوسرا کون ہوں اس کا جواب یہ ہے کہ میں غیر نہیں ہوں۔ بھائی جان میں آپ کے چھوٹے بھائی کی بیوی ہوں۔ فریدہ نام ہے میرا۔''

''معیز کی بیوی......؟''

''جی صحیح سمجھے آپ!''

شفیع الدین کی آنکھیں حیرت سے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ انھیں یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ جسے انھوں نے اسے ذلیل کر کے گھر سے نکالا تھا اس کے بدلے میں کوئی ایسا بھی کر سکتا ہے۔ جس بیگم پر ان کو ناز تھا وہ ان کی خیریت پوچھنے بھی ہفتہ دس دن بعد آتی ہے۔ جس اولاد کے لیے سب کا حق مارا وہ دور بھاگتی ہے۔ جسے...... جسے...... اُف خدا! جسے میں نے پیسا تو ایک طرف، عزت بھی نہ دی وہ میری خدمت کر رہی ہے۔ اتنے دن سے پھر وہی لمحہ تھا وہ اس سے معافی مانگ رہے تھے۔ اپنی غلطیوں کا اعتراف کر رہے تھے، رو رہے تھے۔ ان دنوں کے لیے جب ان سے یہ سب سرزد ہوتا چلا گیا۔ ''کاش، کاش...... میں بھی اچھا انسان ہوتا۔''

ہم بنے عامل

مڑ کر دیکھا تو والد محترم ایک ہاتھ میں ٹارچ اور دوسرے میں لاٹھی لیے کھڑے تھے

محمد اختر شیرانی

الف اے کے امتحانات سے فارغ ہوئے تو کچھ دن تو بے فکری کے عالم میں نیند کے مزے لوٹتے رہے۔ مگر تا بہ کجا؟ اُکتا گئے۔

سوچا کچھ نہ کچھ کرنا چاہیے۔ اور بقول شاعر

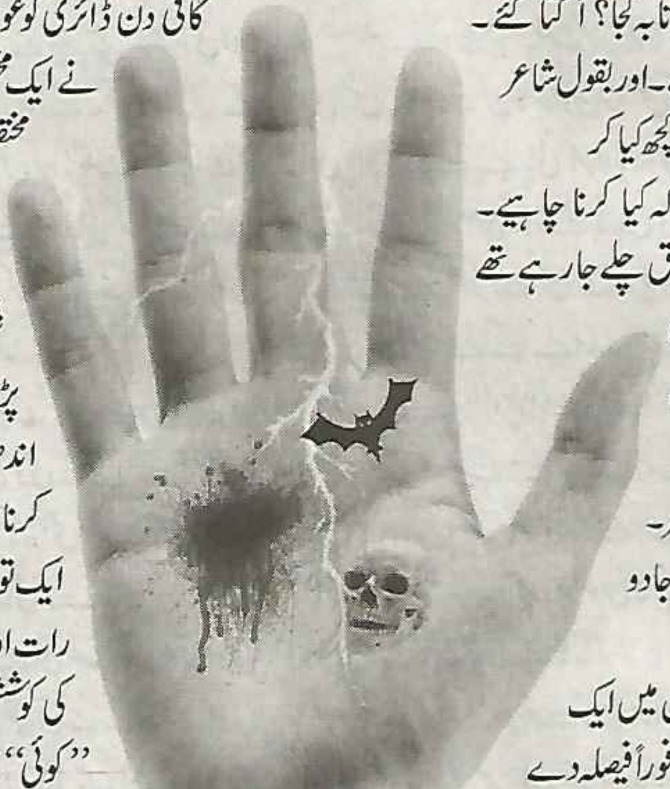
؎ بے کار مباش کچھ کیا کر

سوچ میں پڑ گئے کہ کیا کرنا چاہیے۔

ایک دن اسی سوچ میں غرق چلے جا رہے تھے کہ ایک دیوار پر نگاہ پڑی۔ جہاں جلی حروف میں لکھا تھا

"عملیات کے ماہر۔ کاٹ و پلٹ کے استاد۔ جادو شکن عامل بنگالی بابا"

بس پھر کیا تھا۔ ذہن میں ایک جھماکا سا ہوا اور عقل نے فوراً فیصلہ دے دیا کہ عملیات کی دنیا کھنگالنی چاہیے اور عامل بن کر دکھی انسانیت کی خدمت کرنی چاہیے۔ ایک سنسنی سی پیدا ہوئی اور ہم نے مستقبل کے سہانے خواب جاگتے میں دیکھنے شروع کر دیے۔



گھر جا کر ہم نے مرحوم دادا جان (جن کے بارے میں مشہور تھا کہ بڑے زبردست قسم کے عامل تھے) کی ایک ڈائری ڈھونڈنی شروع کر دی جس کو کئی بار دیکھ کر اور اپنے مطلب کی نہ جان کر اِدھر اُدھر رکھ دیتے تھے۔

کافی تلاش کے بعد بالآخر ڈائری ہاتھ لگی، محفوظ کر کے رکھ دی اور جب رات کو تنہائی ہوئی تو اسے پڑھنے لگے۔ جوں جوں پڑھتے گئے احساس ہوتا گیا کہ یہ کام اگر ناممکن نہیں تو انتہائی مشکل ضرور ہے۔ مگر ایک شعر نے حوصلہ بڑھایا

؎ ارادے جن کے پختہ ہوں نظر جن کی خدا پر ہو
تلاطم خیز موجوں سے وہ گھبرایا نہیں کرتے

کافی دن ڈائری کو غور سے پڑھنے اور سمجھنے کے بعد ہم نے ایک مختصر سا عمل منتخب کر لیا۔ عمل اگرچہ مختصر تھا مگر شرائط کافی سخت تھیں۔ مثلاً یہ عمل رات کو کرنا ضروری تھا، قبرستان میں جا کر کرنا تھا اور کسی شکستہ قبر کے سرہانے بیٹھ کر وظیفہ پڑھنا تھا۔ یہ شرط بھی کہ رات اندھیری ہو اور بارہ بجے کے بعد یہ عمل کرنا تھا۔

ایک تو قبرستان کا خوف اور پھر اندھیری رات اور اس پر طرح یہ کہ اگر کوئی ڈرانے کی کوشش کرے تو ہرگز نہ ڈریں۔ اس "کوئی" نے پہلے ہی سے خوف زدہ کر دیا، لیکن ہم نے بھی سوچ لیا کہ کچھ پانے کے لیے کچھ تکالیف تو برداشت کرنی پڑتی ہیں۔ تسلّی تھی تو صرف یہ کہ حصار میں بیٹھ کر کیا جانے والا یہ عمل صرف تین راتوں تک محدود تھا۔

گرمیوں کا موسم تھا۔ راتیں اندھیری تھیں۔ وظیفہ زبانی یاد کر چکے تھے۔ شکستہ قبر بھی منتخب کر کے تھوڑی بہت

صفائی بھی کرلی تھی۔

ایک رات ساڑھے بارہ بجے جب گھر والے سو گئے۔ ہم نے تکیے چارپائی پر سیدھے رکھے اور اوپر چادر ڈال دی تاکہ کسی کو خالی چارپائی دیکھ کر شک نہ ہو۔ پانی کی ایک بوتل اور ایک پیکٹ بسکٹ کا ساتھ لے کر قبرستان کی طرف چل پڑے۔

دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ قبرستان پہنچے تو ہُو کا عالم تھا۔ گورکن کی جھونپڑی میں اندھیرا تھا۔ قبرستان کے بالمقابل ایک کاٹن فیکٹری تھی۔ مگر سیزن نہ ہونے کے سبب فیکٹری بند تھی۔ البتہ فیکٹری میں دور کہیں ایک لائٹ جل رہی تھی۔ اندازے سے منتخب شدہ قبر کے سرہانے جا پہنچے۔ کچھ گرمی اور کچھ خوف کی وجہ سے پسینے میں شرابور ہوگئے۔ مگر حوصلہ کرکے حصار کھینچا اور بیٹھ گئے۔ پانی کی بوتل اور بسکٹ کے پیکٹ کو گرمی اور گھبراہٹ کی وجہ سے پہلے ہی خالی کر چکے تھے۔ ڈرتے ڈرتے بیٹھ گئے۔ آنکھیں بند کرکے وظیفہ پڑھنا شروع کر دیا۔ جوکہ مسلسل ایک گھنٹا پڑھنا تھا۔

وظیفہ شروع کیے ابھی پندرہ منٹ ہوئے ہوں گے کہ کسی کے قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ گھبرا کے آنکھیں کھولیں تو اندھیرے کی وجہ سے کچھ بھی نظر نہ آیا۔ قبر کی سمت منہ تھا اور آہٹ پیچھے سے سنائی دے رہی تھی۔ پیچھے مڑ کر دیکھنا نہیں تھا (ڈائری میں ایسے ہی لکھا تھا۔) قدموں کی آہٹ قریب آتی گئی۔ مارے گھبراہٹ کے وظیفہ بھول گیا۔ سختی سے کبوتر کی طرح آنکھیں میچ لیں اور خدا کو یاد کرنے لگے کہ اے خدا ہمیں بچا لے، آئندہ ایسی حرکت نہیں کریں گے۔ عجیب عجیب خیالات ذہن میں آنے لگے کہ اگر کچھ ہوگیا تو لوگ کیا کیا باتیں بنائیں گے اور اگر خدانخواستہ فوت ہوگئے تو.....

قدموں کی آہٹ قریب آتی گئی۔ اچانک کسی نے کندھے پر ہاتھ رکھ کر تھپتھپایا۔ مارے خوف کے میری چیخ نکل گئی۔ دوسری طرف بھی چیخ سنائی دی۔ بھاگنے کی کوشش میں ہم دونوں ایک دوسرے سے ٹکرا کر گر گئے۔ گرتے پڑتے قبرستان سے باہر آئے۔ کانوں میں کون ہے؟ کون ہے؟ کی آواز پڑی اور ٹارچ کی روشنی نظر آئی۔

حواس بحال ہوئے تو پتا چلا کہ گورکن تھا۔ اطمینان کی سانس لی۔ اس نے ازراہِ تجسّس پوچھا ''کیا ہو رہا تھا؟''

ہمیں غصہ آگیا۔ ہم نے کہا ''جو کچھ ہو رہا تھا تمھیں اس سے مطلب؟'' گورکن منہ پھلاتے ہوئے بولا۔ ''آپ خوامخواہ ناراض ہو رہے ہیں۔ میں اس قبرستان کا محافظ ہوں۔ اگر کوئی نقصان ہو جاتا تو جوابدہ تو میں ہی تھا نا؟

ہم نے سوچ لیا کہ غصہ کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ مصلحت اسی میں ہے کہ گورکن کا تعاون حاصل کریں۔ ہم نے کہا ''اچھا پانی پلاؤ'' وہ نلکے سے پانی بھر لایا۔ اسی دوران ہم نے سوچ لیا کہ اسے کیسے مطمئن کرنا ہے۔ پانی پی کر ہم نے کہا ''بات یہ ہے کہ ہمارے گھر سے کسی نے زیورات اٹھا لیے ہیں۔ اس چوری کا پتا چلانے کے لیے ایک وظیفہ پڑھنا ہے قبرستان میں آکر'' اس نے کہا ''اچھا جناب پھر؟''

ہم نے جیب سے پچاس روپے کا ایک نوٹ نکال کر اسے دیا اور کہا ''یہ رکھ لو چائے وائے پی لینا۔ اور میں تین راتیں یہاں آکر یہ وظیفہ پڑھوں گا تم اس کا ذکر کسی سے نہ کرنا ورنہ چوری کا پتہ نہیں چلے گا۔''

نوٹ دیکھ کر وہ بہت خوش ہوا اور دانت نکالتے ہوئے بولا ''جناب یہ تو قبرستان ہی آپ کا ہے۔ جب دل چاہے آ جائیں جب دل کرے چلے جائیں۔ ویسے جو ایک بار یہاں آیا، آج تک واپس گیا نہیں۔'' یہ سن کر ہم پر کپکپی طاری ہوگئی۔ ہم دل ہی دل میں اپنی خیریت کی دعائیں مانگتے ہوئے واپس گھر کی طرف چل پڑے۔

اگلی رات وقت مقررہ پر پھر قبرستان پہنچے۔ گورکن کی طرف سے بے فکر تھے۔ حصار کھینچا اور وظیفہ پڑھنے میں

مصروف ہوگئے۔ کچھ ہی دیر گزری تھی کہ پھر محسوس ہوا کہ کوئی آ رہا ہے۔ وہم سمجھ کر ہم نے نظرانداز کر دیا۔ تھوڑی ہی دیر میں عقب سے کسی کی زور زور سے سانس لینے کی آواز محسوس ہوئی۔ شک پڑا کوئی ''اور'' مخلوق تو نہیں۔ (ڈائری میں لکھا تھا کہ ایسا ہوسکتا ہے) مگر اطمینان تھا کہ حصار کے اندر بیٹھے ہیں اور ڈائری کے مطابق کوئی ''اور'' حصار کے اندر نہیں آ سکتا۔ مگر دل کی دھڑکنیں تیز ہوتی گئیں اور وظیفہ اٹکنے لگا۔

اچانک ایک ناقابل یقین بات ہوئی۔ اس غیرمرئی مخلوق یا آسیب نے ہماری کمر پر ہاتھ ڈالا اور ایک جھٹکے سے ہمیں اوپر اٹھا لیا۔ ہمیں اپنے پیٹ پر اس کے ہاتھ محسوس ہوئے اور یہ بھی محسوس ہوا کہ ہم زمین سے بلندی پر ہیں۔ ایک ناگوار سی بُو بھی محسوس ہو رہی تھی۔ ہم نے چلانا شروع کر دیا اور ہاتھ پاؤں مارنے لگے۔ اس مخلوق کی طرف سے بھی چیں چاں چیں چاں کی غیرمانوس آواز سنائی دینے لگی۔ اور وہ آسیب (ہمارے خیال کے مطابق) ایک طرف بھاگنے لگا۔ خوف کی شدت سے ہم بے ہوش ہوگئے۔

ہوش آیا تو خیال ہوا کہ شاید عالم بالا میں پہنچ چکے ہیں۔ مگر جنت یا جہنم؟ یہ ابھی واضح نہیں ہوا تھا۔ منہ پر پانی کے چھینٹے محسوس ہوئے۔ جلدی سے آنکھیں کھولیں۔ اِدھر اُدھر دیکھا تو علاقہ دیکھا بھالا محسوس ہوا۔ اٹھ کر بیٹھے اور غور کیا تو محسوس ہوا کہ یہ قبرستان کے بالمقابل فیکٹری کا ایریا ہے۔ ایک صاحب ہمارے منہ پر پانی کے چھینٹے مار رہے تھے۔

حواس بجا ہوئے تو معلوم ہوا کہ فیکٹری کا ایک مزدور ہمیں اپنے کندھے پر اٹھا لایا ہے۔ فیکٹری کے چوکیدار (جس نے ہمارے منہ پر پانی کے چھینٹے مارے تھے) نے بتایا کہ مزدور آپ کو مشکوک سمجھ کر اٹھا لایا ہے۔ ہمیں سخت غصہ آیا ''اس بدتمیز کو اتنا بھی نہیں معلوم کہ اس حرکت سے خدانخواستہ ہماری جان بھی جا سکتی تھی۔ کیا وہ بول نہیں سکتا تھا؟'' چوکیدار نے کہا ''جناب مجبوری یہ تھی کہ وہ بے چارا گونگا ہے۔ بس صرف چیں چاں چیں چاں ہی کر سکتا ہے۔''

مگر اس کے بدبودار ہاتھ؟ پھر یہ گتھی بھی گونگے مزدور کے سامنے آنے پر سلجھ گئی۔ معلوم ہوا کہ وہ کالے تیل کے ایک بڑے ٹینک کو اندر سے صاف کر رہا تھا۔ اس کے جسم اور کپڑوں پر کالا تیل لگا ہوا تھا، اور یہ اسی تیل کی بدبو تھی جو ہمیں محسوس ہوئی تھی۔ مزدور نے سامنے آ کر ہاتھ جوڑ دیے اور معافی مانگنے لگا۔ اس وقت تک ہماری اپنی حالت بھی خاصی ناگفتہ بہ ہو چکی تھی، ہم نے ان کو وہیں چھوڑا اور گھر کی طرف چل پڑے۔

صبح کو کپڑوں کی حالت دیکھ کر امی نے پوچھا تو ہم نے کہا کہ گر گیا تھا پتا نہیں کیا لگ گیا۔ انھوں نے زیادہ پوچھ گچھ نہیں کی کہ ان کی عادت نہیں تھی۔

رات کو پھر قبرستان جا پہنچے۔ ہمیں خود پر حیرت ہو رہی تھی کہ خوف زدہ ہونے کے باوجود ہمارے دماغ سے عملیات کا بھوت کیوں نہیں اتر رہا؟ خیر قبرستان پہنچ کر حصار کھینچا اور وظیفہ پڑھنے بیٹھ گئے۔ ایک گھنٹے کے بعد گھڑی کا الارم بجا تو ہمیں یقین نہ آیا کہ بغیر کسی رکاوٹ کے وظیفہ مکمّل ہوگیا۔ کوئی عجیب و غریب واقعہ پیش نہیں آیا۔ دوسری رات پھر جوش و خروش سے وظیفہ پڑھنے لگے اور حیرت انگیز طور پر یہ رات بھی خیریت سے گزر گئی۔

تیسری اور آخری رات بھی وظیفہ ختم ہونے تک کوئی واقعہ پیش نہ آیا تو خوشی کی انتہا نہ رہی۔ اب ڈائری کے مطابق آخری مرحلہ درپیش تھا۔ ہم نے بلند آواز سے کہا ''اے صاحبِ قبر کیا تم میری آواز سن رہے ہو؟''

آواز آئی ''ہاں سن رہا ہوں''

ذہن کو ایک جھٹکا لگا کہ ڈائری میں تو لکھا تھا کہ آواز نہیں آئے گی۔ خوف کی ایک لہر پیدا ہوئی اور ہمارے رونگٹے کھڑے ہوگئے۔ مگر آخری لمحات میں شرائط پوری کیے بغیر

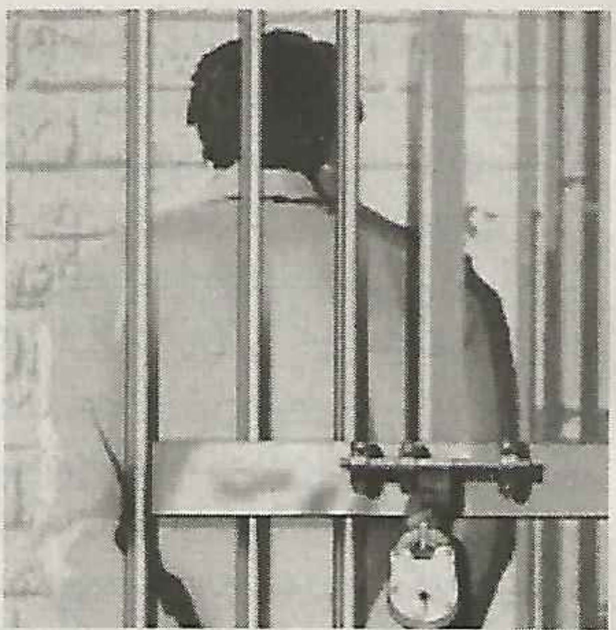
جانے کا خیال دل سے نکال دیا اور حوصلہ کر کے ہم نے پھر بلند آواز سے کہا ''اگر میں عامل بن گیا تو ہر جمعرات تیری قبر پر پھولوں کی چادر چڑھانے آیا کروں گا۔''

آواز آئی ''میں تمھیں چھوڑوں گا تو تم چادر چڑھاؤ گے''

اس کے ساتھ ہی ایک ہماری گردن کے پچھلے حصے پر ایک زوردار تھپڑ لگا اور ہم اوندھے منہ قبر پر جا گرے۔ چیختے ہوئے اٹھے تو معلوم ہوا کہ یہ ہمارے والد محترم تھے جو ایک ہاتھ میں ٹارچ اور دوسرے میں لاٹھی لیے کھڑے عالم فیض میں ہمیں دیکھ رہے تھے، کہنے لگے۔ ''ٹھہر میں تجھے ابھی عامل بناتا ہوں۔ میں بھی کہوں کہ برخوردار رات کو روزانہ کہاں تشریف لے جاتے ہیں۔ ابھی تیری خبر لیتا ہوں۔'' وہ آگے بڑھے تو ہم نے دوڑ لگانے میں ہی اپنی عافیت جانی۔

بھاگتے ہوئے ہم سیدھے اپنے ماموں کے گھر پہنچے۔ ماموں اور ممانی جاگے اور ہماری حالت دیکھ کر پریشان ہو گئے۔ مگر ہم نے تسلّی دی کہ اندھیرے میں ٹھوکر لگنے سے گر گئے تھے۔ ممانی نے دودھ کا گلاس پلایا اور ہم ان کے گھر ہی سو گئے۔ (اکثر و بیشتر ہم ان کے گھر سو جایا کرتے تھے)

صبح آنکھ کھلی تو دیکھا کہ ماموں جان اور والد محترم دونوں سامنے بیٹھے تھے۔ منہ ہاتھ دھو کر ناشتہ کیا۔ دونوں حضرات نے اپنے تجربات اور زمانے کے حالات بڑی نرمی سے سمجھائے اور ہمیں قائل کیا کہ قوم کی خدمت کرنے کے اور بھی بہت سے ذرائع ہیں۔ ہم اپنی تعلیم مکمّل کر کے کسی بھی شعبے کا انتخاب کر کے قوم کی خدمت کر سکتے ہیں۔ بات دماغ میں بیٹھ گئی اور ہم نے اپنی تعلیم کی طرف توجہ دی اور ایم اے (اردو) اور بی ایڈ کرنے کے بعد مقابلے کے امتحان میں سبجیکٹ سپیشلسٹ (ایس ایس) اردو منتخب ہو گئے۔ اب ہم مقامی ہائر سیکنڈری اسکول میں انٹر کلاسز کے نوجوانوں کو مفید شہری بنانے کی بھرپور کوشش کر رہے ہیں۔



ضمیر کا بوجھ

وہ سچ بول کر ضمیر کا بوجھ ہلکا کرنے گیا تھا لیکن......

جاوید راہی

"یار منظور اب کیا ہے؟ سو جاؤ چین سے" میرے ساتھ والے قیدی افتخار نے اپنا منہ دیوار کی طرف کرتے مجھے بیٹھے دیکھ کر کہا۔ میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ میرے ساتھ تقدیر اس طرح کھیل کھیلے گی اگر یقین سے کہا جائے تو میرے ساتھ پیش آنے والے واقعات کوئی معمولی نوعیت کے نہیں تھے۔ جیل کی سلاخوں سے پار باریک جالی سے نظر آنے والے آسمان پر ٹمٹماتے ستاروں کو دیکھا۔ چاند کسی بدلی کی اوٹ میں گم مدھم روشنی میں بدل چکا تھا۔ سپرنٹنڈنٹ جیل میرے رویے سے خوش تھا۔ میری مشقّت 'ان پڑھ قیدیوں کو جیل میں پڑھانے کی ڈیوٹی تھی اور اب میری رہائی میں چند روز باقی رہ گئے تھے اس لیے باہر کی فضا میں سانس لینے کی آرزو بے چین کیے ہوئے تھی۔

رہائی تو مل گئی مگر میرے اندر ٹوٹ پھوٹ بڑھتی ہی جارہی تھی۔ میں کچھ چاہتا تھا کیا چاہتا تھا کوئی خبر نہیں تھی۔ میں دن اور رات اپنے کمرے میں پڑا رہتا جب اُکتا جاتا تو گاڑی نکال کر یونہی آوارہ گردی پر نکل پڑتا۔ میرے دل اور ضمیر پر بوجھ تھا کہ میں قاتل ہوں چاہے اپنے کیے کی سزا کاٹ چکا تھا مگر اپنے اندر کی جیل میں دن رات قید تھا۔

سڑکیں ویران تھیں۔ میں نے تیز رفتاری سے بائیں جانب موڑ کاٹا اور ایک گھر کے احاطے میں داخل ہوگیا۔ پیچھے آنے والی ایک اور کار کے ڈرائیور نے پوری قوت صرف کر کے بریک لگائے تھے اور چلا کر ان سب کو جو عموماً آگے پیچھے دیکھے بغیر اور اپنی یا دوسروں کی زندگی سے بے نیاز ہو کے ایسی غیر ذمے دارانہ ڈرائیونگ کرتے ہیں گالی دی مگر میں نے کچھ نہیں سنا۔ مجھے احساس تک نہ تھا کہ میری لاپروائی کی عادت کے باعث وہ کیسے جان لیوا حادثے کا شکار ہوتے ہوتے رہ گیا ہے۔ کار میں نے گھر کے پورچ کے بجائے گیراج کے بند دروازے سے چند انچ کے فاصلے پر روکی۔ میں نے کار سے اُترنے میں کسی عجلت کا مظاہرہ نہیں کیا میں کچھ دیر اسی طرح پیر پھیلائے اور ایک ہاتھ اسٹیئرنگ پر رکھے بیٹھا کچھ سوچتا رہا پھر فیصلے کو ناگزیر سمجھتے ہوئے میں نے دروازہ کھولا اور باہر آکر سگریٹ کا آخری کش لینے کے بعد آدھے سگریٹ کو جوتے سے مسل دیا۔ رومال نکال کے اپنی جبیں سے پسینہ پونچھا جس کا کہیں نشان تک نہ تھا۔

میں اب بھی تذبذب کا شکار تھا میں نے ایک نظر اس گھر کو دیکھا جس کے دیوار و در سے آشنائی کا رشتہ بہت پرانا تھا مگر اس سے وابستہ یادیں بہت تلخ تھیں۔ گھر میں اندر کے کسی کمرے سے صرف ٹیلی وژن کی آواز آرہی تھی اور روشنی بھی صرف ایک ہی کمرے میں تھی۔ ایک بار پھر میں نے اپنے جذباتی فیصلے پر نظر ثانی کی۔ واپس لوٹ جانے کے بارے

میں سوچا اور آہنی دلائل سے اس خیال کو رد کر دیا جواب تک میں خود کو باہر دے چکا تھا۔ اپنے اقدام کے حق میں اور اس کے خلاف دلائل کی یہ ذہنی کشمکش مدت سے جاری تھی اور یہاں تک پہنچ جانا اس حقیقت کا اعتراف تھا کہ میرے اندر کا وہ آدمی جو اس کی مخالفت کرتا تھا ہار گیا ہے۔ میں نے کال بیل بجا کے ایک منٹ تک انتظار کیا۔ آوازوں سے میں اندازہ کر سکتا تھا کہ کوئی دروازہ کھولنے آرہا ہے۔

جس شخص نے دروزاہ کھولا وہ تقریباً میرا ہم عمر تھا۔ چالیس پینتالیس سال کا آسودہ حال اور مطمئن نظر آنے والا عام سا آدمی جو زندگی کی جدوجہد میں دن صرف کرنے کے بعد شام کے ہر لمحے کو سکون سے اپنے بیوی بچوں کے ساتھ چھوٹی چھوٹی خوشیاں سمیٹنے میں راحت محسوس کرتا ہے۔

''جی؟'' اس نے مجھے متجسّس نظروں سے دیکھتے ہوئے مہذب لہجے میں کہا۔ ''کس سے ملنا ہے آپ کو؟''

''شہر یار صاحب۔'' میں نے خاموشی سے مختصر وقفے کے بعد کہا ''آپ نے مجھے پہچانا نہیں؟''

دروازہ کھولنے والا اپنا نام سن کے تھوڑا سا چونکا اور اس نے اپنی یادداشت پر شرمندہ ہو کے غور سے دیکھا ''میں..... معاف کیجیے گا میں پہچان تو رہا ہوں لیکن کچھ یاد نہیں آتا.....''

''میں سلیم ہوں۔'' میں تھوڑا سا آگے روشنی میں آ کے بولا۔ اب اس کے حیران ہونے کی باری تھی۔

''سلیم احمد؟'' شہر یار نے زیرلب دہرایا۔ ''وہ انشورنس ایجنٹ.....!''

''نہیں..... دیکھیے، میں نے ہی آپ کی بیوی کو قتل، میرا مطلب ہے مارا تھا۔'' میں نے کہنا شروع کیا۔

شہر یار بالکل غیرارادی طور پر ایک قدم پیچھے ہو گیا۔ ''تو تم..... وہ والے سلیم احمد ہو..... ہاں..... مگر.....'' ''شہر یار صاحب..... مجھے احساس ہے کہ..... کہ مجھے یہاں نہیں آنا چاہیے تھا۔'' میں نے کہا ''مگر میں آ گیا۔''

شہر یار کا وہ چہرہ جو کچھ دیر پہلے سکون کی تصویر تھا عذاب کے پیکر میں ڈھل گیا۔ یادوں کے تاریک سائے اس کی صورت پر نفرت کا رنگ بن کر پھیل گئے وہ اپنی بیوی کے قاتل کو پلک جھپکائے بغیر دیکھتا رہا۔

''مجھے بہت افسوس ہے..... مجھے بارہا خیال آیا تھا۔'' میں نے پھر کہنا شروع کیا ''لیکن مجھے موقع نہیں ملا۔ آج اتفاق سے میرا گزر اس طرف ہوا۔ میں نے سوچا شاید پھر اس سے بہتر موقع نہ ملے، بات اتنی پرانی ہے..... لیکن میں یہ نہیں کہتا کہ اس سے آپ کے رنج و غم کا وجود نہیں رہا۔ وقت سب سے بڑا چارہ گر ہے اور صدمے کی شدت شاید اب پہلے جیسی نہیں ہوگی..... مگر پھر بھی میرے یہاں آنے کا مقصد اس غم کو تازہ کرنا نہیں.....''

شہر یار نے سر ہلایا۔ ''پھر؟'' اس نے ایک سرد آہ بھر کے کہا۔ ''اب کیا چاہتے ہو؟''

''کچھ نہیں'' میں نے محض شرمندگی مٹانے کے لیے رومال سے بے وجود پسینہ خشک کرنے کا عمل جاری رکھا۔ ''بس کچھ باتیں کرنی تھیں..... اگر اجازت ہو اور کوئی قباحت نہ ہو تو میں اندر آ جاؤں؟''

شہر یار نے بے خیالی میں سر ہلایا ''اب کیسی قباحت، آؤ..... آ جاؤ۔'' وہ اور پیچھے ہٹا اور پلٹ کے چلنے لگا۔ میں اس کے پیچھے رہا۔ یہ متوسط طبقے کے ایک فرد کا چھوٹا سا بنگلہ تھا جس میں آسائش کے سب لوازمات تھے۔ اتنی جگہ تھی کہ گھر کے مکیں آرام سے رہ سکیں اور وہ آرائش تھی جس سے دولت کا نہیں اعلیٰ ذوق اور نفاست کا پتا چلتا تھا۔ یہ سلیقہ اور حسن انتظام بھی کسی عورت کی موجودگی کا مظہر تھا مگر ابھی تک وہ عورت نظر نہ آئی تھی۔

ہم دونوں ایک کشادہ، صاف ستھرے اور خاصے آراستہ کمرے میں جا بیٹھے جہاں ٹیلی وژن پر کوئی فلم چل رہی تھی۔ کرسی پر وہ اخبار رکھا تھا جو شہر یار پڑھتے پڑھتے چھوڑ گیا تھا اور کافی کا آدھا مگ جو شہر یار پی رہا تھا اور اگر میں مخل نہ ہوتا، تو وہ

میز پر پیر پھیلائے ایک ہاتھ میں اخبار اور دوسرے میں کافی کا مگ تھامے کبھی اخبار اور کبھی ٹی وی دیکھتا رہتا۔ اب اس نے ٹی وی بند کیا اور دوسرا مگ لے کر آیا۔ اس وقت تک میں ساتھ والی کرسی پر بیٹھ چکا تھا۔

"معلوم ہوتا ہے پھر شادی کر لی ہے۔" میں اسے مگ بھرتا دیکھتا رہا۔ ٹی کوزی کے نیچے چائے دانی میں کافی اب بھی بہت گرم تھی۔ شہریار نے اثبات میں سر ہلایا اور مگ میرے سامنے رکھ دیا۔ "المیہ یہی ہے کہ ہم کمینے اور خود غرض انسان اس وقت تک محبّت کے دعوے کرتے ہیں جب تک خود نہیں مرتے، مرنے والوں کو اور ان کی محبّت کو بہت جلد بھول جاتے ہیں۔"

"تمھاری بیوی مجھے دکھائی نہیں دی؟" میں نے بے چینی سے پہلو بدلا "بچے ہیں؟"

"دو بچے ہیں اب تو۔" شہریار نے اپنا آدھا مگ پھر اُٹھا لیا۔ "بڑا لڑکا چوتھی کلاس میں ہے اور چھوٹی لڑکی اس سے دو سال پیچھے ہے ابھی میں نے ڈانٹ کر سلا دیا ہے دونوں کو۔ ایسی سنجیدہ فلمیں جن میں ذرا بھی ایکشن نہیں ہوتا وہ بھی خوامخواہ دیکھتے رہتے ہیں۔ ٹی وی ساری رات چلے، تو ساری رات نہ اُٹھیں مگر انھیں صبح اسکول جانا ہوتا ہے اور نظر بھی تو خراب ہوتی ہے۔ کافی ٹھنڈی تو نہیں ہوئی؟"

"کافی؟" میں چونکا۔ "نہیں..... بالکل نہیں....."

"معاف کرنا میں نے خود ہی بنائی ہے۔ بیوی ساتھ والے بنگلے میں گئی ہوئی ہے۔ وہاں کوئی شادی یا منہدی کی رسم ہو رہی ہے۔ ان عورتوں کو تم جانتے ہو۔ سات سال کی بچی ہو یا ستر سال کی بڑھیا۔ شادی میں پاگل ہو جاتی ہیں۔ اب رات بھر ڈھولک بجائیں گی، ناچیں گی، گائیں گی۔ اَن پڑھ ہو یا تعلیم یافتہ، رسموں کے معاملے میں سب ایک ہیں۔" وہ اچانک خوش دلی سے ہنس پڑا۔ "اصل میں ہمارے یہاں نسوانیت کا ایک مخصوص مزاج اور سانچہ ہے۔"

"تم اپنی موجودہ ازدواجی زندگی سے بہت خوش..... میرا مطلب ہے مطمئن ہو۔" میں نے کہا اور مسکرایا۔

شہریار کی شگفتگی کافور ہو گئی۔ "ہاں میں اس بات سے انکار نہیں کر سکتا۔" یہ بات میں اس وقت بھی کہتا تھا جب نغمہ..... میری پہلی بیوی زندہ تھی.....شاید یہ تقدیر کی رحم دلی اور مہربانی تھی کہ اس نے مجھے سلمٰی جیسی بیوی دے کر اس سے زیادہ دے دیا جتنا مجھ سے چھینا تھا۔ خدا مجھے معاف کرے۔ میرا مقصد مرحومہ کی روح کو صدمہ پہنچانا نہیں۔ وہ بھی بہت اچھی تھی۔ اتنی اچھی کہ زندہ رہتی، تو شاید میں زیادہ خوش اور مطمئن ہوتا۔ میں نے کہا نا عورت کا ایک مثالی روپ ہوتا ہے جو ہر مرد کے ذہن میں موجود رہتا ہے۔ اس کی کوئی ٹھوس صورت نہیں ہوتی اور اس کے تصور میں خاصی لچک ہوتی ہے۔ وہ ایسی بیوی چاہتا ہے جو حسین ہو اور جسمانی طور پر بھی پُرکشش ہو۔ محبّت کر سکتی ہو اور محبّت کرنے پر مجبور کر سکتی ہو۔ راحت اور آسودگی کا احساس دے سکتی ہو۔ سلیقہ مند ہو کہ گھر کو چلا سکے اور بچوں کی صحیح تربیت کر سکے اور مرد کو تفکّرات سے دور رکھے تاکہ وہ یکسوئی کے ساتھ ان کی خوش حالی کے لیے بھرپور جدوجہد کر سکے۔ خوش مزاج اور تھوڑی بہت سوشل اور باوفا ہو..... یہ سب خوبیاں اُس میں بھی تھیں اور اِس میں بھی ہیں۔ میرا خیال ہے اور بہت سی ایسی ہی عورتیں..... ہوں گی جو ایسے ہی گھر آباد کر چکی ہیں یا کر سکتی ہیں مگر میں اسے قدرت کی فیاضی ہی کہوں گا کہ اس نے مجھ سے ایک مثالی بیوی کو چھینا، تو دوسری دے دی۔

میں غور سے اس کی صورت دیکھ رہا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے شہریار یہ سب باتیں اپنے آپ سے کر رہا ہے اس کی نظر ٹی وی پر رکھے کتاب کی طرح کھلنے والے چاندی کے بنے ہوئے ڈبل فریم پر تھی جس میں ایک طرف وہ خوبصورت سوٹ پہنے کھڑا تھا دوسری جانب ایک بے حد حسین اور جاذبِ نظر نقوش کی مالک عورت دلہن کے روپ میں موجود تھی۔

"یہ شادی کی تصویر ہے۔ دس سال پرانی" شہریار نے کہا "مگر سلمٰی اب اس سے کہیں زیادہ حسین ہو چکی ہے۔"

''حسن''میں نے کافی کا ایک گھونٹ لے کر فلسفیانہ لہجے میں کہا۔ ''ایک احساس کا نام ہے جو دیکھنے والے کی نگاہ میں ہوتا ہے۔''

''ہاں۔ شاید'' شہریار بولا ''میں غیر جانبداری سے فیصلہ نہیں کرسکتا۔ تمھارا کیا خیال ہے؟''

''میرا خیال!'' میں نے بوکھلا کر کہا اور مگ نیچے رکھ دیا۔ ''کس سلسلے میں؟''

''نغمہ زیادہ حسین تھی یا سلمیٰ زیادہ حسین ہے؟'' شہریار نے کہا ''تم نے تو اسے دیکھا تھا۔''

مجھے اپنے ماتھے پر پسینے کی نمی محسوس ہوئی ''نہیں حقیقت یہ ہے کہ میں نے نہیں دیکھا تھا۔''

''پھر تم نے اسے قتل کیسے کر دیا تھا'' شہریار نے تلخ لہجے میں کہا ''دیکھے بغیر؟''

''میں..... میں یہی وضاحت کرنے کے لیے آیا تھا'' میں نے رومال ماتھے پر پھیرا ''گو اب اس کی ضرورت کسی کو نہیں۔ سوائے میرے۔''

''کیوں؟ تمھیں اس کی ضرورت کیوں محسوس ہوتی ہے؟'' شہریار نے کہا۔

''اس لیے کہ جو کچھ میں نے عدالت میں کہا تھا اسے کسی نے سچ نہیں مانا تھا اور بہت کچھ میں نے اپنے وکیل کی ہدایت پر بھی کہا تھا لیکن یہاں تمھارے گھر میں جو کچھ میں کہوں گا جھوٹ نہیں ہوگا۔ کیونکہ یہاں میں سچ بول کر اپنے ضمیر کا بوجھ ہلکا کرنے آیا ہوں۔'' میں نے کہا ''اندیشہ مجھے یہ تھا کہ میری صورت دیکھتے ہی تم مشتعل ہو جاؤ گے اور میری کوئی بات سنے بغیر مجھے گالیاں اور دھکے دے کر نکال دو گے۔ تم نے مجھے یہ موقع فراہم کیا۔ مجھے اتنی مہلت دی کہ میں کچھ کہہ سکوں۔ قانون نے مجھے مجرم سمجھا تھا۔''

''لیکن تمھیں وہ سزا، تو نہیں ہوئی جو قاتل کو دی جاتی ہے۔'' شہریار نے طنز سے کہا۔

''ہاں۔ قانون کے فیصلے حالات کے پس منظر میں کیے جاتے ہیں۔'' میں نے کہا۔

''تم نے بہت بڑا وکیل کیا تھا'' شہریار نے گالی دے کر خالی مگ کو میز پر پٹخ دیا۔ ''اس نے تمھیں بچا لیا۔''

میں نے نفی میں سر ہلایا ''میں نے قید بامشقّت کے گیارہ سال کاٹے۔ تمھارا عذاب تو میری سزا سے بہت پہلے ختم ہو گیا تھا۔ غالباً ایک سال بعد ہی تم نے دوسری شادی کر لی تھی اور تمھیں معلوم ہے جیل کا ایک دن کتنا لمبا ہوتا ہے۔ خیر اس بات کو بھی جانے دو۔ یہ سزا، تو مجھے ملنی ہی چاہیے تھی۔ جب میں جیل میں تھا تو مجھے معلوم ہوا کہ میری ماں مر گئی کیونکہ جو پنشن میرے باپ کو ملتی تھی اس سے وہ پیٹ بھر کے روٹی بھی نہیں کھا سکتے تھے۔ ماں کا علاج کیسے ہوتا تم تو جانتے ہو کہ ان کا واحد سہارا میں تھا اور ان دنوں میں اور تم ایک ہی پوسٹ پر تھے۔ اب تم کیا ہو؟''

شہریار نے دیوار کو گھورتے ہوئے کہا ''میں ڈائریکٹر ہوں۔''

میں نے سر ہلایا ''میں تم سے سینئر تھا خیر..... جب میں سکھر جیل سے رہا ہو کر حیدرآباد پہنچا تو میرا باپ بسترِ مرگ پر تھا۔ سرکاری ملازمت کے قواعد و ضوابط تم سمجھتے ہی ہو۔ میں جیل جانے کے بعد ہمیشہ کے لیے سرکاری نوکری کے لیے نااہل ہو گیا ہوں اور کہیں چپراسی تک بھرتی نہیں ہو سکتا۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ اس عرصہ میں کبھی مجھے تمھارا خیال نہیں آیا تھا۔ آیا تھا مگر مجھے فرصت نہیں تھی اور اب چلا جاتا تو پھر نہ جانے کب فرصت میسر آتی۔ تم میری بات پر اعتماد کرو گے نا؟''

''میں..... میں کوشش کروں گا.....'' شہریار نے کہا ''کہنا کیا چاہتے ہو تم؟''

''میں یہ کہنا چاہتا تھا کہ جب..... جب میں نے گولی چلائی تو بقائمی ہوش و حواس نہیں چلائی تھی۔''

''یہی مؤقف تمھارے وکیل کا تھا'' شہریار طنز سے

بولا ''اس نے کہا تھا کہ تم پیئے ہوئے تھے۔''

میں نے نفی میں گردن ہلائی ''وہ محض قانونی نکتہ پیدا کرنے والی بات تھی۔ میں نے زندگی میں کبھی حرام شے کو ہاتھ نہیں لگایا۔ میرے کہنے کا مقصد تھا کہ میں نے جانتے بوجھتے تمھاری بیوی پر گولی نہیں چلائی تھی۔ قانون تو قسم پر اعتبار نہیں کرتا مگر یہاں صرف تمھارے سامنے میں حلف اٹھا کے کہوں تو تمھیں مان لینا چاہیے کہ سچ یہی ہے۔ مجھے اب جھوٹ سے کیا فائدہ؟..... نغمہ..... تمھاری پہلی بیوی کی جان میرے ایک احمقانہ فعل کا نتیجہ تھی۔ میرا باپ مجھے عقل کا اندھا کہتا تھا۔ اس لیے کہ مَیں بچپن میں بھی سوچے سمجھے بغیر کام کرتا اور نقصان اٹھاتا تھا۔ میری کھوپڑی اُلٹی تھی اور اس میں جو خیال آتا وہ سیدھا بہت کم ہوتا تھا مگر میں نفع نقصان کی بعد میں سوچتا قدم پہلے اٹھاتا تھا۔ ایسے لوگوں کو کچھ بھی کہو، غیر ذمے دار، عاقبت نااندیش، کوتاہ بین، اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ کتے کی دم والی مثال میرے جیسے لوگوں پر صادق آتی ہے حالانکہ کتے کی دم کو کسی نے بارہ سال نلکی میں رکھنے کا تجربہ نہیں کیا مگر یہ سچ ہے۔''

شہریار مسکرایا ''آدمی کی فطرت واقعی نہیں بدلتی۔''

''جب میں آٹھ سال کا تھا، تو میں نے آنگن میں درخت پر گرگٹ کو اپنی غلیل سے نشانہ بنایا'' میں نے کہا ''درخت کے نیچے میری ماں ہنڈیا میں کڑھی گھوٹ رہی تھی۔ گرگٹ سیدھا ہنڈیا میں گیا اور کڑھی کے زرد رنگ میں گرگٹ کا خون مل گیا اس کے بعد میری ماں تمام عمر کڑھی نہ کھا سکی۔ اسکول میں لکڑی کے زینے کی ریلنگ پر سے پھسلنا بچوں کا دلچسپ مشغلہ تھا۔ ایک بار میں اوپر سے راکٹ کی طرح آیا اور ایک ہلکے پھلکے کم عمر کے بچے کو رگیدتا ہوا لے گیا۔ وہ اور میں ایک ساتھ نیچے گرے، لیکن میں اوپر تھا مجھے کچھ نہ ہوا۔ اس بچے کی دو ہڈیاں ٹوٹ گئیں اور پتا نہیں مجھے کتنے لوگوں نے مارا۔ کلاس کے بڑے لڑکوں نے پھر ماسٹر اور ہیڈ ماسٹر نے، گھر پر ماں نے اور پھر باپ نے اور آخر میں اس لڑکے کے باپ نے۔ چودہ سال کی عمر میں مجھے میرے ماموں نے چھرّے والی ائیر گن لا دی۔ جس سے چڑیاں کبوتر مارتے مارتے میں نے ایک روز دودھ والے کو زخمی کر دیا۔ نشانہ میں نے اس کے گھڑے کا لیا تھا وہ باڑے کا خالص دودھ مٹکے میں لے کر آتا تھا میں نے سوچا اس میں چھرّے سے جتنے سوراخ ہوں گے اتنی ہی دودھ کی دھاریں نکلیں گی اور اس عجیب منظر کے تصور نے مجھے عملی قدم اُٹھانے پر مجبور کر دیا مگر چھرّے گھڑے کے بجائے اس کی گردن میں لگے جس سے مٹکا گر کر پھوٹ گیا اور دودھ والے کی گردن سے خون بہنے لگا۔ وہ چیختا دہاڑتا میرے باپ کے پاس فریادی بن کے پہنچا اور پھر وہی ہوا جو ہمیشہ ہوتا تھا یعنی جوتا کاری کا طویل عمل۔''

شہریار بے ساختہ ہنسا ''بچے بعض اوقات چلبلے پن میں حد سے بڑھ جاتے ہیں۔ دو کا خون تم پہلے بہا چکے تھے بلکہ گرگٹ سمیت تین کا۔''

''ہاں کبھی نہ کبھی ایسا اتفاق ہوتا تھا'' میں نے کہا ''بعد میں میرے باپ نے ائیر گن چھین لی اور خنجر تو درکنار مجھے پنسل تراشنے کے لیے کوئی چاقو تک رکھنے سے منع کر دیا۔ وہ کہتا تھا یہ لڑکا تو خونی ہے۔ کسی روز سچ مچ کسی کا خون کر دے گا اور ہماری عاقبت خراب کرے گا۔'' میں نے کہا ''عاقبت کا تو مجھے علم نہیں لیکن اس نے جو کچھ کہا تھا وہ تقدیر نے سچ کر دکھایا۔ آپ کی بیوی کی موت، تو بہت بعد میں پیش آنے والا آخری حادثہ تھا۔ اس سے پہلے کالج میں یہ ہوا کہ کرکٹ میں میچ کھیلتے ہوئے میں نے چھکا مارنے کے لیے بلا گھمایا۔ گیند نکل گئی اور بلا میرے ہاتھ سے چھوٹ کر مڈ آف پر چند گز دور کھڑے مخالف ٹیم کے کپتان کے منہ پر جا لگا۔ اس کی ناک کی ہڈی اور سامنے کے دانت ٹوٹ گئے۔ دوسری ٹیم والوں نے میری ٹھکائی لگائی پھر میری ٹیم بھی میدان میں آ گئی اور بڑا گھمسان کا رَن پڑا جس میں امپائر سمیت سب پٹے۔ وہ معاملہ بڑی مشکل سے رفع دفع ہوا کیونکہ دانستہ میں نے کچھ نہیں کیا تھا۔''

’’معاف کرنا میں تمھیں سگریٹ پیش نہیں کر سکتا۔‘‘ شہریار نے کہا ’’میری بیوی نے یہ عادت چھڑا دی ہے اور بہت سی غلط عادتوں کے علاوہ۔‘‘

’’بیویاں سب کچھ چھڑا دیتی ہیں۔‘‘ میں معنی خیز انداز میں مسکرایا ’’میرے پاس اپنے سگریٹ ہیں۔‘‘ میں نے جیب سے سگریٹ نکال کر لائٹر سے سلگائی۔ ’’بات میں اس دن..... اس منحوس دن کی کرنا چاہتا تھا لیکن جو کچھ اس روز ہوا وہ میرے ماضی کے پورے کردار کو سامنے رکھے بغیر سمجھا نہیں جا سکتا۔ یہ باتیں میں نے عدالت میں کہاں بتائی تھیں۔ میں خود کو عقل کا اندھا اور اتنا عاقبت نا اندیش ثابت کرتا، تو مجھے حالات کی رعایت کہاں ملتی۔ اصل بات یہ ہے کہ ہم ایک پارٹی میں شریک تھے۔ تمھیں یاد ہوگا ہمارے ساتھ ایک پٹھان افسر تھا۔ یہ اس کی شادی کا ولیمہ تھا۔ مجھے نام یاد نہیں آرہا ہے اس کا۔ شیر محمد خاں یا شیر باز خاں۔ اس نے مجھے ایک ریوالور دکھایا کہ یہ درّے کا بنا ہوا ہے۔ بتاؤ اس میں اور ولائتی ریوالور میں کوئی فرق ہے؟ میں نے ریوالور دیکھا اور پٹھان کاریگروں کے ہنر کی تعریف کی۔ اس کا توازن دیکھنے کے لیے میں نے ریوالور کھلی کھڑکی سے باہر رکھتے ہوئے نشانہ لیا۔ اس نے مجھے بتایا تھا کہ ریوالور خالی ہے، لیکن اسے خود معلوم نہ تھا کہ چیمبر میں ایک گولی موجود ہے۔ میں بار بار ریوالور کا ٹریگر دباتا گیا اور کسی خاص سمت میں دیکھے بغیر فائر کرتا گیا۔ جب آخری چیمبر کی گولی کا دھماکا ہوا، تو میں اُچھل پڑا۔ میرے ہاتھ میں بھی شدید جھٹکا آیا تھا کیونکہ میں فائر کے لیے تیار نہ تھا۔ میرا دوست گھبرا گیا۔ اس نے مجھ سے ریوالور چھینا اور بھاگ گیا۔ وہ درّے سے غیر قانونی طور پر لایا ہوا ریوالور تھا اور اس کا لائسنس بھی نہیں تھا۔ گولی کی آواز کے بعد کسی عورت کی چیخ سنائی دی تھی اور میں نے اوپر سے دیکھا، تو نیچے مہمانوں میں بھگدڑ مچی ہوئی تھی۔ میرا دوست کہنے لگا یار غضب ہو گیا گولی کسی عورت کو لگ گئی ہے۔ اس وقت تک ہم دونوں میں سے کسی کو یہ بھی معلوم نہ تھا کہ وہ عورت کون ہے۔ میرے دوست نے کہا یار جو ہونا تھا وہ تو ہو گیا۔ میرا نام مت لینا کہ میں نے ریوالور دیا تھا اور کہا تھا کہ اس میں گولی نہیں۔ صرف ایک دن پہلے اس کی شادی ہوئی تھی۔ میرے ساتھ وہ بھی پھنس جاتا۔ میں نے کہا اور کیا کہوں وہ بولا کہہ دینا ریوالور یہاں پڑا تھا اتنے مہمان جو شادی میں شرکت کے لیے پشاور، کوہاٹ، مردان اور بنوں سے آئے ہیں ان سب کی موجودگی میں کسی ایک پر الزام نہیں آسکتا۔ تم کہنا کہ مَیں پستول کو خالی سمجھا تھا، میں تمھیں بچا لوں گا۔ میں ہکا بکا اور ذہنی طور پر مفلوج کھڑا تھا۔

مجھے یقین نہیں آتا تھا کہ نادانستگی میں ہی سہی مگر میں نے ایک قتل کر دیا ہے۔ ایک جیتی جاگتی عورت کو مار دیا ہے۔ میں وہیں کھڑا تھا کہ لوگوں نے مجھے پکڑ لیا اور میں نے وہی کہہ دیا جو میرے دوست نے کہا تھا۔ یہ تو مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ وہ تمھاری بیوی تھی۔ اب اسے کیا کہا جائے۔ یہی کہ اس کی قضا آگئی تھی۔ یہ نوشتۂ تقدیر تھا اسے میرے ہاتھوں اسی طرح مرنا تھا۔ وعدے کے مطابق بعد میں میرے دوست نے میری بہت مدد کی۔ اس نے پولیس کو دے دلا کر سب مشتبہ مہمانوں کو پکڑنے سے باز رکھا جو اس کے مہمان تھے۔ تم جانتے ہو مہمان کی عزت پر تو پٹھان جان دے دیتے ہیں۔ وکیل وغیرہ بھی اس نے کیے تھے اور بیچارہ جب تک یہاں رہا مجھ سے ملنے کے لیے اپنی بیوی کے ساتھ باقاعدگی سے جیل آتا رہا آج کل دبئی میں ہے۔ میں اپنی مقدس ترین چیز یعنی اپنے ضمیر کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ یہ ایک حادثاتی قتل تھا۔ غیر ارادی اور میری اسی احمقانہ عاقبت نا اندیشی کا نتیجہ۔ ریوالور خالی ہو تب بھی میں آسمان کی طرف رُخ کر کے ٹریگر دبانا چاہیے۔ اس وقت جب یہ حادثہ پیش آیا، تو میری حالت ایسی تھی جیسے میں واقعی نشے میں ہوں۔ مجھے اپنا ہوش بالکل نہ تھا۔ بعد میں وکیل نے اسی نکتے پر میری جان بچا لی مگر یہ جھوٹ مجھے اس عذاب سے تو نہیں بچا سکتا تھا جو میں نے برسوں کے شب و روز کے ہر لمحے میں جھیلا۔ جرم

سے زیادہ یہ احساسِ گناہ تھا جس سے مفر نہ تھا۔ میں نے اپنی پوری زندگی کا تجزیہ کیا جو ایسے ہی حادثات سے بھری پڑی تھی اور مجھے اپنے باپ کی بات اکثر یاد آتی جس نے کہا تھا کہ یہ لڑکا کسی روز سچ مچ کوئی قتل کر دے گا۔ دنیا کی طرح انھوں نے بھی یقین نہیں کیا کہ میں نے اس عورت کو بلاوجہ مار دیا، جتنے منہ اتنی باتیں، کوئی مجھ سے جیل میں ملنے تک نہیں آیا تھا، سوائے اس دوست کے جس کی بیوی میری شکر گزار تھی کہ میں نے اس کا سہاگ بچا کر ان کے خاندان کی عزت بچالی۔ میرے لیے یہ خیال بھی باعثِ آزار تھا کہ میرے والدین سے بیٹا ہی نہیں چھنا معقول آمدنی کا ایک ذریعہ بھی چھن گیا۔ اب وہ دنیا کو کیا منہ دکھاتے ہوں گے اور کیسے گزارا کرتے ہوں گے؟ میں نے طے کیا کہ سارا قصور میری لاابالی فطرت کا ہے۔ مجھے دنیا میں رہنا ہے، تو احتیاط سے کام لینا ہوگا۔ ہر فیصلہ سوچ سمجھ کر کرنا ہوگا اور عجلت میں آگے پیچھے دیکھے بغیر قدم اُٹھانے کی عادت بلکہ فطرت کو بدلنا ہوگا۔ فطرت کو بدلنا آسان کام نہیں مگر آدمی قوتِ ارادی سے کام لے، تو ناممکن کو ممکن کر دکھاتا ہے۔ قوتِ ارادی کی کمی مجھے کبھی محسوس نہیں ہوئی۔''

''اب یہاں آ کے مجھے یہ سب کچھ بتانے کا مقصد کیا ہے؟'' شہریار نے موقع پاتے ہی پہلو بدلا اور اپنی کلائی کی گھڑی میں وقت دیکھ کے جمائی لی ''پتا نہیں سلمیٰ کب آئے گی؟''

''میں صرف یہ بتانے آیا تھا کہ جو کچھ ہوا اس میں میرے ارادے کا ایک فیصد بھی دخل نہیں تھا۔'' میں نے کہا۔

''مجھے اب تمھاری بے گناہی میں کسی قسم کا شبہ نہیں'' شہریار نے کہا ''جو ہوا اسے تم بھی بھول جاؤ۔''

''میں ایسے نہیں بھول سکتا شہریار صاحب۔'' میں نے کہا ''جب تک آپ مجھے صدقِ دل سے معاف نہیں کر دیتے میں قانون کا نہیں آپ کا مجرم ہوں۔''

شہریار میری صورت کو غور سے دیکھتا رہا کہ میں گیارہ سال کی قیدِ بامشقت کاٹنے کے باوجود اپنے ضمیر پر ایک بوجھ لیے پھر رہا تھا اور واقعی شرمندہ تھا۔ خود اپنی نظر میں گناہ گار تھا اور نادانستگی میں سرزد ہو جانے والے جرم پر اب اس سے معافی مانگنے آیا تھا۔ وہ آہستہ سے اُٹھا اور میرے پاس آ گیا ''اگر تم اس سے مطمئن ہو سکتے ہو دوست تو میں تمھیں معاف کرتا ہوں۔ خدا گواہ ہے کہ میرے دل میں کوئی کدورت نہیں۔ میں جو کچھ کہہ رہا ہوں نیک نیتی سے کہہ رہا ہوں۔''

اس نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا اور شفقت سے دبایا۔

میں اُٹھ کھڑا ہوا ''مجھے اس کی بہت کم امید تھی۔'' میرا چہرہ مسرت سے دمک رہا تھا۔ ''لیکن آپ واقعی فراخدل اور عظیم آدمی ہیں۔ میں اب خود کو بہت ہلکا پھلکا اور نیا آدمی محسوس کر رہا ہوں۔''

''گنہگار ہم سب ہیں غلطی ہم سب کرتے ہیں۔'' شہریار نے کہا ''مگر نیت کا حال خدا جانتا ہے۔ وہ معاف کرنے والا ہے۔''

''اب میں چلتا ہوں۔'' میں نے مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔ وہ مجھے چھوڑنے باہر تک آیا۔ مجھے کار میں بیٹھتے ہوئے دیکھتا رہا۔

میں نے کار اسٹارٹ کی۔ میں بہت خوش تھا اور بہت جوش میں تھا۔ میں نے دیکھے بغیر کار کو تیزی سے ریورس گیئر میں ڈال کر واپس کیا۔ کسی عورت کے چیخنے کی آواز اس وقت آئی جب کار اس سے ٹکرا چکی تھی اور دیوپیکر کار کے پہیے جھٹکا کھا کر اس کے اوپر سے گزر چکے تھے۔ میں نے شہریار کے چلانے کی آواز بھی سنی اور گھبرا کے نیچے اُترا۔

کار کے نیچے ایک حسین عورت مری پڑی تھی۔ اس کا بھاری پیلا جوڑا جو اس نے شادی کی رسم کے لیے پہنا تھا لہو سے تر ہو گیا تھا اور اس کے مہندی لگے ہاتھ فریاد طلب انداز میں پھیلے رہ گئے تھے۔ وہ ساتھ والے بنگلے سے آئی تھی اور وہ وہی عورت تھی جس کی تصویر گھر کے اندر ٹی وی پر چاندی کے فریم میں لگی ہوئی تھی۔



ننھے منے سراغ رساں

لاشوں کے جاسوس کیڑے

ایک پیچیدہ مقدمے کی داستان جسے حل کرنے میں حشرات الارض مددگار بن گئے

رضوان علی شاہ

29 ستمبر ۱۹۳۵ء کا سورج انگلستان میں آب و تاب سے طلوع ہوا۔ جب آفتاب اپنے حسن کا خیرہ کن جلوہ دکھائے، تو انگریز بہت خوش ہوتے ہیں۔ وجہ یہ کہ انگلستان میں سورج کم ہی نکلتا ہے۔ موسم خوشگوار دیکھا، تو برطانوی شہر، ایڈن برگ کی دوشیزہ، مس سوزین کے دل میں آیا کہ سیر کرنے مضافاتی پُرفضا مقامات کا رخ کیا جائے۔ چناں چہ وہ دوپہر کو گارڈن ہوم اِن نامی مقام پر پہنچ گئی۔

گارڈن ہوم ایک پہاڑی علاقہ ہے جہاں کئی چشمے بہتے ہیں۔ ان چشموں کا پانی دریائے انان میں جا گرتا ہے۔ علاقے میں درخت اور جھاڑیاں بکثرت ہیں۔ ان میں مختلف اقسام کے پرندے بستے ہیں۔ دلفریب قدرتی مناظر کی بنا پر قریبی شہروں سے فطرت پسند انسان یہاں سیاحت کرنے آتے رہتے ہیں۔

مس سوزین گھومتے گھامتے ایک ایسے چشمے پر جا پہنچی جہاں چھوٹا سا پل بنا ہوا تھا۔ وہ پل پر کھڑے ہو کر اردگرد کے مناظر دیکھنے لگی۔ تھوڑی دیر بعد اس نے دیکھا کہ نیچے ایک جگہ اخباروں کا ڈھیر پڑا ہے۔ اس ڈھیر میں اسے عجیب سی شے پڑی نظر آئی۔ سوزین نے غور سے شے کو دیکھا، تو خوف کے مارے اس کی چیخ نکل گئی..... وہ کٹا ہوا انسانی بازو تھا۔

سوزین فوراً قریبی قصبے، موفٹ پہنچی اور وہاں پولیس کو کٹے ہوئے انسانی ہاتھ کی بابت بتایا۔ پولیس چوکی کا سربراہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ جائے وقوع پہنچا۔ اخباری کاغذوں کے ڈھیر سے انسانی اجسام کے تقریباً ستر کٹے پھٹے اعضا برآمد ہوئے۔

قاتل یا قاتلوں نے مقتولین کے جسم کا ایک بھی حصہ سالم نہیں چھوڑا تھا۔ جسمانی اعضا دیکھ کر پولیس والوں کے بدن میں بھی خوف کی لہر دوڑ گئی۔

اب یہ جاننے کے لیے سراغ رسانی شروع ہوئی کہ لاشیں کن بدنصیبوں کی ہیں۔ ان کے بارے میں کسی کو کچھ نہیں پتا تھا۔ پہلے پولیس سمجھی کہ یہ چھ مقتولین ہیں، پھر معلوم ہوا کہ یہ دو خواتین کی لاشیں ہیں۔ پولیس نے انھیں شناخت کرنے کی سرتوڑ کوششیں کیں مگر عقدہ نہ کھل سکا۔

آخرکار مکھیوں کے بچوں یا سنڈیوں نے سراغ حل کیا۔ ہوا یہ کہ ماہرین کو لاشوں سے مکھیوں کی سنڈیاں بھی ملیں۔ انھیں بغرض تحقیق ایڈن برگ یونیورسٹی بھجوایا گیا۔ وہاں ماہر حشرات، ڈاکٹر میرنز نے لیبارٹری میں ان کا معائنہ کیا۔ یہ مقامی بلو مکھی (Blowfly) کے بچے تھے۔ تخمینہ لگا کر ڈاکٹر میرنز نے سراغ

رسانوں کو بتایا کہ بچوں کی عمر چودہ دن ہے۔ یوں پولیس نے جانا کہ عورتوں کو چودہ پندرہ روز پہلے قتل کیا گیا۔

جب قتل کی موت کا تعین ہوا، تو پولیس نے پورے برطانیہ کے تھانوں کا ریکارڈ چیک کیا اور اخبارات بھی دیکھے گئے۔ سراغ رساں جاننا چاہتے تھے کہ آیا دو خواتین کی گمشدگی کی رپورٹ کس علاقے میں درج ہوئی ہے۔ آخر انھیں لنکاسٹر شہر سے اثبات کی خبر موصول ہوئی۔ وہاں ایک ڈاکٹر کی بیوی اور ملازمہ وسط ستمبر سے گم شدہ تھیں۔ موفٹ کی پولیس فوراً اس شہر پہنچ گئی۔

اس ڈاکٹر کا نام بختیار رستم جی تھا۔ وہ ایک پارسی ہندوستانی تھا جو ۱۸۹۹ء میں بمبئی میں پیدا ہوا۔ وہیں طب کی تعلیم پائی اور پھر ۱۹۳۰ء میں لنکاسٹر، برطانیہ چلا آیا۔ شہر میں اس نے اپنا کلینک کھولا اور اپنی خوش اخلاقی کے باعث جلد لوگوں میں مقبول ہو گیا۔ وہ نادار مریضوں سے فیس نہیں لیتا تھا۔ لنکاسٹر آنے کے چند ماہ بعد اس نے مقامی لڑکی، ازبیلا کیر سے شادی کر لی۔ ان کے ہاں تین بچے تولد ہوئے۔

چھان بین سے پولیس کو معلوم ہوا کہ ڈاکٹر اور اس کی بیوی کے مابین تعلقات کشیدہ تھے۔ اس کو شک تھا کہ بیوی آوارہ مزاج ہے۔ چناں چہ دونوں میں اکثر جھگڑا ہو جاتا۔ ایک بار تو ازبیلا نے تھانے میں یہ رپٹ درج کرائی کہ اس کی زندگی کو شوہر سے خطرہ ہے۔ تاہم ڈاکٹر کی نیک نامی کے باعث پولیس نے تفتیش کرنا مناسب نہیں سمجھا۔

لنکاسٹر تھانے کے ریکارڈ کی رو سے ۱۶ ستمبر ۱۹۳۵ء کی دوپہر میری راجرسن کی ماں نے یہ رپٹ درج کرائی کہ اس کی بیٹی گم شدہ ہو چکی۔ میری ڈاکٹر رستم جی کے گھر کام کرتی تھی۔ پولیس نے ڈاکٹر سے رابطہ کیا۔ اس نے بتایا کہ میری دو دن سے کام پر نہیں آئی۔ پولیس نے رستم جی کی بات پر یقین کر لیا۔

۱۸ ستمبر کو ازبیلا کے دوست تھانے آپہنچے۔ انھوں نے بھی اس کی گم شدگی کی رپورٹ درج کرائی۔ پولیس پھر تفتیش کرنے ڈاکٹر رستم جی کے پاس پہنچی۔ وہ کہنے لگا کہ اس کی بیوی اپنے عاشق کے ساتھ فرار ہو گئی ہے۔ اور اسے اس کے بارے میں کچھ معلوم نہیں۔ پولیس کو دوبارہ رستم جی کے بیان پر یقین کرنا پڑا، آخر کار وہ شہر کا معزز ڈاکٹر تھا۔ تاہم رفتہ رفتہ شہادتیں آنے کے بعد پولیس کو یقین ہو گیا کہ ڈاکٹر رستم جی ہی اپنی بیوی اور ملازمہ کا قاتل ہے۔

معاملہ یہ ہوا تھا کہ ۱۵ ستمبر کی صبح ڈاکٹر اور بیگم کے مابین سخت تلخ کلامی ہوئی۔ ڈاکٹر کو اتنا شدید غصہ آیا کہ اس نے گلا دبا کر بیوی کو مار ڈالا۔ اتفاق سے ملازم نے یہ منظر دیکھ لیا۔ ڈاکٹر نے اپنا جرم چھپانے کے لیے اسے بھی مار ڈالا۔ ڈاکٹر نے پھر لاشوں کے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالے۔ چونکہ رستم جی ڈاکٹر تھا۔ لہٰذا اس نے اپنے اوزاروں سے پیشہ ورانہ انداز میں اجسام کاٹے تھے۔ تفتیش کے دوران یہی عمل اس کے قاتل ہونے کا ثبوت بن گیا۔

ڈاکٹر رستم جی نے پھر کٹے جسمانی اعضا اخبارات میں لپیٹ دیے۔ یہ اخبار صرف لنکاسٹر میں شائع ہوتے تھے۔ یہ امر بھی عدالت میں بطور ثبوت پیش کیا گیا۔ ڈاکٹر پھر گاڑی میں رات کو سفر کرتے ہوئے ۱۰۰ میل دور گارڈن ہوم ان جا پہنچا۔ اسے سیاحت کا بہت شوق تھا۔ ایک سیاحتی سفر کے دوران ہی وہ اس علاقے میں آیا تھا۔ علاقہ بالکل غیر آباد تھا اور شاذ ہی وہاں کوئی آتا۔ اسی لیے ڈاکٹر نے کٹی پھٹی لاشیں وہاں پھینک دیں۔ ڈاکٹر کو یقین تھا کہ کوئی اس کا جرم نہیں جان سکے گا۔ مگر اللہ تعالیٰ کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ چناں چہ ایک خاتون سیاح وہاں پہنچ گئی۔

لنکاسٹر جاتے ہوئے گھبراہٹ میں ڈاکٹر رستم جی کینڈل نامی دیہہ میں ایک سائیکل سوار سے ٹکرا گیا۔ سائیکل سوار محفوظ رہا مگر اسے غصہ آیا کہ کار ڈرائیور اس کی مزاج پرسی کرنے نہیں رکا۔ چناں چہ وہ مقامی پولیس چوکی پہنچا اور سارا ماجرا سنایا۔ اس چوکی نے اگلے دیہہ، ملنتھروپ میں یہ خبر بھیجی۔ وہاں پولیس والوں نے ڈاکٹر رستم جی کو روک کر پوچھ گچھ کی اور تنبیہہ کے بعد چھوڑ دیا۔ مگر بعد ازاں یہ واقعہ اس امر کا ثبوت بن گیا کہ ڈاکٹر رستم ۱۵ ستمبر کی رات گارڈن ہوم ان گیا تھا۔

درج بالا شہادتوں کی روشنی میں ۱۳/۱۲ اکتوبر کی صبح ڈاکٹر رستم جی کو گرفتار کر لیا گیا۔ مارچ ۱۹۳۶ء میں اس پر مقدمہ چلا۔ لنکاسٹر کے بہت سے لوگ مقتولہ ازبیلا کو آوارہ مزاج سمجھتے تھے۔

اس زمانے میں انگلستانی معاشرہ آج کی طرح آزاد خیال نہیں تھا اور اخلاقی اقدار و روایات کی پاس داری ہوتی تھی۔ اسی لیے لنکاسٹر کے رہائشیوں نے ڈاکٹر رستم جی کو بے گناہ قرار دیا اور اس کی رہائی کے لیے مہم چلائی۔ تاہم قانون تو آنکھ کے بدلے آنکھ کے مقولے پر یقین رکھتا ہے۔ چناں چہ بیوی اور ملازمہ کو قتل کرنے کے جرم میں ہندوستانی معالج کو پھانسی کی سزا سنائی گئی۔ ۱۲مئی کو سینتیس سالہ ڈاکٹر پھانسی کے پھندے پر لٹک گیا۔

انگلستان پہنچ کر رستم جی نے اپنا نام بک رکسٹن (Buck ruxton) رکھ لیا تھا۔ اسی لیے اس کا مقدمہ تاریخ میں ''بک رکسٹن کیس'' کے نام سے مشہور ہوا۔ پیچیدہ ازدواجی کیفیت کے باعث اسی مقدمے کو پورے برطانیہ میں شہرت ملی۔ آج اس کی وجہ شہرت یہ ہے کہ برطانوی تاریخ میں پہلا کیس ہے جس میں حشراتی شہادت کی مدد سے مجرم تک پہنچا گیا۔

حشرات اور جرمیات کا تعلّق

انسان یا کوئی بھی ذی حس مر جائے اور لاش فضا میں پڑی رہے، تو جلد ہی اس سے گوشت خور حشرات یا کیڑے مکوڑے چمٹ جاتے ہیں۔ عموماً وہ لاش پر انڈے دیتے ہیں جن سے بچے نکل آتے ہیں۔ ان بچوں کی عمر کا اندازہ لگا کر یہ جاننا ممکن ہے کہ لاش کتنی پرانی ہے۔ چین میں ۱۱۸۸ء تا ۱۲۵۱ء سنگ تزو نامی جج گزرا ہے۔ وہ لاش کے کیڑوں کا مشاہدہ کر کے موت کے وقت کا تخمینہ لگاتا تھا۔ سنگ تزو نے اس عمل کو اپنی کتاب میں بھی بیان کیا۔ یہ جرم کی تفتیش میں حشرات سے مدد لینے کا پہلا ریکارڈ شدہ بیان ہے۔

یہ بات قابل ذکر ہے کہ جغرافیائی مقام، موسم، آب و ہوا اور ماحول کی تبدیلیوں کے باعث لاشوں سے مختلف اقسام کے کیڑے چمٹتے ہیں۔ مثال کے طور پر جو لاش کھیتوں سے ملی، اس کے کیڑے جھیل کنارے پڑے مردے سے چمٹے کیڑوں سے مختلف ہوں گے۔ اسی طرح اگر لاش شہر کے کسی گنجان آباد علاقے سے ملی، تو اس پر مختلف کیڑوں نے حملہ کیا ہوگا۔ مزید برآں حشرات کے بچوں (سنڈیوں) کی پیدائش اور نشوونما پر دھوپ اور حرارت کا اثر بھی مختلف ہوتا ہے۔

جرم کی چھان بین میں حشرات سے مدد لینے کا آغاز صحیح معنوں میں بیسویں صدی سے شروع ہوا۔ تب تک ماہرین حشرات لاکھوں کیڑوں کی اقسام دریافت کر چکے تھے۔ خاص طور پر گوشت خور حشرات کے رہن سہن کا مطالعہ بھی جاری تھا۔ یوں ماہرین کو ان کے انداز زندگی کی بابت قیمتی معلومات حاصل ہوئیں۔ جدید آلات کی ایجاد نے بھی حشرات پر تحقیق آسان بنا دی۔ آج حشرات الارض کا مطالعہ ایک علم بن چکا جو حیوانیات کی ایک شاخ ہے۔

لاشیں کھانے والے کیڑوں کی کئی اقسام ہیں۔ اسی لیے ماہرین حشرات ہر کیس کو انفرادی طور پر دیکھتے اور اسے حل کرنے کی سعی کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر ایک کیس پیش ہے۔

۲۵ برس قبل اٹلی کی بندرگاہ، وینس میں امریکا سے ایک بحری جہاز پہنچا۔ اگلے ہفتے جہاز کا کپتان ایک دن چھ بجے اپنی ڈیوٹی پر پہنچا۔ اسی دن رات نو بجے جہاز سے ایک اطالوی پوسٹ ماسٹر کی لاش برآمد ہوئی۔ کپتان کو شبے کی بنیاد پر گرفتار کر لیا گیا۔

اگلے دن لاش کا پوسٹ مارٹم ہوا۔ پتا چلا کہ لاش پر ماس مکھی کا لاروا یا انڈے بڑی تعداد میں موجود ہیں۔ تاہم اس ثبوت کو بطور شہادت نہیں برتا گیا۔ دیگر شہادتیں کپتان کے خلاف تھیں، اس لیے امریکی کپتان کو عمر قید کی سزا سنا دی گئی۔ کپتان نے سزا کے خلاف اپیل کر دی۔

مقدمہ طول پکڑ گیا۔ پانچ سال بعد آخر حشراتی شہادت کو بھی عدالت میں پیش کرنے کا فیصلہ ہوا۔ چناں چہ اس ماہر حشرات کو بطور گواہ طلب کیا گیا جس نے لاش سے ملنے والے انڈوں کا معائنہ کیا تھا۔ اس نے بتایا کہ تحقیق کے مطابق اٹلی میں ایسی کوئی ماس مکھی نہیں پائی جاتی جو شام کے وقت انڈے دے۔ لاش پر جس ماس مکھی کے انڈے ملے، وہ صبح کے وقت انڈے دیتی ہے۔

ماہر حشرات کی شہادت کا نتیجہ یہ نکلا کہ لاش کئی گھنٹے پرانی تھی کیونکہ اس پر صبح ماس مکھی نے انڈے دیے جبکہ کپتان چھ بجے ڈیوٹی پر پہنچا تھا۔ گویا حشرات نے یہ گواہی دے دی کہ وہ بے گناہ ہے۔ اسی بنا پر اسے رہا کر دیا گیا۔ بعدازاں پولیس نے

اصل مجرم کو گرفتار کرلیا۔ بحری جہاز کے ایک فرانسیسی ملازم نے کسی جھگڑے میں پوسٹ ماسٹر کو مار ڈالا تھا۔

ماہرین حشرات کا کہنا ہے کہ اگر ایک لاش کھلی ہوا میں رہے، تو عموماً چوبیس گھنٹے کے اندر اندر گوشت خور کیڑے اس تک پہنچ جاتے ہیں۔ یہ کیڑے پھر نہ صرف گوشت کھاتے ہیں، بلکہ بہت سے انڈے بھی وہیں دے دیتے ہیں۔ وجہ یہ کہ اس جگہ خوراک وافر دستیاب ہوتی ہے۔ اسی لیے انڈوں سے بچے نکل کر گوشت پر پلتے بڑھتے اور جوان ہوتے ہیں۔

مکھیوں کے جو بچے لاش کا گوشت کھا کر جوان ہوں، وہ اکثر قرب و جوار میں منڈلاتے رہتے ہیں۔ تب ان کا معائنہ کیا جائے، تو انکشاف ہوتا ہے کہ وہ کسی لاش سے آئے ہیں۔ ایک بار اسی بات نے پولیس کو ایک لاش تک پہنچا دیا۔

ہوا یہ کہ فرانس میں گرمیوں کی ایک صبح ایک سرکاری افسر اپنے دفتر پہنچا۔ اس نے دیکھا کہ کمرے کے قالین پر مکھیوں کے بچے بیٹھے بھنبھنا رہے ہیں۔ اس نے صفائی والے کو طلب کرکے پوچھا ''تم قالین کی صفائی کتنے دن بعد کرتے ہو؟''

صفائی والے نے بتایا کہ صاحب جی، روزانہ کرتا ہوں۔ کل شام آپ چلے گئے، تو میں نے پورا کمرا صاف کیا تھا۔ افسر نے کہا تم جھوٹ بولتے ہو اور اسے برطرف کردیا۔

افسر پڑھا لکھا تھا۔ اسے علم حشرات سے بھی دلچسپی تھی۔ اسے حیرت ہوئی کہ مکھیوں کے بچے اس کے کمرے میں کہاں سے آگئے۔ اسی نے چند بچے پکڑوائے اور شیشی میں بند کر کے ایک ماہر حشرات کو بھجوا دیے۔ اس ماہر نے اپنی رپورٹ میں انکشاف کیا کہ یہ بچے کسی انسانی لاش کا گوشت کھا کر پلے بڑھے ہیں اور یقیناً وہ لاش قالین والے کمرے کے آس پاس ہی ہوگی۔

اس رپورٹ نے سرکاری افسر کو چونکا دیا۔ اسی نے پھر پوری عمارت کی تلاشی لینے کا حکم دیا۔ اسی منزل کے ایک کمرے سے ایک نامعلوم لاش برآمد ہوگئی۔ مکھیوں کے بچے صبح اسی سے اڑ کر سرکاری افسر کے کمرے میں پہنچے تھے۔ جب حقیقت سامنے آئی، تو سرکاری افسر نے صفائی والے کو ملازمت پر بحال کردیا۔ جبکہ پولیس قتل کی تفتیش کرنے لگی۔

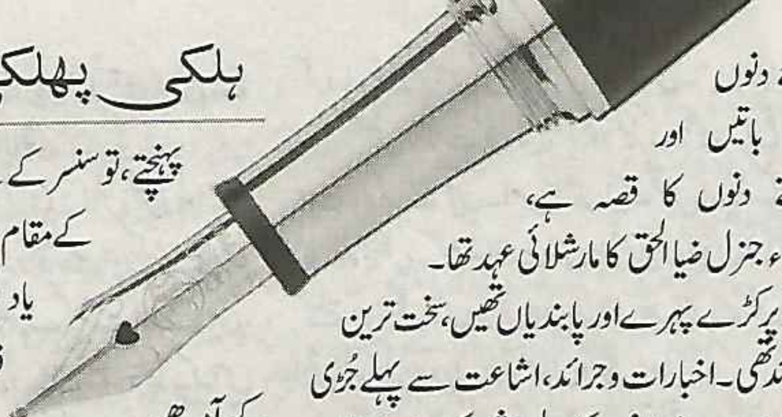
بعض اوقات مٹی میں موجود کیڑے بھی سراغ رسانوں کی بہت مدد کرتے ہیں۔ امریکا میں ایک شخص اپنے کتے کو ٹہلانے لگا۔ وہ جنگل کے مضافات میں واقع ایک گاؤں کا باسی تھا۔ ٹہلتے ٹہلتے وہ جنگل میں داخل ہوگیا۔ اسی جگہ گڑھے میں اسے انسانی لاش نظر آئی، تو وہ الٹے قدموں واپس ہولیا۔

آدمی نے پولیس کو لاش کے متعلق بتایا، تو سپاہی جائے وقوعہ پر پہنچے۔ لاش کا آدھا دھڑ باہر تھا جبکہ آدھا مٹی میں دھنسا ہوا تھا۔ باہر نکلے دھڑ پر ماس مکھی کی سنڈیاں منڈلا رہی تھیں۔ ان کے معائنے سے افشا ہوا کہ وہ ایک ہفتے کی عمر رکھتی ہیں۔ مگر لاش کی ظاہری حالت سے عیاں تھا کہ وہ زیادہ عرصے پرانی ہے۔ لاش کی جلد خاصی سوکھ چکی تھی جو ایک عورت کی تھی۔

اب یہ مسئلہ سامنے آیا کہ یہ کیسے معلوم کیا جائے کہ لاش کتنا عرصہ پرانی ہے۔ یہ مسئلہ بھی حشرات الارض ہی نے حل کیا۔ ہوا یہ کہ ماہرین نے اس مٹی کا کیمیائی تجزیہ کیا جس میں لاش دھنسی ہوئی تھی۔ وجہ یہ کہ مٹی کے اندر بھی مختلف کیڑے مکوڑے پائے جاتے ہیں۔

جب لاش مٹی میں دفنا دی جائے، تو تعفّن کی وجہ سے بعض مخصوص کیڑے مر جاتے ہیں۔ (جبکہ گوشت خور کیڑے لاش کا بدن چٹ کرنے لگتے ہیں) جب دو ماہ گزر جائیں، تو پھر نئے کیڑے جنم لیتے ہیں۔ جب عورت کی لاش والی مٹی کا تجزیہ ہوا، تو اس میں دو ماہ پرانے مردہ کیڑے بھی پائے گئے۔ یوں ثابت ہوگیا کہ عورت کو مرے ہوئے دو ماہ سے زیادہ عرصہ گزر چکا۔

حشرات الارض کی مدد سے جرائم حل کرنے کا فن اصطلاح میں ''فورنسک اینٹومولوجی (Forensic Oentomology) کہلاتا ہے۔ یورپ اور امریکا میں اس فن کے ماہرین جدید آلات کی مدد سے پیچیدہ ترین کیس بھی حل کر ڈالتے ہیں۔ سچ ہے، اللہ تعالیٰ نے اپنی بنائی ہر شے میں کوئی نہ کوئی فائدہ رکھا ہے۔ یہی دیکھیے کہ بظاہر بے فائدہ کیڑے بھی قانون کے کام آرہے ہیں۔



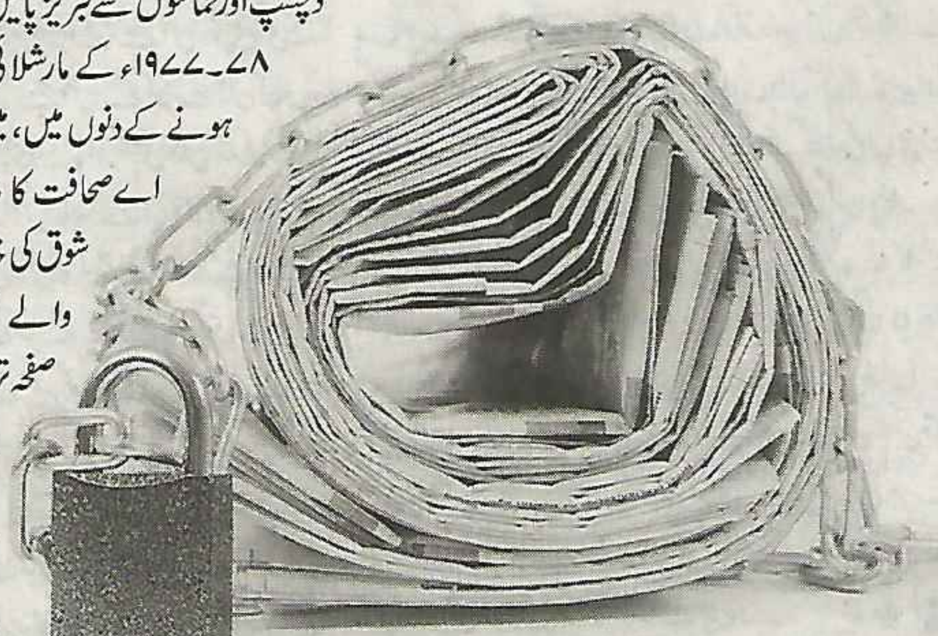
سنسر! یوں بھی ہوتا ہے

لکھنے والے بین السطور یا تکنیکی مہارت سے اپنی بات کہہ جاتے ہیں

افتخار مجاز

یہ گئے دنوں کی باتیں اور بیتے دنوں کا قصہ ہے، ۱۹۷۷ـ۷۸ء جنرل ضیا الحق کا مارشلائی عہد تھا۔ زبان واظہار پر کڑے پہرے اور پابندیاں تھیں، سخت ترین سنسر شپ عائد تھی۔ اخبارات و جرائد، اشاعت سے پہلے جُڑی ہوئی کاپیوں کی صورت میں سنسر کے لیے پیش کیے جاتے تھے۔ متعلّقہ حکام جس خبر، مضمون، کالم، اداریے یا شعری تخلیق پر معترض ہوتے اسے کاپی سے اکھاڑ لیا جاتا اور پھر بقیہ مواد اشاعت کے لیے اجازت پاتا۔ اس صورت میں شائع ہونے والے اخبارات و جرائد اور رسائل جب قارئین کے ہاتھوں میں پہنچتے، تو سنسر کے لیے اکھاڑی گئی خبروں اور مضامین کے مقام سے وہ پرچے خالی ہوتے۔ مجھے یاد پڑتا ہے اور اخبارات و جرائد کی فائلیں شاہد ہیں کہ بعض اخبارات کے آدھے آدھے صفحے خالی اور بلینک ہوتے، بات کسی دوسری طرف نکلنے سے روکنے کے لیے براہِ راست اس واقعے کی طرف آتا ہوں، جسے آپ تک پہنچانے کا بنیادی مقصد صرف یہ بتانا ہے کہ سنسر کی ڈیوٹی پر مامور لوگ بھی بزعم خود عجیب وغریب قسم کے دانشور ہوتے ہیں ان کے سنسر کے لیے قائم کیے گئے معیار اور انداز بھی بڑے ''معرکتہ آرا'' قسم کے ہوتے ہیں۔ ادھر لکھنے والوں کا بھی یہ کمال ہوتا ہے کہ وہ بین السطور یا تکنیکی مہارت کے ساتھ اپنی بات بالآخر کہہ جانے کامیاب ہو کر ان کی آنکھوں میں دھول جھونک ہی جاتے ہیں۔ مگر یہاں میرا موضوع فی الوقت سنسر اور مواد کے نفس مضمون کو پاس فیل کرنے کا اختیار رکھنے والوں کی دانشوری، فہم اور ادراک کا تذکرہ کرنا ہے جسے آپ یقیناً دلچسپ اور حماقتوں سے لبریز پائیں گے۔

۱۹۷۷ـ۷۸ء کے مارشلائی متذکرہ بالا سخت سنسر نافذ ہونے کے دنوں میں، میں پنجاب یونیورسٹی میں ایم اے صحافت کا طالب علم تھا اور محض اپنے شوق کی خاطر لاہور سے شائع ہونے والے ایک روزنامہ میں ادارتی صفحہ ترتیب دیا کرتا تھا۔ پرچے کے ایڈیٹر جناب ظہور عالم شہید تھے جبکہ دیگر سینئر لوگوں میں جناب اکرام رانا، قمر تسکین، عبدالقدیر



نعمانی، م۔ش خالد کاشمیری، نصر اللہ غلزئی وغیرہ شامل تھے۔ یہاں میں ہفتہ میں ایک مرتبہ ادبی صفحہ بھی پیش کیا کرتا تھا۔ ان دنوں ایک مرتبہ صدر جنرل ضیا الحق لاہور تشریف لائے، تو جناب اشفاق احمد (تلقین شاہ) سے ان کی ایک تفصیلی ملاقات ہوئی جس میں جناب اشفاق احمد نے دیگر باتوں کے علاوہ جنرل صاحب کو اپنا یہ مشہور نظریہ بھی پیش کیا کہ اس ملک کو نقصان پڑھے لکھے لوگوں نے پہنچایا ہے اَن پڑھوں نے نہیں۔ مجھے اس نقطہ نظر سے اختلاف تھا، میں نے اپنے ادبی صفحہ میں اس واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے اس پر ایک کالم لکھا اور عنوان باندھا ''ضیاالحق لطیفے سن رہے ہیں'' معمول کے مطابق جب صفحہ مذکورہ اشاعت سے پہلے سنسر کے لیے گیا، تو یہ کالم سنسر کی زد میں آ گیا اور یوں میرا کالم اکھاڑ لیا گیا اور یہ جگہ خالی بلینک شائع ہوئی جس کا مجھے قلق ہوا۔ چناں چہ میں نے آئندہ ہفتے وہی کالم لے آؤٹ اور سرخی تبدیل کر کے دوبارہ ادبی صفحہ کی زینت بنا دیا۔ اس مرتبہ کالم کا عنوان لکھا ''صدر ضیا اور اشفاق احمد کی لطیفہ بازی'' صفحہ مذکورہ اس مرتبہ بھی سنسر کے لیے گیا، تو حسب سابق پھر میرا یہ کالم سنسر کی نذر ہو گیا۔ اب میرا ڈھیٹ پن ملاحظہ کیجیے کہ تیسرے ہفتے میں نے پھر وہی کالم ایک نئی ہیڈ لائن ''صدر ضیا قوم کی فکری راہنمائی کر رہے ہیں'' کے عنوان سے ادبی صفحہ میں شامل کر دیا۔ آپ یقین کیجیے اور ریکارڈ شاہد ہے کہ مذکورہ کالم من و عن شائع ہو گیا۔ اب آپ خود اندازہ لگا لیں کہ لکھنے والوں کا رویہ اور طریقہ کار کیا ہوتا ہے اور سنسر والوں کی دانش وری کیا کیا رنگ دکھاتی ہے۔

مذکورہ بالا طویل قصہ کہانی مجھے دراصل ایک ٹیلی ویژن چینل پر محبِ گرامی عطاالحق قاسمی کی زبان سے ایک واقعہ سن کر یاد آئی۔ قاسمی صاحب نے بتایا کہ انھوں نے عہدِ ضیاالحق ہی میں بکرا عید پر ایک ڈراما ٹیلی ویژن والوں کی درخواست پر لکھا، دوسرے روز ٹیلی ویژن کا پروڈیوسر ان کا لکھا ہوا ڈراما اسکرپٹ واپس لے کر آ گیا کہ یہ On-Air نہیں جا سکتا۔ وجہ پوچھی تو موصوف نے بتایا کہ آپ نے اس میں قربانی کے بکروں کے جس حلیہ کا ذکر کیا ہے اس میں کئی جگہ ذکر ہے کہ بکروں کی سیاہ آنکھیں سرمے سے مامور ہیں۔ صدر ضیاالحق کی آنکھیں بھی سیاہ ہیں اور وہ سرما لگاتے ہیں۔ لہٰذا یہ واضح طور پر پتا چلتا ہے کہ بکروں کی مماثلت ضیاالحق سے قرار دی جا رہی ہے یا یہ تشبیہہ صدر ضیا کی طرف واضح اشارہ دیتی ہے۔ عطاالحق قاسمی بتاتے ہیں کہ مذکورہ تحریر لکھتے ہوئے واقعتاً مجھے احساس نہیں تھا کہ میری یہ تحریر ضیاالحق کے حوالے سے ہے، مگر جب میں نے مسترد شدہ ڈراما کی جگہ نیا ڈراما لکھ کر دیا، تو اس میں ضیائی عہد کے حوالے سے کئی چیزیں پہلو اور معاملات سوچ سمجھ ارادتاً ضیائی عہد کے حوالے سے لکھے۔ مثلاً ایک جگہ پر تحریر تھا کہ ایک صاحب بکرا منڈی عید قربان پر بکرا لینے جاتے ہیں ایک بیوپاری انھیں ایک بہت ہی دبلا، پتلا، کمزور نحیف اور مریل سا دنبہ دکھاتا ہے اس پر خریدار بیوپاری سے پوچھتا ہے کیا یہ اصلی دنبہ ہے یا تم نے اسے مار مار کر دنبہ بنا دیا ہے۔ عطا کہتے ہیں یہ واضح طور پر ان دنوں پیپلز پارٹی کے کارکنوں پر ہونے والے بے پناہ تشدد کے حوالے سے میرا جملہ تھا، مگر ٹیلی ویژن کے مذکورہ دانشور پروڈیوسر اور دیگر جملہ متعلقین کے سر کے اوپر سے گزر گیا اور ڈراما نشر ہو جانے کے بعد کئی لوگوں نے مجھے اس جملے، فقرے اور منظر نامہ لکھنے کی داد دی، مگر سمجھ نہیں آئی، تو ٹیلی ویژن کے بزعم خود دانشوروں کو!

مذکورہ پروگرام ہی میں اس حوالے سے دانشور، شاعر اور کمپیئر اعزاز احمد آذر (مرحوم) نے ایک دلچسپ واقعہ سنایا، کہنے لگے ایک ٹیلی ویژن چینل پر ہلکی پھلکی، دلچسپ گفتگو پر مبنی ایک پروگرام ریکارڈ ہوا۔ جس میں عطاالحق قاسمی، امجد اسلام امجد اور اصغر ندیم سید جیسے دانشور شریک تھے۔ بات چلتے چلتے سکھوں کی ظرافت اور حماقتوں کی طرف جا نکلی، چناں چہ ایسے

میں، میں نے ایک سکھ کا یہ دلچسپ لطیفہ سنایا، اب باقی بات ان کی زبانی ملاحظہ کیجیے۔

سکھ سردار نے دعویٰ کر دیا کہ وہ خدا ہو گیا ہے، لوگوں نے اسے بہت سمجھایا کہ ایسی بات نہیں کرتے مگر سکھ کا اصرار تھا کہ وہ خدا ہے وہ رب ہے اور وہ اپنے رب ہونے کے حق میں دلیل اور گواہ بھی پیش کر سکتا ہے۔ مگر لوگوں نے اسے بہت مارا اس کے باوجود اس کا اصرار جاری رہا کہ وہ رب ہے، وہ خدا ہے اور وہ اپنے سچا ہونے کی گواہی بھی پیش کر سکتا ہے۔ بات بہت بڑھ گئی، تو کسی سیانے نے لوگوں کو مشورہ دیا چلو اس کی پوری بات سن تو لیں اور دیکھیں یہ کون سی گواہی اور دلیل پیش کرتا ہے۔ لوگ اس امر پر آمادہ ہوئے تو سکھ خوش ہو گیا اور کہنے لگا آؤ میرے ساتھ، چناں چہ وہ آگے آگے چل پڑا اور لوگوں کا ہجوم اس کے پیچھے پیچھے جلوس کی صورت، کبھی وہ ایک بازار سے گزرتا اور دوسرے کوچے میں داخل ہو جاتا، دوسرے کوچے سے وہ تیسرے محلے اور پھر لوگوں کو گلیوں گلیوں لے کر پھرتا پھرتا ایک تنگ و تاریک، خستہ حال گندی مندی گلی میں پہنچا، اس کے پیچھے آنے والوں کا برا حال اور تجسّس بہت بڑھ چکا تھا۔ یہاں آکر وہ رکا، پیچھے مڑ کر دیکھا اور ہجوم سے مخاطب ہو کر بولا بھائیو خبردار، دھیان سے سننا، کان کھول لو اور متوجہ ہو جاؤ۔ یہ کہہ کر اس نے بند گلی کا آخری دروازہ جس پر ٹاٹ کا پردہ پڑا ہوا تھا زور زور سے کھٹکھٹایا اور بغیر انتظار و توقف کیے مسلسل دستک دیتا ہی چلا گیا۔ دروازے پر اس کی دستک جاری تھی کہ دفعتاً دروازے کے دونوں پٹ اندر کی طرف کھلے اور حیرت زدہ چہرے اور غصے کے عالم میں دروازہ کھولنے والی ۷۰ سالہ اماں نے سردار کو مخاطب کرتے ہوئے کہا ''ہائے! ہائے! اور ربّا توں فیر آ گیا ایں'' (ہائے! ہائے! ربا، تم پھر آگئے ہو)

مائی کا یہ جملہ سن کر وہ سردار پھر ہجوم کی طرف پلٹا اور بولا، اب تو آپ کو یقین آ گیا ہے ناں......

آذر صاحب بتاتے ہیں کہ سردار جی کے اس فہم و ادراک اور ذہنی کیفیت کے بیان پر سب موجود اہلِ دانش ور لوٹ پوٹ ہو گئے، مگر پروگرام کے دانشور، پروڈیوسر یا متعلقہ ''سنسر کنندگان'' نے اس دلچسپ قصے، واقعے یا لطیفے کو کانٹ چھانٹ (Editing) کی نذر کر دیا۔ حالانکہ اس پروگرام کا فارمیٹ اور مقصد ہی تفریح طبع اور دلچسپ و مزیدار واقعات کا بیان و گپ شپ تھا۔

اب اسی پروگرام کا ایک اور قابل توجہ پہلو بھی دیکھیں جو متعلّقہ دانشوروں کی نظروں اور فہم سے اوجھل رہا، راوی بتاتا ہے کہ دانشور ڈاکٹر مہدی حسن نے بتایا کہ ان دنوں جہاں وہ پڑھاتے تھے وہاں انگریزی میڈیم بچے ہوتے تھے۔ ہم نے ایم اے کی سطح کے طالب علموں کا اردو زبان سے شغف دلچسپی اور معیار دیکھنے کے لیے انھیں چند محاورے دیے کہ وہ ان کا اردو زبان میں فقروں میں استعمال کریں۔ انھوں نے جو تین محاورے بتائے ان میں سے ایک محاورہ غم غلط کرنا بھی تھا۔ مہدی صاحب نے بتایا کہ ایک طالب علم نے لکھا ''فاطمہ یونیورسٹی کے تمام لڑکوں کا غم غلط کر دیتی ہے۔'' اب ملاحظہ فرمائیے سنسر اتھارٹی کا کمال کہ جس بات، فقرے یا لفظ کو سنسر یا Edit کرنا چاہیے تھا وہ تو آن ایئر چلا گیا اور جو دلچسپ مزیدار اور لطف اندوز ہونے والی بات یا لطیفہ تھا وہ سنسر کی نذر ہو گیا۔ غالباً اسے ہی تو کہتے ہیں۔

جو چاہے آپ کا حسن کرشمہ ساز کرے۔

اور حرفِ آخر کے طور پر یہ کہ ان سارے واقعات کا تعلّق اُس باکمال ادارے سے ہے جسے پاکستان ٹیلی ویژن کہتے ہیں اور یہیں ہم نے ۳۲ برس سے زائد کا عرصہ ملازمت ایسے ایسے نابغہ روزگار دانشوروں، پروڈیوسروں کی رفاقت میں گزارا ہے۔

انا للّٰہ و انا الیہ راجعون

ہمارے حوصلے دیکھو ہم ایسے گھر میں رہتے ہیں۔



مریض دل کا علاج

دل کے مریض سے یوں کہتا تھا اک معالج
گولی یہ دردِ دل کی ہر روز لیجیے گا
روغن سے اور نمک سے ہے احتیاط لازم
"ٹی وی نیوز" سے بھی پرہیز کیجیے گا

با اصول اسپیشلسٹ

دیتا نہیں ہے مفت کسی کو وہ مشورہ
محتاط ہو کے اس سے ذرا بات کیجیے
وہ ڈاکٹر تو گھر میں بھی کچھ گفتگو کے بعد
بیوی سے کہہ رہا ہے "میری فیس دیجیے"

آشوب چشم

دنیا والو ظاہر کی اس خوبی میں
ممکن ہے عیبوں کی پردہ داری ہو
لوگ جسے آنکھوں کی مستی کہتے ہیں
ممکن ہے ذرا آنکھوں کی بیماری ہو

ڈائٹنگ

پچپن برس کے بعد بھی پتلی سی ہے کمر
اور تنگ اس کا کوئی لبادہ نہیں ہوا
حیرت ہے عاشقوں کے کلیجے چبا کے بھی
اس کا کولیسٹرول زیادہ نہیں ہوا

ماڈلنگ

فن کے چکر میں دخترانِ پاک
آج کل ماڈلنگ بھی کرتی ہیں
اور موقعہ ملے تو چپکے سے
یہ منی لانڈرنگ بھی کرتی ہیں

عدم برداشت

اب ختم ہوئی ہیں تحمل مزاجیاں
دنگا فساد قوم کی پہچان ہو گیا
ہم نے جسے بھی پیش کیا دستِ دوستی
وہ شخص ہم سے دست و گریبان ہو گیا

قصائی

کیوں عید پر تلاش اسے کر رہے ہو تم
اور یہ بھی دے رہے دہائی، نہیں ملا
حکام کھال کھینچ رہے ہیں عوام کی
تم پھر بھی کہہ رہے قصائی نہیں ملا

گھوسٹ اسکول

تعلیم کے گلشن میں سب پھول ہیں کاغذ کے
اب صید بھی جعلی ہے، صیاد بھی جعلی ہے
بچوں کو بھلا کیسے تعلیم ملے اصلی!
اسکول بھی جعلی ہے، استاد بھی جعلی ہے

یو۔این۔سیکیورٹی کونسل

یہ پنچائت گلوبل گاؤں کی ہے
لگا ہے جس پہ یو این او کا جھنڈا
یہاں انصاف ملتا ہے اسی کو
ہے جس کے ہاتھ میں "ویٹو" کا ڈنڈا

گلوبل وارمنگ

گلوبل وارمنگ سے پانیوں میں
حرارت اتنی ہائی مل سکے گی
سمندر کا وہ ہو گا ٹمپریچر
ہمیں مچھلی فرائی مل سکے گی

قرضِ حسنہ

آئی ایم ایف کے جال میں لیڈر
اس طرح مسکرا کے پھنستے ہیں
اربوں ڈالر کے قرض کو گویا
قرضِ حسنہ سمجھ کے ہنستے ہیں

رزقِ حلال

اہلِ فن پڑ گئے ہیں چکر میں
جن کے کسب کمال پر ہے ٹیکس
مالِ رشوت پہ کچھ نہیں لگتا
صرف رزقِ حلال پر ہے ٹیکس

سیل فون

اس زمانے میں لڑکیاں لڑکے
عشق سیل فون پر لڑاتے ہیں
پہلے یہ دل سے دل ملاتے تھے
ان دنوں سم سے سم ملاتے ہیں

بیوٹی پارلر

بیوٹی پارلر جانے سے پہلے
وہ اک معصوم بڑھیا لگ رہی تھی
مگر میک اپ کرا کے جب وہ نکلی
تو پھر آفت کی پُڑیا لگ رہی تھی

بڑھاپا

جوانی میں کبھی سوچا نہ تھا ہم نے بڑھاپے کا
مگر اب دور پیری میں جوانی یاد آتی ہے
کبھی ہم یاد کرتے ہی نہ تھے اپنے بزرگوں کو
مگر اب بن گئے دادا تو نانی یاد آتی ہے



میاں محمد شوکت

ماضی گم گشتہ کا روشن چراغ

کچھ ایسے بھی اٹھ جائیں گے اس بزم سے جن کو
تم ڈھونڈنے نکلو گے مگر پا نہ سکو گے

نصیر احمد سلیمی

زمانہ طالب علمی میں بھی اور بعدازاں صحافتی زندگی میں بھی مجھے ایسی بے شمار مایۂ ناز شخصیات سے نہ صرف نیاز وملاقات کا شرف حاصل رہا ہے بلکہ انہیں قریب سے دیکھنے اور جاننے کا موقع بھی ملا ہے۔ یہ تمام شخصیات اپنے علم وفضل کے اعتبار سے اور اپنے شخصی اوصاف اور اخلاق وکردار میں اپنے ہم عصروں میں منفرد اور ممتاز تھیں۔ اپنے اُصولوں اور نظریات پر سختی سے کاربند بھی تھیں اور اپنے مخالف نقطۂ نظر کے لوگوں سے سماجی اور معاشرتی تعلّقات بھی مثالی تھے۔ وہ دل آزاری کے بجائے دلوں کو جوڑنے اور دلیل سے بات کرنے کے اور دوسرے کا نقطۂ نظر تحمل سے سننے کے عادی تھے۔ گفتگو اور مکالمے میں شائستہ لب ولہجہ اور حفظِ مراتب کا خیال رکھنا اُن کا وتیرہ تھا۔ ایسی شخصیات کا تعلق ہر حلقے اور ہر شعبۂ زندگی سے تھا، جن کے کردار وعمل کا تصوّر آج بھی میرے خیال اور عمل کو راستی کی دعوت دیتا رہتا ہے۔ بلکہ اگر میں یہ کہوں کہ ان شخصیات کے عالمِ بالا کی سمت کوچ کر جانے کے باوجود میں ان شخصیات کے فکر وعمل کے سحر میں گرفتار ہوں تو بے جا نہ ہوگا۔ ان ہی شخصیات میں سے ایک شخصیت میاں محمد شوکت مرحوم کی تھی، جن کی یاد ہر لحظہ میرے قلب کو اخلاص عمل اور کردار کو اعتدال وتوازن کا درس دیتی رہتی ہے۔ اُن کو خدا نے علم سے شغف بھی دیا تھا اور اہلِ علم سے استفادہ کی صلاحیت واہلیت بھی دی تھی، جن کی اصابت رائے اور فہم وفراست کے قائل ان کے نقطۂ نظر کے مخالف بھی تھے۔ اُنہوں نے اپنی ساری زندگی اپنے مقصدِ حیات کے لیے وقف کر دی تھی۔ جو اپنی ذات میں سراپا خیر تھے اور جو کسی زبان، نسل، مسلک ومذہب اور سیاسی نظریات کے امتیاز کے بغیر سب ہی کے لیے ایثار کیش تھے۔ جن کا واحد مقصدِ حیات اللہ کی بندگی اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت اور اس کی تعلیمات کی طرف لوگوں کو بلانا تھا اور خلق خدا کی بے لوث خدمت میں لگے رہنا تھا۔ خدا نے میاں صاحب کی شخصیت میں علمی، مذہبی، اخلاقی اور انتظامی صلاحیتیں باہم آمیز ویکجان کر دی تھیں۔ وہ اپنے ہم عصروں میں بلکہ اپنے عہد اور آنے والے زمانوں میں بھی منفرد اور یادگار رہیں گے۔ خدا نے ان کی شخصیت میں بہ یک وقت بہت سی خوبیاں اور اوصاف جمع کر دیے تھے۔ خدا کی زمین خیر اور اہل خیر سے تو کبھی خالی نہیں رہتی۔ مگر فی زمانہ ایسی خوبیوں اور اوصاف کے لوگ کم کم ہی ہوتے ہیں، وہ صاحب علم وفضل بھی تھے اور بے داغ سیرت وکردار کے مالک بھی۔ خدا نے ان کو دوسروں کی غیبت اور عیب جوئی سے بھی محفوظ رکھا تھا۔ سیاسی اور سماجی کاموں میں اہم کردار کے باوجود شہرت ونام ونمود کی خواہش کے جذبے سے بے فکر اور بے نیاز تھے۔ مطالعہ کی وسعت نے ان کی فکر ونظر میں اعتدال و

توازن پیدا کیا تھا، تقریر و تحریر دونوں میں ہی ملکہ تھا۔ البتہ تحریر کی طرف توجہ بہت تاخیر سے دی۔ اگر شروع ہی سے اس طرف متوجہ رہتے تو وہ ان کے سیاسی کام کے مقابلے میں زیادہ وقیع ہوتا۔ تاریخ عالم اور تاریخِ اسلام پر ان کی گہری نظر تھی۔ قرآن و حدیث، سیرت طیبہ کا مطالعہ بہت گہرا تھا اور اس کے مطالب و معانی سمجھنے کے لیے عربی زبان بھی سیکھی اور عربی لغت سے استفادہ کرنے کی استعداد بھی پیدا کی۔ اور جدید و قدیم مفسّرین کی تفاسیر کا عرق ریزی کے ساتھ مطالعہ بھی کیا۔ انہیں مطالعے کا شوق اسکول کے زمانے سے تھا۔ اپنے اسکول میں ذہین ترین طالب علم کی شہرت رکھتے تھے۔ ہر کلاس میں اوّل درجے میں پاس ہوتے، میٹرک کا امتحان فرسٹ کلاس فرسٹ ڈویژن میں پاس کیا تھا۔ ساتھ ہی غیر نصابی سرگرمیوں اور کھیلوں کے مقابلے میں ممتاز پوزیشن حاصل کرتے تھے۔ کبڈی کے کھیل میں خصوصی دلچسپی تھی اور اس میں اپنے علاقے کے نامی گرامی پہلوان کی سی شہرت حاصل کی تھی۔ کھلی فضا اور کھلے میدان میں لمبی سیر اور ورزش پابندی کے ساتھ کرنے کی عادت بچپن ہی سے تھی۔ جس کی وجہ سے جسامت جاذب نظر اور صحت قابلِ رشک تھی۔ دراز قد، چھریرا بدن، آنکھوں میں چمک تھی، لبوں پر مسکراہٹ، شلوار قمیص اور سر پر جناح کیپ مستقل پہناوا تھا۔

۱۹۲۱ء میں سرہند شریف میں 'بسّی' شہر میں پیدا ہوئے، جو ریاست پٹیالہ کا ضلعی صدر مقام تھا۔ 'بسّی' کے بارے میں پروفیسر گوہر صدیقی کا کہنا ہے کہ اس بستی کو حضرت مجدد الف ثانیؒ کی سرہند میں آمد پر ان لوگوں نے بسایا تھا جو ان کے ساتھ آئے تھے اور مستقل سکونت حضرت مجدد الف ثانیؒ کی قربت میں چاہتے تھے۔ ابتدا میں یہ خالص مسلمانوں کی بستی تھی۔ بعد میں کچھ غیر مسلم بھی آباد ہو گئے تھے۔ تاہم ۱۹۴۷ء تک یہ مسلم اکثریتی شہر رہا۔ ۱۹۴۷ء میں قیامِ پاکستان کے بعد یہاں کے مسلمانوں پر قیامت صغرا ٹوٹی اور وہ اگست سے اکتوبر تک تین ماہ ہندوؤں اور سکھوں کے محاصرے اور نرغے میں اس طرح رہے کہ سامنے لاشوں کے ڈھیر تھے اور چاروں طرف آگ کے الاؤ اور کشت و خون سے کٹے پٹے مسلمان خود میاں محمد شوکت کی پہلی اہلیہ اور ان سے اکلوتی اولاد نومولود بیٹا بھی شہید ہوا۔ میاں محمد شوکت کی اہلیہ اپنے میکے جو شہر کے مضافات میں 'میاں رسول نگر' نامی گاؤں میں تھا، گئیں ہوئی تھیں، میاں شوکت کی اہلیہ کے والد علاقے کے بااثر زمیندار بھی تھے اور ان کا ایران میں وسیع کاروبار بھی تھا۔ انہوں نے بلوائیوں کو پیشکش کی کہ اگر وہ پورے گاؤں کو جو پانچ ہزار نفوس پر مشتمل تھا (یہ سب کے سب میاں محمد شوکت صاحب کے سسر کے قرابت دار تھے) باحفاظت نکال دیں تو وہ اپنی ساری جائداد اور سارے گھروں کا قبضہ دیگر یہاں سے جانے کو تیار ہیں۔ بلوائیوں نے یہ شرط منظور کرلی اور ان سب کو اپنے علاقے سے باحفاظت نکلنے دیا، مگر عیاری یہ کی کہ ان کے گاؤں سے نکلتے ہی اگلے مقام پر بلوائیوں کو اس کی اطلاع کردی کہ اس قافلے کے پاس زیور، نقدی اور دیگر قیمتی سامان ہے۔ جنہوں نے اس پورے کے پورے قافلے کو جنگل میں گھیر کر لوٹنے کے بعد تہ تیغ بھی کر دیا۔ ان پانچ ہزار نفوس میں سے ایک بھی زندہ نہیں بچ سکا تھا۔ ان اندوہناک اور المناک سانحات سے گزرنے کے بعد جو مسلمان سرہند شریف سے پاکستان کی سرحد میں داخل ہو سکے۔ وہ داخل ہوتے ہی سجدہ ریز ہو گئے تھے۔ (پاکستان کے لیے ہجرت میں اتنے دُکھ اُٹھانے والے خاندان کو حیدر آباد میں ۱۹۸۵ء میں زبان کی بنیاد پر غیر مہاجر قرار دیا گیا)۔

میاں محمد شوکت کے دادا میاں الٰہی بخش تحریک خلافت کے اپنے علاقے میں بڑے سرگرم اور فعال کارکن تھے۔ ۱۹۲۱ء تحریکِ خلافت کے عروج کا زمانہ تھا۔ ۱۹۲۱ء میں جس دن میاں محمد شوکت کی پیدائش ہوئی، اسی دن علی برادران اپنی والدہ محترمہ بی اماں کے ساتھ 'بسّی' میں جلسۂ عام سے خطاب کرنے آئے تھے۔ جلسے کے منتظمین میں میاں شوکت کے دادا بھی پیش پیش تھے، پورے شہر کو دلہن کی طرح سجایا گیا تھا۔ جلسے کا اہتمام میاں

شوکت کے گھر کے بالکل سامنے بہت بڑے کھلے میدان میں کیا گیا تھا۔ جلسہ سننے خلقت امڈ آئی تھی۔ جلسے کی کامیابی کی خوشی سے سرشار دادا گھر لوٹے تو پوتے کی نوید سے نہال ہوگئے اور پوتے کا نام علی برادران کے نام پر شوکت علی تجویز کردیا جسے خاندان کے سارے افراد نے پسند کیا۔ تین سال بعد ۱۹۲۴ء میں پیدا ہونے والے پوتے کا نام محمد علی رکھا۔ میاں محمد شوکت کے چھوٹے بھائی میاں محمد علی صاحب کو بھی اللہ تعالیٰ نے بڑی صلاحیتوں اور اعلیٰ شخصی اوصاف سے نوازا ہے۔ خدا انہیں صحت و تندرستی کے ساتھ سلامت رکھے۔ بڑی باغ و بہار شخصیت ہیں۔ ۹۰ سال سے اوپر کی عمر ہے، جب بھی ملے مزاج میں شگفتگی بھی وہی اور والہانہ محبّت سے ملنے کا انداز بھی وہی ہے۔ اس عمر میں بھی مربوط گفتگو کرتے ہیں۔ اس ناچیز کو انھوں نے ہمیشہ اپنی محبّت سے بھائی اور بچوں کی طرح نوازا، خوشی و غمی میں شریک کیا اور سب سے زیادہ کرم یہ کیا کہ میری درخواست پر میاں محمد شوکت کی بڑی بیٹی طاہرہ خورشید کا رشتہ جناب مجیب الرحمٰن شامی سے طے کرانے میں اہم کردار ادا کیا۔ میاں محمد علی صاحب سے تو پہلے ہی میرے گھریلو تعلّقات تھے۔ اس رشتے نے مجھے میاں شوکت صاحب کے گھر کی طرح کا فرد بنا دیا۔

میں نے میاں محمد شوکت کا نام اخبارات میں ۱۹۶۳ء میں پڑھا تھا، لیکن دیکھا مادرِ ملت محترمہ فاطمہ جناح کی صدارتی انتخابی مہم میں ۱۹۶۴ء میں۔ ان سے پہلی ملاقات اور تعارف جناب الطاف حسن قریشی کے ساتھ ۱۹۶۷ء میں ہوا۔ حیدرآباد میں ہونے والے اسلامی جمعیت طلبہ کے سالانہ اجتماع کے اختتام پر نہایت قریب سے دیکھنے اور جاننے کا موقع ملا۔ ۱۹۷۳ء میں شامی صاحب کے رشتے کے سلسلے میں میرا کراچی سے حیدرآباد کئی بار آنا جانا ہوا۔ اس رشتے کے سلسلے میں کراچی سے حیدرآباد جاتا تو ملاقات رہتی۔ ۱۹۹۷ء۔۱۹۹۸ء میں ان کی شدید بیماری کے دوران مجھے اُن کے زیادہ قریب رہنے کے مواقع ملے، جس میں ان کے شخصی اوصاف کے وہ گوشے بھی مجھ پر منکشف ہوئے جس سے میں پہلے واقف نہیں تھا۔ ہر حال میں خدا کی مشیّت پر راضی بہ رضا رہنے والے صابر و شاکر، لوگ کم ہی ہوتے ہیں۔ میاں صاحب کے خاندان کا آبائی پیشہ تو زراعت تھا۔ دادا کی بھی زرعی اراضی تھی جو خود کاشت نہیں کرتے تھے، بلکہ 'بٹائی' (ٹھیکے) پر دے رکھی تھی، خود عمارتی لکڑی کی تجارت کرتے تھے۔ جنگلات خرید کر کٹوانے کے بعد فروخت کیا کرتے تھے۔ ان کے بعد والد میاں اللہ بخش نے بار برداری کا کاروبار کیا، جس کے لیے بیلوں سے چلنے والی بڑی بڑی گاڑیاں بنوا رکھی تھیں جو شہر کے ۵۰ میل کے علاقے میں سامان کے نقل و حمل کا کام کرتی تھیں۔

میاں شوکت صاحب کے ایک بڑے بھائی خدا بخش تھے جن کی شہر میں دکان تھی۔ میاں شوکت اور میاں محمد علی کی تعلیم کے دوران ہی وہ شدید بیمار ہوگئے۔ چار سال کی شدید علالت میں ان کی والدہ نے اپنے بڑے بیٹے کے علاج معالجے پر گھر کی ہر چیز اور ساری جمع پونجی خرچ کردی، مگر وہ بچ نہ پائے، لہٰذا گھر میں معاشی تنگ دستی کی چادر تن گئی۔ نامساعد حالات میں بھی والدہ نے انتہائی سمجھداری، سلیقہ مندی اور کفایت شعاری سے گھر کا بھرم کھلنے نہیں دیا۔

میاں محمد شوکت کو کسی سفارش و تعلّق کے بغیر نارتھ ویسٹرن ریلوے میں ٹرین ایگزامینر کی اچھی ملازمت مل گئی۔ پہلی پوسٹنگ کوٹری جنکشن سندھ میں ہوئی۔ میاں صاحب کا خاندان علمائے دیوبند کا پیروکار تھا۔ ہندوستان میں چلنے والی آزادی کی تحریکوں سے اُن کو بھی دلچسپی تھی، مولانا ابوالکلام آزاد کی تحریروں کے شیدائی اور علامہ اقبال کے عاشق تھے۔ ۱۹۱۲ء سے نکلنے والے 'الہلال' کے تمام شمارے تلاش کر کے پڑھتے تھے۔ مولانا روم کی مثنوی اور علامہ اقبال کا فارسی کلام پڑھنے اور سمجھنے کے لیے باقاعدہ فارسی پڑھی تھی۔ ان کے چھوٹے بھائی میاں محمد علی کا کہنا ہے کہ علامہ اقبال کا فارسی اور اُردو کے سارے کلام کا مطالعہ بڑی گہرائی کے ساتھ کرتے

تھے اور بار بار کرتے تھے۔ میاں محمد علی کے مطابق ایک موقع پر وہ مولانا حسین احمد مدنیؒ سے باقاعدہ بیعت بھی ہوئے تھے جو کئی سال رہی۔ انگریز کی غلامی سے آزادی کی تڑپ بھی دل میں موجود تھی۔ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کی فکر کے اسیر ہوئے تو سرکار کی نوکری کو حرام سمجھتے ہوئے جلد ہی ریلوے کی نوکری سے مستعفی ہو کر واپس 'بستی' آگئے اور اپنی ہی مادرِ علمی میں تاریخ اور جغرافیہ کے استاد ہو گئے۔ ذاتی محنت اور سینئر اساتذہ کی راہنمائی اور حوصلہ افزائی سے اسکول ہی نہیں، بلکہ پورے علاقے میں مقبول استاد کے طور مشہور ہو گئے۔ قیامِ پاکستان تک استاد کی حیثیت ہی سے کام کیا۔ ہجرت کے بعد کچھ عرصے لالہ موسیٰ میں قیام کیا۔ پھر دونوں بھائی سکھر منتقل ہو گئے۔ وہاں سے میاں شوکت صاحب ۱۹۵۰ء میں حیدر آباد آگئے۔ درمیان میں مختصر عرصہ سعید آباد میں بھی رہے۔

حیدر آباد میں سیاسی اور سماجی مصروفیات کے ساتھ ملازمت بھی کی اور ذاتی کام بھی کیے۔ کوئٹہ میں اپنے اسکول کے ہم جماعت اور جگری دوست شیخ کریم اللہ کی شراکت میں کان کنی کا کاروبار کیا۔ حیدر آباد میں معروف محقق دانشور (صدر شعبۂ اُردو، سندھ یونیورسٹی) ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان (مرحوم و مغفور) سے بہت ہی قریبی تعلق رہا۔ ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان نے ہی ان کی پہلی تصنیف 'آویزشِ خیر و شر' کا مقدمہ لکھا تھا جس میں وہ لکھتے ہیں "عالی جناب محترم محمد شوکت میرے قدیم کرم فرما ہیں۔ سرہند شریف سے ان کا تعلق ہے۔ اس لیے حق گوئی، بے باکی اور قومی ہمدردی ان کے مزاج کی خصوصیات ہیں۔ پُر جوش و جذبہ اور ولولہ بھی وہیں کا فیض ہے۔ چناں چہ اس جذبے کے تحت محترم نے 'آویزشِ خیر و شر' (مسلمانوں کی قدیم و جدید تاریخ کے آئینے میں) مرتب فرمائی ہے۔ اور 'ابتدائیہ' علامہ اقبال کے اس شعر سے کیا ہے:

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
چراغِ مصطفویؐ سے شرارِ بولہبی

گویا پوری کتاب اس شعر کی تفصیل ہے۔ انبیا علیہم السّلام، صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین، پھر بزرگانِ دین، سب اسی شرارِ بولہبی کے شر کو دُور کرتے رہے اور اب اس شر کو دُور کرنے کی ضرورت پر محترم نے زور دیا ہے۔ خلافت بنواُمیہ، خلافت عباسیہ، نور الدین زنگی، صلاح الدین ایوبی، اندلس، صقلیہ (سسلی)، بوسنیا، سربیا کے معاملات سے لے کر ہندوستان اور خطۂ کشمیر سے متعلق تمام سیاسی حالات اسی خیر و شر کی آویزش کی داستان ہیں۔ ہم اب بھی ماضی سے سبق نہیں لینا چاہتے اور ہمارے بعض لیڈر آج بھی 'بکاؤ مال' بنے ہوئے ہیں۔ محترم محمد شوکت صاحب نے بڑی بے باکی کے ساتھ ان معاملات کا تجزیہ کیا ہے اور جگہ جگہ علامہ اقبال اور مولانا حالی وغیرہ کے اشعار سے بھی اس تجزیے کی تائید کی ہے۔ گویا اقوامِ عالم کی تاریخ کو آپ نے نہ صرف دیکھا ہے بلکہ پرکھا ہے۔ مبارک ہیں وہ ہستیاں جو اس دور میں بھی حق گوئی کو اپنا شعار بنائے ہوئے ہیں اور صرف اللہ کے لیے کھل کر خیر کی تائید کر رہی ہیں۔ بقول اقبال:

بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق
عقل ہے محوِ تماشائے لبِ بام ابھی

یہ کتاب کالجوں اور یونی ورسٹیوں میں داخلِ نصاب ہونے کے لائق ہے۔ میری دلی دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمارے محترم کو اجرِ عظیم عطا فرمائے اور مزید علمی اور تحقیقی کاموں کے لیے ان کی بے باکی کو قائم و دائم رکھے۔ آمین۔"

میاں محمد شوکت جماعتِ اسلامی کے قافلے کے اوّلین لوگوں میں شامل تھے۔ قیامِ پاکستان سے قبل ہی دونوں بھائی جماعت اسلامی کے رکن بن گئے تھے۔ ۱۹۴۶ء میں بہار میں مسلمانوں کے خلاف ہونے والے فسادات کے بعد وہاں کے مسلمانوں کی ریلیف کے لیے جانے والی جماعت اسلامی کے رضا کاروں کی ٹیم میں شامل تھے۔ قیامِ پاکستان کے بعد ۱۹۵۰ء سے ۱۹۵۳ء تک سکھر کے امیر رہے اور ۱۹۵۴ء سے لے کر نوّے

کی دہائی تک حیدر آباد شہر کے اور امیر ضلع رہے۔ ۱۹۷۴ء سے لے کر ۱۹۸۴ء تک دس سال صوبہ سندھ کے جنرل سیکرٹری رہے۔ ۱۹۵۸ء سے لے کر ۱۹۹۴ء تک چالیس سال مرکزی مجلس شوریٰ اور مجلس عاملہ کے تواتر کے ساتھ رکن منتخب ہوتے رہے۔ ۱۹۹۴ء میں انہوں نے از خود جماعتِ اسلامی حیدر آباد کے ارکان سے درخواست کی تھی کہ انہیں مرکزی مجلس شوریٰ کے لیے منتخب نہ کیا جائے۔ حیدر آباد شہر میں جماعت اسلامی کی شناخت بنانے میں مولانا سید وصی مظہر ندوی (مرحوم) جو خود ایک بڑی علمی شخصیت اور انتظامی صلاحیتوں کے مالک تھے اور میاں محمد شوکت کی مساعیٔ جمیلہ کا بنیادی کردار رہے۔

مولانا سید وصی مظہر ندوی تو ستّر کی دہائی میں جماعت اسلامی چھوڑ گئے تھے۔ ۱۹۷۹ میں حیدر آباد شہر کے میئر منتخب ہوئے اور ۱۹۸۰ء کی دہائی میں مہاجر سیاست سے متاثر ہو گئے تھے۔ ۱۹۸۵ کے غیر جماعتی انتخاب میں رکن قومی اسمبلی منتخب ہوئے۔ محمد خان جونیجو وزیر اعظم پاکستان کی قیادت میں مسلم لیگ کی پارلیمانی پارٹی میں شامل ہو گئے۔ جونیجو صاحب کی برطرفی کے بعد نگران کابینہ میں وزیر مذہبی امور بنے۔ ۱۹۸۸ کے الیکشن میں ایم کیو ایم کے آفتاب احمد شیخ کے مقابلے میں ہار گئے۔ بعد ازاں اپنے بچوں کے پاس کینیڈا شفٹ ہو گئے، وہیں ان کا انتقال ہوا۔ میاں محمد شوکت نے جماعت اسلامی کے تیسرے امیر قاضی حسین احمد کی پالیسیوں سے جماعت اسلامی کے دستور کے تحت متعلّقہ فورم یعنی مجلس شوریٰ اور اجتماعِ ارکان میں شدید اختلاف بھی کیا اور کھل کر تنقید بھی کی۔ میں کبھی جماعت اسلامی کا کارکن یا رکن نہیں رہا، البتہ اسلامی جمعیت طلبہ کا کارکن اور رکن ضرور رہا، اس پر فخر ہے اس لیے وہاں ہونے والی تنقید کا پورا علم تو نہیں ہے، مگر یہ علم ہے کہ جب کبھی جماعت اسلامی سے باہر کے دوست اُن کو جماعت کو خیر باد کہنے کا مشورہ دیتے تو میاں شوکت کا جواب ہوتا تھا ”جب مجھے جماعت کے دستوری فورم پر اپنی بات کہنے کا موقع حاصل ہے، لوگ میری بات سنتے ہیں اور مجھے بولنے سے روکا نہیں جاتا تو مجھے جماعت چھوڑنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے“۔ قاضی حسین احمد کی پالیسیوں کی وجہ سے انہوں نے ۱۹۹۰ء میں جماعت اسلامی کی مرکزی مجلس شوریٰ سے استعفا بھی دے دیا تھا، مگر ارکان جماعت نے انہیں دوبارہ شوریٰ کا رکن منتخب کر لیا تھا۔ جب ۱۹۹۴ء میں شوریٰ کے لیے دوبارہ انتخاب کا وقت آیا تو انہوں نے خود ہی معذرت کر لی تھی۔ جماعت اسلامی کے آخری سانس تک رکن رہے۔ میاں محمد شوکت میں اتنی اخلاقی جرأت بھی تھی اور علمی قابلیت بھی کہ اُن کو مولانا مودودیؒ کی رائے سے جہاں اختلاف محسوس ہوا، انہوں نے اختلاف کرنے میں کوئی تامل نہیں کیا۔

میاں محمد شوکت صاحب کو سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کی قرآن پاک کی معرکۃ الآرا تفسیر ’تفہیم القرآن‘ کی آخری جلد میں ’معوذتین‘ کی تفسیر اور تفہیم سے اختلاف ہوا تو اس پر اپنی بے لاگ رائے کا اظہار کیا اور یہ اختلاف جماعت اسلامی کے سرکاری ترجمان ہفت روزہ ’ایشیا‘ لاہور میں شائع بھی کرایا۔ مولانا مودودیؒ سے مذکورہ اختلاف کے باوجود میاں محمد شوکت کی مساعیٔ جمیلہ سے ہی تفہیم القرآن کی چھ جلدوں کا سندھی زبان میں ترجمہ پایۂ تکمیل کو پہنچا تھا۔ اس کام کی نگرانی انہوں نے خود کی تھی۔ حافظ محمد موسیٰ بھٹو کے بیان کے مطابق تفہیم القرآن کا سندھی زبان میں آخری پروف میاں محمد شوکت خود ایک سے زائد بار پڑھتے تھے اور پروف کی اور زبان کی جو غلطیاں رہ جاتی تھیں، اس کی طرف متوجہ کرتے تھے۔ اس سے ان کا سندھی زبان پر دسترس کا اندازہ ہوتا ہے۔ وہ سندھی زبان میں بات چیت بھی بڑی روانی سے کرنے پر قادر تھے۔ سندھی زبان کے مقبول افسانہ نگار اور ترقی پسند ادیب محمد عثمان ڈیپلائی سے میاں محمد شوکت کے گہرے تعلّقات تھے۔ ۵۰ کے عشرے میں میاں محمد شوکت صاحب نے عثمان ڈیپلائی سے سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کی کئی کتابوں کا سندھی میں ترجمہ کرا کے شائع کیا تھا۔ آخری دس سال انہوں نے اپنی پوری توجہ سندھی

زبان میں تفہیم القرآن کے ترجمے کی تکمیل پر صَرف کی۔

سیّد مودودیؒ سے سندھی زبان میں ترجمے اور اس کی اشاعت کی منظوری، جناب عبدالوحید قریشی نے حاصل کی تھی۔ ترجمہ کا کام مولانا جان محمد بھٹو نے شروع کیا تھا۔ مولانا جان محمد بھٹو کا انتقال ہوا تو سورۂ یوسف تک ترجمہ ہو چکا تھا۔ بقیہ ترجمے کا کام مولانا امیر الدین مہر نے کیا۔ ترجمے پر نظر ثانی کا کام عبداللہ تونیو صاحب نے کیا تھا۔ ابتدا میں ایک پارے کا ترجمہ ڈاکٹر محمد علی محمدی کے زیر اہتمام طبع ہوا تھا۔ جناب عبدالوحید قریشی، جناب مشتاق احمد ایڈووکیٹ، نعمان بھٹو اور شکیل احمد خان کی تکنیکی معاونت اور جناب انجینئر صدرالدین فاروقی کی مالی معاونت سے یہ کام میاں محمد شوکت کی زیرِ نگرانی تکمیل تک پہنچا تھا۔

آخری دس سالوں میں انہوں نے تصنیف و تالیف کے کام پر توجہ دی۔ میاں محمد شوکت صاحب کی زیرِ نگرانی سندھی زبان میں ہفت روزہ 'ونجھار' بھی شائع ہوتا تھا جس میں ہمارے دوست اور معروف صحافی جناب علی حسن نے بھی جز وقتی کام کیا ہے، وہ بھی میاں صاحب کی صلاحیتوں اور اخلاق و کردار کے گرویدہ ہیں۔

میاں صاحب کا مزاج دعوتی اور سماجی تھا۔ خدمتِ خلق اور دُکھی انسانیت کے لیے ان کی خدمات کا ریکارڈ بہت ہی شاندار ہے۔ وہ حقیقی معنوں میں ایک درویش صفت انسان اور دُکھی انسانیت کے بے لوث خدمت گزار تھے۔ تھرپارکر کے لوگ تو ان کی توجہ کا اس زمانے سے مرکز رہے جب وہاں جانے کے ذرائع تک مفقود تھے۔ انسان اور جانور ایک ساتھ ایک کھلے ٹرک میں سفر کرنے پر مجبور تھے۔ میاں محمد شوکت اس زمانے سے جب میڈیا میں کسی نے تھرپارکر کا نام بھی نہیں سنا تھا۔ تھر کے مفلوک الحال لوگوں کے لیے امدادی سامان لے جا کر تقسیم کر کے آیا کرتے تھے۔ اہل درد اور اہل اخلاص کی خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ وہ خدمت خلق کے کاموں میں نمود و نمائش سے کوئی سروکار نہیں رکھا کرتے۔ (آج تو خیرات بھی 'بزنس کے پروموشن' میں کامیاب ہتھیار کے طور پر استعمال ہونے لگی ہے)۔

میاں شوکت صاحب شدید علالت کے بعد ۱۹۹۸ء میں حیدر آباد سے اپنی بیٹیوں اور بھائی کے پاس اسلام آباد چلے گئے اور پھر وہاں سے لاہور میں منتقل ہو گئے، جہاں جولائی ۱۹۹۹ء میں ان کا انتقال ہو گیا، ان کی نمازِ جنازہ سیّد منوّر حسن نے منصورہ میں پڑھائی اور تدفین لاہور کے ماڈل ٹاؤن کے قبرستان میں ہوئی۔

ان کے انتقال کے بعد جناب عمر مجیب شامی نے اپنے نانا جناب میاں محمد شوکت کی حیات و خدمات کے حوالے سے ایک تفصیلی پروگرام بنایا تھا۔ اس کام کے لیے جناب مجیب الرحمٰن شامی نے حیدر آباد میں ممتاز صحافی جناب ظہیر احمد کو ٹاسک دیا تھا۔ میں نے بھی رضا کارانہ خدمات اس پروجیکٹ کے لیے پیش کر دی تھیں۔ میں نے بہت سے لوگوں سے مضامین لکھوائے تھے اور کچھ لوگوں کے انٹرویو کیے تھے۔ جن کا کچھ حصہ دفتر میں کمپوز بھی ہو گیا تھا۔ کچھ انٹرویو ٹیپ کی صورت میں تھے۔ وہ دفتر میں اِدھر اُدھر ہو گئے۔ ایک طویل انٹرویو میاں محمد شوکت صاحب کے چھوٹے بھائی میاں محمد علی صاحب سے بھی کیا تھا۔ اس کے ضائع ہونے کا بڑا قلق ہے کہ اب ان کی صحت ایسی نہیں رہی کہ ان سے اتنا طویل انٹرویو ہو سکے۔ البتہ جناب ظہیر احمد نے جو کام کیا ہے وہ ان کے پاس محفوظ ہے۔ پھر میں نے اور جناب جاوید قریشی نے جنرل جہاں داد خاں، عبداللہ جے میمن اور ملک لعل خاں سے فرداً فرداً ملاقاتیں کر کے میاں شوکت صاحب کی شخصیت کے بارے میں مزید معلومات اکٹھی کیں۔

جنرل جہان داد خان ۱۹۷۷ء میں حیدر آباد کے جی او سی تھے۔ ان سے میاں صاحب کے بارے میں سوال کیا گیا تو اُن کا جواب تھا۔ ''میں نے ساری زندگی میں ایسا آدمی نہیں دیکھا، جس نے اپنے سیاسی مخالفوں کے بارے میں نہ صرف ہم سے کبھی کوئی شکایت کی بلکہ جب میں نے ایک بار ان کے ایک سیاسی مخالف کے بارے میں رائے طلب کی تو ان کا جواب تھا، سیاسی مخالفوں کے بارے میں انتظامیہ کے سامنے لب کشائی کرنا میرے مسلک کے خلاف ہے۔ جناب جنرل جہان داد خان نے یہ بھی

گواہی دی کہ انہوں نے مجھے کبھی بھی اپنے کسی ذاتی کام کے لیے نہیں کہا۔ جب بھی بات کی شہر کی ترقی کی اور مظلوموں کی دادرسی کی۔ ہم سے بات کرتے وقت جنرل جہان داد خان کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ جناب عبداللہ جے میمن کا کہنا تھا: میں ان کا پرانا نیاز مند تھا، زمانۂ طالب علمی سے وہ مجھے اور میں ان کو جانتا تھا۔ مگر مجھے جب بھی فون کیا، شہر کے اجتماعی مسائل کے حل اور وسائل سے محروم لوگوں کی داد فریاد سننے کے لیے کیا، البتہ میری ذاتی خواہش تھی کہ وہ مجھے اپنی ذات کے حوالے سے خدمت کا کوئی موقع دیں۔ مگر اس کا انہوں نے کبھی کوئی موقع نہیں دیا، جناب ملک لعل خان نے کہا کہ میں پیپلز پارٹی میں تھا۔ میں نے ۱۹۷۷ء کے انتخاب میں ان کے خلاف وہ سب کچھ کیا جو ہمارے اور ہماری انتظامیہ کے بس میں تھا۔ مگر ہماری حکومت ختم ہونے کے بعد وہ ہم سے بدلہ تو کیا لیتے ہمیشہ مشکل وقت میں مدد و تعاون کرتے رہے۔ اب اس کردار کے لوگ پیدا ہونے بند ہو گئے ہیں۔ ۱۹۸۵ء میں مہاجر سیاست کے علمبرداروں نے ان کے خلاف ایک ہی نعرہ لگایا کہ وہ مہاجر نہیں ہیں اور مہاجر کا ووٹ مہاجر کے لیے ہے۔ مگر جب ایم کیو ایم کے میئر آفتاب احمد شیخ پر قاتلانہ حملہ ہوا تو میاں محمد شوکت ان کی اپنی لیڈر شپ سے بھی پہلے ان کے پاس کھڑے تھے۔ ۱۹۸۷ء میں جماعت اسلامی حیدرآباد کے دفتر پر مسلح حملہ ہوا تھا۔ اس کی ایف آئی آر میں ایم کیو ایم کے لوگ نامزد تھے۔ ۱۹۹۲ء میں ایم کیو ایم کے خلاف آپریشن میں حکومت اس ایف آئی آر کو استعمال کرنا چاہتی تھی۔ تو میاں صاحب نے جماعت کے لوگوں کو مشورہ دیا کہ ہمیں اس گھڑی میں ان کے خلاف فریق نہیں بننا چاہیے۔ جماعت کے لوگ ان لوگوں کے خلاف شہادت نہ دیں جنہیں حکومت ایم کیو ایم سے تعلق کی بنا پر پھنسانا چاہتی ہے۔ اس کیس کی سماعت جیل میں کی گئی تھی۔ میاں صاحب کو جیل میں گواہی اور ملزموں کو شناخت کے لیے بلایا گیا تو میاں صاحب نے گواہی دینے اور ملزموں کو شناخت کرنے کے بجائے الٹا جج سے سوال کر دیا کہ حکومت کو ۱۹۸۷ء کا کیس ۱۹۹۳ء میں کیسے یاد آ گیا؟ جس پر میئر آفتاب شیخ اور ایم کیو ایم کے دوسرے اسیران حیران و ششدر رہ گئے۔ یہی معاملہ میاں صاحب نے حیدرآباد کے تالپور برادران کے ساتھ بھی اس وقت کیا جب میر رسول بخش تالپور اپنے بڑے بھائی میر علی احمد تالپور کے بھٹو سے اختلاف کے بعد سندھ کی گورنری چھوڑ کر حیدرآباد پہنچے تھے۔ میر رسول بخش تالپور جب گورنر تھے تو پیپلز پارٹی کی حکومت نے میاں محمد شوکت کو جھوٹے کیس میں گرفتار کر کے جیل میں ناگفتہ بہ حال میں رکھا تھا۔ رسول بخش تالپور گورنری سے الگ ہو کر جب حیدرآباد پہنچے تو میاں صاحب ان کا استقبال کرنے کے لیے حیدرآباد اسٹیشن پر موجود تھے۔ میاں صاحب نے ایوب خان کی بھی جیل کاٹی اور ذوالفقار علی بھٹو کی بھی اور اس کی بیٹی بے نظیر بھٹو کی بھی مگر جب بھی ان لوگوں پر کوئی مشکل گھڑی آئی تو میاں صاحب نے صاحب عزیمت لوگوں کی طرح دکھ پہنچانے والوں کے ساتھ حسن سلوک کا معاملہ رکھا۔

میاں صاحب حیدرآباد لطیف آباد میں سادگی سے چار مرلے کے مکان میں رہے، البتہ تعلیمی اداروں کی تعمیر و ترقی کا شوق رہا۔ شاہ ولی اللہ کالج منصورہ ہالا ضلع حیدرآباد کے قیام اور تعمیر میں ان کا بڑا کردار رہا۔ مدرسہ ریاض العلوم اور مسجد رحمانیہ کی تعمیر انہی کی نگرانی میں ہوئی اور ان اداروں کے صدر اور سیکرٹری بھی رہے۔

حاصل

ایک بندے نے مکان بنایا، تو اپنے پیر صاحب کے پاس گیا اور کہا "جناب میں نے مکان بنایا ہے۔"

انھوں نے کہا "مبارک ہو۔ ایسا مکان بنانا کہ چھوڑتے وقت تکلیف نہ ہو۔ اب تم نے کہا، مکان بنانا ہے۔ جتنا اچھا بنے گا چھوڑتے ہوئے اتنی ہی تکلیف ہوگی۔ حاصل میں بھی تکلیف اور چھوڑنے میں بھی تکلیف۔ بڑی مشکل سے حاصل ہوا، بڑی مشکل سے چھوڑا۔ آسانی سے حاصل کر لو اور آسانی سے چھوڑو۔ (واصف علی واصف)

خیمۂ اعتراف میں بیٹھا ہوا کذّاب

ہر آدمی کے اپنے عذاب اور اپنی سزائیں ہیں

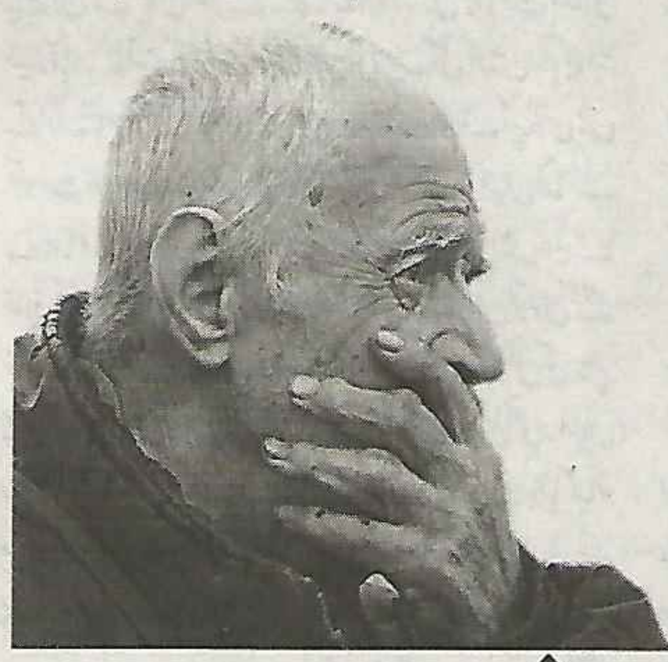
خواجہ رضی حیدر

ادھر تقریباً ایک ماہ سے طبیعت میں کچھ ایسی اُداسی دَر آئی ہے کہ بسا اوقات خود اپنے وجود سے بھی اُلجھن سی محسوس کرنے لگتا ہوں۔ یہ اُداسی جب مایوسی میں تبدیل ہونے لگتی ہے تو میں اُس لمحے اس راز کو پالیتا ہوں کہ لوگ خودکشی پر کیوں آمادہ ہوجاتے ہیں، زندگی حقیر کیوں ہوجاتی ہے اور موت آرزو کیسے بن جاتی ہے۔

میں اپنے روّیے سے بظاہر ایک ہوشمند اور کسی حد تک ایک عیّار آدمی ہوں لیکن میرے وجود میں ایک ایسی رُوح موجود ہے جو نوزائیدہ بچوں کی طرح معصوم ہے۔ یہ رُوح انگاروں کو پھول اور پتھر کو پارس سمجھتی ہے۔ یہ رُوح معصومیت کے نقطے سے کھینچی ہوئی ایک ایسی لکیر ہے جس کا ہر رُخ فریب کا ایک قائمہ زاویہ بناتا ہے۔ اسی رُوح نے میرے کومل اور سجل لمحوں کو قتل کردیا ہے۔ میرے اندر اُداسی کا زہر گھول دیا ہے، مجھے دھوکے میں اسیر کردیا ہے اور میری آنکھ میں تشکیک کا ایک ایسا منظر کاشت کردیا ہے کہ میں اس منظر سے نجات کی خواہش کو بینائی پر ترجیح دینے لگا ہوں۔ اس رُوح نے جو میری سوچ کو ہر لمحے مسخر کیے رہتی ہے، بار بار میرے اندر ایک ایسی جنگ شروع کی ہے جس کا ہر انجام اُداسی اور ملامت پر منتج ہوتا ہے۔ مگر میں جو ایک ہوشمند اور کسی حد تک عیّار آدمی ہوں اس روح کے زیر اثر بھی ہمہ وقت اُس لمحے کی تلاش ہوتا ہوں جو میرا اپنا ہو۔ ایسا لمحہ جس پر میرا اپنا تسلّط ہو، جس پر میری اپنی گرفت ہو، ایک ایسا لمحہ جس کے ہاتھوں میں جب چاہوں غم کی زنجیر ڈال دوں اور جب چاہوں اس کے پیروں میں خوشی کے گھنگرو باندھ دوں۔ لیکن ایسا لمحہ نہ اب تک آیا ہے اور نہ شاید کبھی آئے۔

میری زندگی کے شب و روز اسی ادھیڑ بُن میں صرف ہوئے جا رہے ہیں کہ آخر کب میرے مقدر کی کوکھ سے کوئی ایسا لمحہ جنم لے گا جو اپنائیت سے بھرپور ہو، جو اخلاص کا پرداختہ ہو جو ہر قسم کی منافقت اور ریاکاری سے عاری ہو۔ مگر شاید ابھی اس لمحے کے استقرار کا وقت نہیں آیا اور شاید ابھی میں اس لمحے کی دریافت کی بابت عجلت کا شکار ہو رہا ہوں۔ اگر ایسا ہے تو کیا میں نے اپنی عمر کے اڑسٹھ برس یوں ہی گزار دیے۔ کیا دعا اور اجابتِ دعا کے درمیان زیاں کی سنگلاخ دیوار حائل ہے اور کیا اس دیوار کے اُس طرف کی کوئی نیکی کسی دُعا کے جواب میں کبھی اس طرف نہیں آئے گی۔

میں ایک عمر تک اپنے اظہار کی شہ رگ پر مصلحت کا خنجر رکھے رہا۔ مگر اب میں سچائی کی صلیب پر مروّت کا لباس تار تار کیے کھڑا ہوں۔ میں نے چشم پوشی کے ہر امکان کو ختم کردیا ہے



اور اب میں اظہار کے اس جانگسل موڑ پر آگیا ہوں جہاں آدمی بے دھڑک اپنی بات کہہ گزرتا ہے، میں بھی اب اپنی بات کہنا چاہتا ہوں، وہ بات جو ایک عمر سے میری زبان پر کانٹا بنی ہوئی ہے۔ وہ بات جو عرصے سے میرے نطق کی نیام میں ہے۔ وہ بات جو برسوں سے لب گزیدہ ہے اور اب جراحت روح کے لیے اپنا اظہار چاہتی ہے، مگر سوال یہ ہے کہ میں یہ بات کس سے کروں اور وہ کون سی منصفِ سماعت ہے جو اس بات کے اظہار پر تعزیر عائد نہیں کرے گی اور جو برسرِ عام مجھ سے یہ جملے کہے گی کہ جاؤ تم ایک ایسے عذاب سے آزاد کیے جاتے ہو جس عذاب کے آتشکدہ نے تمہاری سوچ کے تمام مثبت زاویے خاکستر کر دیے ہیں۔

میں سوچتا ہوں اور خوف زدہ ہو جاتا ہوں مجھے اپنے ذاتی اور سماجی مراسم کی بلند و بالا عمارتیں منافقت اور ریاکاری کے رنگ و روغن سے زنگار عمارتیں اس ایک جملے کی زد میں آکر زمین بوس ہوتی ہوئی دکھائی دینے لگتی ہیں، عزیز و اقارب پرائے اور اپنے بچے اجنبی نظر آنے لگتے ہیں اور میں اپنی سماعت کو اس ایک جملے کے پھیلاؤ میں اس قدر تنہا محسوس کرنے لگتا ہوں کہ میری سانسوں کا زیر و بم میری اپنی سماعت میں ہوائے تند کے مانند مخل ہونے لگتا ہے۔ ایک بے پایاں سکوت میرے اطراف حصار باندھ لیتا ہے اور کوئی بھی دل ستاں آواز سنائی نہیں دیتی، اس ایک جملے کی بازگشت اور گونج میں مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے گویا میری سابقہ عمر کا ہر لمحہ اپنے داخل اور خارج میں منافقت آمیز تھا۔ اس میں سچائی اور صداقت کی کوئی آرائشی محراب نہیں تھی۔ اس میں گویا جھوٹ اور ریاکاری زرنقد کی صورت رائج تھی اور اسی زرنقد پر تمام کاروبارِ حیات کا انحصار تھا۔ تمام تعلقات، تمام رشتے، تمام جذبے، تمام کیفیتیں اسی زرنقد کی مرہونِ منت تھیں۔

ہر آدمی کے اپنے عذاب اور سزائیں ہوتی ہیں، وہ عذابوں اور سزاؤں سے مانوس ہونے کے باوجود ان کے تشدد میں مبتلا رہتا ہے، اس کی کوشش ہوتی ہے کہ وہ کسی طرح اس تشدد سے نجات حاصل کرلے۔ لیکن وہ ایسا نہیں کرپاتا، کیوں کہ بیشتر وہ اس تشدد کی علّت نمائی سے واقف نہیں ہوتا، اس کے علم میں نہیں ہوتا کہ اس کا کون سا عمل تھا جس نے تشدد کی اس آگ کو فزوں کیا اور اس کی کون سی ادا تھی جس نے اس تشدد کا دائرہ تنگ کر دیا مگر لاعلمی کا یہ عرصہ زیادہ طویل نہیں ہوتا اور بہت جلد اس آدمی کے روز و شب کے بطن سے ایک ایسا لمحہ جنم لیتا ہے جس کے محیط میں تمام سفید اور سیاہ اس پر آشکار ہو جاتے ہیں، اس کی احتسابی آنکھ کھل جاتی ہے اور اس کے ہر عمل کی علت غائی اس پر منکشف ہونے لگتی ہے۔ عموماً یہ لمحہ عمر کی ایک ایسی منزل پر آتا ہے جب آدمی فعال زندگی کے دائرے کو پھلانگ چکا ہوتا ہے اور اس کے سامنے صرف انفعالی زندگی کی معدوم ہوتی ہوئی حدود رہ جاتی ہیں، چناں چہ ایسی صورت میں اس کے پاس اس کے سوا کوئی اور چارہ کار نہیں ہوتا کہ وہ اپنے ماضی کی طرف سے آنکھیں بند کر کے فعال زندگی کے دائرے میں موجود افراد کو چیخ چیخ کر اصلاحِ اعمال کی طرف رجوع کرے۔ ان کو سپید و سیاہ سے آگاہ کرے، ان کے سامنے جبر و قدر کے معاملات رکھے۔ اپنے اعترافات کو واضح کرے اور یہ تصور کرے کہ شاید اس کا یہی عمل اس کے ماضی کی لغزشوں کا کفارہ ہے۔ لیکن ایسا بہت کم لوگ کرتے ہیں۔ وہ عموماً اپنے سابقہ اعمال کی قباحتوں کو نت نئے جواز کا لباس پہناتے رہتے ہیں تاکہ انفعالی زندگی سے نجات مل سکے۔ وہ اعتراف کا سہارا لے کر اپنے ضمیر کا بوجھ کم نہیں کرتے، خود کو دوسروں کے لیے عبرت نہیں بناتے۔ چناں چہ ایسے افراد کی میتیں اکثر بھاری پڑ جاتی ہیں۔ میرے مشاہدے اور تجربے میں ایسے کئی افراد آئے ہیں جو اپنی زندگی کی تلخیوں کو

دوسروں کی زندگی کے ساغر میں انڈیلنے میں مصروف رہتے ہیں، ایسے افراد دراصل بزدل ہوتے ہیں اور ان کی یہی بزدلی ان کو اخلاقی کج روی کی سمت لے جاتی ہے۔ وہ اپنے مضبوط حریف سے چوں کہ انتقام لینے کا حوصلہ نہیں رکھتے، لٰہذا اپنے دائرۂ اثر میں موجود افراد پر طبع آزمائی شروع کردیتے ہیں۔ ایسے افراد ایک ایسی انتقامی بے حسی کا شکار ہوجاتے ہیں جو خونی رشتوں کے پاس ولحاظ سے بھی محروم ہوجاتی ہے۔ میرے رابطے میں ایک صاحب ایسے آئے ہیں جنھوں نے سخت محنت کی اور خود کو اس لائق بنایا ہے کہ وہ آج ایک اہم علمی ادارے کے سربراہ ہوئے اور صاحبِ ثروت کہلائے، ایک دن ان حضرت نے مجھے مشورہ دیا کہ آپ اپنے بچوں پر زیادہ رقم خرچ نہ کیا کریں، چوں کہ آپ کے بچے ابھی بہت چھوٹے ہیں اور یہ بڑے ہوکر بھول جائیں گے کہ آپ نے ان کے ساتھ کیا سلوک کیا تھا۔ جب وہ باشعور ہوجائیں تب ان کے ساتھ کوئی امتیازی سلوک کریں تاکہ وہ اسے یاد رکھ سکیں۔ ان کا مشورہ سن کر مجھے اپنے والد کی شفقت، فریفتگی اور عنایات اتنی کثرت وشدت سے یاد آئیں کہ میں نے فوراً ہاتھ بلند کردیے اور اپنے والد کے لیے دعائے مغفرت کرنے لگا۔

ہائے کیا لوگ تھے زنداں میں بھی ہم سے پہلے

میرے ایک محترم بزرگ حکیم محمود احمد برکاتی (شہید) نے ایک مرتبہ دورانِ گفتگو فرمایا کہ بسا اوقات ایک شخص کی نیکی کو دوسرے شخص کی بدی نگل لیتی ہے۔ برکاتی صاحب نے یہ بات کس سیاق وسباق میں کہی تھی، وہ ایک الگ باب ہے لیکن میں نے جب بھی اس جملے پر غور کیا تو عجیب و غریب خیالات نے ذہن کو گھیر لیا۔ خیال آیا کہ نیکی انسان کے باطن سے جنم لیتی ہے اور بدی ظاہر سے۔ یہی وجہ ہے کہ بدی جلد ظاہر ہوجاتی ہے اور نیکی عرصے تک مخفی رہتی ہے، شاید اسی لیے نیکی مخفی رکھنے کا حکم دیا گیا ہے اور یہ ضرب المثل رائج ہوئی کہ ''نیکی کر دریا میں ڈال'' بادی النظر میں اس ضرب المثل کو میں نیکی کے خلاف ایک سازش تصور کرتا ہوں۔ ''اعلان'' کسی امر کے فروغ کا بنیادی تقاضا ہے۔ جب نیکی کا اعلان نہیں ہوگا تو یہ فروغ کس طرح پائے گی۔ بدی میں متعدّی امراض کی طرح پھیلنے اور خود کو فروغ دینے کی بے پناہ قوت ہوتی ہے، جب کہ نیکی اپنی حرکت پذیری کے لحاظ سے محتاط ہوتی ہے۔ جو شے تلاش کی جائے وہ موجود ہوتے ہوئے بھی معدوم ہوتی ہے اور معدوم کا معلوم کی حد میں آنا دشوار طلب ہوتا ہے۔ برخلاف اس کے قبول وہ شے کی جاتی ہے جس کا اعلان کیا جائے چناں چہ مقبول تک رسائی سہل اور معدوم تک رسائی دشوار ہوتی ہے، نیکی اور بدی میں بھی دشوار اور سہل کا فرق ہوتا ہے۔ تو پھر کیا میں نیکی کی تلاش میں اپنے معلوم اعمال کی حدود سے باہر نکل جاؤں اور دشواریوں کو خوش آمدید کہوں۔ مگر کیوں؟ کیا بدی کی سرزمین پر نیکی کا کوئی پودا کبھی پروان نہیں چڑھے گا۔ کیا میں اعلان کو نیکی کی اساس بنا کر سرخ روئی کے اُس خطے میں داخل ہوجاؤں گا جس کی نوید نیک لوگوں کو دی گئی ہے۔ وہ خطہ جس کو ''ارضِ موعود'' کہا گیا ہے اور جسے پاک طینت افراد کا مقدر تصور کیا جاتا ہے، نہیں شاید ایسا نہیں ہوسکے گا، کیوں کہ میرے اندر موجود معصوم روح نے میری بینائی میں تشکیک کا منظر کاشت کردیا ہے۔ میں کبھی اُس لمحۂ اعتراف میں صادق قرار نہیں پاؤں گا جس کے محیط میں ''ارض موعود'' موجود ہے۔ میں انفعالی روّیہ کے حصار میں بیٹھا ہوا ایک ایسا کذّاب ہوں جو ہر لمحہ اپنے اعمال کی رذالتوں کو جواز کا لباس فراہم کرتا رہتا ہے۔ میرا یہی عمل میری اُداسی کا سبب ہے اور اسی سبب کی بنا پر مجھے زندگی کے بجائے موت کی آرزو ہراساں اور پریشان رکھتی ہے۔



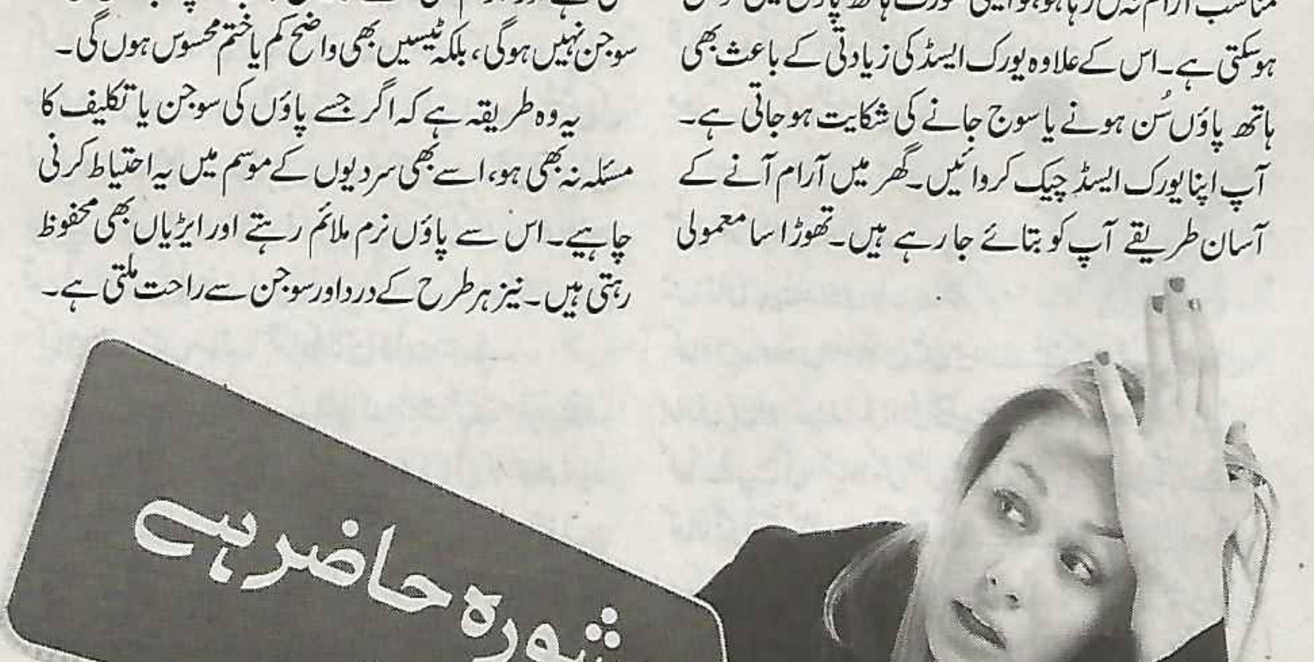
ہاتھوں پیروں کی سوجن

میرے ہاتھ پیر رات کو اکثر سوج جاتے ہیں۔ پہلے ہاتھ اور پاؤں کی ہڈیوں میں ہلکا ہلکا درد شروع ہوتا ہے اور آہستہ آہستہ سنسناہٹ کے ساتھ سوجن بڑھنے لگتی ہے۔ میں اس سے بہت پریشان ہوتی ہوں کیونکہ پھر نہ تو کوئی کام کیا جاتا ہے نہ ہی مجھ سے چلا جاتا ہے۔ حتیٰ کہ زمین پر پاؤں رکھنے سے بھی ٹیس اُٹھتی اور تکلیف ہوتی ہے۔ براہِ کرم مجھے مشورہ دیں کہ اس حالت میں کیا کیا جائے۔

(مسز عابدہ، شیخوپورہ)

☆ سردیوں میں عموماً ہاتھ پاؤں سوج جاتے ہیں۔ یہ زیادہ تکان کے باعث بھی ہوتا ہے اور اگر کمزور ہڈیاں ہوں یا جسم میں وٹامن اور کیلشیم کی کمی ہو یا جسم کو کام کے دوران مناسب آرام نہ مل رہا ہو، تو ایسی صورت ہاتھ پاؤں میں سوجن ہو سکتی ہے۔ اس کے علاوہ یورک ایسڈ کی زیادتی کے باعث بھی ہاتھ پاؤں سُن ہونے یا سوج جانے کی شکایت ہو جاتی ہے۔ آپ اپنا یورک ایسڈ چیک کروائیں۔ گھر میں آرام آنے کے آسان طریقے آپ کو بتائے جا رہے ہیں۔ تھوڑا سا معمولی خیال رکھنے سے آپ یہ تکلیف ختم کر سکتی ہیں۔ رات کو لیٹنے سے پہلے نیم گرم پانی میں تھوڑا سا نمک اور زیتون کا تیل ڈال کر اس میں پاؤں ڈبو کر بیٹھ جائیں۔ یاد رہے کہ پانی نہ تو بہت زیادہ گرم ہو اور نہ ہی بہت ہلکا۔ اتنا گرم ہو کہ آپ کے پاؤں کی مناسب ٹکور ہو جائے اور قابل برداشت بھی ہو۔ ساتھ ساتھ آپ ہاتھوں کو بھی پانی میں ڈبو سکتی ہیں۔ اس سے سکون ملے گا اور تھکن بھی دور ہوگی۔ جب آپ کو لگے کہ پانی دوبارہ نارمل یا ٹھنڈا ہو رہا ہے تو آپ ساتھ ساتھ اس میں تھوڑا سا گرم پانی مزید ملا دیں۔ مگر دھیان رہے کہ پاؤں پر براہ راست گرم پانی نہ گرے۔ اچھی طرح ٹکور کرنے کے بعد پاؤں کسی صاف نرم تولیے سے خشک کر لیں اور زیتون کے تیل یا اچھے سے لوشن سے ہاتھوں، پیروں کا مساج کریں اور سوتی جرابیں پہن کمبل اوڑھ کر لیٹ جائیں۔ آپ کو محسوس ہوگا کہ ٹانگوں کی تھکن کم ہو گئی ہے اور آرام بھی آئے گا۔ صبح جب آپ جاگیں گی تو سوجن نہیں ہوگی، بلکہ ٹیسیں بھی واضح کم یا ختم محسوس ہوں گی۔

یہ وہ طریقہ ہے کہ اگر جسے پاؤں کی سوجن یا تکلیف کا مسئلہ نہ بھی ہو، اسے بھی سردیوں کے موسم میں یہ احتیاط کرنی چاہیے۔ اس سے پاؤں نرم ملائم رہتے اور ایڑیاں بھی محفوظ رہتی ہیں۔ نیز ہر طرح کے درد اور سوجن سے راحت ملتی ہے۔



دانتوں کا پیلا پن اور دھبے



میرے دانتوں میں کچھ عرصے سے عجیب سا پیلا پن نمایاں ہوتا جارہا ہے۔ پہلے میرے دانت بالکل صاف اور سفید ہوا کرتے تھے۔ کچھ عرصے سے ان میں پیلاہٹ آرہی ہے اور کبھی کبھی سفید دھبے بھی پڑے نظر آتے ہیں۔ میں کیا کروں کہ میرے دانت پہلے جیسے صاف اور سفید نظر آئیں۔ (سمیرا ندیم، لاہور)

☆سمیرا! مجھے احساس ہے کہ اگر دانت بھدے گندے یا پیلاہٹ مائل ہوں تو ان کا اثر انسان کی شخصیت پر براہ راست پڑتا ہے کیونکہ جب ہم کسی سے ملتے، بات کرتے یا ہنستے بولتے ہیں تو دانت ہمارے چہرے کے بعد، سب سے زیادہ نظروں میں آتے ہیں۔ اگر کوئی انسان بے انتہا پرکشش ہو، چہرے کے خدوخال بھی خوبصورت ہوں، بات چیت میں بھی مثالی ہو لیکن اگر وہ آپ سے ہنس کر بات کرے اور اس کے دانت پیلے یا داغ دھبوں والے ہوں، تو ایک سیکنڈ میں آپ اسے پرکشش کی فہرست سے نکال دیتے ہیں۔ لہٰذا دانتوں پر خاص توجہ دینی چاہیے۔ ایک چیز اور قابل ذکر یہ ہے کہ کچھ لوگوں کے دانت قدرتی طور پر پیلے ہوتے ہیں۔ ایسے دانتوں کو سفید نہیں بنایا جا سکتا، صرف انھیں صاف ستھرا رکھنا ہی کافی ہوتا ہے۔

لیکن جیسا کہ آپ نے بتایا کہ دانت پہلے سفید تھے۔ پہلے تو آپ یہ جائزہ لیں کہ کہیں چائے یا کافی کا بہت زیادہ استعمال تو نہیں کر رہیں۔ جن کے اثرات آپ کے دانتوں پر پڑنا شروع ہوگئے ہیں۔ دوسری بات یہ کہ دن میں کم از کم تین دفعہ دانت صاف کرنے کی عادت ڈالیے۔ ضروری نہیں کہ آپ ٹوتھ پیسٹ ہی استعمال کریں۔ آپ تینوں اوقات میں مختلف چیزیں استعمال کر سکتی ہیں۔ صبح آپ ٹوتھ پیسٹ استعمال کریں، شام کو اچھا سا منجن یا کھانے کا سوڈا انگلی پر لگا کر اس سے دانت صاف کریں اور رات کو تھوڑے سے ناریل کے تیل میں ذرا سی ہلدی چھڑک کر ایک پیسٹ سی بنالیں۔ اس آمیزے کو دانتوں پر ہلکا ہلکا ملیں، چاہیں تو انگلی یا پھر برش استعمال کرلیں۔ پانچ، سات منٹ یونہی ہلکا ہلکا ملنے کے بعد کلی کرلیں۔ ناریل اور ہلدی کا یہ پیسٹ دانتوں میں چمک پیدا کرتا ہے۔ اگر آپ کے دانت حساس نہیں ہیں تو آپ لیموں کا چھلکا بھی ہفتے میں ایک دفعہ دانتوں پر مل سکتی ہیں۔ کیلشیم کی روزانہ ایک گولی کھائیے۔ دودھ رات یا صبح کی غذا میں شامل کرلیں۔ نیز جب بھی چائے یا کافی پئیں، فوراً سادے پانی کی کلی ضرور کرلیں۔ کھانے کا سوڈا بھی دانتوں پر منجن کی طرح لگا کر برش کرنے سے داغ دھبے اور پیلا پن ختم ہوجاتا ہے۔ لیکن یہ صبر آزما ٹوٹکا ہے۔ مستقل مزاجی سے کچھ ہفتے جاری رکھنے سے ہی مطلوبہ نتائج سامنے آتے ہیں۔ ایک نہایت مجرب ٹوٹکا یہ بھی ہے کہ برابر مقدار میں نمک میٹھا سوڈا اور بورک ایسڈ ملا کر منجن بنا کر اس سے دانت صاف کریں۔ چند ہی دنوں میں دانت چمکدار ہوجائیں گے۔

معدے میں تیزابیت



میرے معدے میں ہر وقت جلن اور تیزابیت رہتی ہے۔ چاہے میں خالی پیٹ رہوں یا پیٹ بھر کر کھاؤں۔ دونوں صورتوں میں میرے سینے میں عجیب سی جلن، بھاری پن اور بے زاری والی کیفیت رہتی ہے۔ یوں لگتا ہے کہ کھانے پینے کی اشیا واپس حلق میں آرہی ہیں۔ یوں لگتا ہے کہ کھانا بھی ہضم نہیں ہوتا کیونکہ کھانے کے تین چار گھنٹے بعد بھی یوں محسوس ہوتا رہتا ہے جیسے ابھی ابھی کھانا کھایا ہو۔ میں اپنی اس حالت سے بہت بے زار رہتی ہوں۔ برائے مہربانی مجھے کوئی آسان گھریلو حل بتائیے۔ کیونکہ دوائیاں مجھے پسند نہیں۔

(عائشہ، راولپنڈی)

☆گھبرانے کی بات نہیں۔ معدے میں تیزابیت اور سینے کی جلن کا مسئلہ تب ہوتا ہے جب معدے کے گیسٹرک گلینڈ

بہت زیادہ مقدار میں ہائیڈروکلورک ایسڈ خارج کرنے لگتے ہیں۔اس سے معدے کی تیزابیت میں اضافہ ہوتا ہے اور سینے میں جلن اور درد ہونے لگتا ہے۔گھریلو قدرتی اشیا کا باقاعدہ استعمال تیزابیت کے خاتمے کے لیے بے حد مفید ثابت ہوتا ہے۔جس سے انسانی صحت پر کسی بھی قسم کے منفی اثرات مرتب نہیں ہوتے۔آپ لیموں کے استعمال سے اس تکلیف کو رفع کرسکتی ہیں۔ایک چوتھائی لیموں کا ٹکڑا ایک گلاس پانی میں رات بھر بھگو کر رکھ دیں۔اگلی صبح اس پانی میں تھوڑا اور پانی شامل کر کے پئیں اور شدید تیزابیت ہونے کی صورت میں اس عمل کو روزانہ دہرائیں تقریباً سات دن تک۔واضح افاقہ محسوس کریں گی۔اس کے علاوہ ایک گلاس پانی میں ایک چمچ لیموں کا رس اور چٹکی بھر سوڈا بائی کاربونیٹ ملا کر دن میں دو مرتبہ ضرور استعمال کریں۔سنگترے کا موسم ابھی گیا نہیں ہے۔آپ ایک سنگترے کا رس نکال کر اس میں ایک چھوٹا چائے کا چمچ بھنا ہوا زیرہ اور چٹکی بھر کالا نمک شامل کر کے دن میں کم از کم دو مرتبہ ضرور استعمال کریں۔نیز ہر کھانے کے بعد اسپغول کا چھلکا دودھ میں ملا کر پینے سے بھی تیزابیت اور جلن کو آرام ملتا ہے۔

مستقل نزلہ زکام اور کھانسی



سردیاں شروع ہوتے ہی مجھے نزلہ زکام اور ہلکی ہلکی گلے کی خراش کا مسئلہ شروع ہو جاتا ہے۔کھانسی نہ تو کھل کر ہوتی ہے نہ ہی ٹھیک ہوتی ہے۔جس کی وجہ سے گلے میں درد رہتا ہے اور زکام کی وجہ سے سر درد کی شکایت اور سر بھاری رہتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ سردیوں کے موسم میں کہیں آنے جانے سے پرہیز کرنا پڑتا ہے۔اس مسلسل نزلہ زکام کی وجہ سے عجیب سی سستی اور بے زاری چھائی رہتی ہے۔بہت دوائیاں آزمالیں اتنی دوائیاں کھانا اب میرے بس میں نہیں۔برائے مہربانی سادہ گھریلو نسخے بتادیں۔

(صائمہ ظفر، بہاولپور)

☆ نزلہ زکام اور کھانسی ایسی بیماریاں ہیں جو کہ موسم کی آمد کے ساتھ ہی آن وارد ہوتی ہیں اور اگر مناسب نگہداشت یا دیکھ بھال نہ کی جائے تو یہ نہ صرف زور پکڑ لیتی ہیں بلکہ پورا سیزن جان نہیں چھوڑتیں۔ایک آسان گھریلو نسخہ یہ ہے کہ ادرک کے رس میں تھوڑا سا شہد ملا کر کھانے سے نزلہ زکام کو آرام ملتا ہے۔شہد کی افادیت سے کسی کو انکار نہیں۔اور شہد میں جراثیم کشی کی صلاحیت ہوتی ہے۔اور لیموں میں شامل حیاتین ج (یعنی وٹامن سی) جسم کی قوت مدافعت کو مستحکم کرتا ہے۔اس مرکب کو دھیرے دھیرے نگلنے سے منہ میں خوب لعاب بنتا اور گلے کو آرام ملتا ہے۔اس کے علاوہ ایک آسان حل یہ بھی ہے کہ چائے کی پتی میں تھوڑے سے پودینے کے پتے جوش دیں اور یہ قہوہ پینے سے بھی کھانسی کو افاقہ ہوتا ہے۔نزلہ سے آرام و بچاؤ کا نہایت آسان گھریلو علاج یہ ہے کہ ایک تولہ سونف میں پانچ سے آٹھ دانے لونگ دو کلو پانی میں ڈال کر چولہے پر جوش دے لیں۔اور جب پانی آدھا رہ جائے تو اس میں مصری (حسب ذائقہ) ڈال کر چائے کی طرح گرم گرم نوش کیجیے۔اس سے نزلہ زکام دور ہوجاتا ہے۔

☆☆



سردیوں کی آمد اور جاتی سردیوں کے موسم میں اپنا اور بچوں کا بہت خیال رکھنے کی ضرورت ہوتی ہے۔کیونکہ موسم کی تبدیلی آپ کی صحت پر اثرانداز ہوسکتی ہے۔لہٰذا موسم کی مناسبت کو دھیان میں رکھتے ہوئے اپنے لباس اور غذا پر مکمّل توجہ دیں۔مارچ کے مہینے میں ہمیں دہرے موسم کا مزا اٹھانے کا موقع ملتا ہے۔دن میں لطیف ہوائیں موسم بہار کے پھولوں سے مہکی ہوئی، ہمیں خوشگواریت کا احساس دلاتی ہیں۔سردیوں کی شدت میں نمایاں کمی ہو جاتی ہے اور ہم سوئیٹر، شال سے بے نیاز ہونے لگتے ہیں،

جبکہ رات کو موسم خنک ہو جاتا ہے۔ دراصل ایسا موسم ہماری طبیعت کو بہت جلد اپنی پکڑ میں لے لیتا ہے۔ لہٰذا ایسے موسم میں زیادہ احتیاط کی ضرورت ہوتی ہے اور غذا بھی متوازن ہونی چاہیے۔ آج آپ کو ایک ایسا متوازن، غذائیت اور ذائقے سے بھرپور سادہ سا سوپ بتا رہی ہوں جو کہ بدلتے موسم میں نہ صرف آپ کو مزیدار لگے گا بلکہ جسم کو تمام ضروری توانائی بھی مہیا کرے گا۔ بچے بوڑھے اور جوان سبھی کو نہایت مزے کا لگتا ہے اور تیاری میں بھی آسان ہے۔

ایک ساس پین میں تقریباً آدھی پیالی مکھن گرم کر کے اس میں کٹی ہوئی ایک کلو پالک اور آدھا کلو مٹر ڈال کر تھوڑی دیر فرائی کریں۔ پھر اتنا پانی ڈالیں جس میں سبزی ڈوب جائے اور مٹر گلنے تک پانی ابالیں۔ اس کے بعد پالک اور مٹر کے اس مکسچر کو گرائینڈر میں بلینڈ کر لیں۔ اب اسے ساس پین میں ڈالیں اور اس میں ایک پیالی دودھ، وائٹ پیپر پاؤڈر، جائفل پاؤڈر اور نمک تینوں اجزا حسبِ ذائقہ ملا کر تھوڑی دیر پکنے دیں۔ ۵ یا ۷ منٹ بعد ایک برتن میں ۱/۲ پیالی کارن فلور ٹھنڈے پانی میں گھول لیں اور سوپ میں ملا دیں۔ اب ۲ یا ۳ انڈے پھینٹ کر سوپ میں آہستہ آہستہ شامل کریں ساتھ ہی تھوڑی سی سویا ساس تقریباً ایک چمچ ملا دیں۔ لیجیے مزیدار پالک مٹر سوپ تیار ہے۔ گرم گرم پییں اور بچوں بڑوں سب کو پلائیں۔ یہ طاقت میں بھی بے مثال ہے اور ذائقے میں بھی لاجواب ہے۔

سادہ، بھرپور اور صحت افزا غذا نہ صرف آپ کو چست و توانا رکھتی ہے، بلکہ بہت سی بیماریوں سے بھی محفوظ رکھتی ہے۔ بچوں کو باہر کی الابلا چیزیں دینے کے بجائے انھیں گھر پر سادہ اور مزیدار ہلکی پھلکی غذا تیار کر کے دیں تا کہ انھیں مزا بھی آئے اور صحت بھی برقرار رہے۔

عرق کی افادیت اور اقسام

کافی قارئین نے عرق کی افادیت اور عرق کی مختلف اقسام کے بارے میں سوال پوچھے۔ آپ کی معلومات میں اضافے کے لیے ذیل میں فرداً فرداً ہر عرق کی افادیت کے بارے میں لکھا جا رہا ہے۔



☆ عرق سونف: امراض معدہ و جگر بدہضمی، ہاضم ہے اور معدے کی اصلاح کرتا ہے۔

☆ عرق سچی بوٹی: مصفّی خون، مقوی معدہ، جگر، رافع بخارے ہے، قے کو ساکن کرتا ہے۔

☆ عرق مکو: ورم معدہ، جگر و رحم، ہیپاٹائٹس، استقاء، جگر سکڑنا، پیاس و حرارت کم کرتا ہے۔

☆ عرق شاہترہ: خون کو صاف کرتا ہے، پھوڑے پھنسی کی شکایت کو دور کرتا ہے۔

☆ عرق کاسنی: جگر گردوں اور مثانے کی گرمی کو دور کرتا ہے، یرقان اور ورم جگر کے لیے۔

☆ عرق گاؤزبان: مفرح ہے دل کے لیے پیاس کو بجھاتا ہے، بلڈ پریشر، دماغ، گھبراہٹ۔

☆ عرق اجوائن: بھوک بھڑکاتا ہے، ہاضم ہے، جگر کے فعل کو درست کرتا ہے۔

☆ عرق پودینہ: درد شکم اور ریاح کو زائل کرتا ہے، متلی اور قے کو روکتا ہے، ہیضہ میں مفید ہے۔

☆ عرق زیرہ: مقوی ہے، معدہ، جگر و امعا، ہاضم و کاسر ریاح، خواتین میں دودھ بڑھاتا ہے۔

☆ عرق گلاب: آشوب چشم اور آنکھوں کی جلن و خارش، گھبراہٹ و بے چینی کو دور کرتا ہے۔

☆ عرق بید مشک: مقوی قلب ہے، سر درد، معدہ کو قوت دیتا ہے اور دماغ کے لیے۔

☆ عرق مہزل: جسمانی کمزوری پیدا کیے بغیر فالتو چربی کو ۱۰۰ فی صد ختم کرے۔

☆ عرق کلونجی: ہر قسم کے مرض بلڈ پریشر، ذہنی دباؤ، ذیابیطس، دردسر، جزام، کمر درد، اور معدہ میں تیزابیت، جسمانی کمزوری کے لیے مفید ہے۔

جنگلی جانور بھی کھیلتے ہیں

جنگلی جانوروں کے بعض کھیل
ہمارے کھیلوں سے ملتے جلتے ہیں

محمد خلیل چودھری

آپ نے کتے کے پلے کو گیند کے ساتھ کھیلتے یا بلی کے بچے کو اُون کے گولے پر چھلانگ لگاتے اور اپنے پنجوں سے لڑھکاتے دیکھا ہوگا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جانور بھی کھیل کود کو پسند کرتے ہیں۔ یورپین ملک ہالینڈ کے دارالحکومت ایمسٹرڈم کے چڑیا گھر میں ”ہپوپوٹے مس“ دریائی گھوڑے کا ایک بچہ تھا۔ ایک دن اس کے تالاب میں درخت کا ایک پتہ آ گرا۔ ہپو نے پانی میں غوطہ لگایا اور جس جگہ پتا تیر رہا تھا۔ اس کے نیچے جا کر زور سے پھونک ماری۔ پتا ہوا میں اڑنے لگا۔ جب یہ پتا واپس نیچے کی طرف آیا تو ہپو نے پھر غوطہ لگایا اور جوں ہی پتا پانی کی سطح کے قریب آیا، اس نے پھر زور سے پھونک ماری۔ پتا اچھل کر ہوا میں اڑنے لگا۔ ہپو یہ کھیل کافی دیر تک کھیلتا رہتا اور لوگ کھل کھلا کر ہنستے اور تالیاں بجاتے رہتے۔



تقریباً تمام جنگلی جانور چاہے چھوٹے ہوں یا بڑے کوئی نہ کوئی کھیل ضرور کھیلتے ہیں۔ جنگلی چوہے دائرہ بنا کر ناچتے ہیں اور پھر ایک ساتھ اس طرح ہوا میں چھلانگ لگاتے ہیں جیسے بیلے ڈانسر چھلانگ لگاتی ہے۔ سمندری جہازوں کے ملاح نے دیو جیسی وہیلوں کو دیکھا ہے جو مداری کی طرح سمندری گھاس کا گچھا سر پر رکھ کر تیرتی ہیں اور جب گچھا پانی میں گرتا ہے تو اسے پکڑ کر پھر سر پر رکھ لیتی ہیں۔

جنگلی جانوروں کے بعض کھیل ہمارے کھیلوں سے ملتے جلتے ہیں۔ افریقا کے جنگلوں میں ایک قسم کی دیمک پائی جاتی ہے جو اپنے رہنے کے لیے زمین کے اندر بل بناتی ہے۔ (اس بل میں وہ لاکھوں کی تعداد میں رہتی ہیں) بل کھودنے سے جو مٹی باہر نکلتی ہے۔ اس سے بل کے منہ پر پہاڑی سی بن جاتی ہے۔ اب شیر کے بچوں میں مقابلہ ہوتا ہے کہ کون پہلے دوڑ کر اس پہاڑی پر چڑھتا ہے جو بچہ سب سے پہلے پہاڑی پر چڑھتا ہے۔ وہ جیت جاتا ہے۔ شیر کے بچوں کا یہ کھیل یورپ اور امریکا کے بچوں کے ایک کھیل ”کنگ آف دی ہل“ (پہاڑی کا بادشاہ) سے ملتا جلتا ہے۔

لیکن جنگلی جانوروں کے بعض کھیل ایسے ہیں جنھیں کھیلنے کا ہم تصور بھی نہیں کر سکتے۔ مثلاً نوجوان ہاتھیوں کا پسندیدہ کھیل جو آپ کھیلیں گے تو اپنا سر تڑوا بیٹھیں گے۔ اس کھیل میں دو نوجوان ہاتھی حصہ لیتے ہیں۔ دونوں آمنے سامنے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ پھر آہستہ آہستہ پیچھے ہٹتے ہیں اور جب پندرہ بیس فٹ پیچھے ہٹ جاتے ہیں تو ایک دم دوڑ کر آگے آتے ہیں اور اتنے زور سے ایک دوسرے سے ٹکراتے ہیں کہ اس کے دھماکے سے سارا جنگل گونج اٹھتا ہے۔



ہاتھیوں کا ایک اور دلچسپ کھیل کُشتی ہے۔ دو جوان ہاتھی

مستک سے مستک ملا کھڑے ہو جاتے ہیں (مستک ہاتھی کے ماتھے کو کہتے ہیں) پھر جو ایک دوسرے کو پیچھے دھکیلنے میں کامیاب ہو جاتا ہے وہ جیت جاتا ہے۔

جب بارش ہوتی ہے تو ہاتھی گولا پھینکنے کا کھیل کھیلتے ہیں۔ وہ سونڈ سے گیلی مٹی کے گولے بناتے اور انھیں اچھال کر زیادہ سے زیادہ دور پھینکنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کا یہ کھیل ایتھلیٹکس کے ایک کھیل "شاٹ پٹ" سے ملتا جلتا ہے۔

ہاتھیوں کا ایک اور پسندیدہ کھیل ہے۔ تالاب میں لوٹنیاں لگانا اور سونڈ میں پانی بھر کر ایک دوسرے پر پھینکنا۔

دوسرے جنگلی جانور بھی طرح طرح کے کھیل کھیلتے ہیں۔ چمگادڑیں عام طور پر اندھیرے غاروں اور ویران عمارتوں میں رہتی ہیں۔ یہ جب موج میں آتی ہیں تو ادھر اُدھر اڑتی ہیں۔ اور ایک دوسرے کے پَر مار کر اسے گرانے کی کوشش کرتی ہیں۔

سیہی زمین پر لوٹ پوٹ کر گیند سی بن جاتی ہے اور اِدھر اُدھر لڑھکتی پھرتی ہے۔ اور بلاؤ (Beaver) جاپانی کُشتی لڑتے ہیں۔ دو اود بلاؤ منہ سے منہ اور جسم سے جسم ملا کر کھیلتے ہیں۔

ایک امریکی ماہر حیوانات، ڈیان فوسی، تیرہ سال یوگنڈا کے جنگلوں میں گوریلوں کے درمیان رہی تھی۔ اس کا کہنا ہے کہ گوریلوں کے بچے انسانوں کے بچوں کی طرح قسم قسم کے کھیل کھیلتے ہیں۔ ان کا ایک دلچسپ کھیل ہمارے فٹ بال سے ملتا جلتا ہے۔ ایک گوریلا زمین پر گرے ہوئے پھل کو کِک لگاتا ہے۔ سارے گوریلے اس کے پیچھے دوڑتے ہیں۔ اور جو پہلے پھل کے پاس پہنچ جاتا ہے وہ اسے کِک لگاتا ہے۔ یہ کھیل کافی دیر تک جاری رہتا ہے اور جنگل کھلاڑیوں کی چیخوں سے گونج اٹھتا ہے۔

بندروں میں سب سے زیادہ کھلنڈرے بندر چیمپینزی ہیں۔ ان کی اکثر عادتیں انسانوں سے ملتی جلتی ہیں۔ ان کا ایک دلچسپ کھیل گُدگُدی ہے۔ چیمپینزی کے بچے ایک دوسرے کی ٹھوڑی کے نیچے یا پیٹ یا پیروں میں ہاتھوں سے گُدگُدی کرتے ہیں اور جس کو گُدگُدی کی جاتی ہے۔ وہ چیخ چیخ کر سارا جنگل سر پر اٹھا لیتا ہے۔

ایک انگریز ماہر حیوانات جین گڈآل نے تنزانیہ کے جنگلوں میں گھوم پھر کر چیمپینزیوں کی عادتوں کا مطالعہ کیا تھا۔ اس کا کہنا ہے کہ بڑے چیمپینزی بھی اپنے بچوں کے ساتھ کھیل کود میں شریک ہوتے ہیں۔ بچے ان پر چھلانگیں لگاتے اور ان کی گردن کو دانتوں سے گدگداتے ہیں تو وہ ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہو جاتے ہیں۔

بعض جنگلی جانور اپنے بچوں کے ساتھ کھیلتے کودتے ہیں تو بعض انھیں خاموشی سے کھیلتا ہوا دیکھتے ہیں اور کسی حد تک ان کی شوخیاں اور شرارتیں برداشت کرتے ہیں۔

گینڈے کے بچے اپنی ماں کے گرد چکر لگاتے ہیں اور پھر اچانک اس کے پہلو میں زور سے ٹکر مارتے ہیں۔ ان کی ماں دو تین بار تو ان کی یہ شوخی چپ چاپ سہ لیتی ہے۔ لیکن جب وہ حد سے بڑھتے ہیں تو غرا کر انھیں خبردار کرتی ہے۔ بچے سہم کر بیٹھ جاتے ہیں اور کھیل ختم ہو جاتا ہے۔

سائنس دانوں کا کہنا ہے کہ حیوانوں کے بچوں میں کھیل کود کی جبلّت قدرت کی طرف سے دی گئی ہے۔ کھیل کود سے ان کے پٹھے مضبوط ہوتے ہیں، جسم میں چستی اور پھُرتی آتی ہے اور دماغ کی نشوونما ہوتی ہے اور جب وہ جوان ہوتے ہیں تو انھیں خوراک حاصل کرنے اور اپنے آپ کو دشمنوں سے بچانے کے لیے انہی چیزوں کی ضرورت پڑتی ہے۔ کھیل کود سے جانوروں کو اپنے ماحول سے واقف ہونے اور اپنے خاندان کے دوسرے جانوروں سے دوستی کرنے کا موقع بھی ملتا ہے۔ بہر حال کھیل کود کا یہ مقصد بھی ہو سکتا ہے۔ لیکن سائنس دانوں کا کہنا ہے کہ بعض اوقات جانور صرف تفریح کے لیے بھی کھیلتے ہیں۔ جسم اور دماغ کو چاق چوبند رکھنے کے لیے تفریح بھی ضروری ہے۔

حوالہ جات

☆ جانوروں اور پرندوں کی حیرت انگیز دنیا کا انسائیکلو پیڈیا..... خان اکبر علی خان

☆ جانوروں کا انسائیکلو پیڈیا..... احسان ملک

☆ ہمدرد سائنس انسائیکلو پیڈیا..... ہمدرد فاؤنڈیشن

سیاست کے نامی گرامی حریف

پاکستان اور بھارت جب میدانِ کرکٹ میں ٹکرائے

۱۹۷۸ء کی تاریخ ساز سیریز کا دلچسپ احوال جو اٹھارہ سال کے طویل وقفے کے بعد کھیلی گئی اور جس میں پاکستانی فتح یاب ٹھہرے

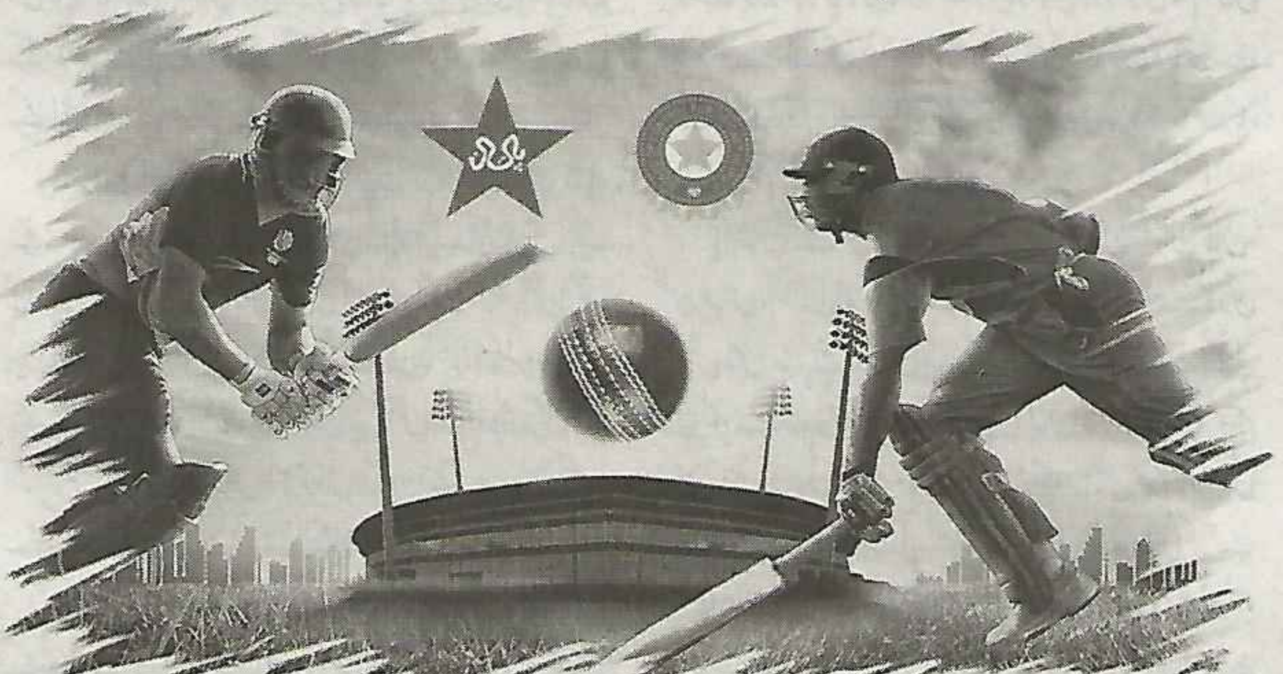
عاصم محمود

یہ اکتوبر ۱۹۵۲ء کی بات ہے جب پاکستان کرکٹ ٹیم پہلے دورے پر اپنے پڑوسی، بھارت پہنچی۔ تب سے دونوں ممالک کے مابین "سولہ ٹیسٹ سیریز" کھیلی جا چکیں۔ مگر سیاسی اختلافات کے باعث اکثر درمیان میں طویل وقفے آتے رہے، اسی لیے دونوں پڑوسی پچھلے تریسٹھ برس میں صرف ۵۸ ٹیسٹ ہی کھیل پائے۔ (ان میں بارہ پاکستان جبکہ نو بھارت نے جیتے۔)

پاکستان اور بھارت کے مابین آخری ٹیسٹ ۸ تا ۱۲ دسمبر ۲۰۰۷ء کو بنگلور میں کھیلا گیا تھا۔ گویا پچھلے آٹھ برس سے دونوں ممالک کی کرکٹ سیریز منعقد نہیں ہوئی۔ حالانکہ دونوں ملکوں میں کرکٹ کروڑوں لوگوں کا پسندیدہ کھیل ہے۔ پھر پاکستان اور بھارت کے مابین ٹیسٹ ہو یا ٹی ٹوئنٹی مقابلہ، ہر مقابلہ نہایت ذوق وشوق سے دیکھا جاتا ہے۔ اس موقع پر شائقین کا جوش وخروش دیدنی ہوتا ہے۔

کرکٹ تاریخ عیاں کرتی ہے کہ پاکستان اور بھارت کے مابین ایک بار تقریباً "اٹھارہ سال" تک کوئی ٹیسٹ نہیں کھیلا گیا۔ یہ عرصہ دسمبر ۱۹۶۰ء سے اکتوبر ۱۹۷۸ء تک محیط رہا۔ بھارتی ٹیم نے ۱۹۶۵ء میں پاکستان کا دورہ کرنا تھا مگر اسی اثنا میں سرحدی جھڑپیں شروع ہو گئیں۔ بعد ازاں جنگ ۱۹۶۵ء کی وجہ سے دونوں ممالک کے مابین خلیج بہت بڑھ گئی۔

۱۹۷۱ء کی جنگ نے دونوں پڑوسیوں میں دشمنی مزید بڑھا دی۔ اس ماحول میں کرکٹ سیریز منعقد ہونا بہت کٹھن تھا۔ آخر ۱۹۷۵ء میں پاکستان بھارت کے کرکٹ بورڈوں میں بات چیت کا



دور شروع ہوا۔ دونوں سیریز کھیل کر تعلقات معمول پر لانا چاہتے تھے۔ لیکن بھارتی کرکٹ بورڈ اپنے وعدوں پر پورا نہیں اتر سکا۔

وجہ یہ تھی کہ وزیراعظم اندرا گاندھی نے بھارت میں ایمرجنسی نافذ کر دی۔ چناں چہ اگلے دو تین سال تک بھارت سیاسی ہلچل کا نشانہ بنا رہا۔ اواخر ۱۹۷۶ء میں کرکٹ سیریز کھیلنے کے سلسلے میں بات چیت پھر شروع ہوئی۔ چونکہ سولہ سال پہلے پاکستانیوں نے بھارت کا دورہ کیا تھا، اس لیے طے پایا کہ بھارتی کرکٹ ٹیم پاکستان کا دورہ کرے گی۔

لیکن اب پاکستان میں سیاسی ہلچل شروع ہو گئی۔ جولائی ۱۹۷۷ء میں فوج نے بھٹو حکومت کا تختہ الٹا اور جنرل ضیاالحق برسر اقتدار آ گئے۔ اُدھر بھارت میں انتخابات ہوئے، تو اندرا گاندھی شکست کھا گئیں اور مرار جی ڈیسائی وزیراعظم بن بیٹھے۔ تاہم دونوں نئی حکومتوں نے کرکٹ سیریز کھیلنے کی منظوری دے دی۔ یوں برصغیر پاک و ہند کے کروڑوں شائقین کو معلوم ہوا کہ ستمبر نومبر ۱۹۷۸ء میں پاکستانی و بھارتی کرکٹ ٹیموں کا رن پڑے گا۔

اس خبر کو دونوں ممالک کے میڈیا نے بہت نمایاں کیا۔ اسی لیے ماہ ستمبر میں بھارتی کرکٹ ٹیم لاہور ہوائی اڈے پہنچی، تو وہاں اس کا پُرتپاک استقبال ہوا۔ ائیرپورٹ پر کئی غیر ملکی اخبارات کے نمائندے بھی موجود تھے۔ سبھی کو توقع تھی کہ اب دونوں ٹیموں کے مابین کانٹے دار مقابلے دیکھنے کو ملیں گے۔

اس سیریز سے قبل پاک بھارت نے ۱۵ ٹیسٹ کھیلے تھے۔ بھارت نے دو جبکہ پاکستان نے ایک میچ جیتا۔ بقیہ ٹیسٹ برابر رہے۔ بھارتی ٹیم کی قیادت لیگ اسپنر بشن سنگھ بیدی کر رہے تھے۔ ان کا بالنگ اٹیک تین نامور اسپنروں..... چندر شیکھر، پرسنا اور وینکٹ رگھوان پر مشتمل تھا۔ وہ خود بھی مایہ ناز اسپنر تھے۔ ان چاروں اسپنروں نے ۷۰۰ سے زائد وکٹیں لے رکھی تھیں۔ وہ اپنے زمانے کے بہترین اسپنر تھے۔

گویا بالنگ بھارتی کرکٹ ٹیم کی طاقت تھی۔ تاہم ان کے بلے باز بھی کم نہ تھے۔ ان کی قیادت سنیل گواسکر اور گنڈاپا وشوا ناتھ کے سپرد تھی..... چیتن چوہان، مہندر ناتھ اور وینگ سارکر اور دیگر نمایاں بلے باز تھے۔ بس فاسٹ بالروں کی کمی مہمانوں کا کمزور پہلو ثابت ہوئی۔

بھارتی تیز رفتار بالروں میں مدن لال تجربے کار تھے۔ کرشن گھاوری عمدہ بالر کی حیثیت سے ابھر رہا تھا۔ تاہم یہ دونوں میڈیم پیسر تھے۔ ان کی اصل ذمے داری یہ تھی کہ گیند کو پرانی بنا دیں تاکہ وہ پھر اسپنروں کے کام آ سکے۔ بھارتی اسکواڈ میں ۱۹ سالہ کپل دیو بھی شامل تھے۔ ان کی رفتار مدن لال اور گھاوری سے زیادہ تیز تھی، مگر تب ناتجربہ کاری کے باعث وہ عمدہ کارکردگی نہیں دکھا سکے۔

دوسری طرف پاکستان کرکٹ ٹیم ابتری کا نشانہ بنی ہوئی تھی..... دراصل اس زمانے میں آسٹریلوی صنعت کار، کیری پیکر نے ''ورلڈ کرکٹ سیریز'' شروع کر رکھی تھی۔ کرکٹ کے عالمی ادارے، آئی سی سی نے اس سیریز کو غیر قانونی قرار دے دیا۔ مگر کیری پیکر اپنی کرکٹ سیریز میں کھیلنے والے کھلاڑیوں کو پُرکشش معاوضے دے رہا تھا، اس لیے کئی کھلاڑی میچ کھیلنے آسٹریلیا پہنچ گئے۔

مثال کے طور پر تقریباً پوری آسٹریلوی ٹیم کیری پیکر کی ورلڈ کرکٹ سیریز میں جا شامل ہوئی۔ چناں چہ آسٹریلوی کرکٹ بورڈ کو ناچار ریٹائرڈ کھلاڑی واپس بلوا کر نئی ٹیم تشکیل دینا پڑی۔ جب سبھی کرکٹ بورڈوں نے کھلاڑیوں کو ہاتھ سے جاتے دیکھا، تو اعلان کر ڈالا کہ جس نے کیری پیکر کا ساتھ دیا، اسے قومی ٹیم سے نکال دیا جائے گا۔

پاکستان سے بھی پانچ کھلاڑی..... ماجد خان، عمران خان، ظہیر عباس، مشتاق محمد اور آصف اقبال آسٹریلوی صنعت کار کی آغوش میں جا پہنچے۔ چناں چہ پاکستانی کرکٹ بورڈ نے انھیں قومی ٹیم سے خارج کر دیا۔ قومی ٹیم کی کمان پھر وکٹ کیپر وسیم باری کے سپرد ہوئی۔ تاہم وہ آنے والے میچوں میں عمدہ کارکردگی نہیں دکھا سکے۔ جب بھارتی ٹیم پاکستان پہنچی، تو پاکستانی کرکٹ بورڈ کو احساس ہوا کہ وہ خاصی مضبوط ہے۔ اور کمزور پاکستانی ٹیم اس کا مقابلہ نہیں کر پائے گی۔ چناں چہ اس نے درج بالا اپنے

پانچوں بڑے کھلاڑیوں پر عائد پابندی اٹھا لی۔ یوں وہ راتوں رات زیرو سے ہیرو بن گئے۔

بھارتی کرکٹ ٹیم کی پاکستان آمد نے عوام میں بہت جوش وخروش پیدا کر دیا۔ بھارتی کپتان، بیدی اور پاکستانی ٹیم کے کپتان، مشتاق محمد مشہور ٹی وی چینل، اسٹوڈیو ۹ میں شریک ہوئے۔ اس موقع پر انھوں نے اپنے مزاح اور دلچسپ گفتگو سے ناظرین کو خوب محظوظ کیا۔

بھارتیوں نے پہلے "وارم اپ" ہونے کے لیے کراچی اور پشاور میں مقامی ٹیموں سے میچ کھیلے۔ پھر وہ پہلا ایک روزہ بین الاقوامی میچ کھیلنے کوئٹہ کے ایوب اسٹیڈیم پہنچے۔ چھوٹا سا اسٹیڈیم تماشائیوں سے بھرا ہوا تھا۔ بھارتیوں نے ۴۰ اوور میں ۱۷۰ رنز بنائے۔ آل راؤنڈر مہندر امرناتھ نے ۵۱ رنز کی عمدہ اننگ کھیلی ..... پاکستانی عام سے اسکور کا تعاقب کرتے ہوئے افراتفری کا شکار ہو گئے۔ چناں چہ وہ پہلا ایک روزہ میچ چار رنز سے ہار گئے۔ صرف ماجد خان نے نصف سنچری بنائی۔

دوسرا ون ڈے انٹرنیشنل سیالکوٹ کے جناح اسٹیڈیم میں کھیلا گیا۔ اس کی پچ پر سبزہ لہرا رہا تھا۔ بھارتیوں نے پہلے بلے بازی کی۔ سرفراز نواز، سلیم الطاف، سکندر بخت اور حسن جمیل نے بھارتی بلے بازوں کا بھرکس نکال دیا۔ وہ صرف ۹۷ رنز بنا پائے۔ زخمی ہونے کے باعث عمران خان میچ نہ کھیل سکے۔ پاکستان نے صرف سولہ اووروں میں ٹارگٹ حاصل کر لیا۔ ظہیر عباس نے بھارتی بالروں کی ٹھکائی کی اور ۴۸ رنز بنائے۔ اب تیسرا اور نتیجہ خیز ایک روزہ مقابلہ دوسرے ٹیسٹ کے بعد ساہیوال میں کھیلا جانا تھا۔

پہلا ٹیسٹ ۱۶ تا ۲۱ اکتوبر ۱۹۷۸ء

فیصل آباد کے نئے تعمیر شدہ اقبال اسٹیڈیم میں پہلا ٹیسٹ منعقد ہوا۔ گو میدان سبز گھاس سے بھرا ہوا تھا۔ مگر پچ پر سبزے کا نام ونشان نہ تھا۔ پاکستان نے ٹاس جیت کر پہلے بلے بازی کی اور پہلی اننگ میں ۵۰۳ رنز کا پہاڑ کھڑا کر دیا۔ ظہیر عباس اور جاوید میاں داد نے سنچریاں بنائیں۔ بھارتی اسپنر پاکستانی دفاع جلد نہ توڑ سکے۔

اب پاکستانی تیز رفتار بالروں کا امتحان تھا، مگر وہ بھی توقعات پر پورے نہ اترے۔ بھارتیوں نے پہلی اننگ میں ۴۶۲ رنز بنا ڈالے۔ وشواناتھ نے سنچری بنائی۔ دراصل وکٹ بالکل بے جان تھی، اس پر گیند سوئنگ نہ ہوئی۔ ایک دفعہ تو عمران خان نے ناراضی سے پچ کو ٹھوکر ماردی۔ زچ ہو کر سرفراز اور عمران شارٹ پچ گیندیں کرانے لگے مگر ان سے کوئی فائدہ نہ ہوا۔ پاکستانیوں کی فیلڈنگ بھی مایوس کن رہی، انھوں نے چھ کیچ گرائے۔

پاکستانیوں نے دوسری اننگ میں بھی بڑا اسکور کیا۔ آصف اقبال نے سنچری ماری، ظہیر عباس نے ۹۴ رنز بنا ڈالے۔ مگر مردہ وکٹ کی وجہ سے پہلا ٹیسٹ نتیجہ خیز ثابت نہ ہو سکا۔ میچ کے بعد عمران خان نے ایک ٹی وی انٹرویو میں پچ کو شدید تنقید کا نشانہ بنایا۔

دوسرا ٹیسٹ ۲۷ اکتوبر تا ۱ نومبر ۱۹۷۸ء

اب بھارتی اور پاکستانی ٹیمیں لاہور پہنچیں جہاں دوسرا ٹیسٹ کھیلا جانا تھا۔ عمران اور سرفراز نواز کے دباؤ پر مشتاق محمد نے پاکستان کرکٹ بورڈ پر زور دیا کہ لاہور میں تیز رفتار پچ بنائی جائے۔ وجہ یہی کہ تیز رفتار بالر پاکستانی ٹیم کی طاقت تھے۔ بورڈ نے اس حقیقت کا اعتراف کرتے ہوئے تیز رفتار پچ ہی بنوائی۔

جب تماشائیوں کا جم غفیر قذافی اسٹیڈیم پہنچا، تو انھوں نے دیکھا کہ پچ پر بھی خوب گھاس موجود ہے۔ اس میں اچھال (باؤنس) موجود تھا اور گیند سوئنگ کرنے کی صلاحیت بھی۔ بیدی کے ساتھ ٹاس کی خاطر جاتے ہوئے مشتاق محمد نے آصف اقبال کو بتایا: "اگر ٹاس میں نے جیتا تو ہم فیلڈنگ کریں گے۔ میرا خیال ہے، پچ کی بظاہر شگفتگی زیادہ عرصے نہیں رہے گی۔" ماجد خان نے اپنی آپ بیتی میں لکھا ہے، مشتاق محمد کرکٹ پچ کی ماہیت سمجھنے والے بہترین کھلاڑیوں میں شامل تھے۔

مشتاق ہی نے ٹاس جیتا، چناں چہ بھارتی بیٹنگ کرنے لگے۔ بھارتی ٹیم میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔ تاہم پاکستانی ٹیم میں صادق محمد کی جگہ مدثر نذر اور سکندر بخت کے بجائے سلیم

الطاف کو کھلایا گیا۔

حسب توقع پاکستانی بالروں نے مہمانوں کو تگنی کا ناچ نچا دیا۔ وہ صرف ۱۹۹ رنز بنا سکے۔ عمران اور سرفراز نے چار چار کھلاڑی آؤٹ کیے۔ صرف دلیپ وینگ سارکر ہی ۷۶ رنز بنا کے کچھ مزاحمت کر سکے۔ مہندر ناتھ امرناتھ کے منہ پر عمران خان کی گیند لگ گئی۔ انھیں اسٹریچر پر لٹا کر اسپتال پہنچایا گیا۔

مشتاق محمد کی پیشین گوئی درست ثابت ہوئی اور پہلے دن کے آخر تک وکٹ شکست و ریخت کا شکار ہو گئی۔ دوسرے دن پاکستانی کھل کر کھیلے اور ۵۳۹ رنز بنا ڈالے۔ ظہیر عباس نے مشہور بھارتی اسپنروں کو خوب پیٹا۔ انھوں نے ۲۹ چوکوں اور دو چھکوں کی مدد سے ۲۳۴ رنز بنائے۔ وسیم باری (۸۵) اور مشتاق محمد (۶۷) نے ظہیر کا خوب ساتھ دیا۔ یوں پاکستان کو ۳۴۰ رنز کی برتری حاصل ہو گئی۔

بھارتی دوسری اننگ کھیلنے پہنچے، تو وکٹ خاصی ٹوٹ پھوٹ چکی تھی۔ تاہم انھوں نے صبر کا ثبوت دیا اور ٹک ٹک کرتے وکٹ پر جمے رہے۔ چناں چہ بھارت کے پہلے چار بلے بازوں نے نصف سنچریاں بنائیں۔ بھارتی یہ میچ بھی ڈرا کرنا چاہتے تھے۔ میچ کا آخری دن شروع ہوا، تو بھارت پانچ وکٹوں پر ۴۰۷ رنز بنا چکا تھا۔ جبکہ وشواناتھ وکٹ پر چٹان کی طرح کھڑا تھا۔ سبھی کو یقین تھا کہ یہ ٹیسٹ بھی برابر رہے گا۔

تبھی ایک کرشمہ ظہور پذیر ہوا۔ مشتاق محمد نے نو آموز بالر، مدثر نذر کو بال دی۔ انھوں نے ایسی ''ان کٹر'' گیند کرائی کہ وہ وشواناتھ کا دفاع پاش پاش کرتی وکٹوں سے جا ٹکرائی۔ یوں بقیہ بھارتی کھلاڑیوں کو آؤٹ کرنے کی راہ کھل گئی۔

بھارتی وکٹ کیپر سید کرمانی نے جوابی حملہ کیا اور پاکستانی بالروں کو چوکے مارے۔ وہ وقت گزارنے میں بھی کامیاب رہے۔ لیکن پاکستانیوں نے بھی حوصلہ برقرار رکھا۔ آخر عمران نے آخری بھارتی کھلاڑی کو آؤٹ کر دیا۔ اب جیتنے کے لیے پاکستان کو ۲۵ اوور میں ۱۲۵ رنز بنانے تھے۔

جب لاہوریوں کو محسوس ہوا کہ پاکستانی بلے باز یہ ٹارگٹ حاصل کر سکتے ہیں، تو وہ جوق در جوق اسٹیڈیم آنے لگے۔ بیدی نے انتہائی دفاعی فیلڈنگ کھڑی کی اور بالروں کو کہا کہ وہ بلے سے دور گیندیں کرائیں۔

ماجد خان اور مدثر نذر رنذر نے پاکستانی اننگ شروع کی۔ کپل دیو نے باؤنسر مارے اور لیگ سائڈ پر گیندیں پھینکیں۔ آغاز میں پاکستانی ہوا میں بلا گھماتے رہے، مگر پھر ماجد بھارتیوں کو پیٹنے لگے۔ ایک دفعہ ماجد خان کپل سے ناراض ہو گئے۔ انھوں نے لیگ سٹمپ اکھاڑی اور اشارہ کیا کہ اسے لیگ سائیڈ کی طرف لگانا چاہیے۔ امپائر نے ماجد کو انتباہ کیا کہ وہ آئندہ ایسی حرکت نہ کریں۔

جب اسکور ۵۷ پر پہنچا، تو مدثر آؤٹ ہو گئے۔ ماجد اور ظہیر عباس نے تیز کھیلنا جاری رکھا۔ جب اسکول ۹۵ پر پہنچا، تو ماجد بھی پویلین سدھارے۔ اب سات اووروں میں ۳۵ رنز جیت کے لیے درکار تھے۔ خوش قسمتی سے آصف اقبال اور ظہیر عباس نے چوکے مار کر پاکستانی کشتی منزل تک پہنچا دی۔ وہ آج کی طرح چوکے چھکے مارنے کا زمانہ نہیں تھا، اس لیے تیز کھیل کر پاکستانیوں نے کارنامہ کر دکھایا۔

پاکستان نے اٹھائیس سال بعد بھارت کو شکست دی تھی۔ پاکستانی تو خوشی کے مارے پاگل ہو گئے۔ حتیٰ کہ حکومت بھی اس فتح سے اتنی جذباتی ہوئی کہ اگلے دن قوم کو چھٹی کا اعلان عطا کر دیا۔

تیسرا ''ناخوشگوار'' ایک روزہ میچ

بھارت اور پاکستان ایک ایک ون ڈے جیت چکے تھے۔ اب وہ تیسرا ایک روزہ کھیلنے ساہیوال کے ظفر علی اسٹیڈیم پہنچے۔ لاہور میں پاکستان کی ڈرامائی جیت نے پاکستانی ٹیم کے حوصلے بلند کر دیے تھے۔ ادھر بھارتی ٹیم خاصی افسردہ تھی۔ تاہم وہ تیسرا ون ڈے جیت کر اپنی ہمت جوان کرنا چاہتی تھی۔

پچ پر کچھ گھاس موجود تھی اور وہ بالروں کی دوست دکھائی دیتی۔ بھارت نے ٹاس جیت کر پاکستان کو کھیلنے کی دعوت دی۔ پاکستانیوں

نے عمدہ کھیل پیش کیا اور ۴۰ اوور میں ۲۰۵ رنز بنائے۔ آصف اقبال نے خصوصاً کپل دیو کی خاصی پٹائی کی اور ۶۷ رنز بنائے۔

بھارت نے بھی جارحانہ انداز میں کھیل کا آغاز کیا۔ جب ۳۵ اوور ختم ہوئے، تو وہ صرف دو وکٹوں کے نقصان پر ۱۸۰ رنز بنا چکے تھے۔ گویا انھیں جیت کے لیے صرف ۲۵ رنز درکار تھے۔ تب مشتاق محمد اپنے دونوں تیز رفتار بالروں، سرفراز اور عمران سے گیندیں کروانے لگے۔

سرفراز نواز پنجابی میں بھارتی بلے بازوں سے چھیڑ خانی کر رہا تھا۔ اس کی کوشش تھی کہ ان کا دھیان بٹ جائے اور وہ آؤٹ ہو جائیں۔ وہ پھر انھیں باؤنسر کرانے لگا۔ اس زمانے میں یہ قانون موجود نہ تھا کہ ایک بالر اوور میں کتنے باؤنسر کرائے۔ لہٰذا گیندیں شائیں شائیں کرتی بھارتی بلے بازوں کے کانوں کے قریب سے گزرنے لگیں اور امپائر بالروں کو کچھ نہ کہتے۔ عمران خان بھی شارٹ پچ گیندیں کرنے لگے جو بھارتیوں سے کھیلی نہ جاتیں۔

غرض باؤنسروں کی یلغار نے بھارتی بلے بازوں کو باندھ کر رکھ دیا۔ اب رنز بمشکل بننے لگے۔ آخرکار بھارتی بلے باز، انومن گائیکواڑ نے امپائروں کو اشارہ کیا۔ انھوں نے مشتاق محمد سے گفتگو کی اور انھیں کہا کہ پاکستانی بالر "منفی لائن" پر بالنگ نہ کرائیں۔

تاہم مشتاق محمد کا استدلال یہ تھا کہ ان کے بالر جارحانہ بالنگ کرا رہے ہیں اور اس میں کوئی قباحت نہیں۔ جب ۳۷ویں اوور میں سرفراز کی چوتھی گیند بھی شوں کرتی گائیکواڑ کے قریب سے نکلی، تو بھارتی کپتان بشن سنگھ بیدی میدان میں آ گیا اور مشتاق محمد سے باتیں کرنے لگا۔

ہمیں یہ معلوم نہیں کہ دونوں کپتانوں میں کیا گفتگو ہوئی، تاہم بیدی نے اپنے دونوں بلے بازوں کو ڈریسنگ روم جانے کا اشارہ کر دیا۔ کچھ دیر بعد مشتاق محمد بھارتیوں کے پاس گئے اور اصرار کیا کہ بھارتی بلے باز واپس میدان میں آ جائیں۔ مگر بیدی نے انکار کر دیا۔ اس نے پاکستانی کپتان پر الزام لگایا کہ انھوں نے اپنے بالروں کو باؤنسر پھینکنے کی اجازت دی اور یوں غیر مناسب اسپورٹس مین شپ کا مظاہرہ کیا۔

بیدی کا یہ بھی کہنا تھا کہ سرفراز اور جاوید میاں داد میدان میں بھارتی کھلاڑیوں پر ناشائستہ جملے کستے ہیں۔ چونکہ بیدی اپنی ٹیم کو میدان میں نہیں لائے۔ لہٰذا امپائروں نے پاکستان کے حق میں فیصلہ دے دیا۔ تاہم میچ خراب کرنے پر بھارتی اور پاکستانی میڈیا نے پاکستانی ٹیم کو تنقید کا نشانہ بنایا۔ گو بعض مبصّرین کا کہنا تھا کہ بیدی نے کچھ زیادہ ہی ردعمل دکھا دیا۔

تیسرا ٹیسٹ ۱۴ تا ۱۹ نومبر ۱۹۷۸ء

ساہیوال سے رخصت ہونے کے بعد بھارتیوں نے بہاولپور اور حیدر آباد میں دو سائڈ میچ کھیلے۔ چناں چہ بھارتی جب آخری ٹیسٹ کھیلنے کراچی پہنچے، تو ساہیوال میں جنم لینے والی بدمزگی کچھ کم ہو چکی تھی۔ بھارتیوں کو علم نہ تھا کہ کراچی ٹیسٹ میں بھی انھیں تاریخی اور عبرت ناک شکست ہونے والی ہے۔

کراچی کے نیشنل اسٹیڈیم کی پچ بھی اسپاٹ اور گھاس سے عاری بنائی گئی۔ عمران خان نے اپنی آپ بیتی میں لکھا ہے کہ پاکستان کرکٹ بورڈ اس ٹیسٹ کو بے نتیجہ دیکھنا چاہتا تھا تاکہ پاکستانی ٹیم سیریز جیت جائے۔ اس بار مشتاق محمد نے بھی تیز رفتار بالروں کو فائدہ دینے والی پچ بنانے پر اصرار نہیں کیا۔

بھارت نے پہلے بیٹنگ کی اور قابل ستائش ۳۴۴ رنز بنائے۔ وہ یقیناً زیادہ رنز بناتے مگر عمران اور سرفراز کی نپی تلی گیند بازی نے بھارتیوں کو کھل کر کھیلنے نہیں دیا۔ تاہم وہ سنیل گواسکر کو سیریز کی دوسری سنچری بنانے سے نہ روک سکے۔

پاکستانیوں کی اننگ کا آغاز اچھا نہیں ہوا اور انھوں نے ۱۸۷ رنز پر پانچ وکٹیں گنوا دیں۔ سیریز میں پہلی بار بھارتی لیگ بریک بالر، چندر شیکھر نے اپنی بالنگ کا جادو جگایا اور اس کی گھومتی گیندوں کو پاکستانی بلے باز کھیل نہ پائے۔ بھارتیوں کو یقین تھا کہ بقیہ پاکستانی کھلاڑی آؤٹ ہونے میں دیر نہ لگائیں گے۔

لیکن پھر جاوید میاں داد اور مشتاق وکٹ پر جم گئے۔ وہ سمجھ داری کے ساتھ کھیلے اور اسکور ۳۴۱ تک لے گئے۔ اس موقع پر

مشتاق ۷۸ رنز بنا کر آؤٹ ہو گئے۔ جاوید میاں داد نے اپنی اننگ جاری رکھی اور شاندار چھکا لگا کر سنچری مکمّل کی۔ پاکستانی بالروں نے اچھی بلے بازی دکھائی اور پاکستان نے قیمتی ۱۳۷ رنز کی برتری حاصل کر لی۔

بھارتی ٹیم نے دوسری اننگ میں بھی عمدہ کارکردگی دکھائی۔ میچ کا چوتھا دن ختم ہوا، تو وہ ۱۳۲ رنز بنا چکے تھے۔ پانچویں دن کپتان مشتاق نے عمران اور سرفراز پر زور دیا کہ وہ محنت اور ہمت کا مظاہرہ کریں۔ چناں چہ لنچ تک چھ بھارتی کھلاڑی آؤٹ کر لیے گئے۔

مگر سنیل گواسکر وکٹ پر جمے ہوئے تھے۔ انھیں گھاوری کی صورت اچھا ساتھی بھی مل گیا۔ وہ دونوں پاکستانی بالروں کو تنگ کرنے لگے۔ جواباً سرفراز اور جاوید نے زبانی جملوں کا حملہ شروع کر دیا۔ آخر ایک بار گواسکر پاکستانی کپتان کے پاس گیا اور کہا: ''میرا جتنا مذاق اڑا سکتے ہو، اڑا لو۔ مگر میرے ملک کی توہین نہ کرو۔ تاہم سرفراز نواز پنجابی میں پست قامت بھارتی بلے باز پر تیز و تند فقرے اچھالتے رہے۔

سنیل گواسکر اپنی آپ بیتی میں رقم طراز ہے ''مشتاق محمد نے جاوید میاں داد کو میرے نزدیک کھڑا کر دیا.....وہ نوجوان کبھی سیٹی بجاتا، کبھی بھارتی اور پاکستانی گانے گاتا اور کبھی مجھے سکھاتا کہ کیسے کھیلا جاتا ہے۔''

آخر سرفراز نواز نے گواسکر کو کیچ آؤٹ کرا دیا۔ گو وہ تیسری سنچری میں کامیاب رہا۔ اب کپل دیو میدان میں اترا۔ چائے کے وقفے تک کپل اور گھاوری ٹپ ٹپ کر کے وقت گزارتے رہے۔ چائے کا وقفہ ہوا، تو بھارت ۲۵۰ سے زائد رنز بنا چکا تھا۔ بیشتر لوگوں کا خیال تھا کہ یہ کیچ بھی ڈرا کی طرف گامزن ہے۔

تاہم وقفے کے بعد بھارتی ٹیم کی بقایا تین وکٹیں بہت جلد گر گئیں۔ اب پاکستان کو ۲۵ اوور میں ۱۶۴ رنز بنانے تھے۔ یہ لاہور ٹیسٹ سے زیادہ مشکل ٹارگٹ تھا۔ مشتاق محمد اپنی آپ بیتی میں رقم طراز ہیں ''ظہیر عباس نے مجھے کہا کہ ہمیں سست رفتار بلے بازی کرنی چاہیے تاکہ ٹیسٹ ڈرا ہو جائے۔ اگر ہم تیز کھیلے، تو میچ ہار سکتے ہیں۔''

مشتاق محمد نے پھر بقیہ سینئر کھلاڑیوں، آصف اقبال اور ماجد خان سے مشورہ کیا۔ ان کی رائے تھی کہ پاکستان کو میچ جیتنے کی کوشش کرنا چاہیے۔ چناں چہ ماجد اور آصف ہی نے اننگ کا آغاز کیا۔ بدقسمتی سے ماجد جلد آؤٹ ہو گئے مگر پاکستانیوں نے ہمت نہ ہاری۔

اب جاوید میاں داد میدان میں آئے۔ بھارتی بالر نپی تلی گیندیں کرا رہے تھے۔ آصف اور جاوید شارٹس مارنے کے بجائے ایک ایک، دو دو رنز لینے لگے۔ انھوں نے کئی بار خطرہ مول لیا اور ایسے وقت پہ بھی دوڑ پڑے جب وہ بآسانی آؤٹ ہو سکتے تھے۔ یوں سنگل اور دو رنز بنا کر نہ صرف انھوں نے اسکور میں اضافہ کرنا جاری رکھا بلکہ بھارتی بالروں کی خود اعتمادی بھی ریزہ ریزہ کر دی۔

پاکستان کا اسکور ۱۲۰ رنز تھا کہ بھارتی حملہ کامیاب ہوا اور آصف اقبال بیش قیمت ۴۴ رنز بنا کر آؤٹ ہو گئے۔ اب آخری پانچ اوور میں ۴۶ رنز درکار تھے۔ لوگوں کو امید تھی کہ اب ظہیر عباس آئیں گے، مگر مشتاق محمد نے ایک داؤ کھیلا اور عمران خان کو میدان میں بھجوایا۔ دراصل پچھلی اننگ میں عمران نے چوکے چھکے مار کر ۳۶ رنز بنائے تھے۔

عمران خان چلبلے جاوید کی طرح برق رفتار نہیں تھے۔ اس لیے رنز لینے کی کوشش کرتے ہوئے وہ آؤٹ ہوتے ہوتے بچے۔ مگر عمران جلد سنبھل گئے۔ انھوں نے پھر بشن سنگھ بیدی کو دو چھکے جڑ دیے۔ یوں دیکھتے ہی دیکھتے میچ پاکستان کی گرفت میں آ گیا۔ جب جاوید نے فاتحانہ اسٹروک لگایا، تو پورا اسٹیڈیم پاکستان زندہ باد کے جوشیلے نعروں سے گونج اٹھا۔ انھوں نے ہر چھوٹے بڑے پاکستانی کا لہو گرما دیا اور وہ جذبہ حب الوطنی سے سرشار ہو گئے۔

یہ وقت کا عجب کھیل ہے کہ جب بھارتی ٹیم پاکستان آنے والی تھی، تو پاکستان کرکٹ بورڈ میں یہی سوچا جا رہا تھا کہ سیریز کس طرح برابر کی جائے۔ مگر جب معتوب کھلاڑی پاکستانی ٹیم کا حصہ بنے، تو سبھی کھلاڑیوں نے ایسی عمدہ کارکردگی دکھائی کہ پاکستان ٹیسٹ اور ایک روزہ مقابلے، دونوں میں فاتح ٹھہرا۔

تاریخ کی ایک دلچسپ داستان

اورنگ زیب عالمگیر کا گمشدہ خزانہ

دو برطانوی غوطہ خوروں کی تحیّر انگیز جستجو نے انھیں ایک قیمتی خزانے تک پہنچا دیا

عالیہ فاطمہ



یہ ۱۷۰۲ء کی بات ہے، سورت سے ایک شاہی بحری جہاز سراندیپ (سری لنکا) کی سمت روانہ ہوا۔ سورت ہندوستانی ریاست گجرات کا دوسرا بڑا شہر اور سب سے بڑی بندرگاہ ہے۔ اس زمانے میں یہ شہر مغل بادشاہ اورنگ زیب عالمگیر کی سلطنت میں شامل تھا۔ اس شہر میں مغل حکومت نے ایک ٹکسال بھی قائم کر رکھی تھی جہاں سونے اور چاندی کے سکے ڈھلتے تھے۔

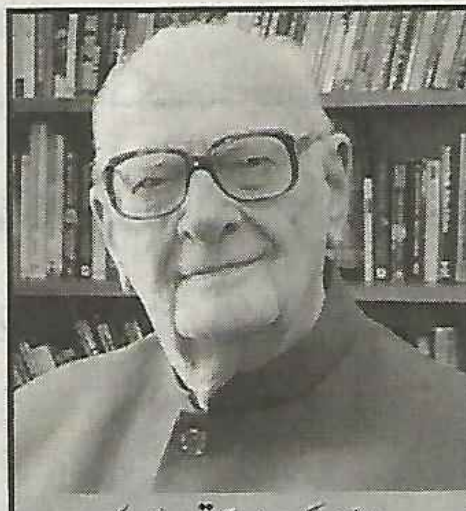
۱۷۰۲ء میں جو شاہی بحری جہاز سورت بندرگاہ سے نکلا، اس پر بھی چاندی کے لاکھوں سکے لدے تھے۔ یہ ایک روپے کے سکے تھے جو ۱۷۰۱ء میں ڈھالے گئے۔ یہ سکے تھیلوں میں بند تھے۔ ہر تھیلے میں ایک ہزار سکے رکھے گئے تھے۔

اس بحری جہاز کی آخری منزل کلکتہ تھی جہاں چاندی کے سکے اتارے جانے تھے۔ یہ سکے پھر علاقے کے مختلف شہروں اور قصبوں میں شاہی منصب داروں کو تقسیم کر دیے جاتے۔ سکوں کی حفاظت کے خیال سے جہاز پر چھوٹی بڑی توپیں بھی نصب تھیں تاکہ بحری قزاق حملہ نہ کر سکیں۔

یہ بحری جہاز جنوبی ہند کے ساحلی علاقوں سے ہوتا آخر کار سراندیپ پہنچ گیا۔ اس ملک میں ملنے والے قیمتی پتھر پوری دنیا میں مشہور تھے۔ ممکن ہے کہ جہاز کے عملے نے وہاں کچھ خرید و فروخت کی ہو۔ چند دن رک کر جہاز کلکتہ کی جانب روانہ ہو گیا۔ مگر عملے کو علم نہ تھا کہ ایک قدرتی آفت ان کی راہ تک رہی ہے۔

سراندیپ سے خلیج بنگال کی سمت چلیں تو پندرہ سولہ میل بعد سمندر کے نیچے واقع مرجان یا مونگے کی چٹانیں آجاتی ہیں۔ یہ چٹانیں سطح آب کے نیچے ہیں اسی لیے دکھائی نہیں دیتیں۔ خدا کا کرنا یہ ہوا کہ اسی علاقے میں ایک شدید سمندری طوفان نے جہاز کو آن دبوچا۔ عملے نے جہاز کو سنبھالنے کی سرتوڑ کوششیں کیں مگر وہ چٹانوں سے ٹکرا کر ٹوٹ پھوٹ گیا۔ جیسے ہی اس میں پانی بھرا، بحری جہاز تہ آب میں جا بیٹھا۔

اس زمانے کے مؤرخین نے اپنی کتب میں بیان نہیں کیا کہ عملہ جہاز پر کیا بیتی۔ کیا اُن میں کچھ خوش قسمت زندہ بچ گئے یا سبھی اپنی جانوں سے ہاتھ دھو بیٹھے؟ غالب امکان یہ ہے کہ عملے میں سے کوئی زندہ نہیں بچا۔ ان کے عزیز و اقارب بھی اپنے پیاروں کا انتظار کرتے کرتے مر کھپ گئے۔ یوں اورنگ زیب عالمگیر کا وہ شاہی بحری جہاز ایک سربستہ راز بن گیا جس پر کئی من چاندی کا خزانہ سکوں کی صورت موجود تھا۔ یہ راز ڈھائی صدیاں گزرنے کے بعد ہی افشا ہوا۔


برطانوی لکھاری آرتھر سی کلارک

برطانوی لکھاری کی آمد

برطانیہ میں آرتھر سی کلارک نامی ایک ادیب سائنسی موضوعات پر کہانیاں لکھتا تھا۔ یہ پہلا لکھاری ہے جس نے اپنی کہانیوں میں مواصلاتی سیاروں کا تصور پیش کیا جو بعدازاں حقیقت میں ڈھل گیا۔ یہ ۱۹۵۵ء کی بات ہے کہ آرتھر سی کلارک مختلف ممالک کی سیاحت کرتے سری لنکا پہنچے۔ قدرتی نظاروں سے مالامال یہ جزیرہ انھیں بہت پسند آیا۔ خاص طور پر سری لنکا کا موسم! برطانیہ میں شدید سردی تھی، تو سری لنکا میں سارا سال موسم معتدل رہتا۔

آرتھر سی کلارک سری لنکا پر ایسے فدا ہوئے کہ ۱۹۵۶ء میں انھوں نے سری لنکا کو اپنا گھر بنا لیا اور وہیں رہنے لگے۔ ان کا ایک دوست مائنک ولسن بحری جہاز میں ملازم تھا۔ اسے غوطہ خوری کا شوق تھا۔ اسی سے یہ شوق کلارک کو بھی لگ گیا۔ چنانچہ مائنک ولسن جب بھی سری لنکا آتا تو دونوں آس پاس کے سمندری علاقوں میں غوطہ خوری کرنے نکل جاتے۔ مونگے کی چٹانوں کے زیر آب علاقے ان کی پسندیدہ جگہ تھے۔

رفتہ رفتہ ان کے دیگر قریبی دوست مثلاً راڈنی مارش اور پیٹر بھی سری لنکا آ کر غوطہ خوری کرنے لگے۔ اس وقت تک مونگے کی چٹانوں کے علاقے میں روشنی کے دو منار تعمیر ہو چکے تھے۔ وہ بحری جہازوں اور وہاں سیر کے لیے آنے والوں کو راستہ دکھاتے تھے تاکہ وہ چٹانوں سے ٹکرا نہ پائیں۔

ایک بار راڈنی مارش اور مائنک ولسن میں ایک دلچسپ بحث چھڑ گئی۔ بحث یہ تھی کہ ماضی میں کئی بحری جہاز چٹانوں سے ٹکرا کر غرق ہو چکے۔ کیا اب ان میں سے کسی کا ڈھانچا محفوظ ہوگا؟ مائنک کا خیال تھا کہیں نہ کہیں غرق شدہ جہاز مل جائے گا۔ راڈنی کو اس امر سے انکار تھا۔

جب بحث طویل ہوگئی تو کلارک نے یہ تجویز پیش کی کہ چٹانوں والے علاقے میں گہرائی تک غوطہ خوری کی جائے۔ یوں دودھ کا دودھ پانی کا پانی ہو جائے گا۔ مسئلہ یہ تھا کہ سال کے بیشتر مہینے اس علاقے میں تیز ہوائیں چلتی ہیں۔ اسی لیے وہاں موجوں میں طغیانی رہنا عام بات ہے۔ اس طغیانی میں بڑے بحری جہاز تو چل سکتے ہیں، کشتی پر وہاں جانا موت کو دعوت دینے کے مترادف ہے۔ لہٰذا طے پایا کہ راڈنی اور مائنک دونوں ماہ اپریل میں پھر سری لنکا آئیں گے۔ اس مہینے ہوا ساکت ہوتی ہے اور سمندر بھی پُرسکون!

چنانچہ چھ ماہ بعد اپریل ۱۹۶۰ء میں راڈنی اور مائنک سری لنکا

پہنچ گئے تا کہ اپنی بحث کا نتیجہ نکال سکیں۔ آگے کی داستان آرتھر سی کلارک نے اپنی آپ بیتی میں بیان کی ہے۔ وہ آپ انہی کی زبانی پڑھیے۔

علی بابا سے دوستی

سری لنکا کے مشرقی ساحل پر قریبی بندرگاہ کرنڈہ ہے۔ وہاں سے منار کے عملے کی ضروریات ''فرعون'' نامی ایک دخانی کشتی کے ذریعے پوری کی جاتی ہیں۔ چنانچہ ہم غوطہ خوری کا سارا سامان لے کر اس کشتی میں وہاں پہنچ گئے۔ ہمارے واسطے منار میں ایک کمرا مخصوص کر دیا گیا تھا۔ مگر خدا کی پناہ! اس لمبے تڑنگے منار میں ایک کمرے سے دوسرے تک پہنچنے کے لیے سو سیڑھیاں چڑھنی پڑتی تھیں۔ پھر تمام کمرے گول تھے لہٰذا تین قدم چلنے کے بعد دیوار راہ میں حائل ہو جاتی۔

انتہا یہ ہے کہ ہماری مسہریاں بھی نیم دائرے کی شکل میں بچھی تھیں۔ ان پر سونا اور کروٹ بدلنا کارے دارد تھا۔ لیکن ٹھہرنے کی کوئی اور جگہ نہ تھی اس لیے مہم کا آغاز وہیں سے کیا گیا۔

ہم نے منار سے سو گز دور سمندر میں غوطہ لگایا اور تہ تک پہنچ گئے۔ ہماری ٹیم مجھ سمیت راڈنی اور مائک پر مشتمل تھی۔ پہلی ہی نظر میں ہمیں محسوس ہونے لگا کہ ہم کسی پرستان میں پہنچ گئے ہیں۔ کہیں غار تھے، تو کہیں سیپ سے مزین مکانات! مونگے کی رنگا رنگ وادیاں تھیں تو کہیں زمردیں مخمل کا بنا فرش۔ تہ آب مچھلیوں کا تو شمار ہی نہیں تھا۔ یہی حالت کچھوؤں کی تھی۔

سبھی سمندری جانور مرنج و مرنجاں تھے اور نہایت لاتعلقی سے ہر طرف گھومتے پھرتے۔ ہم نے کیمروں سے ان کی تصاویر کھینچیں مگر ان کے کانوں پر جوں تک نہ رینگی۔ شارک دنیا کی خطرناک ترین مچھلی سمجھی جاتی ہے۔ لیکن سری لنکا کے علاقے میں اس نے کبھی انسان پر حملہ نہیں کیا۔ ایک غار میں ہمیں بھاری بھرکم مچھلی نظر آئی۔ غار کی مناسبت سے ہم نے اس کا نام ''علی بابا'' رکھ دیا۔ چند ہی دن میں وہ مچھلی ہم سے اتنی مانوس ہو گئی کہ جب بھی ہم سمندر میں تیرتے یا غوطہ لگاتے، وہ ہمارے قریب آ جاتی۔

ہمیں اس علاقے میں غوطہ خوری کر کے لطف تو بہت آیا مگر کسی غرق شدہ جہاز کا پتا نہ چل سکا۔ اس لحاظ سے ہماری ساری محنت رائگاں گئی۔ البتہ ہم نے زیر آب جانوروں اور قدرتی مناظر کی جو تصاویر کھینچیں تھیں ان کی ہمیں اچھی قیمت موصول ہو گئی۔ یوں ہمارے سفر کا خرچ پورا ہو گیا۔

لیکن مائک ولسن نے ہار نہ مانی، اسے یقین تھا کہ چٹانوں کے علاقوں میں کسی بحری جہاز کا ڈھانچا ضرور مل جائے گا۔ چناں چہ اگلے سال وہ دوسری مہم کی تیاری کرنے لگا۔ مگر راڈنی اور میں اس مہم میں شریک نہ ہو سکے۔ راڈنی اس وقت آسٹریلیا تھا جبکہ میں نے اس مہم میں زیادہ دلچسپی نہ لی جو میری بدقسمتی تھی۔ مائک نے امریکی سفارت خانے سے چودہ پندرہ سال کے دو لڑکے لیے اور ان کے ساتھ کرنڈہ چلا گیا۔

یہ لوگ ایسے گئے کہ کوئی خط بھی نہ بھیجا۔ کئی ہفتے گزر گئے اور ان کی خیر خبر معلوم نہیں ہوئی۔ ایک روز میں اپنے دفتر میں بیٹھا تھا کہ ایک بس دروازے پر آن رکی۔ مائک اور اس کے دونوں کم عمر ساتھی اترے اور علیک سلیک کے بعد اپنا سامان اتارنے لگے۔ میری نظریں ایک صندوق پر جمی تھیں جسے تینوں اٹھا کر اندر لے آئے۔

میں نے مائک سے پوچھا کہ کہو کیسی گزری؟ اس نے مسکین سا چہرہ بنایا اور مختصر جواب دیا ''کچھ اتنی بری بھی نہیں گزری۔'' میں نے انھیں چائے پلائی۔ مائک نے پھر دونوں لڑکوں کو رخصت کر دیا۔ پھر وہ دروازہ بند کر کے میرے پاس آیا، صندوق کا تالا کھولا اور بولا ''دیکھیے اس کے اندر کیا ہے؟''

میری نگاہیں دو چھوٹی توپوں پر جم گئیں۔ وہ قدیم ہونے کے باوجود صاف ستھری اور بے داغ نظر آتی تھیں۔ یہ اس امر کا ثبوت تھا کہ مائک نے آخر کسی غرق شدہ بحری جہاز کا سراغ لگا لیا ہے۔ صندوق کے اندر ہی ناریل جیسے گول ڈھیر بھی نظر آئے۔ اس نے ایک ناریل اٹھا کر میرے ہاتھوں میں دے دیا۔ اب جو

میں نے اسے بغور دیکھا تو چونک اٹھا۔ یہ تو سکے تھے جو ایک دوسرے سے جڑ چکے تھے۔

وہ خالص چاندی کے سکے تھے۔ میں نے کوشش کر کے چند سکے ڈھیلے سے علیحدہ کر لیے۔ اُن پر فارسی زبان میں کچھ جملے کندہ تھے جنھیں ہم دونوں نہیں پڑھ پائے۔ سکوں کے ان ڈھیلوں کا وزن تقریباً سوا من تھا۔ سکے دیکھ کر مجھے بہت خوشی ہوئی۔ انھیں فروخت کر کے ہم اچھی خاصی قیمت حاصل کر سکتے تھے۔ میرا خیال تھا کہ یہی اصل خزانہ ہے۔ مگر مائک نے بتایا کہ غرق شدہ جہاز کے اردگرد ایسے کئی ڈھیلے موجود ہوں گے۔

خزانے کے مسئلے

اب کئی پیچیدہ مسائل ہمارے سامنے آ کھڑے ہوئے۔ سب سے اہم بات یہ تھی کہ اس خزانے کی بھنک کسی غیر تک نہ پہنچے۔ ایک قانونی پہلو یہ تھا کہ ہم اس خزانے کی اطلاع سری لنکن حکومت کو دیں یا نہیں؟ اگر حکومت نے اس خزانے پر قبضہ کر لیا تو خصوصاً مائک کی ساری محنت اور سعی خاک میں مل جاتی اور اسے کچھ حاصل نہ ہوتا۔

آخری مسئلہ یہ تھا کہ سکوں پر کندہ عبارت کیونکر پڑھی جائے۔ اسے پڑھ کر معلوم ہو سکتا تھا کہ ان سکوں کا تعلق کس حکومت اور کس دور سے ہے۔ یوں غرق شدہ جہاز کی ملکیت کا بھی پتا چل جاتا۔ آخر میں ہمیں یہ معلوم کرنا تھا کہ بازار میں خالص چاندی کا کیا بھاؤ ہے اور سکوں کے ڈھیر کی ہمیں کیا قیمت ملے گی۔

مائک کو وہ سکے تین حالتوں میں ملے تھے۔ اوّل علیحدہ شکل میں، دوم ڈھیلوں کی صورت جن پر مونگوں نے دبیز قسم کا پلستر کر دیا تھا۔ اس لیے چاندی اپنی اصل حالت میں محفوظ رہی۔ سوم ایسے سکے جن پر پانی کی تیزابیت نے اثر کیا تھا۔ لہٰذا وہ چاندی کے بجائے سلور سلفائیڈ مادہ بن گئے تھے۔ اب ان کی صرف کیمیائی اہمیت ہی تھی۔

ہم دونوں بیٹری کے تیزاب کی مدد سے سکوں کو چمکانے لگے۔ چند گھنٹوں بعد ہمارے اردگرد کئی چمکتے دمکتے سکے بکھرے پڑے تھے۔ ان پر تین جگہ ''ایک'' اور اس کے دائیں ہاتھ ''تین'' کا ہندسہ منقّش تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ یہ سکے ۱۱۱۳ھ میں ڈھالے گئے۔ انسائیکلوپیڈیا آف اسلام سے ہمیں معلوم ہوا کہ مسلمانوں کا سن ہجری جولائی ۶۲۲ء سے شروع ہوتا ہے جب پیغمبر اسلام ﷺ نے مدینہ ہجرت فرمائی تھی۔

ہم نے ۱۱۱۳ھ میں ۶۲۲ کا اضافہ کیا، تو ۱۷۳۵ء عدد نکل آیا۔ گویا یہ سکے ۱۷۳۵ء میں ڈھالے گئے تھے۔ مگر جب یہ سکے ماہرین تاریخ تک پہنچے اور انھیں درج بالا سن معلوم ہوا، تو وہ ہماری بے وقوفی پر بہت ہنسے۔ ان کے ذریعے یہ معلوم ہوا کہ سکوں پر مغل بادشاہ، اورنگ زیب عالمگیر کا نام اس طرح درج تھا ع

سکہ زد در جہاں چو بدر منیر
شاہ اورنگ زیب عالمگیر

اور سن جلوس ۴۶ درج تھا۔ سن ہجری کے حساب سے یہ ۱۷۰۲ء سال بنتا ہے۔ یعنی سکے اس سال ٹکسال میں مضروب ہوئے۔ ہم سے یہ غلطی ہوئی کہ اسلامی سال کو عیسوی پیمانے سے ناپتے رہے۔ حالانکہ ان دونوں میں ہر سال دس دن کا فرق پڑ جاتا ہے۔

ماہرین ہی کے ذریعے معلوم ہوا کہ ہر ڈھیلے میں ایک ہزار سکے موجود ہیں۔ یہ جان کر ہمیں بہت حیرت ہوئی۔ ہمیں بھارت کے ایک مسلمان عالم نے بتایا کہ مغل حکومت میں ایک ہزار سکوں کی تھیلی ہوا کرتی تھی۔ غالباً یہ تھیلیاں ہی تھیں جن پر مونگوں نے کیلشیم کی تہ جما کر انھیں ڈھیلے کی صورت دے ڈالی۔

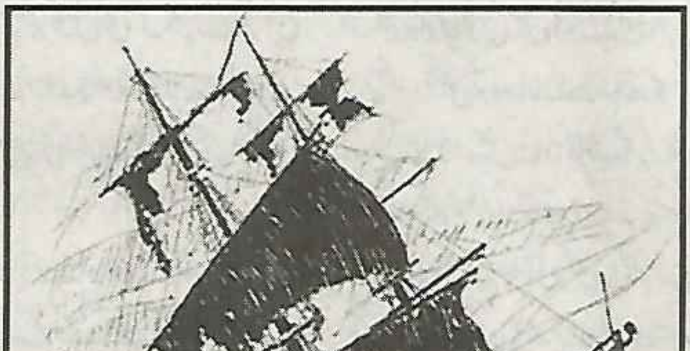
سکوں پر ٹکسال کا نام ''سورت'' درج تھا۔ یہ گجرات کا قدیم شہر ہے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی نے پہلے پہل اسی شہر کو اپنا ہیڈ کوارٹر بنایا تھا۔ تمام سکوں پر ایک ہی سن درج تھا۔ ہمیں

احساس ہوا کہ یہ سب سکے ٹکسال سے نئے نئے نکلے تھے کہ انھیں بحری جہاز پر لاد دیا گیا۔

پہلے ہمارا خیال تھا کہ یہ بحری جہاز ایسٹ انڈیا کمپنی کا تھا۔ ہم نے کئی جگہ تحقیق کی مگر یہ پتا نہیں چل سکا کہ کیا ۱۷۰۲ء میں کمپنی کا کوئی جہاز سیلون (سری لنکا) میں غرق ہوا تھا۔ البتہ ہالینڈ میں ڈچ انڈیز کمپنی کے رجسٹروں میں ایک جہاز کا تذکرہ ملا جو ۱۷۰۶ء میں سیلون میں ڈوب گیا تھا۔ یہ جہاز انڈونیشیا کی سمت جا رہا تھا مگر اس پر ہندوستانی روپیا نہیں لدا تھا۔

بہرحال ہمیں یقین تھا کہ غرق شدہ جہاز کے اردگرد اور تھیلیاں مل جائیں گی۔

اب ہم قانونی مسائل کی سمت متوجہ ہوئے۔ سری لنکن قانون میں خزانے کی تعریف یہ لکھی ملی: ”وہ قیمتی چیز جو زمین میں اس خیال سے دفن کر دی جائے کہ اسے دوبارہ کھود کر نکال لیا جائے گا۔“



غرق شدہ جہاز

لیکن ہمارا خزانہ زمین میں دفن نہیں تھا اور نہ ہی مالکان اسے دوبارہ حاصل کرنا چاہتے تھے۔

دوسرا حل طلب مسئلہ یہ تھا کہ ہمیں جس مقام پر چاندی کے سکے ملے، کیا وہ سری لنکا کی حدود میں واقع ہے؟ ہر ملک اپنے ساحل کے متعلق مختلف قانون رکھتا ہے۔ ہمیں معلوم ہوا کہ سری لنکن قانون کی رو سے ساحل سے چھ میل دور تک کا علاقہ مملکت میں شامل تھا۔

ہماری خوش قسمتی کہ مونگے کی چٹانوں کا وہ علاقہ جہاں مغل ہندوستان کا بحری جہاز ڈوبا وہ سری لنکا ساحل سے ساڑھے چھ میل دور ہے۔ ہومی رستم جی ہمارے وکیل تھے۔ انھوں نے ہمیں سری لنکن قانون کی ایک خاص شق بتائی جس نے ہمیں خوشی سے نہال کر دیا۔ وہ شق یہ تھی: ”اگر کسی قیمتی شے مثلاً سونے چاندی کو دانستہ طور پر چھپایا گیا اور اس کے مالک کا پتا نہیں چل سکے تو اس کی مالک حکومت ہوگی۔ لیکن اگر اسے دانستہ پوشیدہ نہیں رکھا گیا بلکہ وہ خود ہی گم ہو جائے یا کہیں گر جائے تو جس شخص نے اسے پایا وہی اس کا مالک ہوگا۔ حکومت کو اس سے سروکار نہیں ہوگا۔“

ہم نے پھر محکمہ کسٹمز سے معلومات لیں۔ انھوں نے بھی بتایا کہ سری لنکن مملکت میں کسی کو اتفاقاً خزانہ مل جائے تو حکومت اس کی مالک نہیں ہوگی۔

یہ پتا چلا کر ہماری جان میں جان آئی۔ چند دن بعد میں نے سکوں کا ایک چھوٹا ڈھیلا امریکا کے مشہور تحقیقی ادارے، اسمتھ سونین انسٹی ٹیوٹ کو تحفے کے طور پر بھیج دیا۔ اس عمل میں ایک غایت یہ تھی کہ ہمارا دریافت شدہ خزانہ دنیائے مغرب میں مشہور ہو جائے اور اگر کوئی سکے خریدنا چاہے، تو ہم سے رجوع کر لے۔

بقیہ خزانے کی تلاش

خزانے کا بڑا حصہ ابھی سمندر نے اپنی آغوش میں چھپا رکھا تھا۔ امریکی لڑکوں کا کہنا تھا کہ غرق شدہ جہاز کے نزدیک ہی ایک غار ہے۔ وہاں سکوں کی تھیلیاں ڈھیلوں کی صورت میں موجود ہو سکتی ہیں۔ مگر اس خزانے کو کھودنے، نکالنے اور

ساحل تک لانے کے لیے جدید آلات، کشتیوں اور جہاز کی ضرورت تھی۔ یہ سامان سرمائے سے حاصل ہونا تھا جبکہ ہماری جیبیں خالی تھیں۔

میں سکوں کے کسی بڑے خریدار کو تلاش کرنے کی غرض سے یورپ اور امریکا میں گھومنے لگا۔ اُدھر مائک بھی ایسی ترکیبیں سوچنے میں مصروف تھا جن سے رقم ہاتھ آ جائے۔ آخر اس نے سوچا کہ سری لنکا کی زیرِ آب سمندری زندگی پر دستاویزی فلم بنائی جائے۔

اس دوران سری لنکا میں یہ خبر پھیل گئی کہ ہم نے قریبی ساحلی علاقے سے مغل دور کا ایک خزانہ ڈھونڈ نکالا ہے۔ ہوا یہ کہ کولمبو کے سب سے بڑے انگریزی اخبار میں کسی گمنام آدمی کا یہ خط شائع ہوا:

''مائک ولسن نامی ایک انگریز نے کرنڈہ کے علاقے میں مغل خزانہ دریافت کیا ہے۔ اس کے ایک حصے کی نمائش امریکا میں ہو رہی ہے۔ میں یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ مائک اور کلارک کو یہ جرأت کیسے ہوئی کہ جو روپے انھیں سری لنکا کے سمندر سے حاصل ہوئے، وہ مقامی عجائب گھر میں رکھنے کے بجائے امریکا بھیج دیں۔ ان سکوں کے اصل مالک سری لنکن ہیں۔ یہ بھی اسی قسم کی لوٹ کھسوٹ ہے جیسی یورپی ایشیا اور افریقا میں کرتے رہے ہیں۔ ایشیائی سلاطین کے محلات اور فراعنہ کے مقابر لوٹ کر ہی برطانیہ کے عجائب خانے سجائے گئے۔ اب اِن لوگوں نے سری لنکا میں فلم بنانے کا ڈھونگ رچایا ہے۔ مجھے خدشہ ہے کہ فلم کی آڑ میں نئی شرارت کرنا مقصود ہے۔''

ہم آج تک نہیں جان سکے کہ خزانے کا راز کس نے افشا کیا۔ ممکن ہے، امریکی لڑکوں یا ہمارے وکیل نے کسی سے اس کا تذکرہ کر دیا۔ بہرحال ایک قدرتی مظہر نے ہمارے نو دریافت خزانے کی خبر سری لنکا میں پھیلنے نہیں دی۔ ہوا یہ کہ خط کی اشاعت کے اگلے دن بھارت اور سری لنکا کے اخبارات میں یہ ڈھنڈورا پیٹ گیا کہ ۵ فروری ۱۹۶۳ء کو نظام شمسی کے تمام سیارے سورج سے ٹکرا جائیں گے اور یوں قیامت آ جائے گی۔

اب تمام سری لنکن اس قدرتی مظہر میں دلچسپی لینے لگے اور خزانے کی خبر قیامت کی ہاہاکار میں دب گئی۔ ہم نے سکھ کا سانس لیا اور سری لنکا کی سمندری زندگی پر دستاویزی فلم بنانے پر جت گئے۔ ہم نے شدید محنت کی اور اس کا ہمیں پھل بھی میٹھا ملا۔ فلم سری لنکا اور بیرون ممالک میں بھی خاص و عام کو پسند آئی اور ہمارے ہاتھ اچھی خاصی رقم لگ گئی۔

پیٹر تھراک برطانیہ کا مشہور تیراک تھا۔ اس نے بحیرہ روم اور بحیرہ اوقیانوس میں ڈوبے کئی بحری جہازوں کا پتا لگایا تھا۔ اس نے فلم دیکھی تو وہ ہمارے ساتھ کام کرنے کو تیار ہو گیا۔ چنانچہ اپریل ۱۹۶۳ء میں ہمارا قافلہ پھر کرنڈہ جا پہنچا۔

موسم خوشگوار تھا اور سمندر پُرسکون تاہم اس کی موجوں میں اب بھی خاصی طغیانی تھی۔ ہم نے غوطہ خوری کا لباس پہنا، آکسیجن کی مشین پیٹھ پر لادی اور سمندر میں کود گئے۔ مائک کے پیچھے پیچھے ہم اس کھائی میں جا پہنچے جہاں ہندوستانی جہاز کا ڈھانچا کسمپرسی کے عالم میں پڑا تھا۔

جہاز کے اردگرد پتھر، لوہے کے ٹکڑے اور ناقابل شناخت اشیا بکھری پڑی تھیں۔ ہمیں جہاز سے کم خزانے سے زیادہ دلچسپی تھی چنانچہ اس مقام کی سمت بڑھ گئے جہاں چاندی کے سکے ڈھیلوں کی صورت پڑے تھے۔ ہم نے کدالوں، پھاوڑوں اور دوسرے اوزاروں کی مدد سے فوراً کام شروع کر دیا۔

ہزار ہزار روپے کے ڈھیلے ایک دوسرے سے علیحدہ کیے جانے لگے۔ پیٹر اپنے ساتھ ایک قسم کا غبارہ ساتھی لایا تھا۔ اس کی مدد سے ڈھیلے سطح آب پر پہنچائے جانے لگے۔ وہاں ہمارے ساتھی ڈھیلوں کو کشتیوں میں رکھ لیتے۔ صبح دس بجے ہم نے کام شروع کیا اور دوپہر تک کرتے رہے۔

کھانا کھانے کے بعد ہم دوبارہ زیرِ آب اترے تو میری نظر شمالی گوشے پر پڑی۔ وہاں کوئی شے چمک رہی تھی۔ میں نے جا کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ وہاں بھی نقرئی سکے اِدھر اُدھر بکھرے

ہیں۔ لگتا تھا کہ مغلوں کے جہاز پر لاکھوں سکے لدے تھے۔

اس جگہ بکھرے سکوں کو جمع کرنا آسان کام نہیں تھا۔ بہرحال ہم نے ہمت پکڑی اور تیزی سے ہاتھ چلانے لگے۔ آخر سہ پہر تک بیشتر بکھرے سکے جمع کر لیے گئے۔ وہ یوں دمک رہے تھے جیسے ابھی ٹکسال سے ڈھل کر نکلے ہوں۔ صبح سے سہ پہر تک سکوں سے بھرے چھ بورے ہم نے اپنی کشتیوں تک پہنچائے۔ ان کا وزن ایک اندازے کے مطابق تقریباً ایک ٹن (ایک ہزار کلو) تو ہو گا۔

دوپہر کو مائک کہیں سے مچھلیاں شکار کر لایا تھا۔ انہی کو پکا کر دعوت شیراز اڑائی گئی۔ یوں بھوک کا مسئلہ بھی حل ہو گیا۔ خزانہ ایک بڑی نعمت ہے مگر وہ پیٹ کی آگ تو نہیں بجھا سکتا۔ ہم وقفے وقفے سے ستانے بیٹھ جاتے اور گپیں لڑاتے۔ اس دوران بچی مچھلیاں بھی کھائی جاتیں۔

پیٹر تھراک کچھ اور کام بھی کرنا چاہتا تھا۔ اُس کا کہنا تھا کہ دنیا والے اس انتظار میں ہوں گے کہ ہم نے جس بحری جہاز کو ڈھونڈ نکالا ہے اس سے کیسی اشیا برآمد ہوئیں۔ چنانچہ سہ پہر کو وہ اپنے دو ساتھیوں سمیت پھرتہ آب میں پہنچ گیا۔ مگر اسے ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔

دو گھنٹے کی جستجو کے بعد اسے معقول چیزیں ہاتھ آ گئیں اس کو کسی خاتون کے بندے ملے نیز ایک بڑی سی فولادی پلیٹ (روٹی پکانے کا توا) ٹوٹے پستول اور توپوں کے دہانے بھی ہاتھ آئے۔

جب واپسی کا وقت آیا، تو یہ فکر دامن سے چمٹ گئی کہ ہزاروں نقرئی سکے کیسے چھپائے جائیں۔ ہم انھیں پوشیدہ رکھنا چاہتے تھے۔ ہمیں علم تھا کہ چوروں کو اس خزانے کی بھنک مل گئی تو ہم کثیر سکوں سے ہاتھ دھو بیٹھیں گے۔

مائک نے صلاح دی کہ سکے ایک کشتی کے پیندے پر ڈھیر کیے جائیں۔ پھر ان پر سارا سامان لاد دیا جائے۔ یوں وہ چھپ جائیں گے۔ یہ ترکیب پیٹر اور مجھے پسند آئی۔ چناں چہ ایسا ہی کیا گیا۔

ہم ساحل پر پہنچے تو وہاں کثیر تعداد میں صحافی موجود تھے۔ انھوں نے ہم پر تابڑ توڑ سوالات کی بھرمار کر دی: خزانہ کہاں ہے؟ کیا کیا قیمتی سامان دستیاب ہوا؟ جہاز کس ملک کا ہے؟ اب اس کی کیا حالت ہے۔ یہ سوال سن کر ہم کچھ پریشان ہو گئے۔ مگر پیٹر کی زندگی صحافیوں کے تیز و تلخ جملوں کا سامنا کرتے گزری تھی، لہٰذا اس نے انھیں سنبھال لیا۔

پیٹر نے فوراً ہی ان اشیا کی نمائش کا اہتمام کر ڈالا جو جہاز سے برآمد ہوئی تھیں۔ پیٹر ہر چیز کی تشریح کرتا اور فوٹو گرافر اس کی تصویر لے لیتے۔ قدیم بندوں کو بڑی دلچسپی سے دیکھا گیا۔ صحافیوں نے کشتی کے اندر جا کر اشیا دیکھیں مگر وہ سامان تلے دبے خزانے کا سراغ نہیں لگا سکے۔

جب تک ہم کولمبو میں رہے، چاندی کے سکے کشتی میں رسیوں، بانسوں، نلکیوں اور غوطہ خوری کے دیگر سامان کے نیچے دبے رہے۔ یوں وہ کسی کی نظر میں نہ آ سکے۔ چوروں کے تو وہم و گمان میں نہیں تھا کہ اتنا قیمتی خزانہ یوں کشتی میں کھلا پڑا ہو گا۔ میں روزانہ رات کو کشتی کا چکر لگا لیا کرتا۔ لیکن یہ احتیاط کرتا کہ غوطہ خوری کا لباس پہن کر جاؤں ورنہ لوگوں کو شک ہو سکتا تھا۔

خاتمہ داستان

چند دن بحری جہاز سے برآمد ہونے والی اشیا کی نمائش کے بعد آرتھر سی کلارک، مائک ولسن اور پیٹر ایک بحری جہاز میں خزانے کو برطانیہ لے گئے۔ وہاں انھوں نے نقرئی سکے مختلف امرا کے ہاتھ بیچ دیے۔ جتنی رقم حاصل ہوئی، وہ دوستوں نے آپس میں تقسیم کر لی۔ یہ رقم اتنی ضرور تھی کہ سبھی دوستوں کی بقیہ زندگی کام کاج کے بغیر ٹھاٹھ سے بسر ہوئی۔ یوں مغل خزانے نے ان کی زندگی بدل ڈالی۔

مائک ولسن ۱۹۹۵ء میں چل بسا۔ جبکہ آرتھر سی کلارک ۲۰۰۸ء کو عالم بالا پہنچ گئے۔ لیکن انھوں نے غرق شدہ مغل جہاز سے جو لاکھوں نقرئی سکے برآمد کیے وہ آج بھی نجی و قومی عجائب گھروں میں محفوظ ہیں۔

بلوچستان کے خوش ذائقہ روایتی کھانے

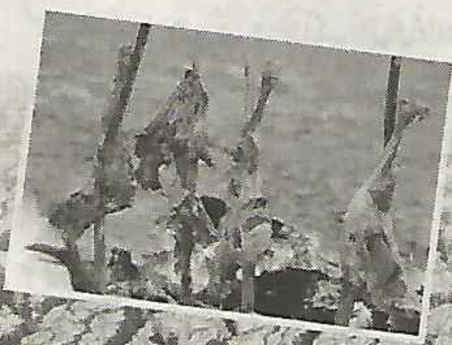
خشک سالی اور قحط کے دنوں میں جنگلی پودے بھی بطور خوراک استعمال کیے جاتے ہیں

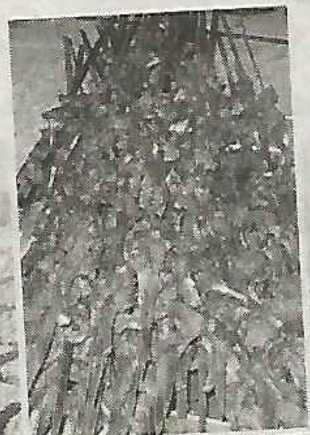
اثیر عبدالقادر شاہوانی

بلوچستان کا بیشتر حصہ سنگلاخ پہاڑوں، چٹیل میدانوں، متحرک ریگستانوں اور صحرائی خطوں پر مشتمل ہے۔ یہاں بارش بہت کم ہوتی ہے۔ جبکہ مصنوعی ذرائع آبپاشی کی جدید سہولتیں اگر ناپید نہیں، تو محدود ضرور ہیں۔ اس لیے یہاں کے عوام تلاش معاش کے علاوہ مال مویشیوں کی چراگاہوں کی جستجو میں عمر عزیز کا بڑا حصہ خانہ بدوشی کی حالت میں گزار دیتے ہیں اس پر ستم یہ کہ وطن عزیز کا یہ بے آب و گیاہ خطہ متعدد بار طویل قحط سالیوں کا بھی شکار رہا ہے۔ مثلاً ۱۷۶۰ء میں خاران کا علاقہ قحط میں مبتلا رہا۔ لہٰذا وہاں کے بعض لوگ سندھ اور کچھ خاندان ہلمند (افغانستان) ہجرت کر گئے۔ ۱۸۳۰ء سے ۱۸۴۲ء تک مسلسل بارہ سال پورا خطہ قحط کی لپیٹ میں رہا اور یوں مکران اور لسبیلہ کے بعض لوگ کراچی اور دیگر علاقوں کے عوام سندھ کے نہری علاقوں کی طرف ہجرت پر مجبور ہو گئے۔

قحط سالی سے متعلّق گوادر کے ایک قبرستان کے کتبے پر یہ دلچسپ عبارت درج ہے۔ ''جب ہم یہاں وارد ہوئے، تو اس وقت یہاں زبردست قحط پڑا ہوا تھا اور اس وقت ایک من گندم کی قیمت ایک اشرفی تھی۔ اس طرح آم کے آٹھ مرتبانوں کی قیمت بھی ایک اشرفی تھی۔ مگر ان تمام مشکلات کے باوجود ہم نے اپنی عورتوں کو طلاق نہیں دی۔

بلوچستان کے ان مخصوص حالات میں خوراک کی فراہمی کا حصول ہمیشہ بڑا کٹھن مسئلہ سمجھا جاتا رہا







ہے۔ لیکن یہاں کے باہمت اور سخت کوش لوگ ''ضرورت ایجاد کی ماں ہے'' کے مصداق فطرت کی ان ستم ظریفیوں کے خلاف نبرد آزما ہو کر کاروانِ حیات کو رواں دواں رکھنے کے لیے روزمرہ عام حالات کے علاوہ خانہ بدوشی کی صورت میں دورانِ سفر خوراک کے سلسلے میں متبادل ذرائع اپناتے ہیں اور انھوں نے جہاں خوش ذائقہ، لذیذ اور مرغوب ترین غذا کو رواج دیا وہاں انھوں نے تلخ ترین پتوں اور جھاڑیوں کو بھی اپنی خوراک بنایا۔ جنھیں عام حالات میں مال مویشی بھی منہ نہیں لگاتے۔ یعنی انھوں نے غذا کے ایسے طریقے دریافت کرنے میں کامیابی حاصل کی جن سے خوراک کی غذائیت اور افادیت کو بڑھایا جا سکتا ہے۔

خوراک کو گلنے سڑنے سے بچانے کے لیے کیمیکل استعمال کیے جاتے ہیں۔ لیکن بلوچستان کے لوگ غیر کیمیائی عمل کے ذریعے مستقبل کی ضروریات کے لیے خوراک اس طرح ذخیرہ کرتے ہیں کہ اس کے حصول میں غیر ضروری مشکلات کا سامنا بھی نہیں کرنا پڑتا اور اس طرح ذخیرہ کی ہوئی غذا کو غیر معمولی طویل عرصے تک سڑاند، بدبو اور مضر صحت اثرات سے محفوظ رکھا جا سکتا ہے۔ اس کی بنیادی خصوصیات بھی برقرار رہتی ہیں۔ یعنی اس کے ذائقے اور خوشبو میں کوئی کمی نہیں ہوتی بلکہ جسمانی لحاظ سے بھی خاص منفعت بخش رہتی ہیں۔

آئیے دیکھتے ہیں کہ یہاں کے لوگ عام حالات میں خوش خوراکی کے علاوہ خانہ بدوشی میں دورانِ سفر کس کفایت شعاری سے کام لیتے اور قحط سالیوں میں کس طرح گھاس پھوس اور زہریلی جھاڑیوں کو مرغوب غذا میں تبدیل کرتے ہیں:

سجی

سجی بلوچستان کے قبائل کی مرغوب غذا ہے۔ انفرادی نوعیت کا یہ کباب جو شہرۂ آفاق خوراک ہے یہاں کے تمام قبائل میں یکساں طور پر مقبول ہے اور انتہائی رغبت اور ذوق و شوق سے پکایا اور کھایا جاتا ہے۔ لیکن سجی پکانے میں مری قبیلہ اپنی ثانی نہیں رکھتا ان کا پکایا ہوا کباب (سجی) انتہائی خستہ اور لذیذ ہوتا ہے۔

سجی پکانے کا طریقہ یہ ہے کہ ایک فربہ، صحت مند دنبے کو ذبح کر کے اس کے اعضا الگ کر دیے جاتے ہیں اور ان اعضا کو سیخوں میں لگا کر زمین میں گاڑ دیا جاتا ہے اور پھر ان سیخوں کے متوازی دونوں اطراف میں پانچ چھ فٹ کے فاصلے پر الاؤ روشن کر دیا جاتا ہے۔ اس طرح تین چار گھنٹے دھیمی آنچ پر گوشت پک جاتا ہے۔ گوشت کے سجی بننے پر اسے اتار کر دسترخوان کی زینت بنا دیا جاتا ہے آج کل بلوچستان کے ہر بڑے بازار میں سجی کی سجی سجائی دکانیں موجود ہیں۔ یہاں ہی نہیں بلکہ بلوچستان کے سجی فروشوں نے اسلام آباد اور ملک کے دیگر بڑے شہروں میں بھی سجی کی دکانیں قائم کی ہوئی ہیں۔

ہندر یا لڑو

یہ بھی گوشت پکانے کا ایک مخصوص طریقہ ہے جو یوں ہے کہ بکرے یا دنبے کی آنتوں کو اچھی طرف صاف کرنے کے بعد گوشت کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں کو نمک مسالا چھڑک کر ان آنتوں میں بھر دیا جاتا ہے اور ان کے دونوں سروں کو گانٹھ لگا کر بند کر دیا جاتا ہے۔ یہ بھی لذیذ اور مقبول عام غذا ہے اسے پشتو میں ہندر اور بلوچی میں لڑو کہا جاتا ہے۔

تندور پیچ

تندور میں پکانے والی سجی کو تندور پیچ کہا جاتا ہے جس کا طریقہ یوں ہے کہ تنور کو اچھی طرح گرم کرنے کے بعد ذبح کیا ہوا جانور خصوصاً لیلا یا برہ کے سالم دھڑ کو اچھی طرح صاف کر کے اس پر نمک مرچ مسالا چھڑک دیا جاتا ہے اور پھر اس پورے کو لوہے کے ایک سلاخ میں پرو کر تنور کے بیچ میں رکھ کر تنور کا منہ گیلی مٹی سے بند کر دیا جاتا ہے۔ تقریباً ایک گھنٹا تنور میں رکھنے کے بعد سالم دھڑ کو باہر نکال دیا جاتا ہے جو انتہائی

خستہ، لذیذ اور صحت بخش غذا ہوتی ہے۔

لاند/خدیت

گوشت سے تیار کی جانے والی یہ غذا جو پشتو میں لاند بلوچی میں کدیت اور براہوی میں خدیت کہلاتی ہے۔ شدید سردیوں میں استعمال ہونے والی خوراک ہے۔ ایک خاص طریقے سے دنبے کے گوشت کو سکھا کر تیار اور محفوظ کیا جاتا ہے۔ یعنی حسب ضرورت ایک یا ایک سے زائد بھیڑوں کو سال بھر اچھی طرح پرورش کر کے نہایت صحت مند اور فربہ بنا دیا جاتا ہے اور موسم سرما کے آتے ہی ذبح کیا جاتا ہے۔ ذبح کرنے کے بعد جانور کے سالم دھڑ کو مع کھال کے اچھی طرح ڈھانپ دیا جاتا ہے اور اس طرح اس میں پسینے نکل آتے ہیں اور پھر چار چھ گھنٹوں کے بعد اس سے دری کمبل وغیرہ ہٹا کر اس کی اون نوچ لی جاتی ہے۔ اوجڑی، کلیجی اور انتڑیاں وغیرہ نکالنے کے بعد اس کو آگ پر جھلسایا جاتا ہے تا کہ باقی ماندہ اون بھی صاف ہو جائے۔ اس کے بعد اس کا گوشت ہڈیوں سے علیحدہ کر کے ان پر اچھی طرح نمک مل دیا جاتا ہے۔ چوبیس گھنٹے نمک کے ساتھ رکھنے کے بعد اس گوشت پر پسا ہوا ہینگ اور انار دانہ چھڑک دیا جاتا ہے اور پھر اس گوشت کو ایک خاص انداز میں تقریباً تین مہینے سائے میں لٹکا کر سکھا دیا جاتا ہے۔ جب گوشت اچھی طرح سوکھ جائے، تو اسے ماش کی دال میں ڈال کر یا ایسے ہی گوشت کے مانند پکایا جاتا ہے۔ یوں یہ غذا نہ صرف لذیذ، دیرپا اور صحت بخش ہوتی ہے بلکہ اس کے کھانے سے سردی کی شدت سے بھی انسان بچ سکتا ہے۔

اشکنہ یا کچھری

جنگلی پستہ جسے پشتو میں شنہ اور بلوچ براہوی میں گئون کہتے ہیں۔ نہ صرف ایسے ہی بھنے چنے کی طرح کھایا جاتا ہے بلکہ اس کو کوٹ کر اس کے روغن سے جو ترکاری تیار کی جاتی ہے اسے پشتو میں اشکنہ اور بلوچی براہوی میں کچھری کہا جاتا ہے۔ اس میں روٹی کے ٹکڑے ڈال کر کھایا جاتا ہے۔

پھوس

اسی طرح نخلستانی علاقوں کے جنگلی پستہ یعنی خنجک کو کوٹ کر اس میں کھجور یا نرم روٹی جسے شڑدی کہا جاتا ہے ملا کر کھایا جاتا ہے اس خوراک کو گئون یا پھوس کہتے ہیں۔

شیرگ

ایک حصہ کھجور اور دو حصہ پانی کو جوش دے کر پانی بالکل خشک کیا جاتا ہے۔ پانی خشک ہونے کے بعد اسے باریک کپڑے سے اچھی طرح چھان کر مٹی کے برتن یا کسی مشکیزہ (جسے زک کہتے ہیں) میں محفوظ کیا جاتا ہے۔ یوں ایک دیرپا ترکاری تیار ہو جاتی ہے جسے کسی بھی وقت استعمال میں لایا جا سکتا ہے۔

مخصوص روٹیاں

پتھر کے توے پر پکائی ہوئی روٹی کو تاپگی، تافوئی اور لوہے کے توے کی روٹی کو تینی کہا جاتا ہے لیکن ان کے علاوہ یہاں لوگ توے کے بجائے راکھ کے اندر سخت اور گرم کی ہوئی زمین پر روٹیاں پکاتے ہیں جسے وری یاشتی کہتے ہیں۔ انگاروں میں پکانے والی روٹی کو اشکری کہتے ہیں۔ مریضوں کے لیے لوہے کی سلاخوں پر آٹا چپکا کر پکانے کو ترگوتیچ یا سیخی کہتے ہیں۔ لوہے کے توے پر نرم آٹے سے جو قدرے موٹی روٹی پکائی جاتی ہے۔ اس عمدہ اور نرم روٹی کو وردیا شڑدی کہتے ہیں۔ تنور کی روٹی کو تندروی داش کے روٹی کو داشی کہتے ہیں۔ جوار کے آٹے کی روٹی کو ڈکو یا ڈوڈی کہا جاتا ہے۔ ان کے علاوہ قلات اور مستونگ کے لوگ ایک خاص طریقے سے مٹی اور شورہ وغیرہ کی آمیزش سے جو توا تیار کرتے ہیں اسے بیرزن کہا جاتا ہے۔ اور اس طرح جو لذیذ اور چمکدار روٹی پکتی ہے وہ بیرزنی کہلاتی ہے۔ اسی طرح بعض لوگ کڑاہی میں بھی روٹی پکاتے ہیں۔ اس لیے اسے کڑچوئی روٹی کہتے ہیں دو

روٹیوں کے درمیان گڑ ڈال کر جو روٹی پکائی جاتی ہے اسے گرڑی کہتے ہیں۔ جن دو روٹیوں کے درمیان موسم بہار کا خودرو ساگ (گربست وغیرہ) ڈال کر جو روٹی تیار کی جاتی ہے وہ گربستی کہلاتی ہے۔

خربوزہ یا سردہ پلاؤ

عام طور پر چاول میں گوشت ڈال کر پلاؤ پکاتے ہیں۔ لیکن بلوچستان کے شمالی علاقے کے قبائلی لوگ خربوزہ اور سردہ کا چھلکا اتار کر انھیں مرتبانوں میں محفوظ کر لیتے ہیں اور موسم سرما میں ان کی خشک ڈلیوں کو پلاؤ میں ڈال کر پکایا جاتا ہے۔

چمڑی

بلوچستان پھلوں کے لحاظ سے خاص اہمیت رکھتا ہے۔ یہاں سیب، انگور، بادام، انار، زرد آلو، آڑو، ناشپاتی وغیرہ کی مختلف اقسام پائی جاتی ہیں۔ ان میں زرد آلو کی پندرہ اقسام ہیں۔ ایک کو شغالی کہتے ہیں جسے تازہ کھانے کے بجائے خشک کر کے بطور ترکاری استعمال کیا جاتا ہے۔ سردیوں کے موسم میں ایسے خشک زرد آلو کو بھگو کر نرم کرنے کے بعد پانی میں رگڑ کر ایک گاڑھا شیر تیار کیا جاتا ہے۔ جس میں حسب ذائقہ مختلف مسالا جات ڈال کر دھیمی آنچ پر پکایا جاتا ہے اور یوں چمڑی کے نام سے ایک نہایت لذیذ میٹھا پکوان تیار ہوتا ہے۔

کرت یا خرود

بلوچستان کے وہ قبائل جن کی معیشت کا زیادہ تر انحصار مویشیوں کے پالنے پر ہے۔ ان کی غذا عموماً دودھ اور اس سے بنی ہوئی اشیا ہیں۔ وہ دودھ سے لسی (قروت، کرت، خرود) اور پنیر مکھن اور گھی جسے خریش بھی کہتے ہیں تیار کرتے ہیں۔ کرت یا خرود ایک قسم کی خشک کی ہوئی لسی ہے۔ یعنی لسی کو جوش دینے کے بعد کپڑے کے تھیلے میں لٹکا دیا جاتا ہے تاکہ اس کا سارا پانی نکل جائے۔ تب تھیلے کو نچوڑ کر لسی کا بقایا پانی بھی نکال دیا جاتا ہے اور پھر لسی کے ڈھیلے بنا کر خشک کیے جاتے ہیں اور بوقت ضرورت اس سے لسی بنا لیتے ہیں یا پھر اس لسی میں پیاز اور مسالا ملا کر ترکاری بنائی جاتی ہے۔ اسی طرح یہ لسی چٹنی میں بھی ملا دی جاتی ہے جس سے چٹنی کی لذت میں کافی اضافہ ہوتا ہے۔

خرود یا کرت دراصل قروت کے بگڑی ہوئی شکل ہے جو ترکی زبان کا لفظ ہے اور یہ غذا آج بھی تازہ یا خشک صورت میں ترکی کے عوام کا قومی من بھاتا کھاجا ہے۔

ہمارے محترم استاد محبوب مشہدی اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں کہ یہ غذا بین الاقوامی شہرت اور اہمیت حاصل کر گئی ہے اور ان کے مشاہدہ کے مطابق یہ یورپی اور امریکی عوام کی سب سے زیادہ من پسند غذا ہے جسے انگریزی زبان میں قروت سے یوگرت (Yougrat) بنالیا گیا ہے۔

پنیر

یہ بھی بلوچستان کے خوش خوراک قبائل کی پسندیدہ غذا ہے۔ یہاں کے قبائل جو پنیر تیار کرتے ہیں وہ نہ صرف دوران سفر چلتے چلتے بآسانی تیار کیا جاسکتا ہے بلکہ بلوچستان کے قبائل کا بنایا ہوا پنیر یورپ اور امریکا کی جدید سائنسی تکنیک سے تیار شدہ پنیر سے ہزار درجہ بہتر اور لذیذ ہوتا ہے۔

پنیر بنانے کے ہمارے ہاں دو طریقے ہیں۔ پہلا طریقہ یوں ہے کہ بادامی پودے کے پھول کو دودھ میں ملا کر کچھ دیر رکھ دیا جاتا ہے۔ تھوڑی سی دیر میں دودھ جم کر سخت ہو جاتا ہے۔ تب اس دودھ کو کسی کپڑے کی تھیلی میں ڈال کر لٹکا دیا جاتا ہے تاکہ اس میں سے زائد پانی نکل جائے اسی طرح تقریباً نصف گھنٹے میں پنیر تیار ہو جاتا ہے۔

پنیر بنانے کا دوسرا طریقہ قدیم بھی اور عجیب بھی ہے۔ یوں کہ جب بھیڑ یا بکری کا نوزائیدہ بچہ پہلے دن ماں کا دودھ پی چکے، تو اس کو ذبح کر کے اس کی اوجڑی جسے شیر دان کہا جاتا ہے۔ نکال کر خشک کیا جاتا ہے اور جب یہ شیر دان سوکھ جائے، تو اس کے ٹکڑے بنائے جاتے ہیں اور بوقت ضرورت ان

ٹکڑوں میں سے ایک ٹکڑے کو کپڑے کی چھوٹی سی تھیلی میں باندھ کر دو تین مرتبہ دودھ میں گھما دیا جاتا ہے اور یوں دودھ پھٹ کر پنیر بنتا ہے۔

خریش یا دیسی روغن

معیاری اور اچھی غذا کی ایک بنیادی صفت اس کی ظاہری شکل وصورت ہے۔ اچھی اور دیدہ زیب رنگوں والی غذا نہ صرف آنکھوں کو بھلی معلوم ہوتی ہے بلکہ ذائقے اور غذائیت کے لحاظ سے بھی عموماً بہترین ہوتی ہے۔ بلوچستان کے لوگ مکھن کو گھی میں تبدیل کرنے کے لیے اس میں ہلدی، گندم کے دانے، قدرے آٹا، سونف، زیرہ اور الائچی ملا کر خوب اچھی طرح جوش دے کر اصلی دیسی گھی تیار کرتے ہیں۔ جس میں توت (زکی) ملا کر سالوں مشکیزہ (زک) میں رکھنے سے اس کی مہک اور رنگت نکھرتی جاتی ہے۔ اس روغن کو نہ صرف ترکاری میں استعمال کیا جاتا ہے بلکہ اسے خود بطور سالن روٹی کے ساتھ استعمال کیا جاتا ہے جبکہ چینی ملانے سے اس کی لذت دوبالا ہو جاتی ہے۔

مدر

سراوان کے علاقے میں مکھن کو مخصوص طریقے سے پکانے میں گندم کے جو دانے پکائے جاتے ہیں۔ انھیں بھی مدر کہا جاتا ہے، لیکن مکران کے علاقے میں کھجوروں سے شیرہ نکالا جاتا ہے اور اس شیرہ سے نہ صرف حلوہ تیار کیا جاتا ہے بلکہ اس سے میٹھی روٹیاں بھی پکائی جاتی ہیں جنھیں مدر کہا جاتا ہے۔

چائے

یہ نعمت اب تو غاروں میں بھی استعمال ہوتی ہے بلکہ میرے مشاہدے کے مطابق بعض شوقین اپنے کتوں کو بھی چائے پلاتے ہیں۔ چونکہ چائے ہر شخص کی روزمرہ کی ضرورت بن گئی ہے اس لیے اگر چائے کی پتی یا شکر نایاب ہو تب بھی وہ اپنی اس ضرورت کو مصنوعی اشیا سے پوری کر لیتے ہیں۔ یعنی اگر چینی میسر نہ ہو تو، توت یا کھجور کو اس کی جگہ استعمال میں لایا جاتا ہے اور اگر پتی نا ہو تو کھجور کے پتے یا پودے کو چائے کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔

خانہ بدوشوں کے خوش ذائقہ کھانے

بلوچستان کے قبائلی وسماجی زندگی میں خانہ بدوشوں کو نہایت ہی اہمیت حاصل ہے۔ ہر سال اونٹوں، گھوڑوں، گدھوں، بیلوں پر سوار، پیدل سفر کرنے والے خانہ بدوش نہ صرف غیر ملکیوں بلکہ عام لوگوں کے لیے بھی دلچسپی کا باعث بنتے ہیں اور بلوچستان پر شائع ہونے والی دنیا میں کوئی ایسی کتاب نہیں جن میں خانہ بدوشوں، اونٹوں، گھوڑوں اور گدھوں کے قافلوں کا ذکر نہ ہو۔ ان خانہ بدوشوں کے جس طرح اپنے ہی رسم و رواج اور ثقافت ہے اسی طرح ان کے خورونوش کا بھی اپنا ہی انداز ہے۔ ہم نے بلوچستان کے قدیم روایتی کھانوں کا علیحدہ ذکر کیا ہے اور اب ہم خانہ بدوشوں کے روایتی کھانوں کا ذکر کریں گے۔

لیجیے اب زادراہ کے لیے استعمال ہونے والی غذاؤں کی مختصر تفصیل جان لیجیے۔ جو نہ صرف خوش ذائقہ اور لذیذ ہوتی ہیں بلکہ مدتوں خراب بھی نہیں ہوتیں۔ ان کی فہرست بہت ہی طویل ہے لیکن معلومات عامہ کے لیے ان کی چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں۔

تندوریچ

شیرین پانی (عموماً پانی میں گڑ ملا دیا جاتا ہے) اور دیسی گھی میں آٹا گوندھ کر اس میں سونف ملا دیا جاتا ہے اور پھر اس کی چھوٹی چھوٹی (بسکٹ نما) روٹیاں بنا کر تنور میں پکائی جاتی ہیں۔ یہ روٹی نہ صرف خوش ذائقہ ہوتی ہے بلکہ عرصے تک خراب بھی نہیں ہوتی۔ اس لیے بطور زادراہ استعمال ہوتی ہے۔

کرنویا کاک

حسب ضرورت کئی گول یا بیضوی پتھر آگ کے الاؤ میں ڈال کر خوب گرم کیے جاتے ہیں اور پھر ان گرم پتھروں پر لکڑی وغیرہ کے ذریعے گوندھے ہوئے آٹے کو لپیٹ کر پتھروں کو پھر سے انگاروں کے درمیان رکھا جاتا ہے۔ جب یہ آٹا پتھروں کی حدت سے پک کر سرخ ہونے لگے، تو اسے نکال دیا جاتا ہے۔ یہ روٹی چونکہ لذیذ اور خستہ ہوتی ہے اس لیے مریضوں کے لیے شافی بھی سمجھی جاتی ہے۔

اچار

حسب ضرورت پیاز کی تعداد لے کر اس میں مرچ مسالا اور انار دانہ وغیرہ کو اچھی طرح کوٹ کر ان میں تھوڑا سا آٹا گوندھا جاتا ہے اور جب یہ تمام اشیا مکس ہو جائیں تب ان کے کیک پیس جیسے حصے بنا کر سکھا دیے جاتے ہیں۔ خشک ہونے کے بعد بوقت ضرورت ان سے ضرورت کے مطابق ٹکڑے لے کر کوٹتے اور ترکاری میں بطور عام مرچ مسالا استعمال کیا جاتا ہے۔

چاری

گندم کے نیم پختہ یعنی سبز خوشوں کو بھگونے کے بعد گرم گرم راکھ میں ڈھانپ دیا جاتا ہے۔ چار پانچ گھنٹے رکھنے کے بعد خوشے نکال کر ان سے دانے الگ کیے جاتے ہیں اور پھر ان دانوں کو پیس کر ان کے آٹے میں چینی اور دیسی گھی ملا کر محفوظ کیا جاتا ہے اور بوقت ضرورت استعمال میں لایا جاتا ہے اسے چاری کے علاوہ بلڑ بھی کہتے ہیں۔ یہ غذا چھ ماہ سے ایک سال تک قابل استعمال ہوتی ہے۔

سبزک

سبزک بھی چاری کی طرح ہے لیکن اس میں گندم کے سبز سٹوں کو آگ پر بھون کر پیس لیا جاتا ہے اور اس میں بھی گڑ اور روغن ملا کر بطور ناشتا یا ترکاری استعمال کیا جاتا ہے۔

ہوش جوش

گندم کے سبز خوشوں کو پانی میں جوش دے کر مناسب وقت تک پکایا جاتا ہے۔ پکنے کے بعد ان دانوں کو پیس لیا جاتا ہے اور پھر اس آٹے کو میٹھے پانی میں حل کر کے استعمال کیا جاتا ہے۔ چونکہ یہ سرد ہے اس لیے گرمیوں میں استعمال زیادہ ہوتا ہے۔ جبکہ شیر خوار بچوں کو بھی کھلایا جاتا ہے۔

نان جوش

پیاز اور مرچ مسالا کو گھی میں اچھی طرح بھون کر اس میں باسی روٹیوں کے ٹکڑے ڈال کر پانی میں جوش دے کر اچھی طرح حل کرنے کو نان جوش کہا جاتا ہے۔ یہ غذا بیک وقت روٹی اور ترکاری دونوں کا کام دیتی ہے اور اس طرح گھر میں بچی ہوئی خشک اور باسی روٹیاں بھی کئی وقت کام دے جاتی ہیں۔

حشک مچار

وہ مسافر جن کے پاس برتن وغیرہ نہ ہو یا شکاری حضرات کے بہت کام کی غذا ہے۔ دوران شکار یا سفر اپنی خوراک کے لیے ایک دنبہ، بکرا ذبح کر کے اس کی اوجڑی کو اچھی طرح صاف کر کے الٹا کیا جاتا ہے اور پھر گوشت کو نمک مسالا اور حسب ضرورت پانی اور گھی ڈال کر اوجڑی میں ڈال دیا جاتا ہے۔ اوجڑی کے منہ میں شہ رگ کا ٹکڑا اس طرح باندھ دیا جاتا ہے کہ اوجڑی کے اندر کی بھاپ اس پائپ نما رگ سے نکلتی رہے اور پھر اس اوجڑی کو انگاروں کے درمیان میں رکھ کر اندر دبا دیا جاتا ہے اور یوں تقریباً ایک گھنٹے کے بعد گوشت پک کر تیار ہو جاتا ہے۔

گئون دانکو

خنجک یا توت کے ساتھ بھنے ہوئے گندم کے دانے ملا کر بطور زادراہ استعمال کیا جاتا ہے۔

برنج کباب

جب کسی مسافر کے پاس کوئی برتن وغیرہ نہ ہو اور نہ ہی روٹیاں پکانے کے لیے کوئی چیز، تو چاول دھو کر کچھ دیر پانی میں رکھ کر نرم کیا جاتا ہے اور پھر ان چاولوں کو ایک بھگوئے ہوئے کپڑے میں لپیٹ کر پہلے سے گرم کی ہوئی زمین پر رکھ کر اس پر گرم راکھ ڈال دی جاتی ہے اور یوں انتہائی لذیذ پکوان تیار ہو جاتا ہے۔

دیر تریت

پانی میں کالی مرچ اور نمک ڈال کر جوش دیا جاتا ہے اور پھر اس میں دیسی گھی ملا کر جو سالن بنایا جاتا ہے وہ دیر تریت کہلاتا ہے۔ اس میں روٹی ڈال کر خوب مزے سے کھائی جاتی ہے۔

دروغ بے دیر

پیاز اور مسالا کو بھون کر گرم پانی ڈالنے سے جو سالن نما خوراک تیار ہوتی ہے، اسے دروغ بے دیر یعنی جھوٹ کا سالن کہا جاتا ہے۔

قحط سالی کے دوران عوام کی خوراک

آیئے اب دیکھتے ہیں کہ بلوچستان کے لوگ کس طرح زہریلی جھاڑیوں کو قابل خوراک بنا کر استعمال کرتے ہیں:

کل کشتہ

کل کشتہ اندرائن ریگستانوں اور میدانی علاقوں کی پیداوار ہے جو انتہائی تلخ اور کڑوی ہوتی ہے۔ لیکن قحط سالی کے دوران لوگ اس کے بیج کو متواتر پندرہ دن پانی میں بھگوئے رکھتے ہیں تاکہ اس کی تلخی میں کمی آجائے۔ تلخی کے کم ہونے کے بعد اسے گندم یا جوار کے آٹے میں ملا کر پیستے ہیں اور پھر وہ اجناس کی کمی پورا کرنے میں کسی حد تک کامیابی حاصل کرتے ہیں۔

مغیر

مغیر غیر آباد زمین کی پیداوار ہے۔ موسم بہار میں لوگ مغیر کھانے کے لیے کوسوں دور نقل مکانی کرتے ہیں اور صبح سویرے ہی بچے اور عورتیں اسی خودرو جھاڑی کے پتے اور بیج جمع کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ بیجوں کو خشک کر کے اسٹور کیا جاتا ہے اور پتوں کو روٹی کے طور پر یا اگر روٹی ہو تو سالن کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے اور انتہائی قحط کے دوران بیجوں کو اگر جواری ہو، تو اس میں ملا کر ورنہ اسی طرح روٹی پکا کر پیٹ بھر لیا جاتا ہے۔ مغیر کے بیج سندھ اور دیگر علاقوں کو بھی برآمد کیے جاتے ہیں جہاں ہندو اپنی گیارس اور اکادشی کی تقاریب پر انھیں خوب کھاتے ہیں اور ان کے عوض گندم دے دیتے ہیں۔

لبو

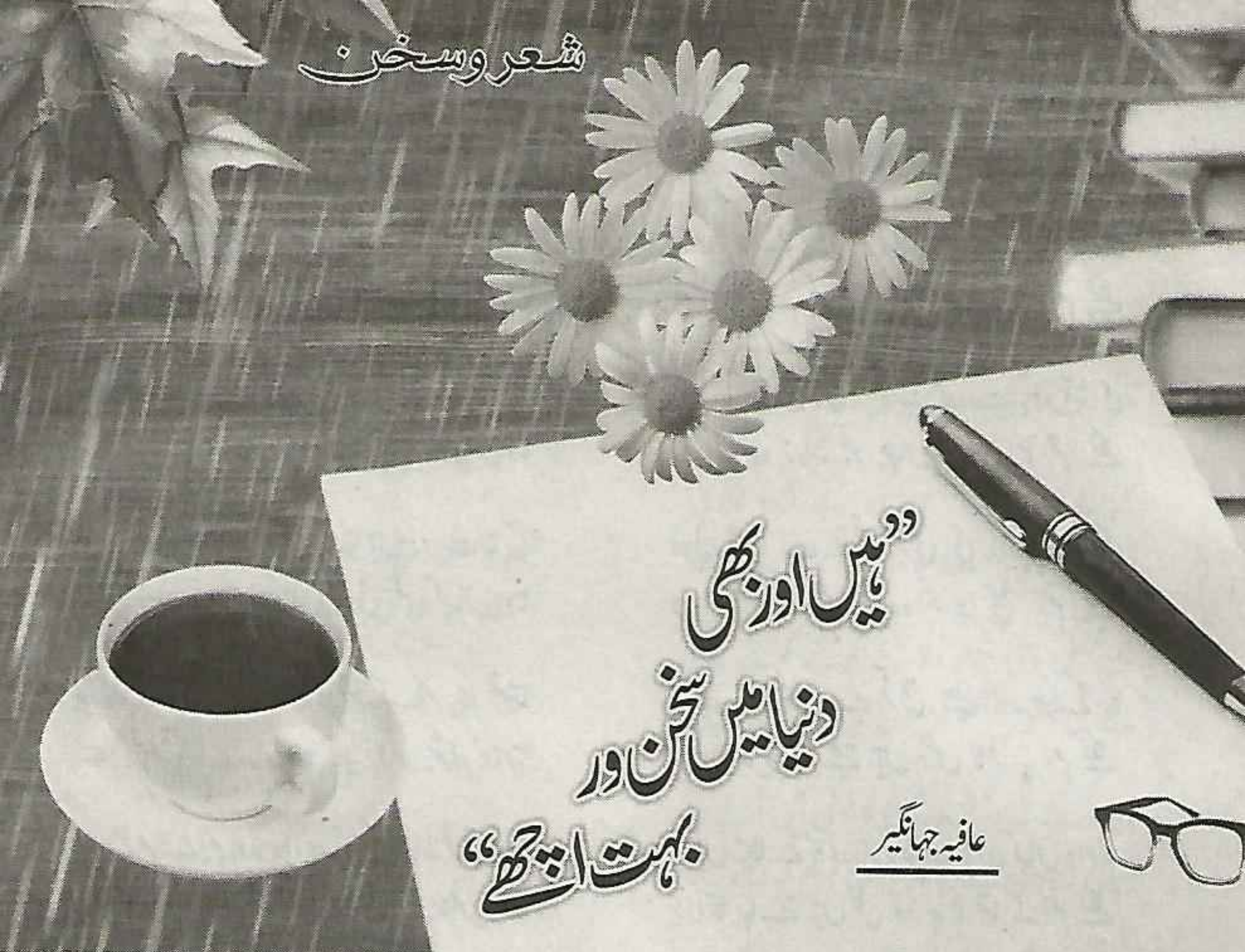
ریگستانی آبادی اس خورو بوٹی کو راکھ میں کباب کی طرح پکا کر کھاتے ہیں جبکہ عام حالات میں اسے کھانسی کے لیے بطور دوا بھی استعمال کیا جاتا ہے۔

گرماسک

ریت میں پیدا ہونے والی اس بوٹی کو چھیل کر اونٹ کے دودھ کے ساتھ کھانے کے علاوہ خشک کر کے شدید ترین قحط کے لیے بھی رکھا جاتا ہے۔

دیگر جھاڑیاں

قحط کے دوران بامر مجبوری ہر وہ جھاڑی خوراک کا کام دیتی ہے جو حلق سے گزر سکے اس لیے ان حالات میں وہ جڑی بوٹیاں بھی خوراک کے طور پر استعمال کی جاتی ہیں جنھیں عام حالات میں جانور بھی نہیں کھاتے۔ مثلاً ہشگ (اس سے کپڑے دھونے کے لیے کھار بنتی ہے) گوماز، جیجو رغت، سیر پیچ، نمبو وغیرہ وغیرہ۔



”ہیں اور بھی دنیا میں سخن ور بہت اچھے“

عافیہ جہانگیر

اُردو ڈائجسٹ کا یہ نیا، منفرد اور خوبصورت سلسلہ آپ سب کے لیے شروع کیا گیا ہے۔ ہر ماہ کسی ایک شاعر کی شاعری پڑھنے کے بجائے اب مختلف مشہور شعرا کا کلام، جن میں پرانے کہنہ مشق اساتذہ کا پراثر کلام اور نئے شاعروں کا منفرد انداز، دونوں ہی پیش کیے جائیں گے۔ کسی غزل کے پس منظر میں بیان کی گئی کہانی، انداز اور اسلوبِ تحریر ہی اس غزل کو ایک ایسا مقام عطا کرتا ہے کہ وہ سیدھی پڑھنے والے کے دل پر اثر کر جاتی ہے۔ قاری سمجھتا ہے کہ یہ تو اس کا درد ہے، اس کی آواز ہے اور اسی کی کہانی ہے۔ ایسا پُراثر اور سحر انگیز اندازِ بیاں ہمیں یکجا صورت میں ایک ساتھ پڑھنے کے لیے مل جائے تو سونے پہ سہاگہ!

شاہکار ادب یا شاہکار شاعری کیا ہے؟ اگر آپ غور کریں تو پتا لگتا ہے کہ کسی استاد شاعر کی ہر غزل یا تمام کلام شاہکار نہیں ہوتا۔ بلکہ چند ایک نظمیں یا غزلیں ہی شاہکار کا درجہ پا لینے میں کامیاب ہوتی ہیں۔ لیکن یہ بھی ضروری نہیں کہ اس فن کے لیے یہ کوئی طے شدہ بات یا کلیہ ہے، بعض اوقات اندازِ بیان و مضمون پر مکمّل دسترس ہونے کے باوجود کلام شاہکار نہیں بن پاتا اور بسا اوقات ایک ہلکی پھلکی چھوٹی سی کاوش ہی شاہکار کا درجہ پا لیتی ہے۔

غالب کا اندازِ بیاں اور سلاست کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ غالب نے انسانی دکھوں اور نفسیات کو اتنی خوبصورتی سے اپنے کلام میں سمویا ہے کہ اس سے قبل یا بعد، کسی نے نہیں کیا، تو پھر شعر کیوں نہ شاہکار ہوتے.....؟

☆☆

یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصالِ یار ہوتا
اگر اور جیتے رہتے یہی انتظار ہوتا

ترے وعدے پر جیے ہم تو یہ جان جھوٹ جانا
کہ خوشی سے مر نہ جاتے اگر اعتبار ہوتا

کوئی میرے دِل سے پُوچھے تیرے تیرِ نیم کش کو
یہ خلش کہاں سے ہوتی جو جگر کے پار ہوتا

یہ کہاں کی دوستی ہے کہ بنے ہیں دوست ناصح
کوئی چارہ ساز ہوتا ، کوئی غم گسار ہوتا

رگِ سنگ سے ٹپکتا وہ لہو کہ پھر نہ تھمتا
جسے غم سمجھ رہے ہو یہ اگر شرار ہوتا

ہوئے مر کے ہم جو رُسوا، ہوئے کیوں نہ غرقِ دریا
نہ کبھی جنازہ اُٹھتا ، نہ کہیں مزار ہوتا

یہ مسائلِ تصوف ، یہ تیرا بیان غالبؔ
تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا
(اسداللہ خان غالبؔ)

☆☆

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نِکلے
بہت نکلے میرے ارماں لیکن پھر بھی کم نکلے

ڈرے کیوں میرا قاتل کیا رہے گا اس کی گردن پر
وہ خوں، جو چشمِ تر سے عمر بھر یوں دم بہ دم نِکلے

نکلنا خلد سے آدم کا سنتے آئے ہیں لیکن
بہت بے آبرو ہو کر ترے کوچے سے ہم نکلے

بھرم کھل جائے ظالم تیرے قامت کی درازی کا
اگر اِس طُرّہ پُر پیچ و خم کا پیچ و خم نکلے

مگر لکھوائے کوئی اُس کو خط تو ہم سے لکھوائے
ہُوئی صبح اور گھر سے کان پر رکھ کر قلم نِکلے

ہُوئی اِس دور میں منسوب مُجھ سے بادہ آشامی
پھر آیا وہ زمانہ جو جہاں میں جامِ جم نکلے

ہُوئی جن سے توقع خستگی کی داد پانے کی
وہ ہم سے بھی زیادہ خستۂ تیغِ ستم نِکلے

محبّت میں نہیں ہے فرق جینے اور مرنے کا
اُسی کو دیکھ کر جیتے ہیں جس کافر پہ دم نِکلے

کہاں میخانے کا دروازہ غالبؔ! اور کہاں واعظ
پر اِتنا جانتے ہیں کل وہ جاتا تھا کہ ہم نِکلے
(اسداللہ خاں غالبؔ)

☆☆

مری داستانِ حسرت وہ سنا سنا کے روئے
مرے آزمانے والے مجھے آزما کے روئے

کوئی ایسا اہلِ دل ہو کہ فسانۂ محبّت
میں اُسے سنا کے رووٗں وہ مجھے سنا کے روئے

مری آرزو کی دنیا دلِ ناتواں کی حسرت
جسے کھو کے شادماں تھے اسے آج پا کے روئے

تری بے وفائیوں پر تری کج ادائیوں پر
کبھی سر جھکا کے روئے کبھی منہ چھپا کے روئے

جو سنائی انجمن میں شبِ غم کی آپ بیتی
کئی رو کے مسکرائے کئی مسکرا کے روئے
(سیف الدین سیف)

☆☆

بڑے خطرے میں ہے حسنِ گلستاں ہم نہ کہتے تھے
چمن تک آ گئی دیوارِ زنداں، ہم نہ کہتے تھے

بھرے بازار میں جنسِ وفا بے آبرو ہو گی
اُٹھے گا اعتبارِ کوئے جاناں، ہم نہ کہتے تھے

اِسی محفل اِسی بزمِ وفا کے گوشے گوشے میں
لٹے گی مستیٔ چشمِ غزالاں، ہم نہ کہتے تھے

اِسی رستے میں آخر وہ کڑی منزل بھی آئے گی
جہاں دم توڑ دے گی یادِ یاراں، ہم نہ کہتے تھے

خزاں کی آہٹوں پر کانپتی ہیں پتیاں گل کی
بکھرنے کو ہے اب زُلفِ بہاراں، ہم نہ کہتے تھے

دلِ فطرت شناس آخر، کہیں یونہی دھڑکتا ہے
فریبِ حُسن ہے جشنِ چراغاں، ہم نہ کہتے تھے
(سیف الدین سیف)

☆☆

کٹ ہی گئی جدائی بھی کب یہ ہوا کہ مر گئے
تیرے بھی دن گزر گئے میرے بھی دن گزر گئے

تُو بھی کچھ اور اور ہے ہم بھی کچھ اور اور ہیں
جانے وہ تُو کدھر گیا جانے وہ ہم کدھر گئے

راہوں میں ہی ملے تھے ہم راہیں نصیب بن گئیں
تُو بھی نہ اپنے گھر گیا ہم بھی نہ اپنے گھر گئے

وہ بھی غبارِ خاک تھا ہم بھی غبارِ خاک تھے
وہ بھی کہیں بکھر گیا ہم بھی کہیں بکھر گئے

کوئی کنارِ آب جُو بیٹھا ہوا ہے سرنگوں
کشتی کدھر چلی گئی جانے کدھر بھنور گئے

تیرے لیے چلے تھے ہم تیرے لیے ٹھہر گئے
تُو نے کہا تو جی اٹھے تُو نے کہا تو مر گئے

وقت ہی کچھ جدائی کا اتنا طویل ہو گیا
دل میں ترے فراق کے جتنے تھے زخم بھر گئے

بارشِ وصل وہ ہوئی سارا غبار دُھل گیا
وہ بھی نکھر نکھر گیا ہم بھی نکھر نکھر گئے

اتنے قریب ہو گئے اتنے رقیب ہو گئے
وہ بھی عدیم ڈر گیا ہم بھی عدیم ڈر گئے
(عدیم ہاشمی)

☆☆

فاصلے ایسے بھی ہوں گے یہ کبھی سوچا نہ تھا
سامنے بیٹھا تھا میرے اور وہ میرا نہ تھا

وہ کہ خوشبو کی طرح پھیلا تھا میرے چار سو
میں اسے محسوس کر سکتا تھا چھو سکتا نہ تھا

رات بھر پچھلی سی آہٹ کان میں آتی رہی
جھانک کر دیکھا گلی میں کوئی بھی آیا نہ تھا

یہ سبھی ویرانیاں اس کے جدا ہونے سے تھیں
آنکھ دھندلائی ہوئی تھی شہر دھندلایا نہ تھا

آج اس نے درد بھی اپنے علیحدہ کر لیے
آج میں رویا تو میرے ساتھ وہ رویا نہ تھا

یاد کر کے اور بھی تکلیف ہوتی تھی عدیمؔ
بھول جانے کے سوا اب کوئی بھی چارہ نہ تھا
عدیم ہاشمی

☆☆

اپنے ہاتھوں کی لکیروں میں بسا لے مجھ کو
میں ہوں تیرا تو نصیب اپنا بنا لے مجھ کو

میں جو کانٹا ہوں تو چل مجھ سے بچا کر دامن
میں ہوں گر پھول تو جُوڑے میں سجا لے مجھ کو

میں کُھلے در کے کسی گھر کا ہوں ساماں، پیارے
تُو دبے پاؤں کبھی آ کے چُرا لے مجھ کو

مجھ سے تُو پوچھنے آیا ہے وفا کے معنی
یہ تِری سادہ دِلی مار نہ ڈالے مجھ کو

میں سمندر بھی ہوں، موتی بھی ہوں، غوطہ زن بھی
کوئی بھی نام مرا لے کے بُلا لے مجھ کو

خود کو میں بانٹ نہ ڈالوں کہیں دامن دامن
کر دیا تُو نے اگر میرے حوالے مجھ کو

بادہ پھر بادہ ہے میں زہر بھی پی جاؤں قتیلؔ
شرط یہ ہے کوئی بانہوں میں سنبھالے مجھ کو
(قتیل شفائی)

☆

گرمیِ حسرتِ ناکام سے جل جاتے ہیں
ہم چراغوں کی طرح شام سے جل جاتے ہیں

بچ نکلتے ہیں اگر آتشِ سیّال سے ہم
شعلۂ آتشِ گلفام سے جل جاتے ہیں

خودنمائی تو نہیں شیوۂ اربابِ وفا
جن کو جلنا ہو وہ آرام سے جل جاتے ہیں

شمع جس آگ میں جلتی ہے نمائش کے لیے
ہم اُسی آگ میں گمنام سے جل جاتے ہیں

جب بھی آتا ہے مرا نام ترے نام کے ساتھ
جانے کیوں لوگ مرے نام سے جل جاتے ہیں
قتیل شفائی

☆☆

راز جو سینۂ فطرت میں نہاں ہوتا ہے
سب سے پہلے دِل شاعر پہ عیاں ہوتا ہے

سخت خونریز جب آشوبِ جہاں ہوتا ہے
نہیں معلوم ، یہ انسان کہاں ہوتا ہے

جب کوئی حادثۂ کون و مکاں ہوتا ہے
ذرّہ ذرّہ مری جانب نگراں ہوتا ہے

جو نظر کردۂ صاحبِ نظراں ہوتا ہے
اُسی دیوانے کے قدموں پہ جہاں ہوتا ہے

جب کوئی عِشق میں بربادِ جہاں ہوتا ہے
مجھ کو محسوس خود اپنا ہی زیاں ہوتا ہے

متزلزل ہے ادب گاہِ محبّت کی زمیں
کوئی دیکھے تو یہ ہنگامہ کہاں ہوتا ہے

کہیں ایسا تو نہیں ، وہ بھی ہو کوئی آزار
تجھ کو جس چیز پہ راحت کا گماں ہوتا ہے

دل غنی ہو تو ہر اک رنج بھی دِل کی راحت
ذہن مفلس ہو تو ہر سُود زیاں ہوتا ہے

امتحاں گاہِ محبّت میں نہ رکھے وہ قدم
موت کے نام سے جس کو خفقاں ہوتا ہے

یہی وہ منزلِ دشوار ہے ، جس منزل میں
ختم ہر مرحلۂ سُود و زیاں ہوتا ہے

ہر قدم معرکۂ کرب و بلا درپیش
ہر نفس سانحۂ مرگِ جواں ہوتا ہے

ناز جس خاکِ وطن پر تھا مجھے آہ! جگؔر
اسی جنّت پہ جہنّم کا گماں ہوتا ہے

جگؔر مُراد آبادی

☆☆

محبّت نے کھویا کھپایا ہمیں
بہت اُن نے ڈھونڈا نہ پایا ہمیں

پھرا کرتے ہیں دھوپ میں جلتے ہم
ہوا ہے کہے تو کہ سایا ہمیں

گہے تر رہیں گاہ خوں بستہ تھیں
ان آنکھوں نے کیا کیا دکھایا ہمیں

بٹھا اُس کی خاطر میں نقشِ وفا
نہیں تو اُٹھا لے خدایا ہمیں

ملے ڈالے ہے دل کوئی عِشق میں
یہ کیا روگ یا رب لگایا ہمیں

ہُوئی اس گلی میں تو مِٹی عزیز
وَلے خواریوں سے اُٹھایا ہمیں

جوانی دِوانی سُنا کیا نہیں
حسینوں کا مِلنا ہی بھایا ہمیں

نہ سمجھی گئی دُشمنی عِشق کی
بہت دوستوں نے جتایا ہمیں

کوئی دم کل آئے تھے مجلس میں میؔر
بہت اس غزل پر رُلایا ہمیں

(میر تقی میر)

☆

محبّت جن سے زندہ ہو حوالے یاد رہتے ہیں
کہ فرقت میں بھی قُربت کے اجالے یاد رہتے ہیں

کہاں سے سیم و زر آیا، ہمیں معلوم ہوتا ہے
حلق سے جو بھی اترے ہوں، نوالے یاد رہتے ہیں

تُو میرا تھا میں تیرا تھا، یہی معلوم کرنے کو
جو سکے اب تلک ہم نے اچھالے، یاد رہتے ہیں

کہاں سے آساں اتنا ہے تیری دہلیز تک آنا
جو سر کر کے یہاں پہنچے، ہمالے یاد رہتے ہیں

ابھی منصور زندہ ہے کہ جس نے چوم کر سولی
محبّت کے جو لکھے تھے مقالے یاد رہتے ہیں

نہ جانے کب چلے آئیں وہ گھر کے سونے آنگن میں
قضا کے حکم تھے اکثر جو ٹالے یاد رہتے ہیں

تیری الفت کے دھوکے میں، میں کیوں آؤں کہ پہلے ہی
تنِ خستہ پہ اُبھرے ہیں جو چھالے یاد رہتے ہیں

روایت یاد ہے دانشؔ، قبیلہ قیس کی ہم کو
جو خونِ دل کے بھیجے تھے پیالے یاد رہتے ہیں

(دانشؔ عزیز)

☆

وہ جن میں ہو جفا شامل سہارے ٹوٹ جاتے ہیں
جو محور سے نکلتے ہیں ستارے ٹوٹ جاتے ہیں

دلِ نازک جو ٹوٹے تو چھلک جاتی ہیں آنکھیں بھی
سمندر جب بپھرتا ہے کنارے ٹوٹ جاتے ہیں

ترے ہونے سے دل اپنا بڑا مضبوط ہوتا تھا
ارادے اب تو اکثر ہی ہمارے ٹوٹ جاتے ہیں

جہاں متروک ہو جائے پرندوں کا سکوں کرنا
تو محلوں کے وہاں اکثر منارے ٹوٹ جاتے ہیں

وہاں رسمِ وفا کب تک بھلا محفوظ رہتی ہے
کہ وعدے ہی جہاں اکثر تمھارے ٹوٹ جاتے ہیں

جنھیں حاصل نہ ہو پائے تری قربت کا لمحہ بھی
تو جسم و جان و دل اکثر ہی سارے ٹوٹ جاتے ہیں

نہیں ہم پار جو اُترے تو شکوہ کیا مقدر سے
کہ طوفاں میں تو اے دانشؔ کنارے ٹوٹ جاتے ہیں

(دانشؔ عزیز)

☆☆

ذات میں تیرے بغیر ایسا ادھورا پن ہے
کوئی بھی کام مکمّل نہیں ہونے پاتا

بن گئے ایسی کہانی تیرے انکار کے بعد
جس کا انجام مکمّل نہیں ہونے پاتا

یوں تو افسانے محبّت کے کہے جاتا ہوں
اک ترا نام مکمّل نہیں ہونے پاتا

تذکرہ کرتے ہیں کچھ ایسے مرے یار مرا
جیسے الزام مکمّل نہیں ہونے پاتا

جب بھی چاہا شبِ مہتاب ترا ذکر کریں
قصہِ شام مکمّل نہیں ہونے پاتا

راستے شہرِ سماعت کے بدل جاتے ہیں
اور کہرام مکمّل نہیں ہونے پاتا

تشنگی عشوہ طرازی پہ اُتر آتی ہے
سفرِ جام مکمّل نہیں ہونے پاتا

(احمد حماد)

پڑھیں، لطف اندوز ہوں اور ہمیں اپنی پسند کا منتخب کلام بھیج کر آپ بھی اس محفل کا حصہ بن جائیں۔ آپ اپنا پسندیدہ کلام ہمیں ہر مہینے کی ۱۰ سے ۱۵ تاریخ تک بھیج سکتے ہیں۔ (ادارہ) editor@urdu-digest.com

اپنی پہچان

ہمارے معاشرے کا المناک پہلو جو والدین اور بچوں میں خلیج کی صورت اختیار کر گیا ہے

خالد محی الدین

اکثر دیکھنے میں آتا ہے کہ لوگ دوسروں کی پریشانی یا کوئی مسئلہ سن کر فوراً اُس کا کوئی نہ کوئی حل بتا دیتے ہیں، چاہے وہ بدنصیب اپنے اوپر بیتنے والی قیامت سے اوسان ہی کھو بیٹھا ہو۔ آج سے بیس سال قبل میرے بہنوئی کوریا میں ٹریفک حادثے میں انتقال کر گئے۔ یہ خبر اہل خانہ پر بجلی بن کر گری۔ دل میں بار بار یہی خیال آتا کہ کاش یہ اطلاع غلط ہو۔ لیکن جب ہمشیرہ کے گھر پہنچے، تو وہاں عزیز و اقارب کا ہجوم دیکھ کر خبر کی تصدیق ہوگئی۔ ہر آنکھ پُرنم تھی۔ ابھی میرے بہنوئی کا جسد خاکی پاکستان نہیں پہنچا تھا کہ لوگوں نے اپنے مخصوص انداز میں ہمدردی اور تفتیش شروع کردی کہ حادثہ کیسے ہوا، مقتول کوریا میں کیا کرتے تھے، مرحوم کے بچے کتنے ہیں وغیرہ وغیرہ۔ جب اُنہیں پتا چلا کہ مقتول کی شادی کو ابھی دوسرا سال ہے اور بیوہ کی گود میں دو ماہ کی بچی ہے، تو خاموش رہنے کے بجائے پوچھنے لگے بیوہ کا دیور جوان ہے، اُس کی شادی تو نہیں ہوئی؟ یہ سن کر ہمارے دل پر جو گزری وہ ہم ہی جانتے ہیں کہ کس طرح لوگ کھڑے کھڑے چٹکیوں میں دوسروں کے مسائل حل کر دیتے ہیں، جبکہ ویسی ہی پریشانی یا صورت حال سے اُن کا اپنا واسطہ پڑ جائے، تو اُنھیں خود کوئی راہ سجھائی نہیں دیتی۔

میرے دوست فہیم بائیسویں گریڈ میں اعلیٰ سرکاری عہدے پر فائز اور خوشحال زندگی گزار رہے ہیں۔ تنگی ترشی اُنھیں چھو کر نہیں گزری۔ اُن کی خوشحالی اور دولت کی فراوانی کا اندازہ اس بات سے لگا لیجیے کہ موصوف کے دونوں بیٹے ایچی سن میں پڑھتے ہیں۔ مختصر یہ کہ جس زندگی کا تصور ہم خوابوں میں کرتے ہیں وہ اُن پر پورا اُترتے ہیں۔

ایک دن چائے کی نشست میں وہ میرے چہرے کے تاثرات دیکھ کر بھانپ گئے کہ میں کسی خلش کا شکار ہوں۔ چائے کے دوران ہی انہوں نے



میری دکھتی رگ کو چھیڑ دیا اور میرے بیٹے کی نااہلی اور نالائقی کا سن کر مجھے اس مشورے سے نوازا کہ یار پروفیسر بچوں سے دوستی رکھا کرو تاکہ وہ اپنے مسائل اور دیگر معاملات بلاجھجک تمہارے ساتھ شیئر کر سکیں اور تم اپنی زندگی کے تجربے سے انہیں مستفید کرو۔ پھر دیکھو ساری پریشانیاں خود بخود ختم ہو جائیں گی۔ اب مار نہیں پیار کا دور آچکا ہے۔ پروفیسر صاحب وہ دن گئے جب خلیل خاں فاختہ اڑایا کرتے تھے...... فہیم نے مجھے خاصا لمبا لیکچر دے ڈالا اور میں حیرانی کے عالم میں اُس کا منہ تکتا اور سوچتا رہا کہ یہ کیسے ممکن ہے باپ بیٹا دوستوں کی طرح ایک دوسرے سے اپنے مسائل پر تبادلہ خیال کریں۔ اس طرح تو باپ بیٹے کا رشتہ ہی گنجلک ہو جاتا ہے۔

میرے نزدیک یہ ممکن ہی نہیں کہ اولاد کے ساتھ دوستوں جیسی بے تکلفی اور دیگر مسائل پر گفتگو کی جا سکے۔ ایسا کرنا، تو گھر کا ماحول بگاڑنے کے مترادف ہے۔ چونکہ میری پرورش جس ماحول میں ہوئی اور میں نے جو اپنے باپ کی ''سختیاں'' جھیلیں، وہی میں اپنے اولاد کو منتقل کر رہا تھا۔ لاکھ کوشش کے باوجود بھی میرے اندر تبدیلی نہ آسکی۔ آج میں جس مقام پر ہوں یہ والدین کی تربیت اور غلط کاموں پر سرزنش ہی کا ثمر ہے کہ انہوں نے زندگی کے نشیب وفراز میں قدم قدم پر میری راہنمائی کی اور آج بھی اُن کے لیے دل سے دعائیں نکلتی ہیں کہ اللہ تعالیٰ اُن کی قبریں تاحد نگاہ کشادہ، درجات بلند اور جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے۔ آمین......

بچے کو اچھے برے کی تمیز سکھانا والدین اور اساتذہ کی ذمے داری ہوتی ہے۔ البتہ خاص مواقع اور مخصوص موضوعات پر بچوں کے ساتھ دوستانہ رویہ اختیار کیا جاسکتا ہے اور کیا جانا چاہیے۔ یہ تو میں بھی جانتا ہوں۔ ویسے بھی ہمارا مذہب دین اسلام اس مقدس رشتے پر ہر پہلو سے روشنی ڈالتا ہے۔ والدین کے بچوں پر اور بچوں کے والدین پر کیا حقوق ہیں جن سے روگردانی ہی انتشار اور بگاڑ پیدا کرتی ہے۔ میرے والد کہا کرتے کہ ماں کی خدمت کیا کرو اُس کے قدموں تلے جنت ہے اور والدہ کہتیں ''باپ کا کہا مانا کرو اگر وہ تم سے ناراض ہوا، تو سمجھو تمہارا رب تم سے ناراض ہے۔'' میں ساری زندگی انہی عوامل پر عمل پیرا رہا۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی غیبی امداد کا فیضان آج تک جاری وساری ہے۔

یقیناً یہ مغرب کی کارستانی ہی ہے جو ہماری ثقافت، بودوباش، ہمارے طور اطوار اور زندگی گزارنے کا ڈھنگ بھی اُن کا مرہون منت ہوتا جا رہا ہے۔ یہ مادر پدر آزاد قوم ہمیں بھی اپنے ساتھ لے ڈوبنے کے خواب دیکھ رہی ہے۔ ۱۹۷۰ء کے اوائل کی بات ہے۔ میری طبیعت اچانک خراب ہوئی، تو میرے والد مجھے ڈاکٹر کے پاس لے گئے۔ دوائی اور انجکشن کے بعد ڈاکٹر نے ابا جان سے کہا کہ بچے کو نرم غذا کی ضرورت ہے لہٰذا روٹی کے بجائے ڈبل روٹی کھلائیں۔ گھر آتے ہی ابا جان نے بڑے بھائی کو ڈبل روٹی لینے بھیج دیا۔ اُن دنوں بی پی ڈبل روٹی سفید کاغذ میں لپٹی ملا کرتی تھی۔ آدھ گھنٹے بعد بھائی نے آکر بتایا کہ ڈبل روٹی نہیں مل رہی۔ پورے محلے میں دو ہی دکانیں تھیں امین بیکری والے اور کالے برف والے کی۔ خیر جیسے تیسے کسی دوسرے محلے سے ڈھونڈ ڈھانڈ کے ڈبل روٹی لائی گئی جو میں نے رغبت سے کھائی۔ بتانے کا مقصد یہ ہے کہ وہ غذائیں جو کبھی بیماروں کے لیے مخصوص تھیں اب ہماری نسل اُن کی دلدادہ ہے۔

گھر میں کبھی بھولے سے بکرے، گائے کا گوشت یا دیسی مرغ پکا لیا جائے، تو بچے کھانا تو دور کی بات دیکھنے کے بھی روادار نہیں ہوتے۔ منہ بنا کے کہتے ہیں ''یہ کیوں پکایا ہے، ہمیں اچھا نہیں لگتا۔'' اس سے تو اچھا تھا چکن پکا لیتے۔ دیسی گھی کی خوشبو بھی انہیں بو محسوس ہوتی ہے۔ کوکنگ آئل اور بناسپتی گھی میں پکا کھانا شوق سے کھاتے ہیں۔ ناشتے میں اگر ڈبل روٹی

شامل نہ ہو تو اُن کا ناشتا ہی نہیں ہوتا۔ برگر، شوارما اور بیکری کی مصنوعات اُن کا من بھاتا کھاجا ہے۔

ہمارے گھر پہلی مرتبہ ڈالڈا گھی والد صاحب اخباری کاغذ میں لپیٹ کر لائے تھے۔ ناشتے میں ہم سب بہن بھائی رات کا بچا سالن اور باسی روٹی بھی کھا لیتے تھے۔ بازار سے پکی پکائی کوئی چیز لانے کا تصور ہی نہیں تھا سوائے دودھ اور دہی کے جو کچھ ماں نے دسترخوان پر چن دیا کوئی اس پر نکتہ چینی نہیں کرتا تھا۔ چپ چاپ سعادت مند بچوں کی طرح بسم اللہ پڑھ کے کھانا شروع کر دیتے۔ دیسی گھی کا پراٹھا، سبز نمکین چائے کے ساتھ کھانے کا اپنا ہی مزہ تھا۔ مختصر یہ کہ سادہ اور طاقتور غذائیں تھیں۔ محوِ حیرت ہوں کہ وہ اشیا اور حرکات جو پہلے معیوب سمجھی جاتی تھیں اب فخر یہ اپنائی اور استعمال کی جا رہی ہیں۔

گھر میں کبھی چھان بورہ اکٹھا ہو جاتا، تو والد صاحب بہت ناراض ہوتے اور سارا نزلہ امی جان پر گرتا کہ یہ رزق کی بے ادبی ہے۔ آج کل گھروں اور شادی بیاہ کی مختلف تقریبات میں جس طرح رزق کی بے ادبی ہوتی ہے وہ قابل مذمت فعل ہے۔ مجھے یاد ہے والدہ چھان بورے میں سے سوکھے روٹی کے ٹکڑوں کی سویٹ ڈش تیار کرتی جو ہم سب شوق سے کھاتے۔ انہیں پکانے کا طریقہ نہایت آسان تھا۔ امی ٹکڑے دھو کر پانی میں بھگو دیتی۔ جب وہ نرم ہو جاتے، تو پتیلی میں مزید پانی ڈال کر ہلکی آنچ پر چولھے پر چڑھا دیے جاتے۔ پھر گڑ کی چار پانچ ڈلیوں کا شیرہ بنا کر ململ کے کپڑے میں چھان کر پتیلی میں ڈال اُسے خوب پکایا جاتا۔ سوہن حلوے کی رنگت کا ملیدہ کھد بد کرنے لگتا، تو امی سبز الائچی دیسی گھی میں ڈال کر گرم گرم ملیدے پر بگھار لگاتی، تو چاروں طرف عجب مسحور کن خوشبو پھیل جاتی جس کی مہک پا کر ہر کوئی یہی سمجھتا کہ ہمارے گھر کوئی خاص کھانا پک رہا ہے۔ مجھے وہ میٹھا اتنا پسند آتا کہ میں دانستہ چھان بورہ بنا کر امی کو پیش کرتا کہ آج پھر وہی ڈش بنائیں۔

ہماری فرمانبرداری کا یہ عالم تھا کہ سر کے بال کٹوانے کے لیے والد صاحب نے جس دکان اور نائی کے پاس بھیجا وہیں سے کٹواتے۔ آج کل کے بچوں کی طرح نہیں کہ اپنی مرضی سے اور جس دکان سے دل چاہا بال کٹوانے چلے گئے۔ اُن دنوں الٹی سیدھی زلفیں اور کارٹونوں جیسی تراش خراش کا رواج ہی نہ تھا۔ بابا شیرا نائی سوا روپے میں ہم پانچوں بھائیوں کی حجامت بنا دیتا۔ موصوف پکوائی کا کام بھی کرتے تھے۔

ہمارے پڑوس میں پختونوں کے ہاں کوئی خوشی کی تقریب تھی اور انہوں نے سویٹ ڈش پکانے کے لیے بابا شیرا نائی کی خدمات مستعار لیں۔ طے پایا کہ زردہ پکایا جائے۔ بابا شیرا نے جو جو لوازمات منگوائے۔ خان صاحب نے فوری طور پر بازار سے لا اُن کے سامنے ڈھیر کر دیے۔ مہمان بھی آنا شروع ہو گئے۔ بابا شیرا نے چاول اُبالنے کے لیے دیگ چولھے پر چڑھا دی اور دوسرے لوازمات کی صفائی ستھرائی میں جت گیا۔ اُدھر مہمانوں کو پتا نہیں کون سی عجلت تھی یا بھوکے تھے جو بار بار پوچھنے آ جاتے کہ زردہ کب تیار ہو گا۔ بابا شیرا کہتا کہ بس شیرہ تیار ہونے کی دیر ہے دو منٹ میں زردہ تیار سمجھو۔ یہ کہتے ہوئے دیگ کا جو ڈھکن اُٹھایا، تو چاولوں کا ملیدہ بن چکا تھا۔ یہ دیکھ کر خان صاحب آگ بگولا ہو گئے اور بابا شیرا کو بے نقط سنانے ہی والے تھے کہ وہ اعتماد سے بولا ”آپ نے سویٹ ڈش ہی پکانی ہے نا، تو میں نے کون سا چاولوں میں زردہ رنگ ڈال دیا ہے جو آپ سیخ پا ہو رہے ہیں۔ پندرہ کلو دودھ لے آئیں مزیدار کھیر تیار ہے۔ خان صاحب کے دل میں نجانے کیا آئی کہ وہ مسکراتے ہوئے دودھ لینے چل دیے۔

بابا شیرا نائی کا انتقال ہو گیا یا وہ کہیں ہجرت کر گیا ہمیں کچھ پتا نہیں چلا کیونکہ اب ہمارا نائی خوشی محمد تھا۔ موصوف کی لب سڑک چھوٹی سی دکان تھی۔ ابا جان نے اُس سے ہمارا تعارف کرا دیا تھا۔ اس کا فائدہ یہ تھا کہ ہم بغیر پیسوں کے بھی اُس کے پاس

بال کٹوانے چلے جاتے تو وہ بعد میں ابا جان سے وصول کر لیتا۔وہ بال کاٹتے ہوئے مخصوص زاویے پر ہمیں سر جھکا کے رکھنے کو کہتا۔ذرا سا سر اوپر نیچے ہوجاتا تو غصے سے اپنے آہنی ہاتھ کے شکنجے میں ہماری گردن اس زور سے دبوچتا کہ دم گھٹتا محسوس ہوتا۔ہمیں چپ چاپ یہ اذیت برداشت کرنی پڑتی اور اسی طرح جب کانوں کے پیچھے اور گردن کی پشت پر اُسترے سے بال صاف کرتا تو جھرجھری سی آتی اور بدن کے رونگٹے کھڑے ہوجاتے۔

بے ساختہ مجھے یہ چٹکلا یاد آ گیا ہے۔

ایک صاحب حجام کی دکان پر شیو بنوانے گئے۔جب نائی صابن سے چہرے پر جھاگ بنا چکا' تو مخصوص انداز میں اُسترہ اپنے ہاتھ پر رگڑا اور شیو شروع ہی کی تھی کہ گاہک چلا اُٹھا کہ تمہارا اُسترہ تیز نہیں ہے۔نائی نے برجستہ جواب دیا ''باؤ جی کلائیوں میں جان ہونی چاہیے آپ بے فکر ہوجائیں۔''

☆☆

خیر یہ تو تھا لطیفہ اب خوشی محمد کی دکان کا نقشہ ملاحظہ فرمائیے۔لکڑی کی دو سادہ کرسیاں' ایک بوسیدہ سا سفید کپڑے کا ٹکڑا جو سبھی گاہکوں کے گلے میں حمائل کیا جاتا' دو آئینے' دو اُسترے' دو قینچیاں' پلاسٹک کی تین چار چھوٹی بڑی کنگھیاں' اُسترہ تیز کرنے والا چھوٹا سا مستطیل کالا پتھر جو درمیان سے خاصا گھسا ہوتا' پھٹکری کا موٹا سا ٹکڑا جو سر یا چہرے پر کٹ لگنے کی صورت میں خون روکنے میں کام آتا' گول سی صابن دانی جس میں شیونگ برش گھمانے سے اُس کا پیندہ نظر آرہا ہوتا' پاؤڈر سے لبریز گول ڈبی جس میں کپڑے کی پوٹلی پڑی رہتی اور حجامت کے بعد نائی اُس کی مدد سے گردن کی پشت پر پاؤڈر تھوپ دیتا۔ایک عدد برش بھی اس سامان میں شامل ہوتا جو کٹے ہوئے بال گاہک کی گردن سے جھاڑنے کے کام آتا۔ایک عدد بال نوچنے والا موچنا' خاص قسم کا نیل کٹر جسے گاہک ''نیرنا'' کہہ کر خوشی محمد سے طلب کرتے۔یہ نیل کٹر خاص طور پر لوہار سے معمولی اُجرت کے عوض بنوایا جاتا۔گاہکوں کے بیٹھنے کے لیے دو لکڑی کے بنچ' چھت والا برقی پنکھا جو شدید گرمی میں بھی آہستہ ہی چلتا' ساٹھ واٹ کا پیلی روشنی والا بلب' دو تین رنگ برنگے تولیے اور ایک چھوٹا سا ہاتھ والا آئینہ جو اکثر بوڑھے ہاتھوں میں لیے دھوپ میں بیٹھے موچنے کی مدد سے اپنے نتھنوں اور کانوں پر اُگے بال نوچتے نظر آتے اور کونے میں ایک انگیٹھی رکھی ہوتی جس پر ایک میلی کچیلی سی کیتلی پڑی رہتی جو سردیوں میں شیو کے لیے پانی گرم کرنے کے کام آتی اور پشت والی دیوار پر چمڑے کی موٹی سی پٹی لٹکی ہوتی جس پر خوشی محمد اُسترے کی دھار ملائم کرتا۔یہ دکان کا کل اثاثہ تھا۔جبکہ بابا شیرا نائی لب سڑک ایک چوڑے سے بنچ پر چھوٹی سی صندوقچی میں اپنے اوزار لیے براجمان ہوتا تھا اور آج کل تو نائیوں کی ائیر کنڈیشن دکانیں اور اُن کی آرائش وزیبائش دیکھ کر عقل دنگ رہ جاتی ہے اور موصوف خود کو نائی کہلوانا اپنی توہین سمجھتے ہیں۔اُن کے نزدیک نائی دیگیں پکاتے ہیں۔وہ خود کو ہیئر ڈریسر کہلوانا پسند کرتے ہیں اور ایسے بن ٹھن کے دکان پر براجمان ہوتے ہیں کہ لگتا ہی نہیں موصوف باربر ہے۔یہ خوشی کی بات ہے کہ جدت نے چھوٹے چھوٹے پیشوں کو جنھیں کبھی حقارت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا باعزت بنا دیا ہے اور لوگ معقول پیسہ کما رہے ہیں۔

ہم خوش قسمت ہیں کہ ہمارا مذہب امیر اور غریب کو یکساں حقوق دیتا ہے اور اسی طرح پیشے کے اعتبار سے کوئی ادنیٰ یا اعلیٰ نہیں۔اللہ تعالیٰ فرماتا ہے' الکاسب حبیب اللہ (ہاتھ سے کام کرنے والا میرا دوست ہے) آج اگر موچی اپنی دکان یا کارخانے پر شومیکر' نائی ہیئر ڈریسر اور قصاب مٹن شاپ کا بورڈ آویزاں اور اپنی دکان کی تزئین و آرائش کرتا ہے تو یہ اچیومنٹ ہے۔انسان چھوٹا یا بڑا اپنے اعمال اور اخلاق کی وجہ سے ہوتا ہے۔

خیر یہ تو تھا مزے کا واقعہ اور دلچسپ احوال تو بات ہو رہی تھی پرانی قدروں کی..... فہیم کے بار بار اسرار اور تقلید کے باوجود میں خود کو اس چلن پر آمادہ نہ کر سکا اور اُسی ڈگر پر گامزن رہا جو پرکھوں سے ہماری نسل در نسل میں رچی بسی اور جس پر چل کر ہم خود پلے بڑھے ہیں۔ بات آئی گئی ہو گئی اور کچھ ہی عرصے بعد فہیم کے ساتھ مجھے کسی ضروری کام کے سلسلے میں لاہور سے باہر جانے کا اتفاق ہوا۔ وہ ڈرائیونگ نشست پر بیٹھا میرا منتظر تھا اور ساتھ والی نشست پر اُس کا چودہ سالہ بیٹا اسد براجمان تھا۔ میں جیسے ہی گاڑی کے قریب پہنچا، فہیم نے اسد سے کہا بیٹا تم پچھلی نشست پر چلے جاؤ انکل نے آگے بیٹھنا ہے۔ یہ سن کر وہ کندھے مٹکانے لگا، تو میں نے فہیم سے کہا کوئی بات نہیں سر میں پیچھے بیٹھ جاتا ہوں۔ مگر فہیم نہ مانا اور اسد کو دوبارہ پیچھے بیٹھنے کی تلقین کی۔ بچے کا ردعمل اب بھی وہی تھا۔ میں پچھلی نشست پر بیٹھنے لگا، تو فہیم نے الٹے ہاتھ کا زور دار تھپڑ اسد کے منہ پر دے مارا اور موٹی سی گالی بھی دی۔ وہ چپ چاپ پچھلی نشست پر چلا گیا اور میں ہکا بکا اُس کے ساتھ والی نشست پر جا بیٹھا۔ بائیسویں گریڈ کے آدمی سے ایسی توقع میں بالکل نہیں کر رہا تھا۔ کچھ دیر گاڑی میں سکوت طاری رہا۔ پھر فہیم خود ہی گویا ہوا کہ یار انہیں چھوٹے بڑے کی تمیز سکھانے کے لیے ایسا کرنا ضروری ہے ورنہ یہ تو بزرگوں کا ادب آداب ہی بھول جائیں گے۔ میں نے اُسے کوئی جواب نہ دیا اور اِدھر اُدھر کی باتوں میں سفر کٹ گیا۔

پھر ایک بار جب فہیم کا تبادلہ اسلام آباد ہوا، تو اُس نے مجھے بھی اپنے ساتھ چلنے کو کہا۔ اپنے ضروری کام نمٹا کر میں فہیم کے ساتھ اُس کے گھر چل پڑا۔ راستے میں فہیم بتانے لگا کہ سامان ٹرک میں لوڈ ہو چکا ہوگا۔ بس گھر کو تالے ہی لگانے ہیں اور ہم ان شاءاللہ شام ڈھلنے سے پہلے اسلام آباد ہوں گے۔ لیکن جب گھر پہنچے، تو خاتون خانہ نے بتایا کہ چھوٹا صاحبزادہ کمپیوٹر پر گیم کھیل رہا ہے۔ میرے لاکھ کہنے کے باوجود اُس نے بات نہیں مانی، اس کے سامان کے علاوہ باقی سب کچھ ٹرک پر لوڈ ہو چکا ہے۔ یہ سن کر فہیم نے پہلے تو بیگم سے کہا اس خبیث کو یہیں چھوڑو، لیکن پھر سرعت سے اُس کے کمرے جا اُسے کان سے پکڑ کر گھسیٹتا ہوا باہر لایا اور اُس کی اچھی خاصی دھنائی کر دی...... میں حیران تھا کہ یہ وہی شخص ہے جو مار نہیں پیار، کے گیت الاپتا تھا۔

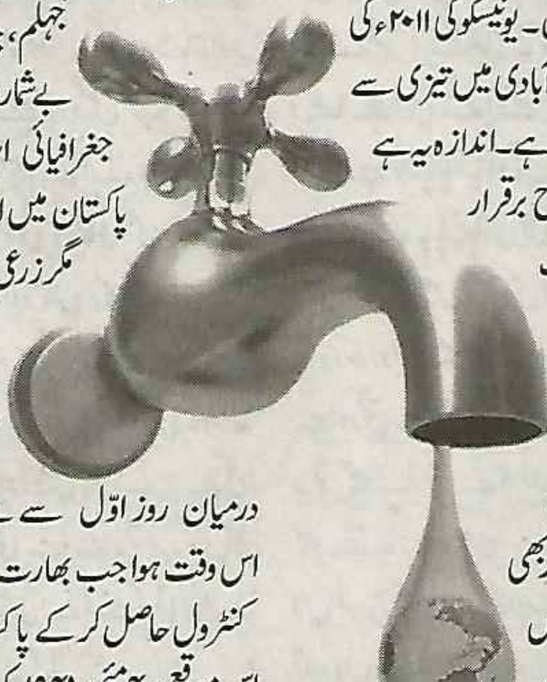
فہیم اپنے بچوں کے بارے کہنے لگا ''یار اُن کا تو دماغ ہی خراب ہو گیا ہے۔'' چند روز پہلے بچوں کی پھوپھی گاؤں سے ملنے آئی تو انہوں نے سیدھے منہ پھوپھو سے بات ہی نہیں کی اور ماں سے کہنے لگے ''آپ کیوں غریبوں کو منہ لگاتی ہیں جو ہمارے گھر آ کے جانے کا نام ہی نہیں لیتیں۔'' اُن کا لباس دیکھا ہے، اس سے اچھے کپڑے تو میرے دوست کی نوکرانی پہنتی ہے اور پاپا کیا دو تین لاکھ روپے تنخواہ لیتے ہیں۔ میرے دوست کے پاپا پچاس لاکھ روپے ماہانہ کماتے ہیں اور اُن کا رہن سہن دیکھیں تو آدمی دنگ رہ جاتا ہے۔ یہ سن کر مجھے اس قدر دکھ ہوا کہ میں نے اُن کی تمام تفریحات پر پابندی لگا دی ہے اور سختی سے جی او آر کی حدود سے باہر جانا بند کر دیا ہے۔ یار یہ تو چھوٹے بڑے کا ادب اور اپنی قدریں اور پہچان ہی بھولتے جا رہے ہیں...... اب میں فہیم کو سمجھا رہا تھا کہ بچوں پر اس طرح تشدد کرنے اور ناراض ہونے کے بجائے انہیں اپنی قدروں سے روشناس اور اپنی پہچان کراؤ، زیادہ وقت اُن کے ساتھ گزارو۔ بے جا لاڈ پیار سے اجتناب اور اُن کی الٹی سیدھی حرکات اور فرمائشوں پر طریقے سے سمجھاؤ اور انہیں بتاؤ کہ کون سی ڈگر اُن کے لیے نقصان دہ اور کون سی ثمر آور ہے کیونکہ یہی ہمارے کل کا مستقبل ہیں اور انہوں نے ہی ملک کی باگ ڈور سنبھالنی ہے۔ فہیم نے مسکراتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا اور باقی سفر ہم نے خوش گپیوں میں گزار دیا۔

سندھ طاس معاہدہ

پانی کی بوند بوند قیمتی

پاکستان میں پانی کی زیرزمین صورتحال تشویشناک ہوتی جارہی ہے

انجینئر محمد سعید اقبال بھٹی



پانی نظام حیات اور نظام ارض کے لیے انتہائی اہم ہے لیکن کرۂ ارض پر پانی کے ذخائر خطرناک حد تک محدود ہوتے جارہے ہیں۔ یونیسکو کی ۲۰۱۱ء کی ایک رپورٹ کے مطابق دنیا بھر میں آبادی میں تیزی سے اضافہ بھی پانی کی قلت کا سبب بن رہا ہے۔ اندازہ یہ ہے کہ پانی کے استعمال کی موجودہ شرح برقرار رہی تو ۲۰۲۵ء تک ترقی پذیر ممالک میں پانی کا استعمال ۵۰ فی صد اور ترقی یافتہ ممالک میں ۱۸ فی صد تک بڑھے گا۔ اور ۱ء۸ ارب افراد پانی کی قلت کا اور دنیا کی دو تہائی آبادی شدید قلت کا شکار ہوگی۔ پاکستان کا شمار بھی پانی کی کمی والے اور نیم خشک ممالک میں کیا جاتا ہے اور یہاں آبی وسائل کی صورت ایک بحران کی شکل اختیار کرتی جارہی ہے۔ حالانکہ ہمارا ملک جنوبی ایشیائی خطے میں واقع ہے جو آبی وسائل کے حوالے سے دنیا میں منفرد مقام رکھتا ہے۔ دنیا کے کئی اہم دریا اسی خطے میں واقع ہیں جن کا پانی استعمال کرنے والے ملکوں میں پاکستان، بھارت، نیپال، بنگلہ دیش، بھوٹان اور چین شامل ہیں۔ دنیا کی ۲۱ فی صد آبادی انہی ممالک میں آباد ہے۔ جنوبی ایشیا کا یہی خطہ دو بڑے دریاؤں سندھ اور برہم پُتر کا منبع بھی ہے۔ بھارت سے ہوتا ہوا دریائے سندھ میں ملنے والا دریائے ستلج بھی ہمالیائی پٹی کے کوہ کیلاش سے جنم لیتا ہے اور ہمالیہ کے پگھلتے گلیشیئر دریائے سندھ، برہم پترا، گنگا، میگنا کو رواں رکھتے ہیں۔ ان دریاؤں کی یہی روانی یہاں ہر قسم کی حیات کے لیے انتہائی اہم ہے۔

انڈس بیس یا سندھ طاس کا کل رقبہ ہمالیہ کے پہاڑوں سے سمندر تک ۳۶۵۰۰۰ مربع میل یا ۵ لاکھ ۳۴ ہزار مربع کلومیٹر میں سے پاکستان میں یہ ۳۱۰۰۰۰ مربع میل یا ۷ لاکھ ۹۴ ہزار مربع کلومیٹر پر مشتمل ہے۔ دریائے سندھ سے ایک یا دو نہیں بلکہ جہلم، چناب، راوی، ستلج، بیاس اور ان کے بے شمار معاون دریا منسلک ہیں۔ سندھ کے جغرافیائی ایریا کا چونکہ ۵۲ء۴۸ فی صد رقبہ پاکستان میں اور ۴۷ء۵۲ فی صد بھارت میں ہے مگر زرعی ملک ہونے کے ناتے سندھ طاس کی پاکستان کے لیے بہت اہمیت ہے۔ جس کی وجہ سے سندھ کے پانی کی تقسیم کا مسئلہ دونوں ملکوں کے درمیان روز اوّل سے ہے مگر اس مسئلے کی شدت کا احساس اس وقت ہوا جب بھارت نے ۱۹۴۸ء میں دریاؤں کے منبع پر کنٹرول حاصل کر کے پاکستان کی طرف پانی کا بہاؤ روکا تھا۔ اس موقع پر ۴ مئی ۱۹۴۸ء کو ایک معاہدہ ہوا مگر اس پر خاطر خواہ عملدرآمد نہیں ہوا۔ پاکستان نے یہ مسئلہ عالمی سطح پر اٹھایا تو ۱۹۵۱ء میں امریکن اٹامک انرجی کمیشن کے چیئرمین نے پاکستان اور بھارت کا دورہ کیا اور خطے میں پانی کے مسئلے پر کولیئر (Collier's) میگزین میں ایک تفصیلی آرٹیکل لکھا جس سے متاثر ہو کر ورلڈ بینک کے اس وقت کے صدر ڈیوڈ بلیک نے ایک ورکنگ کمیٹی کے قیام کی تجویز دی جس نے ۱۹۵۲ء سے ۱۹۵۳ء

تک دونوں ملکوں کے حکام سے بحث و مباحثہ جاری رکھا مگر کسی نتیجے پر نہ پہنچ سکے تاہم ورلڈ بینک کی کوششیں جاری رہیں اور بالآخر ۱۹ ستمبر ۱۹۶۰ کو سندھ طاس معاہدہ (Indus Water Treaty) عمل میں آیا، جس پر کراچی میں پاکستان کے صدر جنرل ایوب خان اور بھارت کے وزیراعظم جواہر لال نہرو نے دستخط کیے۔ ورلڈ بینک اس معاہدہ کا بروکر تھا، ورلڈ بینک ان دنوں انٹرنیشنل بینک آف دی کنسٹرکشن ڈیویلپمنٹ کے نام سے کام کر رہا تھا۔

پانی کی تقسیم کے حوالے سے بھارت اور پاکستان کے درمیان یہ پہلا معاہدہ نہیں تھا۔ اس طرح کے درجنوں معاہدے ہیں جو دو یا دو سے زائد ملکوں کے درمیان قائم ہیں کیونکہ دنیا میں ۲۵۰ سے زیادہ دریا ایسے ہیں جو ایک سے زائد ملکوں کے تصرف میں ہیں بلکہ بعض دریا ایسے ہیں جو دس، دس ممالک سے گزرتے ہیں۔ ان معاہدوں کی موجودگی میں عالمی ماہرین اور اقوام متحدہ کی رپورٹ یہ کہتی ہے کہ "سندھ طاس معاہدہ" ایک بہترین معاہدہ ہے اور اس پر عملدرآمد کی صورت حال بھی بہتر ہے۔ سندھ طاس معاہدے کی بدولت دونوں ملکوں کو اپنی اپنی حدود میں آبی مسائل دوستانہ انداز میں حل کرنے میں مدد ملی ہے مگر سندھ طاس معاہدے پر ابتدا ہی سے سوال اٹھتے رہے ہیں۔ اس کے باوجود یہ معاہدہ برقرار ہے۔ اس کی ایک بڑی وجہ شاید یہ بھی ہے کہ سندھ طاس معاہدے کے تحت ایک مستقل انڈس کمیشن قائم ہے جس کے تحت دونوں ممالک کے درمیان بات چیت اور ملاقات کا سلسلہ جاری رہتا ہے بلکہ اس سلسلے میں ۱۹۶۵ء اور ۱۹۷۱ء کی جنگوں کے دوران بھی تعطّل پیدا نہیں ہوا۔

۱۹۴۷ء میں تقسیم ہند کے وقت وسائل کی تقسیم کے معاہدے کا سب سے عجیب پہلو یہ ہے کہ اس میں دریائے سندھ کے مشترکہ پانی اور خاص طور پر دو بڑی نہروں سینٹرل باری دوآب اور دیپالپور کے حقوق پر کوئی بات نہیں ہوئی تھی۔

تاہم سندھ طاس معاہدہ شراکت داری کا ایسا منصوبہ نہیں تھا جو یونائیٹڈ نیشن (یواین) واٹر کمیشن کے مطابق پانی کی منصفانہ اور مناسب استعمال کی ضمانت فراہم کرتا ہو۔ اس معاہدے میں کئی نقائص یا خامیاں موجود ہیں۔ مثلاً وقت کے ساتھ ساتھ موسم کی تبدیلیوں اور ان کے نتیجے میں پیدا ہونے والی غیر یقینی اور غیر متوقع صورت حال سے نمٹنے کے لیے اس معاہدے میں کوئی وضاحت موجود نہیں ہے۔ مغربی دریاؤں سے بھارت کے لیے پانی کا حصہ وسیع اتار چڑھاؤ کے باوجود ۶ء۳ ملین ایکڑ فٹ مقرر کیا گیا ہے۔ یواین واٹر کمیشن اور پانی کے بین الاقوامی قانون میں حالیہ پیش رفت کے تناظر میں سندھ طاس معاہدے میں ماحولیاتی تحفظ اور واٹر مینجمنٹ میں بہتری کی گنجائش نظر آتی ہے۔

البتہ سندھ طاس معاہدے میں بعض شقیں ایسی بھی موجود ہیں جن پر عملدرآمد سے دونوں ممالک فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ مثلاً تیسرے فریق کی ثالثی اور باہمی معاہدے پر اتفاق اور دریا کی بالائی اور نشیبی ریاستوں کے درمیان پُرامن بقائے باہمی کی ضرورت اور اہمیت کو عالمی قوانین میں تسلیم کیا گیا ہے اور یہ بات شدت کے ساتھ کشن گنگا اور بگلیہار ڈیمز پروجیکٹ کے درمیان بین السرحدی قانون کے استعمال یا ماحولیاتی ذمے داریوں سے متعلق ہیں ان پر عدم تعمیل جان بوجھ کا نتیجہ نہیں، بلکہ یہ مسائل معاہدے کے محض بعض ابہامات کی وجہ سے سامنے آئے۔ سندھ طاس معاہدے اور یواین واٹر کمیشن کا باہم موازنہ کریں اور سندھ طاس معاہدے کی کمزوریوں اور اختیارات کا تجزیہ کریں تو واضح ہو جاتا ہے کہ دونوں ملکوں کو واٹر مینجمنٹ کے حوالے سے معاہدے میں بعض ترامیم پر سنجیدگی سے غور کرنا چاہیے اور انھیں معاہدے کا حصہ بنانا چاہیے۔ ان ترامیم کے لیے یواین واٹر کمیشن کے اصولوں اور ضوابط سے مدد لی جا سکتی ہے۔ اس عام تاثر کی نفی بہت ضروری ہے کہ سمندر میں گرنے والے دریاؤں کا غیر استعمال شدہ پانی ضائع ہو جاتا ہے جبکہ حقیقت یہ ہے کہ دریاؤں کا یہ پانی ساحلی آبادی اور ساحلی ماحول کو نئی زندگی بخشتا ہے۔ یہ تیمر کے جنگلات کی بقا اور

ڈیلٹا کے لاکھوں ماہی گیروں کی گزر اوقات کا ذریعہ ہے۔ لہٰذا اس سلسلے میں بھی سندھ طاس معاہدے کے تحت پانی کے ذخیرے، پانی کی انتظام کاری اور نکاس کے مسائل کا حل تلاش کیا جانا ضروری ہے۔ دونوں ملکوں کی آبادی میں سندھ طاس معاہدے کے سال ۱۹۶۱ء کی ۴۸۵ملین آبادی کے مقابلے میں تین گنا اضافہ ہو چکا ہے اور یہ ۱۳۹۰ملین افراد سے زائد بتائی جاتی ہے۔ لہٰذا آبپاشی، توانائی کی پیداوار اور انسانی ضروریات کے لیے پانی کی طلب بھی بہت بڑھ چکی ہے۔

سندھ طاس میں پانی کی قلت ایک مستقل رجحان ہے جس کی وجہ سے آبی تنازعات جنم لے سکتے ہیں، جن سے بچنے کے لیے انٹربیس تعاون پر مبنی اشتراک اور انتظام وقت کی ضرورت ہے۔ پاکستان اور بھارت میں زیرزمین پانی کی سطح کی صورت حال بھی تشویش ناک ہوتی جارہی ہے جس کے ردعمل میں آبی وسائل پر قبضے اور کنٹرول جیسے اقدامات سامنے آتے ہیں۔ بھارت میں ڈیموں کی تعمیر میں اضافہ اس کی ایک واضح مثال ہے، دریاؤں پر بہت زیادہ تعمیرات سے دریاؤں کے بہاؤ کی قدرتی روانی سست پڑ جاتی ہے اور اس کا اثر پاکستان اور بھارت دونوں پر پڑتا ہے۔ دریائے نیلم پر کشن گنگا ڈیم پروجیکٹ بننے سے بھی دریا کی روانی میں فرق آیا ہے اور آزاد کشمیر میں ۲۰۰ کلومیٹر طویل دریائی علاقہ متاثر ہوا ہے اور ۴۰ کلومیٹر کا علاقہ بالکل خشک ہو گیا ہے جبکہ آزاد کشمیر میں بنائے جانے والے نیلم جہلم پروجیکٹ کی بجلی پیدا کرنے کی گنجائش جو ۹۶۹ میگاواٹ ہے ۱۶ فی صد کم ہو جائے گی۔ بھارت کی ایک اور ستم ظریفی یہ ہے کہ اس نے مشرقی پنجاب میں کسانوں کو زیرزمین پانی نکالنے کے لیے ٹیوب ویلوں کو مفت بجلی فراہم کرنا شروع کر دی ہے، جس کا نتیجہ یہ کہ پاکستان میں مغربی پنجاب کے سرحدی علاقوں کے وہ کسان جو زیرزمین پانی پر انحصار کرتے تھے، اب اپنے بنجر کھیتوں کو حسرت بھری نظروں سے دیکھتے ہیں۔ کیوں کہ ان علاقوں میں جہاں ۸۰ یا ۱۱۰ فٹ گہرائی سے پانی نکل آتا تھا، اب ۱۰۲۰ فٹ سے بھی نیچے چلا گیا ہے۔ یہ صورت حال مسلسل جاری رہی تو ان علاقوں کا کسان فاقہ کشی کا شکار ہو جائے گا۔

سندھ طاس معاہدے کی بنیاد ہمیں آزادی کے بعد سندھ طاس سے ۶۷ ملین ایکڑ فٹ کے بجائے ۸۵ ملین ایکڑ فٹ پانی ملنا شروع ہوا، مگر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس معاہدہ کی خامیاں بھی سامنے آئیں اور اس وقت اس بات کی شدت سے ضرورت محسوس کی جارہی ہے کہ اس کا ازسرنو جائزہ لیا جائے۔ دنیا بھر میں پانی کی تقسیم کے سینکڑوں معاہدے ہیں۔ مگر ان میں کوئی معاہدہ ایسا نہیں ہے جس کی وجہ سے کسی بھی ایک ملک میں کوئی دریا خشک ہو گیا ہو۔ پوری دنیا میں آبی معاہدوں میں عموماً ماحول کی تبدیلیوں کے ساتھ ساتھ ڈیلٹا کے قدرتی ماحول اور اس کی بقا کا خیال نہیں رکھا جاتا۔ سندھ طاس معاہدے میں بھی مستقبل کے خدشات اور مسائل کا خیال نہیں رکھا گیا جس کے پیش نظر اس معاہدے کا ازسرنو اور فوری جائزہ لینے کی ازحد ضرورت ہے۔

ایشین ڈیویلپمنٹ بینک کے مطابق ”پاکستان میں پانی کا بحران شدید ہے۔ ۲۰۲۵ء تک شدید تر ہو جائے گا جبکہ بھارت میں یہ صورت حال ۲۰۵۰ء میں پیدا ہوگی۔“ ماہرین کے مطابق بھارت پانی کے بحران سے نمٹنے کے لیے ۱۱ بڑے ڈیم بنا رہا ہے مگر پاکستان میں تو اس بارے میں سوچا بھی نہیں جا رہا کہ پانی کو محفوظ رکھنے کا نظام ہمارے ہاں موجود نہیں۔ ہمیں بڑے سیلابوں کا بھی سامنا رہتا ہے مگر ہم ڈیم بنانے پر توجہ نہیں دیتے۔ امریکا میں فی کس ۶۰۰۰ مکعب میٹر پانی دستیاب ہے۔ یہ شرح آسٹریلیا میں ۵۵۰۰ مکعب میٹر چین میں ۲۲۰۰ ہے جبکہ پاکستان میں فی کس صرف ۱۰۰۰ مکعب میٹر پانی دستیاب ہے۔ اسی سے ہمارے اس مسئلے اور طرز زندگی کا بھی پتا چلتا ہے۔ پانی کی قلت پر قابو پانے کے لیے ہمیں فوری طور پر ۸۳ ملین ایکڑ فٹ پانی کے ذخائر تیار کرنے چاہئیں۔

پورے ملک میں پانی کی شدید قلت ہے اور عالمی ماہرین

آب کہتے ہیں کہ پاکستان کو پانی کے بحران سے نمٹنے کے لیے پانی کے غیر ضروری ضیاع کو روکنے اور آبی ذخائر میں اضافہ کرنے کی ضرورت ہے جو کم سے کم سالانہ چالیس فی صد ہونی چاہیے جبکہ فی الحال یہ گنجائش صرف ۸ فی صد سالانہ ہے اور ۱۹۷۱ء کے بعد سے پاکستان میں کوئی بڑا ڈیم نہیں بنا ہے۔ مؤقر حلقوں کا خیال ہے کہ پانی کے مسائل سے متعلق تمام امور تکنیکی ہیں جنھیں سیاسی نظر سے دیکھا جارہا ہے۔ اگر ان پر بھرپور تحقیق ہو اور قابل فہم دلائل کے ساتھ کی جائے تو یہ اونٹ کسی نہ کسی کروٹ ضرور بیٹھ سکتا ہے۔

پانی کی قلت کی صورت حال پر قابو پانے کے لیے ضروری ہے کہ فوری طور پر آبی وسائل کے حوالے سے خارجہ پالیسی از سر نو مرتب کی جائے تاکہ سرحدوں کے پار بھی پانی کے مشترکہ وسائل کا پائیدار انتظام کیا جاسکے اور دریائے کابل کے پانی کی تقسیم کے حوالے سے افغانستان حکومت سے بھی ایک معاہدہ کیا جائے۔ آنے والے وقتوں میں افغانستان اور پاکستان کے درمیان آبی تنازعات میں اضافہ ہوسکتا ہے کیونکہ موسموں کی تبدیلی دریائے کابل میں پانی کی مقدار اور روانی کو مسلسل متاثر کر رہی ہے۔ اگر ہم آبپاشی کا نظام جدید خطوط پر استوار کرلیں تو بغیر استعمال کے ضائع ہوجانے والے ۳۰ فی صد پانی کی مقدار کو کام میں لاسکتے ہیں۔

پانی صرف دریاؤں ہی میں کم نہیں ہو رہا ہے بلکہ زیرزمین پانی کی سطح بھی خطرناک حد تک نیچے جارہی ہے۔ یہ صورت حال پانی کے استعمال میں احتیاط کا تقاضا بھی کرتی ہے۔ ہمیں گھروں، دفاتر، کارخانوں غرض ہر جگہ پانی کا استعمال سوچ سمجھ کر کرنا چاہیے ورنہ ہم بوند بوند پانی کو ترس جائیں گے اور کوئی ہمارا پرسان حال نہیں ہوگا۔ کیوں کہ عالمی یوم آب کی تازہ ترین رپورٹ کے مطابق پاکستان کو مستقبل میں آبپاشی کے پانی کی قلت کے ساتھ ساتھ پینے کے پانی کی شدید قلت کا سامنا ہوگا اور فی الوقت بھی ملک میں ڈیڑھ کروڑ سے زائد افراد پینے کے صاف پانی سے محروم ہیں۔

دریائے چناب اور بھارتی ماہرین کے خدشات

دریائے چناب اب ڈیموں والا دریا بننے جارہا ہے، کیونکہ بھارت مقبوضہ جموں و کشمیر اور ہماچل پردیش میں اس دریا پر ۶۰ ہائیڈروپاور پروجیکٹ تیار کررہا ہے جن کے ذریعے وہ لگ بھگ ۱۵ ہزار میگاواٹ بجلی پیدا کرے گا۔ اس سلسلے میں سابق بھارتی وزیراعظم من موہن سنگھ اور جموں و کشمیر میں ۵۲۰ میگاواٹ منصوبے کا سنگ بنیاد رکھ بھی چکے اور اس پر کام جاری ہے۔ ان منصوبوں کے حوالے سے کشمیر یونیورسٹی کے شعبہ اراضی سائنس کے سربراہ کا کہنا ہے کہ کسی ایک دریا پر اس قدر تعداد میں تعمیر کیے جانے والے منصوبوں کے منفی نتائج رفتہ رفتہ سامنے آتے ہیں۔ یہ منصوبے زلزلوں کے قبل از وقت ظاہر ہونے کا اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ریزشِ زمین (Land Sliding) کا سبب بن سکتے ہیں۔ جبکہ بھارت ہی کے زلزلوں کے علم کے ماہر ایم بھٹ کا بھی یہی کہنا ہے۔ اس حوالے سے انھوں نے ۲۰۰۹ء میں بگلیہار ڈیم کا واقعہ یاد دلایا جب بھاری لینڈ سلائیڈنگ نے ڈوڈا اور کشتواڑ کا زمینی راستہ کئی دنوں تک روکے رکھا۔ ساؤتھ ایشین نیٹ ورک آن ڈیمز، ریورز اینڈ پیپلز (SANDRP) نامی غیر سرکاری تنظیم سے وابستہ ماہر ہمانشو ٹھکر کہتے ہیں کہ ہماچل پردیش اور جموں و کشمیر کے چناب بیس میں مختلف ڈیموں اور ہائیڈروپاور پراجیکٹس کے ساٹھ سے زائد منصوبوں کے ماحولیاتی حالات، ارضیاتی ساخت، قدرتی آفات کے امکانات، بدلتے موسموں اور مقامی آبادیوں پر مرتب ہونے والے اثرات کا نہ تو قبل از تعمیرات کوئی مطالعہ کیا گیا ہے، نہ ہی بعد از تعمیرات ان منصوبوں کے اثرات کا جائزہ لیا گیا ہے اور نہ ہی ان منصوبوں کی پائیداری اور ان کے محفوظ ہونے کے بارے میں تحقیق کی گئی جو کہ خطرناک صورتحال ہے۔ اس طرح انڈس ڈیلٹا بھی تباہ ہو رہا ہے۔



صاف پانی......محفوظ زندگی

صاف پانی کے ذریعے صحت مند معاشرے کا قیام

شعیب احمد ہاشمی

ہمیں اکیسویں صدی میں داخل ہوئے ایک دھائی سے زیادہ عرصہ بیت چکا۔ سرمایہ دارانہ نظام اور اُس کی چکا چوند ہے کہ ہر شخص زندگی کو آرام دہ اور پُرسکون بنانے کے لیے کوشاں ہے۔ لیکن ایسے میں ہمارے ہی ملک میں ہمارے ہی لوگ کبھی پیدل تو کبھی جانوروں پر صبح سے شام تک پینے کے پانی کے حصول اور تلاش میں سرگرداں نظر آتے ہیں۔ جی ہاں آج کے پیشہ وارانہ دور میں بھی جن کی زندگی کا سب سے بڑا مقصد پینے کے لیے صاف پانی کی تلاش ہے اور اسی میں اُن کی زندگی کی بقا ہے۔ پانی ہر انسان کی بنیادی ضرورت ہے۔ پانی کی اہمیت کا اندازہ صرف اسی بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ زندگی وہیں پھلتی پھولتی ہے، جہاں پانی میسر ہو۔ گویا پانی زندگی ہے اور صاف پانی محفوظ زندگی۔

عالمی ادارہ صحت (WHO) کے مطابق پاکستان میں پینے کے پانی کی جائزہ رپورٹس میں اس بات پر گہری تشویش کا اظہار کیا گیا ہے کہ پاکستان میں پانی کی آلودگی بہت سی بیماریوں کو جنم دے رہی ہے۔ حالیہ اعداد وشمار کے مطابق پاکستان میں ہر سال ۵ سال سے کم عمر کے اڑھائی لاکھ (۲۵۰۰۰۰) بچے آلودہ پانی کے باعث لڑکپن سے پہلے موت کی آغوش میں سو جاتے ہیں۔ آلودہ پانی سے سانس کی بیماریاں، آنتوں کی سوزش، اسہال، جلدی امراض، غدود کا بڑھنا، ٹی بی، ہیپاٹائٹس جیسے مہلک امراض بڑھتے جا رہے ہیں۔ جس کے علاج معالجے، ادویات کی برآمد اور افرادی قوت کے متاثر ہونے کے باعث پاکستان کی معیشت کو ہر سال ایک ارب ۳۰ کروڑ ڈالر کا نقصان ہو رہا ہے۔ ہر پانچ میں سے چار امراض پانی سے لگنے والی بیماریوں سے پیدا ہوتے ہیں۔ جن میں سے اسہال، بچوں میں اموات کا سب سے بڑا سبب ہے۔

پاکستان میں شہری اور دیہی علاقوں میں پانی کے حصول کے مختلف ذرائع ہیں۔ شہروں میں ٹینکی کے ذریعے سپلائی، گھریلو موٹریں اور ٹیوب ویل وغیرہ۔ اسی طرح دیہات میں کنویں، ہینڈ پمپ اور چشمہ وغیرہ اور دور دراز اور پسماندہ علاقوں میں تو بارش کا جمع شدہ پانی یا کسی ندی نالے سے بھی پانی حاصل کیا جاتا ہے۔ لیکن پانی کے حصول کے اِن مختلف ذرائع میں آلودگی بھی مختلف طرح سے ہو رہی ہے۔ کئی مقامات خاص کر بلوچستان اور جنوبی پنجاب کے علاقوں میں زیر زمین پانی کا معیار نچلی تہ میں کسی قدرتی دھات اور معدنیات کی کثافت کے باعث زیر استعمال نہیں رہتا۔ شہروں میں پانی کے پائپوں کا زنگ آلود ہونا، ٹوٹنا اور اُس میں گندے نالوں کا پانی شامل ہونا وغیرہ۔ شہروں کی آبادی میں تیزی سے اضافہ ہو رہا ہے اور بارش کا پانی گرد و غبار، دھوئیں اور دیگر کثافتیں لے کر جب زیر زمین جاتا ہے تو بھی وہ آلودہ ہو چکا ہوتا ہے۔ کھارے پانی کا مسئلہ تو بالکل عام ہے۔ اسی طرح دیہات میں زرعی زمینوں کے لیے گندے پانی کا استعمال، صنعتی کارخانوں سے خارج ہونے والا گندا پانی زہریلے کیمیائی مادوں پر مشتمل ہوتا ہے اور یہ دریاؤں اور نہروں میں گر کر اِن کے پانی کو جانداروں کے لیے مہلک بنا

دیتا ہے۔اس کے علاوہ بڑے پیمانے پر کیمیائی کھادوں اور کیڑے مار دواؤں کے استعمال نے بھی پانی کو بہت آلودہ کر دیا ہوا ہے۔ زیرِ زمین پانی کی کوالٹی مختلف علاقوں میں مختلف ہے۔ ٹیوب ویلز اور موٹر پمپس کے ذریعے پانی نکالنے سے زیرِ زمین تازہ پانی میں کھاری (Saline) پانی داخل ہو گیا ہے جس سے پینے کے پانی کی کوالٹی بہت خراب ہوگئی ہے۔

پاکستان میں پانی کے معیار پر نظر رکھنے اوراس کا جائزہ لینے کا لائحہ عمل تقریباً نہ ہونے کے برابر ہے۔اداروں کا کمزور انتظام ،لیبارٹریز میں ساز وسامان کی کمی اور اس حوالے سے کسی قانون کی عدم موجودگی سے بھی معاملہ بگڑ چکا ہے۔سب سے بڑھ کر لوگوں کا اس مسئلے کی سنگینی سے لاعلم رہنا زیادہ تشویش ناک ہے۔ مسئلے کے مکمّل ادراک کے لیے ضروری ہے کہ پانی کے ذرائع، پانی کا معیار اور اس کے صحت پر اثرات سے آگاہی حاصل کی جائے ۔اس کے بعد پانی کی حفظانِ صحت کے اصولوں کے مطابق سپلائی کی حکمت عملی طے کی جائے۔ ایسے میں غیر ملکی کمپنیاں پاکستان میں پینے کے پانی کے مسائل سے بھرپور فائدہ اٹھا رہی ہیں ان کے لیے کروڑوں کی آبادی کا ملک بہت بڑی مارکیٹ ہے۔ یہ کمپنیاں مارکیٹ میں بوتلوں میں صاف پانی بیچ کر سرمایہ اکٹھا کر رہی ہیں ۔صاف پانی کی بوتلیں اشرافیہ کے دستر خوانوں کی زینت تو بن گئی ہیں لیکن کیا عام آدمی کو صحت یا صاف پانی کی ضرورت نہیں ہے؟ ایک اندازے کے مطابق پاکستان میں ۶ کروڑ ۳۰ لاکھ آبادی کو صاف پانی میسر نہیں۔اتنی بڑی تعداد میں پانی کی کمی کو پورا کرنا آسان کام نہیں۔

پانی زندگی ہے اور ہر انسان کی بنیادی ضرورت ہے۔ جب ہمارے دور دراز علاقوں میں ،گھر یا گھر کے نزدیک پانی میسر نہیں ہوتا تو بچے اور خواتین روزانہ ۳ سے ۵ گھنٹے گھروں سے دور کسی نلکے ،کنویں ، بارش کے جمع شدہ پانی یا کسی ندی نالے سے پانی لانے میں صرف کرتے ہیں ۔ یہ وہ وقت ہوتا ہے جب بچوں کو اسکول ہونا چاہیے اور خواتین کو گھروں کی صفائی اور دیکھ بھال کرنی چاہیے۔لیکن یہ وقت پانی کے حصول میں گزرتا ہے اور اتنی مشقّت کے بعد یہ جمع شدہ پانی کئی کثافتیں شامل ہونے کے باعث مختلف بیماریوں کا موجب بنتا ہے جس کے علاج معالجے پر الگ اخراجات آتے ہیں۔ ایسے میں اگر اُس علاقے کے قریب پینے کے صاف پانی کا پراجیکٹ شروع کیا جائے تو جو وقت بچے اور خواتین پانی لانے میں صرف کرتے ہیں، اُس وقت میں بچے اسکول جاسکیں گے اور خواتین گھروں کی بہتر دیکھ بھال کرسکیں گی۔ صاف اور صحت بخش پانی سے بیماریوں کا خاتمہ ہوگا اور علاج معالجے کے لیے خرچ کی جانے والی رقم سے بچوں کی کتابیں اور یونی فارم آسکے گا۔ بچے اسکول جاسکیں گے اور خواتین کی صحت بہتر ہوگی۔

۲۲ مارچ دنیا بھر میں پانی کے عالمی دن کے طور پر منایا جاتا ہے۔ گزشتہ کئی سالوں سے الخدمت فاؤنڈیشن سمیت کئی دیگر تنظیمیں بھی پاکستان میں یہ دن مناتی ہیں جس کا مقصد پانی کو آلودگی سے بچانے اور صحت کے لیے اس کے مضر اثرات سے لوگوں کو آگاہی کا کام بھی سرانجام دیا جارہا ہے۔اِس موقع پر ”صاف پانی ......محفوظ زندگی“ کے عنوان کے تحت ملک بھر میں آگاہی واک اور تصویری نمائش کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ پیارے نبی ﷺ نے فرمایا کہ پانی پلانا بہترین صدقہ ہے۔ ”صاف پانی...... محفوظ زندگی“ ایک پیغام اور اعلان ہے جو دعوت دیتا ہے کہ نہ صرف خود پانی کی اہمیت کو سمجھتے ہوئے اِسے آلودہ ہونے سے بچائیں، اِس کا صحیح استعمال کریں بلکہ دوسروں کو بھی اِس دعوت میں شریک کریں اور خاص طور پر ہمارے وہ ہم وطن جن تک یہ بنیادی ضرورت نہیں پہنچی، اُن تک اِس نعمت کو پہنچانے کا انتظام بھی کریں۔ اپنی مدد آپ کے تحت اور دوسروں کی بھلائی کے کلچر کو فروغ دینے کا مستحسن کام تب تک پروان نہیں چڑھ سکتا جب تک عام لوگ ساتھ نہ ہوں۔

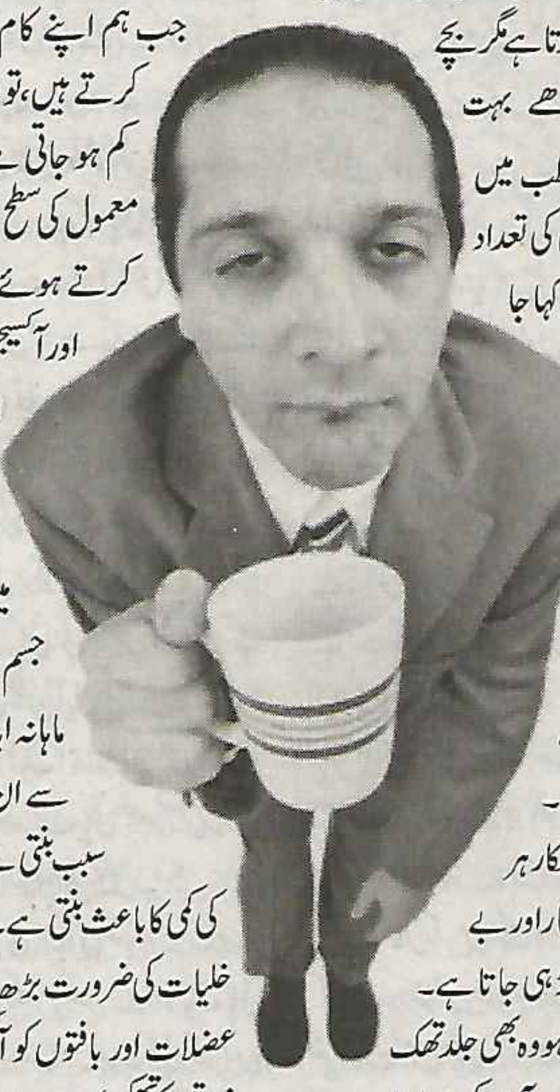
یہ تھکن کیوں؟

آرام کرنا یا سو جانا تو مسئلے کا حل نہیں

حکیم راحت نسیم سوہدروی

تھکن ایک عام شکایت ہے۔ کبھی نہ کبھی کوئی نہ کوئی ہر عمر کا فرد اس کا شکار ہوتا ہے مگر بچے بہت کم جبکہ بوڑھے بہت زیادہ۔ مگر دیکھا یہ گیا ہے کہ اب مطب میں تھکن کی شکایت لے کر آنے والوں کی تعداد میں آئے روز اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ کہا جا سکتا ہے کہ تھکن اس دور کا ایک بڑا اہم مسئلہ ہے۔ یہ تو سب کو علم ہی ہے کہ تھکن کی عام وجہ کثرت کار ہے۔ تھکن کے مریضوں کی جسمانی توانائی اور ہمت جواب دے جاتی ہے اور وہ ذہنی و جسمانی طور پر لاچار ہو جاتے ہیں۔ کاہلی اور سستی آن گھیرتی ہے۔

اگرچہ تھکن ایک ایسا مسئلہ ہے جس کا شکار ہر دور کے افراد رہے ہیں کیونکہ کثرت کار اور بے خوابی سے ہر کسی کو کبھی نہ کبھی واسطہ پڑ ہی جاتا ہے۔ ایسے لوگ جن میں غذائی اجزا کی کمی ہو وہ بھی جلد تھک جاتے ہیں۔ میں بہت تھک گیا ہوں۔ آرام کرنا چاہتا ہوں۔ یہ جملہ ہم اکثر اپنے دوست احباب سے سنتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جن میں غذائی کمی ہوتی ہے اور تھوڑے سے کام یا مشقت سے تھکن محسوس کرتے ہیں مگر اس کے علاوہ اس مسئلہ صحت کے بڑھنے کے جو عوامل سامنے آئے ہیں۔ ان میں خواتین میں ایام کے دوران خون کا زیادہ بہنا، جذبات میں ہیجانی کیفیت، باہمی نفرت کے علاوہ غدہ درقیہ (Thyroid Gland) کا غیر فعال ہو جانا، کیفین کا بکثرت استعمال اور جسم میں کسی وجہ سے پانی کی کمی بھی ہو سکتی ہے۔



جب ہم اپنے کام کاج جسم کی توانائی سے زیادہ کرتے ہیں، تو ہمارے خون میں شکر اور آکسیجن کم ہو جاتی ہے۔ جب اس کا تناسب جسم میں معمول کی سطح سے کم ہو، تو دماغ اس کو محسوس کرتے ہوئے تمام جسم کو پیغام دیتا ہے کہ شکر اور آکسیجن کا ذخیرہ کم ہو رہا ہے اور اس کا اظہار تھکن کی صورت میں کرتا ہے۔ اس وقت جسم میں تھکن اور دکھن محسوس ہوتی ہے۔ ایسے میں تھوڑا آرام کرنے کی صورت جسم نارمل ہو جاتا ہے۔ جن خواتین کو ماہانہ ایام میں زیادہ خون آئے، اس سے ان میں خون کی کمی ہو کر تھکن کا سبب بنتی ہے کیونکہ خون کی کمی جسم میں فولاد کی کمی کا باعث بنتی ہے۔ اس صورت میں خون میں سرخ خلیات کی ضرورت بڑھ جاتی ہے۔ کیونکہ یہ خلیے جسم کے عضلات اور بافتوں کو آکسیجن فراہم کرتے ہیں۔ جن خواتین کو تھکن کا سبب ماہانہ ایام میں خون کی زیادتی ہو ان کو فولاد والی غذاؤں کا زیادہ استعمال کرنا چاہیے تاکہ تھکن جیسے مسئلہ صحت سے محفوظ رہیں۔

جذبات میں ہیجانی کیفیت بھی اس مرض کا بڑا سبب ہے۔ جو تھکن کام کی زیادتی کے باعث ہوتی ہے وہ تھوڑی دیر آرام کرنے کی صورت جاتی رہتی ہے اور طبیعت پھر سے تازہ دم ہوجاتی ہے۔ مگر ایسا شخص جو ہیجانی کیفیت کا شکار ہو مثلاً کسی ایسے شخص سے واسطہ ہو جس سے ذہنی ہم آہنگی نہ ہو اور چپقلش رہتی ہو ایسی تھکن غذاؤں اور آرام کے باوجود نہیں جاتی۔ کیونکہ ایسی تھکن کا سبب اعصابی تناؤ اور ذہنی دباؤ ہوتا ہے۔ اگرچہ ماہرین طب وصحت اس اعصابی و ذہنی تھکن کا حل سیر کو قرار دیتے ہیں کہ اس طرح اعصاب اور ذہن کو سکون ملتا ہے کیونکہ سیر سے دبے ہوئے احساسات کو نکل جانے کا راستہ مل جاتا ہے۔ اس طرح وہ لوگ جو قسمت کی نامرادی کو ذہن پر سوار کر لیتے ہیں یعنی یہ کہ میں زندگی میں کامیاب و کامران نہیں بن سکا یا نہیں ہوسکتا۔ ہمت ہار کر بیٹھ جاتے ہیں کہ ان کے ذہن میں یہ خوف سوار ہوجاتا ہے۔ ایسے لوگ گزرے ہوئے کل کو بھول کر آنے والے روشن دن میں جینا سیکھنے کے اصول پر عمل کریں۔ ہمت ہارنے کی بجائے ہمت باندھیں۔ محنت کریں اور پانچ وقت نماز ادا کریں۔

قدرت نے ہمارے گلے میں ایک چھوٹا سا غدود غدہ درقیہ (Thyroid Gland) رکھا ہے۔ یہ غدود ہضم وانجذاب کے نظام کو کنٹرول کرتا ہے۔ جب یہ غدہ غیر متحرک یا غیر فعال ہو جائے، تو ہضم وانجذاب کا نظام سست ہوجاتا ہے۔ جس سے جسم میں غذائی کمی کے باعث تھکن محسوس ہوتی ہے۔

کیفین جسم میں خون کو تحریک دے کر متحرک رکھتی ہے مگر کیفین کی زیادتی حرکات قلب کو تیز، فشارِ خون کو بلند اور ہیجانی کیفیت پیدا کرتی ہے جس سے جسم تھکن محسوس کرتا ہے۔ جسم میں پانی کی قلت بھی تھکن کا سبب بن سکتی ہے۔ اگر تھکن کا سبب قلت پانی ہے، تو پانی کا استعمال زیادہ کریں۔

عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ ہمارے لوگ تھکن اتارنے کے لیے آرام کی خاطر لیٹ جاتے ہیں یا سو جاتے ہیں۔ وہ لوگ جو کثرت کار کے باعث تھکن کا شکار ہوجاتے ہیں وہ یقیناً کچھ دیر آرام کے بعد تازہ دم ہوجاتے ہیں مگر لیٹ جانا، آرام کرنا یا سو جانا مسئلے کا حل نہیں ہے کیونکہ تھکن کا سبب بے خوابی نہیں۔ دیکھا گیا ہے کہ بعض لوگ رات سے لے کر صبح دیر تک سونے کے باوجود تھکن کا شکار ہوتے ہیں۔ ایسے لوگ اس طرف نہیں سوچتے کہ وہ کوئی کام نہیں کرتے ڈٹ کر آرام کرتے ہیں، تو پھر تھکن کیسی؟ ان لوگوں میں اس تھکن کا سبب یہی بے کاری اور آرام پسندی ہے۔ ایسے لوگوں کو اپنی زندگی کے معمولات تبدیل کر کے کوئی بامقصد کام کرنا چاہیے۔ تھکن دور کرنے کے لیے سب سے اہم یہ ہے کہ تھکن والے لوگ اپنا طرز زندگی تبدیل کریں اور بہتر غذا سے فائدہ اٹھا کر تھکن پر قابو پائیں اور جسمانی توانائی کو قائم رکھیں اگر اس طرح بھی تھکن ختم نہ ہو اور معمول کی جسمانی سرگرمیوں میں حائل ہو، تو پھر فوراً معالج سے رجوع کرنا چاہیے۔ تھکن دور کرنے کے لیے سب سے اہم یہ ہے کہ آپ کی غذائیت درست ہے یا نہیں۔ اگر نہیں تو پھر درست غذا کا استعمال کریں اس حوالے سے چند غذائیں درج ذیل ہیں جو جسم کو توانائی فراہم کرتی ہیں اور تھکن دور کرنے میں معاون ہیں مگر یہ ایسے لوگوں کے لیے ہیں جو غذائی کمی کے

حضرت ابوہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اکرم ﷺ نے فرمایا جس نے پاک کمائی میں سے ایک کھجور کے برابر بھی خیرات کی، اللہ تعالیٰ اسے اپنے دائیں ہاتھ میں قبول فرماتا ہے اور اللہ تو صرف پاک (چیز) ہی قبول کرتا ہے۔ پھر وہ اس (خیرات) کو خیرات کرنے والے کے لیے پالتا رہتا ہے، جیسے تم میں سے کوئی بچھڑے کو پالتا ہے، یہاں تک کہ وہ (خیرات) پہاڑ کے برابر ہوجاتی ہے۔ (صحیح بخاری)

باعث تھکن کا شکار ہوجاتے ہیں۔

پنیر اور دہی

ان کا استعمال غذا کے ہضم و انجذاب کے عمل کو بڑھاتا ہے اور ان میں شامل غذائی اجزا سے عضلات کو توانائی ملتی ہے۔ ان میں شامل کیلشیم اور فاسفورس بہت توانائی بخش ہیں۔

مچھلی اور کم چربی والا گوشت

ان دونوں میں ذہن کو چست اور توانائی بخش اجزا ہوتے ہیں۔ مچھلی میں تقریباً حیاتین اور معدنی نمکیات ہوتے ہیں۔ اس کے ساتھ اس میں اہم چکنائی ہوتی ہے جو غذا کے ہضم اور انجذاب کے نظام کو بہتر کرتی ہے۔

کیلا

یہ پوٹاشیم اور نشاستہ سے بھرپور ہوتا ہے۔ اس کے استعمال سے جسم میں توانائی کا احساس ہوتا ہے جس سے تھکن جاتی رہتی ہے۔ اس طرح ترش پھل حیاتین سے بھرپور ہوتے ہیں۔ یہ حیاتین تھکن پیدا کرنے والے کورٹی سول کی سطح کو کم کرتی ہے۔ اس طرح سیب بھی حیاتین اور فولاد کا اچھا ذریعہ ہیں۔ تربوز جسم میں پانی کی کمی دور کرتا ہے۔

مغزیات

یہ لحمیات اور غذائی ریشے سے بھرپور ہوتے ہیں۔ ہر روز بادام، اخروٹ اور مونگ پھلی کا توازن سے استعمال جسم کو فوراً توانائی فراہم کرتا ہے۔

جئی اور دلیہ

بھوسی والے آٹے کی روٹیاں غذائی ریشے کے علاوہ ملے جلے نشاستہ کی فراہمی میں کردار ادا کرتا ہے جس سے جسم کو طاقت ملتی ہے۔ مختلف قسم کے اناج جو گندم، چاول، باجرے کا آٹا طاقت بخش ہوتے ہیں۔ ان کا دلیہ بطور ناشتا دن بھر توانائی میں اپنی مثال آپ ہے۔ اس دلیہ میں دودھ، دہی، تازہ پھلوں کے ٹکڑے روزانہ ضرورت کے لیے درکار غذائی اجزا کو پورا کر دیتے ہیں۔

پانی

پانی جسم میں تھکن دور کرنے میں اہم ہے کیونکہ اس سے جلد کو توانائی ملتی ہے۔ یہ پیاس بجھانے کے ساتھ جسم کے خلیات کو درکار تمام غذائی اجزا بھی فراہم کرتا ہے۔

سبز چائے

جسم میں بڑھی ہوئی چربی گھلا دیتی ہے اور جسم میں پانی کی کمی دور ہوتی ہے۔

کھانے کے بارے میں ارشاداتِ نبوی ﷺ

۱۔ اکیلے کھانا نہ کھاؤ۔
۲۔ کھانا داہنے ہاتھ سے کھاؤ۔
۳۔ مریض کے ساتھ بیٹھ کر کھانا نہ کھاؤ۔
۴۔ کھانا ٹھنڈا کر کے کھاؤ، گرم کھانے سے معدہ کمزور ہوجاتا ہے۔
۵۔ کھانے کو ٹھنڈا کرنے کے لیے اس میں پھونک نہ مارو۔
۶۔ کھانے کے بعد خلال کیا کرو ورنہ دانت کمزور ہو جاتے ہیں۔
۷۔ دسترخوان پر گری ہوئی چیز اٹھا کر کھانے سے رزق میں فراخی ہوتی ہے۔
۸۔ دسترخوان کو سبزیوں سے زینت دیا کرو۔
۹۔ تکیہ لگا کر یا کھڑے ہو کر کھانے سے بدہضمی ہوتی ہے۔
۱۰۔ رات کو کھانا نہ کھانے سے بڑھاپا جلد آ جاتا ہے۔

(انتخاب: فاطمہ سعاد، واہ کینٹ)

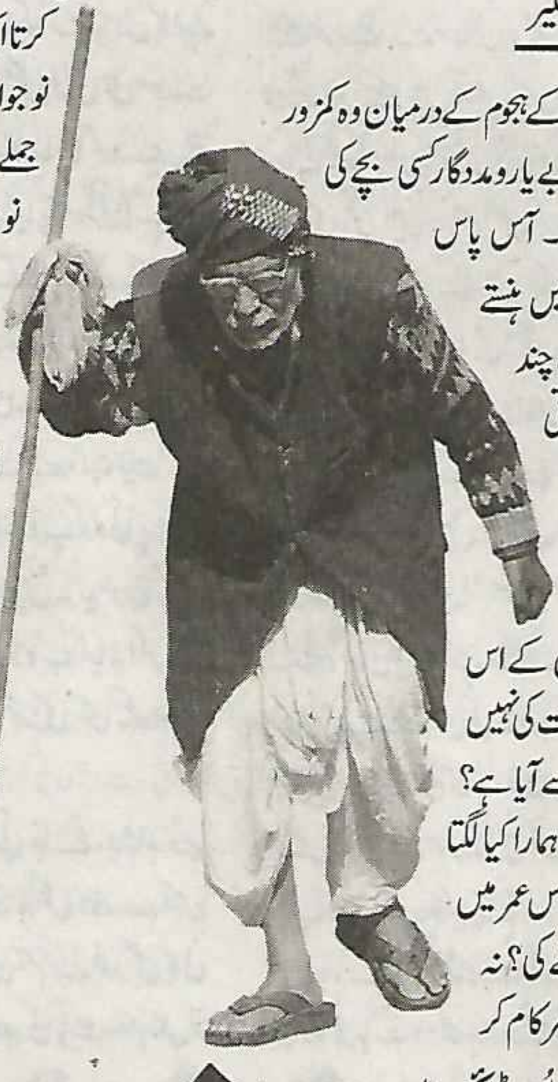


بوڑھے بچے

جن کی ایک ”آہ“ آپ کی زندگی الٹ اور ایک دعا آپ کی زندگی پلٹ سکتی ہے

عافیہ جہانگیر

سڑک پر بے ہنگم ٹریفک کے ہجوم کے درمیان وہ کمزور لاغر بوڑھا شخص بے یارومددگار کسی بچے کی مانند سہما کھڑا تھا۔ آس پاس سے کچھ تنہا، کچھ ٹولیوں کی شکل میں ہنستے باتیں کرتے لوگ گزر رہے ہیں، چند ایک کی نظر اس بوڑھے پر ٹھہرتی ہے۔ طنزیہ نظریں، غصیلی نظریں، ترس کھاتی نظریں اس بوڑھے بزرگ کو مزید حواس باختہ کیے جا رہی ہیں۔ مگر لوگوں کے اس ہجوم میں ایک بھی نظر شفقت، محبّت کی نہیں ہے۔ نجانے کون ہے؟ کہاں سے آیا ہے؟ کہاں جانا چاہتا ہے؟ ہمیں کیا؟ ہمارا کیا لگتا ہے؟ بھلا ضرورت ہی کیا تھی اس عمر میں بھری سڑک پر منہ اٹھا کر نکل آنے کی؟ نہ راستہ پتا ہے نہ ہی ٹھیک سے نظر کام کر رہی ہے۔ پھر بھی بڑے میاں گھر میں ٹک کے بیٹھ نہیں سکے۔ نہ خود آرام سے جیتے ہیں نہ لوگوں کو جینے دیتے ہیں۔ ساری ٹریفک جمع کر دی، تماشا لگا رکھا ہے۔ یہ آوازیں کھسر پھسر کی صورت بوڑھے کے کانوں تک پہنچ رہی ہیں، کچھ منچلے تو تہذیب و ادب کی حدود و قیود کو تقریباً پھلانگتے ہوئے آوازے کس رہے ہیں کہ ارے او بڑے میاں آپ جیسے لوگ ہی تکلیف کا باعث بنتے ہیں۔ کسی گاڑی سے ٹکرا گئے تو بدنام تو ہم نوجوان ہی ہوتے ہیں نا کہ ہمیں گاڑی موٹر سائیکل چلانے کی تمیز نہیں۔ لیجیے! آگے بڑھتے ہی ان بدتمیز نوجوانوں کی ٹولی میں سے کسی ایک کو اسی طرح کی صورت حال کا سامنا کرتا ایک اور بزرگ نظر آیا۔ اب کے تمام نوجوانوں نے پھر سے وہی ہنسی، طنزیہ جملے اچھالنے کا قصد ہی کیا تھا کہ ایک نوجوان چلا اٹھا۔ خاموش! یہ میرے دادا ہیں۔ لڑکوں کی ہنسی کو بریک لگ گیا۔ تقریباً سبھی لڑکے بھاگتے ہوئے اس بزرگ کے پاس پہنچے۔ نوجوان نے نہایت فکرمندی سے پوچھا۔ ارے دادا! آپ یہاں، اتنی بڑی سڑک کے بیچ و بیچ یوں کیوں کھڑے ہیں؟ کیا ہوا؟ اور یہ ہاتھوں میں اتنا سامان کاہے کا ہے؟ مجھ سے کہا ہوتا، میں لا دیتا، آپ کیوں اس عمر میں تن تنہا گھر سے نکلے؟ کہیں گر گرا جاتے تو؟ چوٹ لگ جاتی۔ وہ بوڑھا مسکرایا اور بولا ”بیٹا میں گھر



میں فارغ ہی تھا سوچا کیوں نہ ایک تو پیدل چلنے کا شغل ہو جائے، لگے ہاتھ گھر کا سودا سلف بھی لے لوں گا۔ بس یہ ٹریفک کا رش اتنا تھا کہ گھبراہٹ کے مارے سڑک پار نہ کر سکا اور گھبرا کے قدم وہیں جم گئے۔''

نوجوان نے اپنے دادا کے ہاتھ سے سامان کے تھیلے پکڑے۔ اس کے دوستوں نے دادا کا ہاتھ پکڑا اور پھر وہ دادا کو بڑی محبت اور احتیاط سے گھر کے قریب لے گئے، کسی نے سہارا دیا کسی نے باتوں سے دل بہلایا یوں بڑے میاں کی حالت تھوڑی بہتر ہوئی اور کچھ لمحوں پہلے کی جو گھبراہٹ تھی وہ بھی ختم ہوتی گئی۔ اچانک اس نوجوان کے دماغ میں ایک جھماکا سا ہوا۔ اوہ! یہ ہم نے کیا کر دیا۔ اگر آج اپنے دادا کو اس طرح سڑک پر حیران پریشان کھڑا دیکھ کر میرا دل کانپ اٹھا تو وہ جو پچھلے سگنل پر ایک بابا جی بالکل ایسی ہی صورت حال کا شکار لوگوں کی جھنجھلاہٹ اور غصے کا سامنا کر رہے تھے وہ بھی تو کسی کے دادا، نانا اور باپ تھے۔ کیا پتا وہ بھی اپنے گھر سے یونہی اپنے بچوں کی محبّت میں، ان کے کام آنے کے خیال سے نکلے ہوں اور ہم نے بجائے ان کی مدد کرنے کے، ان کا مذاق اڑا دیا، ان پہ طعنے کسے، بدتمیزی کی۔ کیا تھا جو ہم ان کی بھی مدد کر دیتے، ان سے ایک دفعہ محبّت سے، اپنائیت سے پوچھتے تو سہی کہ آپ کو کہاں جانا ہے بابا؟ آپ کو کوئی پریشانی تو نہیں؟ آئیے ہم آپ کو سڑک پار کرا دیں۔ یہ سوچ کر وہ نوجوان شرمندگی کی اتھاہ گہرائیوں میں ڈوب گیا۔ اگر میں وقت پر نہ پہنچتا تو شاید میرے دادا کے ساتھ بھی یہی کچھ ہوتا۔ وہ خود سے آنکھ نہیں ملا پا رہا تھا۔

جی ہاں! اپنے اردگرد اگر نظر دوڑائی جائے، مشاہدہ کیا جائے تو ایسی ہزاروں کہانیاں، واقعات بالکل ہمارے آس پاس نہ صرف نظر آئیں گے بلکہ بیشتر میں ہم نے خود بھی کافی ''حصہ'' ڈالا ہوگا۔ بزرگوں سے محبّت تو دور کی بات، ہم میں تو ان کا احترام بھی تقریباً مفقود ہوتا جا رہا ہے۔ کالج میں، یونیورسٹی میں، اگر کوئی بزرگ استاد پڑھانے آ جائے تو ہمارا منہ بن جاتا ہے۔ ہم کہتے ہیں اف ان سے ہم کیا پڑھیں گے؟ آپ کے آفس میں بزرگ کام کرتا ہو تو آپ بیزار ہو جاتے ہیں۔ کیا کبھی یہ سوچا ہے کہ آخر بوڑھوں سے اتنی بیزاری کیوں؟ ان کے وجود سے اتنا گریز کیوں؟ ان سے اتنی چڑ کیوں؟ یہ بزرگ بھی آپ کی ہماری طرح زندگی جینے کا اتنا ہی حق رکھتے ہیں جتنا کہ ہم بلکہ میری نظر میں شاید ہم سے کہیں زیادہ۔ کیونکہ ان کے پاس زندگی کا نچوڑ، تجربوں، مشاہدوں کی شکل میں موجود ہوتا ہے۔ عمر کے اس حصے میں جب وہ ہم سے زیادہ اچھا اور بہتر مشورہ نہ صرف دے سکتے ہیں بلکہ زیادہ اچھے طریقے سے مسائل کو سمجھ کر انھیں حل کرنے میں معاون ثابت ہو سکتے ہیں، ہم انھیں فالتو سامان کی طرح بے کار انسان سمجھ کر ان کو قابل توجہ ہی نہیں سمجھتے۔ ہمیں ان کی باتیں دقیانوسی لگتی ہیں۔ ہم کھل کر اپنے والدین سے نہ صرف اختلاف رائے کرتے ہیں بلکہ انھیں یہ بھی جتا دیتے ہیں کہ آپ چپ رہیں، ابا جی! آپ کو آج کے زمانے کا کیا پتا؟ آپ بیچ میں نہ بولا کریں اماں! آپ کو کیا پتا؟ اس قدر ظالم اور سفاک جملے بولتے ہوئے ہم حضور اکرم ﷺ کا یہ فرمان فراموش کر دیتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا ''وہ برباد ہوا، برباد ہوا، برباد ہوا۔'' صحابہ کرامؓ نے سوال کیا ''یا رسول اللہ ﷺ کون؟'' آپ ﷺ نے فرمایا ''جس نے بوڑھے والدین پائے اور ان کی خدمت کر کے جنت حاصل نہ کی۔''
ہم بھول جاتے ہیں کہ وہ وقت دور نہیں جب ہم بھی عمر کے اس دور میں ہوں گے اور ہماری آنے والی نسل ہمیں کہہ رہی ہوگی ''چپ رہیں آپ کو کیا پتا۔''

ہمارے پاس تعلیم ہے بلکہ جدید تعلیم ہے مگر ہمارے پاس ابھی وہ تجربات و مشاہدات نہیں ہیں جو تعلیم سے نہیں بلکہ عمر

سے آتے ہیں۔ تعلیم ہنر سکھاتی ہے مگر اس ہنر کو کس طرح استعمال کیا جائے یہ زندگی کے تجربات سکھاتے ہیں۔ اپنے آپ کو عقلِ کل سمجھنے والے ہم نادان نوجوان یہ بھول جاتے ہیں کہ صرف اعلیٰ اور جدید تعلیم سیکھنا ہی کامیابی نہیں جب تک آپ کے پاس اس تعلیم کو استعمال کرنے کا شعور نہ ہو اور شعور، تجربہ، کامیابی تبھی ممکن ہے جب ہم اپنے بزرگوں سے ان کے تجربات و مشاہدات سنیں، سیکھیں اور پھر ان کی روشنی میں اپنی تعلیم کو بروئے کار لاتے ہوئے زندگی کے فیصلے کریں۔

لیکن بزرگوں سے کچھ سیکھنا تو درکنار ہم نے تو انھیں اپنی زندگی سے الگ تھلگ کرنے کی جیسے قسم کھا رکھی ہے۔ وہ بوڑھے ہیں، بزرگ ہیں، تو کیا وہ ایک اچھی نارمل اور بھرپور زندگی جینے کے حقدار نہیں رہے؟ آپ ذرا سوچیں، آپ کی ذرا سی محبّت، ذرا سی توجہ نہ صرف ان کو اس عمر میں جینے کی نئی راہ دے سکتی ہے بلکہ آپ کی زندگیاں بھی خوبصورت بنا سکتی ہے اور ثواب الگ۔ ہمارا مذہب تو اس قدر خوبصورت اور آسان ہے کہ جس میں صرف بوڑھے ماں باپ کو ایک محبّت بھری نگاہ سے دیکھ لینے سے ہی ہمارے حصے میں کتنا ثواب لکھ دیا جاتا ہے تو سوچیں، اگر ان کی خدمت، دیکھ بھال کی جائے تو کیوں نہ ہمیں دنیا اور آخرت میں کامیابی ملے اور آپ یقین کریں کہ یہ بوڑھے وجود آج بھی اپنے اندر اتنی طاقت رکھتے ہیں کہ ان کی ایک آہ ہماری زندگی کو الٹ سکتی ہے اور ایک دعا ہماری زندگی کو پلٹ سکتی ہے۔ تو پھر جس ہستی کا وجود اتنا طاقتور ہو تو کیا ہمیں ان سے پہلو تہی کرنی چاہیے؟ کیا انھیں بوجھ سمجھنا چاہیے؟ چلیے اپنی ہی غرض کے لیے سہی، کیا ان کی خدمت اور دیکھ بھال ہم نہیں کر سکتے؟

اور یہ تو وہ معصوم، شفیق ہستیاں ہیں جن کو بہلانا، پیار دینا، خیال رکھنا بے حد آسان ہے۔ بالکل ایسے جیسے ایک بچے کو آپ بہلا لیتے ہیں، اسے خوش کر دیتے ہیں، اس کو کسی بڑی چیز کی تمنا یا خواہش نہیں ہوتی۔ وہ تو ایک ذرا سے کھلونے، یا آپ کے محبّت بھرے لمس سے، آپ کی ایک میٹھی نظر سے ہی پرسکون اور مطمئن ہو جاتا ہے۔ ہاں بعض بچے ضدی اور چڑچڑے ہوتے ہیں، لیکن پھر بھی آپ اپنے ماتھے پر ایک بھی شکن لائے بغیر، اس کی ہر ضد پوری کرتے ہیں اور نہ صرف یہ، بلکہ دوسروں کو بھی بہت فخر سے بتاتے ہیں کہ میرا بچہ تو بہت ضدی ہے، اپنی بات منوا کر ہی چھوڑتا ہے۔ یہ کہتے ہوئے آپ کے لہجے میں ایک احساسِ تفاخر نمایاں ہوتا ہے۔ آپ اپنے ملنے جلنے والوں کو بہت فخر سے بتاتے ہیں، جتاتے ہیں کہ آپ اس قابل ہیں کہ آپ اپنے بچے کی ہر جائز و ناجائز خواہش کو پورا کرنے کی اہلیت رکھتے ہیں۔ لیکن یہی ضد کا عنصر یا چڑچڑا پن اگر اپنے بوڑھے والدین یا دادا دادی، نانا نانی میں دیکھیں تو آپ بے زاری کا مظاہرہ کرتے ہوئے سب کو کہتے ہیں کہ بھئی انھوں نے تو زندگی عذاب کر دی ہے۔ نہ خود چین سے رہتے ہیں نہ ہمیں رہنے دیتے ہیں۔ ایک پل کو سوچیے، وہ بچہ جس نے ابھی آپ کے لیے کچھ نہیں کیا، آپ کو کچھ نہیں دیا، اس کی خواہشیں اور ضدیں آپ کو کتنی عزیز ہیں، اور وہ بوڑھے "بچے"، جنھوں نے تمام عمر آپ کو دیا ہی دیا ہے، ان کی ضدیں آپ کو بوجھ لگنے لگیں؟

بہت چھوٹی چھوٹی باتوں کو مدِنظر رکھنے سے آپ اپنے بزرگوں کو نہ صرف ان کی من چاہی زندگی واپس لوٹا سکتے ہیں، بلکہ دعائیں سمیٹ کر اپنی زندگی کو بھی خوشیوں، کامیابیوں اور طمانیت سے بھرپور بنا سکتے ہیں۔

۱۔ بزرگوں سے مشورہ لیجیے

اپنی زندگی کے چھوٹے چھوٹے معاملات میں اپنے بزرگوں کو نظرانداز مت کریں۔ اس طرح آپ خود وجہ بن رہے ہیں ان کی ضد اور چڑچڑے پن کی۔ آپ کا یہ رویہ ہی انھیں ضدی بننے پر اکساتا ہے۔ گھر کے چھوٹے چھوٹے مسائل پر ان سے مشورہ لیں، ان کو شامل کریں۔ ان کو احساس دلائیں کہ زمانہ جتنا بھی بدل چکا ہو یا جدید دور ہو، ان کی باتیں

اور مشورے اب بھی اتنے ہی اہم ہیں جتنا کہ ان کی جوانی کے دور میں ہوا کرتے تھے۔

۲۔ اہمیت کا احساس دلائیں

اپنی باتوں سے انھیں احساس دلائیں کہ آپ زندگی کی موجودہ جس بھی سیڑھی پر کھڑے ہیں، یہاں تک پہنچنے میں آپ کے بزرگ آپ کے معاون رہے ہیں، ان کے بغیر آپ کچھ نہیں بن سکتے تھے۔ آپ کی موجودہ کامیابی صرف انہی کی مرہون منت ہے۔ جس طرح اپنے بچپن میں آپ ان سے ضد کیا کرتے تھے کہ وہ آپ پر اعتماد کریں کیونکہ آپ ''بڑے'' ہو چکے ہیں، اسی طرح اب آپ کی باری ہے کہ آپ ان پر اعتماد کریں کیونکہ بہر حال آپ کے بڑے وہی ہیں۔

۳۔ اپنے بچپن کی باتیں کریں

بزرگوں کے پاس یادوں کا ایک عظیم ذخیرہ موجود ہوتا ہے۔ اپنے بچوں کو اپنے والدین یا گھر کے کسی بھی بزرگ کے پاس بٹھا کر، بزرگوں سے اپنے بچپن کی باتیں سنانے کو کہیں۔ زمانہ جدید ہو یا قدیم، بچپن سب کا ہی دلچسپ اور بھرپور ہوتا ہے۔ آپ کے بچے نہ صرف لطف اندوز ہوں گے بلکہ ان کے اور بزرگوں کے درمیان ایک لطیف سا رشتہ بنے گا۔ بزرگوں کو بھی احساس ہوگا کہ ان کی یادیں اور باتیں سننے والے آج بھی ہیں اور بچے بوڑھوں سے دوستی کا رشتہ استوار کرلیں گے۔ یوں بزرگوں اور نوجوانوں کے بیچ دوری اور فاصلہ کم ہوگا۔

۴۔ خاندانی تقریبات میں شمولیت

اکثر دیکھا گیا ہے کہ اگر کسی گھرانے نے شادی پر جانا ہو تو گھر کے افراد اپنے بزرگ چاچا، دادا، نانی اور تو اور ماں یا باپ کو بھی گھر چھوڑ جاتے ہیں اور عذر یہ پیش کرتے ہیں کہ آپ تھک جائیں گے، بور ہو جائیں گے۔ بظاہر آپ کے بزرگ منہ سے کچھ نہ کہیں، یا آپ کا دل رکھنے کو کہہ دیں کہ ہم وہاں جا کر کیا کریں گے بیٹا آپ لوگ جاؤ اور آپ مطمئن ہو کر چلے بھی جاتے ہیں۔ رکیے! سوچیے ذرا اس جملے کی گہرائی اور دردناک حقیقت۔ ''ہم وہاں جا کر کیا کریں گے۔'' ایسا کیوں؟ یہ نوبت کیوں آ گئی کہ ہمارے عزیز بزرگ، ایسا کہنے پر مجبور ہو گئے۔ کیا اب ان کے کرنے کو کچھ نہیں رہا؟ کیا وہ اتنے بے کار، غیر ضروری ہو چکے کہ ان کا کسی تقریب سے میں جانا تک ضروری نہیں۔ جن اولادوں، پوتے پوتیوں، نواسے نواسیوں کی پیدائش پر ان کی خوشی دیدنی تھی۔ کیا ان کی شادیوں میں شامل ہونے کے بھی وہ حقدار نہیں رہے؟ صرف اس لیے کہ وہاں آپ سب لوگ اپنے ہنگاموں میں اس قدر مصروف ہو جاتے ہیں کہ ان کو یکسر فراموش کر دیا جاتا ہے۔ یا اگر ساتھ لے بھی جائیں تو کسی خالی کونے میں بٹھا کر اپنے بچے ان کے حوالے کر دیے جاتے ہیں تاکہ آپ خود آرام سے تقریب میں گھومیں پھریں، اور وہ آپ کے بچوں کے بچوں یا سامان کی حفاظت کے لیے ایک چوکیدار کی طرح بیٹھے رہیں۔ آپ انھیں ساتھ لے کر جائیں، انھیں سب سے آرام دہ اور نمایاں جگہ پر بٹھائیں تاکہ وہ سب طرف دیکھ سکیں۔ اپنے آپ کو ماحول سے الگ نہ سمجھیں، بزرگوں کے لیے اہتمام سے کھانا لگوائیں اور تمام لوگوں سے انھیں ملوائیں اور سب کو احساس دلائیں کہ اس تقریب میں آپ اپنے بزرگوں کے ساتھ آئے ہیں نا کہ بزرگ آپ کے ساتھ۔

۵۔ گھر میں انھیں مصروف رکھیں

مصروفیت سے کئی لوگ یہ مطلب نہ لیں کہ ان سے گھر کے کام کروانا، اس نازک عمر میں ان کے کمزور کندھوں پر بوجھ ڈالنا ہے بلکہ ایسے تفریحی اور دلچسپ کاموں میں ان کو مصروف رکھیں کہ وہ اپنے آپ کو ناکارہ یا آپ پر بوجھ نہ سمجھیں۔ خواتین گھریلو امور پر ان سے چھوٹے چھوٹے مشورے لے سکتی ہیں۔ پرانے زمانے میں پکائے جانے

والے سادہ مگر لذت سے بھرپور کھانوں کی تراکیب پوچھ کر پکا سکتی ہیں تاکہ منہ کا ذائقہ بھی تبدیل ہو اور پرانی روایات بھی زندہ رہیں اور کم خرچ بالانشین والا معاملہ بھی ہو جائے۔ کیونکہ پرانے وقتوں میں نہایت سادہ غذا کھائی جاتی تھی جو نہ صرف لذیذ بلکہ حفظانِ صحت کے تقاضے بھی پورا کرتی اور کم خرچ بھی ہوتی۔ مرغن کھانے، بدیسی تراکیب معدے کے ساتھ ساتھ، جیب پر بھی بھاری پڑتی ہیں۔ یوں آپ کو بھی سہولت ہوگی اور بزرگوں کی رائے کو اہمیت دے کر آپ ان کا کھویا ہوا اعتماد بھی بحال کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ نہ ہی انھیں یہ شکوہ رہے گا کہ اب باورچی خانے میں ان کی ضرورت نہیں رہی۔ مردوں کی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے گھر کی خواتین کو باور کرائیں کہ مہینے میں دوچار دفعہ کھانا بزرگوں کی پسند اور مرضی کا ہی پکے گا۔ یوں بوڑھی خواتین بھی راضی اور آپ کے اہلِ خانہ بھی آسان اور سستے کھانے پکا کر اور کھا کر خود کو ہلکا پھلکا محسوس کریں گے۔ اگر بزرگ حضرات آپ کے من پسند چٹ پٹے مرغن کھانے کھا کر اپنا گزارہ کر سکتے ہیں، حالانکہ ان کا کمزور معدہ اور نظامِ ہضم اس کی اجازت نہیں دیتا، پھر بھی وہ یہ سب کرتے ہیں صرف آپ کے لیے، تو کیا آپ مہینے میں چند ایک دفعہ ان کی بتائی ہوئی من پسند غذا نہیں کھا سکتے؟ جس میں فائدہ بھی سراسر آپ کا ہی ہوگا۔ وقت اور پیسے کی بچت الگ اور ہمارے بوڑھے بچے بھی خوش ہو جائیں گے اور آپ کو کچھ زیادہ تردد بھی نہیں کرنا پڑے گا۔

اپنے بچوں کے لیے بھی تو مائیں سارا سارا دن باورچی خانے میں گھسی، نت نئی ڈشیں تیار کرتی رہتی ہیں۔ تو بوڑھوں کی فرمائش پوری کرنے میں بھی کوئی حرج نہیں۔ آخر عمر کے اس دور میں وہ کس سے فرمائش کریں۔ ان کا تو سب کچھ اب آپ ہی ہیں۔ ان کے اپنے والدین تو اب رہے نہیں، وہ آپ سے ہی اپنی تمام امیدیں وابستہ کیے ہوئے ہیں۔ جیسے اپنے بچپن میں آپ ان سے کرتے تھے۔

۶۔ ذہنی اور جسمانی صحت

آپ سب اپنی اپنی زندگیوں کی بھاگ دوڑ میں مصروف ہیں، اس ترقی یافتہ دور میں ہر کام جلدی جلدی انجام دیا جانے لگا ہے، وقت کسی کے پاس نہیں، عجب افراتفری کا دور ہے۔ لیکن زمانہ کوئی بھی ہو، اپنے پیاروں کے لیے وقت نکالنا پڑتا ہے۔ جیسے آپ، جتنے بھی تھکے کیوں نہ ہوں، اپنے بچوں کو سیر پر لے جانے کا وقت نکال ہی لیتے ہیں۔ لیکن اپنے بزرگوں کے لیے آپ کے پاس وقت ہی نہیں حالانکہ ضروری نہیں کہ آپ سارا دن ہی ان کے ساتھ بیٹھے رہیں۔ ان کو خوش کرنے اور خیال رکھنے کے لیے وقت کی نہیں، ذرا سی نرم مسکراہٹ، توجہ اور ہلکی پھلکی باتوں کی ہی بس ضرورت ہے۔ آپ اپنے آفس کا کوئی کام کر رہے ہیں، تو آپ اپنی فائلیں اور کاغذات لے کر الگ تھلگ، یا اپنے کمرہ میں بیٹھنے کے بجائے ان کے پاس آکر بیٹھ جائیں۔ یقین جانیں، وہ جانتے ہیں کہ کام آپ کے لیے کس قدر ضروری ہے، وہ کبھی آپ کو ڈسٹرب نہیں کریں گے، ان کے لیے تو یہی خوشی بہت ہے کہ آپ آکر ان کے پاس بیٹھے ہیں۔ یاد کریں، جب آپ اپنے بچپن میں اپنے اسکول کے کام، یا پرچوں کے لیے جاگا کرتے تھے، تو آپ کے والد یا ماں، آپ کے پاس آکر بیٹھ جاتے تھے تاکہ آپ کو اکیلا پن محسوس نہ ہو اور آپ زیادہ مستعدی اور دل لگا کر پڑھائی کر سکیں۔ اسی طرح آج بھی وہ آپ کا ساتھ دیں گے۔ آپ کا ان کے پاس بیٹھنا ہی کافی ہوگا، آپ ان سے کہیں کہ وہ آرام سے لیٹ جائیں یا آپ انھیں کوئی اخبار یا رسالہ تھما دیں، یوں ماحول میں خوبصورتی، تسلسل اور یکسوئی پیدا ہو جائے گی۔ یاد رکھیں، ماں باپ یا بزرگوں کا وجود کبھی بھی ہمارے لیے باعث اذیت تھا نہ ہو سکتا

ہے۔ ان کے پاس بیٹھ کر کام کرنے سے آپ خود کو مزید ہشاش بشاش تازہ دم اور توانا محسوس کریں گے۔

۷۔ ہلکی پھلکی جدید ٹیکنالوجی سکھائیں

آپ کے بزرگوں نے تمام عمر زندگی کا سفر بہت قابلیت، سمجھ بوجھ اور ذہانت و محنت کے ساتھ طے کیا ہے۔ اگر آپ یہ سوچتے ہیں کہ آج کل کے جدید نظام کو وہ نہیں سمجھ پائیں گے تو یہ آپ کی بھول بھی ہوسکتی ہے۔ انھیں کمپیوٹر یا موبائل فون کا استعمال آسان طریقے سے سمجھائیں۔ انٹرنیٹ کی دنیا تنہائی کی اچھی ساتھی ثابت ہوتی ہے اور اب تو اُردو زبان کے بھی سافٹ وئیر اور ویب سائٹس موجود ہیں جہاں ہر طرح کا تفریحی اور معلوماتی مواد موجود ہوتا ہے۔ یہ یقیناً ان کے لیے دلچسپ اور بھرپور وقت گزاری کا سبب بن سکتا ہے۔

۸۔ گھر کی بناوٹ اور بیت الخلا کی سہولت

بعض گھروں میں اونچے نیچے فرش ہوتے ہیں یا کسی کمرے اور برآمدے میں آنے جانے کے لیے دو یا تین سیڑھیوں کا استعمال کیا جاتا ہے جن گھروں کے کمرے اونچے بنے ہوں وہاں عموماً ایسی بناوٹ دیکھنے میں آتی ہے۔ کوشش کریں کہ بزرگوں کو ایسا کمرہ رہائش کے لیے دیں جہاں کا فرش برابر سطح کا ہو تاکہ ان کو ٹھوکر لگنے یا گرنے کا خدشہ نہ ہو۔ جتنا ممکن ہو ان کے آرام کا خیال رکھیں۔ بیت الخلا میں اگر کموڈ نہیں بھی ہے اور آپ زیادہ خرچے کے متحمل نہیں ہو سکتے تو بازار میں بنی بنائی کرسیاں نہایت مناسب نرخ پر مل جاتی ہیں جو بالکل کموڈ کا ہی کام دیتی ہیں اور صفائی کرنے میں بھی آسان ہوتی ہیں وہ لاکر رکھ دیں اور بیت الخلا میں انھیں تنہا نہ چھوڑیں۔ بلکہ خاص تاکید کر دیں کہ آپ دروازے کے باہر ہی موجود ہیں وہ اندر سے کنڈی نہ لگائیں اور جہاں کموڈ یا کرسی رکھنے کی جگہ ہو اس دیوار پر ایک لوہے کا سٹینڈ ضرور لگوا دیں تاکہ اٹھتے بیٹھتے وقت وہ بآسانی اس کا سہارا لے سکیں اور گرنے کا احتمال نہ رہے۔

۹۔ قریبی ڈاکٹر اور طبی سہولیات

آپ جہاں اپنا فون رکھتے ہیں یا سائیڈ ٹیبل پر، جو جگہ آپ کے اور ان کے قریب ترین ہو، وہاں ڈاکٹر کا نمبر لکھ کر لازمی رکھیں یا ان کے کمرے، بستر کے ساتھ والی دیوار پر چسپاں کر دیں تاکہ خدانخواستہ ایمرجنسی کی صورت میں آپ یا وہ خود فوراً قریبی ڈاکٹر کو فون کر سکیں۔ گھر میں بھی ایک میڈیکل باکس (فرسٹ ایڈ) بنا کر رکھیں اور دھیان رکھیں کہ طبی امداد کا ڈبہ آپ کی پہنچ کے قریب ترین اور بچوں کی پہنچ سے دور رہے۔

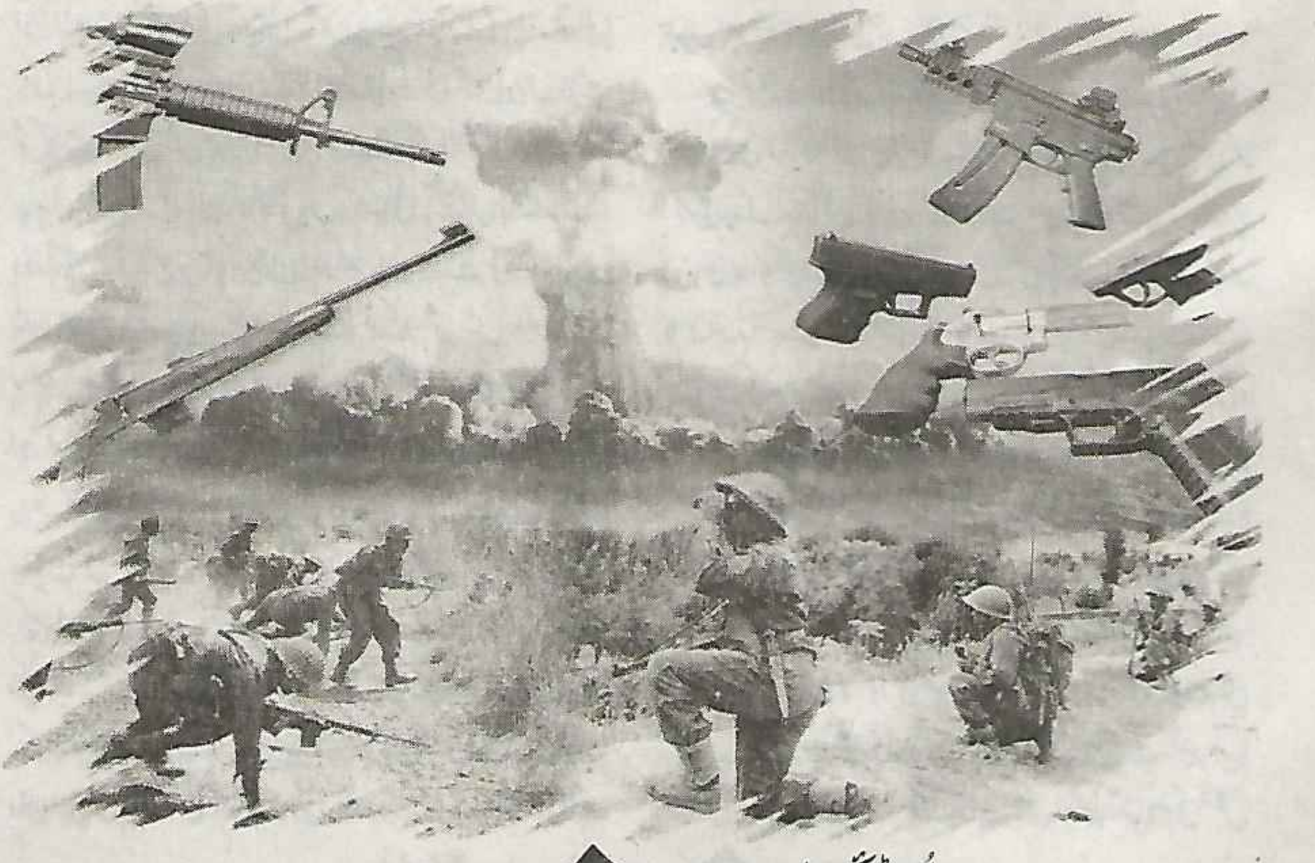
اسی طرح کے چھوٹے چھوٹے عوامل آپ کے ان معصوم بوڑھوں کو زندگی کی نئی حرارت دے سکتے ہیں۔ اخبارات و رسائل کے کوئز، پزل، مختلف قسم کے کھیل جیسے لڈو، کیرم، ریڈیو سننا، خبریں دیکھنا، انھیں گھر کے کسی فالتو چھوٹے غیر آرام دہ کمرے کے بجائے گھر کا بہترین حصہ رہنے کو دیں۔ تاکہ انھیں احساس رہے کہ ابھی زندگی کے خوبصورت ترین دور کی شروعات ہوئی ہے۔ یہ زندگی کا اختتام نہیں ہے بلکہ پوری زندگی کی تھکا دینے والی بھاگ دوڑ کے بعد، سکون سے بیٹھ کر زندگی سے لطف اندوز ہونے کا وقت ہے۔ تمام عمر انھوں نے آپ کو اپنا وقت، پیسا، محبّت دی ہے اور بدلے میں آپ سے نہ پیسا مانگا ہے نہ عیش و آرام۔ صرف تھوڑی سی محبّت اور توجہ، جس کے وہ حقدار ہیں۔ تھوڑا سا وقت بالکل اتنا ہی جتنا آپ موبائل پر ادھر ادھر فضول پیغامات بھیجنے پڑھنے پر لگا دیتے ہیں، اس سے بھی کم وقت آپ اپنے ان ننّھے منھے پیارے بوڑھے بچوں کو دیں، تو یقین کریں آپ کی زندگی بھی خوشیوں اور کامیابیوں سے ہمکنار ہوگی، اور آخرت کی کامیابیوں کا نہ تو شمار نہ حساب کہ یہی بچے آپ کو جنت میں لے جائیں گے۔

پاک بھارت دفاعی بجٹ اور جنگی صلاحیت

انسانی کھوپڑیوں پر کھڑے ہو کر مریخ پر زندگی ٹٹولنا صحیح ہے؟

محمد توفیق

اس اخلاقی اور علمی بحث سے قطع نظر کہ کرہ ارض پر انسان پھول اور بھوک سے لڑنے کے بجائے اپنی تباہی کا ایسے ہولناک ہوش ربا اہتمام کیوں کر رہا ہے کہ دنیا کو سو مرتبہ سے زائد راکھ کا ڈھیر بنایا جا سکتا ہے یہ ایک تلخ مگر ٹھوس حقیقت ہے کہ ۲۰۱۶ء میں دنیا کے ۲۰۶ ممالک کا مجموعی دفاعی بجٹ ۱۶۲۹ء ارب ڈالر ہے۔ آج صرف دنیا کی واحد سپر پاور امریکا بہادر کا دفاعی بجٹ ۵۸۱ بلین ڈالر ہے۔ دنیا میں دفاع پر سب سے زیادہ خرچ کرنے والے پانچ بڑے ملک کون سے ہیں؟ دفاعی سازوسامان تیار اور فروخت کرنے والے صف اوّل کے پانچ ممالک کون سے ہیں؟ دنیا میں اسلحہ کے پانچ سب سے بڑے خریدار اور ایکسپورٹر ممالک کون سے ہیں؟ اس فہرست میں پاکستان بھارت کہاں ہیں؟ ان کی مجموعی آبادی، دفاعی بجٹ، جی ڈی پی میں اس کی فیصد %، ایٹمی ہتھیاروں اور میزائلوں کی تیاری اور تعداد کا سرسری جائزہ ریڑھ کی ہڈی میں سنسنی کی لہر دوڑانے کے لیے کافی ہے۔ یہی وسائل اگر غربت، صحت، تعلیم اور



رہائش کی فراہمی پر صرف کیے جائیں تو خطہ غربت سے نیچے زندگی بسر کرنے والے ۶۰ فی صد عوام کا معیار زندگی قابل ذکر حد تک بہتر بنایا جاسکتا ہے۔

احمد ندیم قاسمی کے بقول:

کبھی تو پھول کھلیں گے ضمیر آدم میں
اگر یہ سچ ہے کہ مٹی ہے آدمی کا خمیر

۶/اگست ۱۹۴۵ء کو صبح آٹھ بج کر پندرہ منٹ پر امریکی جہاز بی ۲۹ نے ہیروشیما پر پہلا ایٹم بم گرایا، اس بم کا نام ''لٹل بوائے'' تھا، اس بم نے ۳۰ سیکنڈز میں ایک لاکھ چالیس ہزار لوگوں کو لقمہ اجل بنا دیا جب کہ ۸۰ ہزار لوگ زندگی بھر کے لیے معذور ہو گئے، امریکا نے ۹/اگست کو صبح ۱۱ بج کر ۲ منٹ پر ناگاساکی پر دوسرا بم گرایا، اس ایٹم بم کا نام ''فیٹ مین'' تھا اور یہ بم ۴۷ ہزار جاپانیوں کو نگل گیا۔ ۱۹۴۵ء میں جاپان میں فوجی گاڑیاں بنانے والی ۱۱۱ور فوج کے لیے برقی آلات بنانے والی ۲ کمپنیاں تھیں، ہنڈا، نیسان اور ایسوزو فوجی ٹرک بناتی تھیں جب کہ ہٹاچی اور توشیبا بموں کے فیوز اور توپوں کے ٹرائیگر تیار کرتی تھیں، اس وقت ٹوکیو میں مشین گن اور رائفلیں بنانے کے ۲۱ کارخانے تھے جاپانی قوم نے ان کو گاڑیاں، سلائی مشینیں، کیمرے، دوربینیں، ریڈیو، ٹیلی ویژن اور گھڑیاں بنانے کی فیکٹریوں میں تبدیل کر دیا۔ حکومت نے ٹوکیو شہر میں ۱۰۰ بڑی یونیورسٹیوں اور تکنیکی کالجوں کی بنیاد رکھی۔ آج ان کالجوں اور یونیورسٹیوں کی تعداد ایک ہزار ہو چکی ہے۔

۱۹۸۰ء میں جاپان دنیا کی دوسری بڑی معیشت بن گیا، جاپان کی گھڑیوں، کیمروں، ریڈیو، ٹی وی، گاڑیوں اور کمپیوٹروں نے پورے امریکہ کو شکست دے دی۔ لوگ ہارورڈ کی بجائے ٹوکیو یونیورسٹی میں داخلہ لینے لگے اور امریکی صدر کے ٹائم پیس تک کے نیچے ''میڈ ان جاپان'' کی مہر لگ گئی۔ یہ وہی جاپان تھا جس میں دوسری جنگ عظیم کے بعد ۳۰ لاکھ نعشیں بے گور و کفن پڑی تھیں۔ جاپان کی یہ ترقی صرف ایک فیصلے کی مرہون منت تھی۔ جاپان نے ۱۹۴۵ء میں فیصلہ کیا تھا امریکا کے پاس ایٹم بم ہے لہٰذا اگر اس نے زندہ رہنا ہے تو اسے اپنے جذبے، اپنی نفرت اور اپنے انتقام کی شکل بدلنا ہوگی اور اسے مغرب کے اس نازک حصے پر ضرب لگانا ہوگی جہاں سے وہ بچ نہ سکے اور اس وقت مغرب کا وہ نازک حصہ معیشت، فیکٹری اور تعلیم تھی۔ لہٰذا اس نے فیصلہ کیا کہ اب وقت آ گیا ہے کہ قوم ہتھیار پھینک کر اوزار اٹھالے اور یہی ہوا، آج جاپان فوج، گولی اور توپ کے بغیر دنیا کا سب سے بڑا فاتح ہے اور آج پوری دنیا جاپان کے سامنے سرنگوں ہے۔ اگر پاکستان اور بھارت بھی اپنی نفرت کا رخ موڑ لیں تو ہم پچاس برسوں میں وہاں پہنچ جائیں گے جہاں مغرب پانچ سو سال میں پہنچا تھا۔ جاپانی قوم کے بارے میں ''جنرل میک آرتھر'' نے کہا تھا

''ان کے غصے نے انھیں ۳۵ برس میں وہاں پہنچا دیا جہاں امریکا ۲ سو سال میں پہنچا تھا''

یہ حقیقت ہے کہ جاپان اور جرمنی دوسری جنگ عظیم اور ایٹم بم کی راکھ سے دنیا کی عظیم معیشتیں اس لیے بن کر اُبھریں کہ ''مارشل پلان'' کے تحت ان پر فوجیں رکھنے پر پابندی عائد کردی گئی تھی۔ لیکن کسی بھی ملک کے دفاعی بجٹ کا براہِ راست تعلّق اس کی معیشت، پڑوسی ممالک سے تعلّقات کی نوعیت اور اس کے جغرافیائی محلِ وقوع، علاقائی و عالمی معاملے میں اس کے کردار سے ہوتا ہے اور اس کی تشکیل انہی عناصر کے زیرِ اثر مرتب ہوتی ہے۔ اسے علیحدہ سے نہیں دیکھا جا سکتا۔ مثلاً پاکستان کے عسکری حلقوں کے لیے بھارتی فوجی تیاریوں سے لاتعلق رہنا ممکن نہیں کیونکہ پاکستان کی سلامتی کو روایتی طور پر بڑا خطرہ بھارتی عزائم ہی سے رہا ہے۔ عالمی دفاعی ماہرین متفق ہیں کہ کشمیر ایسا ''فلیش پوائنٹ'' ہے جو پلک جھپکنے میں ایٹمی تصادم کی شکل

اختیار کرسکتا ہے۔ ہر چند بھارت اسے چین کے ہم پلہ ہونے کی کوشش قرار دیتا ہے۔ پھر بھارت بحرِ ہند پر بحری تسلّط کا مہنگا شوق بھی پال رہا ہے۔ چین کا دفاعی بجٹ بھارت سے چار گنا بڑا ہے بھارت کا روایتی موقف یہ رہا ہے کہ اس کی جنگی تیاریاں چین سے خود کو محفوظ بنانے کے لیے ہیں۔ بھارت کا دفاعی بجٹ پاکستان سے پانچ گنا بڑا ہے اس کا کہنا ہے کہ ہم بھارتی تسلّط کو کم کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اس دلیل کے مطابق تو یہ ''گناہ بے لذت'' اور کبھی نہ ختم ہونے والی دوڑ ہے۔

شجاع نواز اور موہن گروسوامی جیسے مصنفین نشاندہی کرتے ہیں کہ پاکستان کی ۲۱ فیصد آبادی ۲۵ء۱ ڈالر روزانہ سے کم میں گزارا کر رہی ہے جبکہ بھارت کی ۶ء۴۱ فیصد آبادی بھی غیر انسانی حالات میں زندگی بسر کرنے پر مجبور ہے۔ لیکن بھارت کی معیشت سالانہ ۴ء۷ فیصد کی شرح سے ترقی کر رہی ہے اس لیے وہ یہ اخراجات افورڈ کرسکتا ہے اور اس کی دفاعی ''شاپنگ لسٹ'' طویل سے طویل تر ہوتی جا رہی ہے۔ بھارت کو فوجوں اور ہتھیاروں میں ۳ء۱۱ اور ۵ء۱ فیصد کی برتری حاصل ہے۔ بھارت کا دفاعی بجٹ ۷ء۴۰ بلین ڈالر ہے جو پاکستان سے پانچ گنا زیادہ ہے لیکن اس کی جی ڈی پی کا ۷ء۱ فیصد ہے۔ جبکہ پاکستان کا دفاعی بجٹ ۶ء۷ بلین ڈالر ہے جو اس کی جی ڈی پی کا ۵ء۳ فیصد ہے۔ کیا یہ حقیقت ہمارے راہنماؤں سے پوشیدہ ہے کہ غربت کے عالمی انڈیکس میں ہم بالترتیب ۱۳۰ ویں اور ۱۴۷ ویں نمبر پر ہیں جبکہ دفاعی اخراجات کے حوالے سے بالترتیب ۸ ویں اور ۲۵ ویں نمبر پر ہیں۔

دوسری جانب ماہرین اس بارے میں بھی خبردار کر رہے ہیں کہ اعداد و شمار کے اس گورکھ دھندے کو محض عددی برتری نہیں سمجھنا چاہیے کیونکہ پاکستان روایتی ہتھیاروں کی دوڑ سے جتنا پچھڑتا جائے گا اتنا اس کا جوہری ہتھیاروں کی تعداد میں برتری پر انحصار بڑھتا چلا جائے گا۔ سابق امریکی سیکرٹری آف سٹیٹ جارج شلز اسے ''زیرو سم'' گیم قرار دیتے ہیں۔ دونوں ممالک باصلاحیت افراد سے بھرے پڑے ہیں لیکن توجہ تجارت کے بجائے غیر پیداواری سرگرمیوں پر زیادہ ہے حالانکہ بڑھتے ہوئے دفاعی بجٹ کے باوجود دونوں ملکوں میں عسکریت پسندی اور شورشوں میں بھی مسلسل اضافہ ہو رہا ہے۔ وہ اس ضمن میں تجویز دیتے ہیں کہ کشیدگی کم کرنے کے لیے دونوں ملک سرحدوں پر موجود اپنی افواج کے مابین فاصلے (بفر زون) کو مزید بڑھائیں تاکہ تصادم کے امکانات کو کم کیا جاسکے۔

اسٹاک ہوم میں واقع ''انٹرنیشنل پیس ریسرچ انسٹیٹیوٹ'' کے مطابق بھارت دنیا میں اسلحہ کا سب سے بڑا خریدار ہے وہ دنیا کی مجموعی امپورٹ کا ۱۴ فیصد خریدتا ہے جو پاکستان اور چین سے تین گنا زیادہ ہے۔ تازہ ترین خریداری فرانس سے ۳۶ عدد Rafeal طیارے ہیں۔ اس نے روس سے ایم کے آئی ۳۰۔ ایس یو ۲۲۲ طیارے، بحری بیڑے کے لیے ۴۵ مگ کے ۲۹، روس سے ۶۲ مگ ایس ایم ٹی ۲۹، ۴۹ فرینچ میراج ۲۰۰۵ء، ۱۲۶ لڑاکا طیارے، ۱۵ اپاچی ہیلی کاپٹر، ۲۲ سی ایچ ۴۷ ایف چینوک ہیلی کاپٹر، ۱۹۷ ہلکے ہیلی کاپٹر اور ۱۴۵ Ultra Light Howitzers خریدے ہیں۔ اسکے علاوہ نیوکلیئر سب میرین، ایئر کرافٹ کیریئر کے سودے حتمی مراحل میں ہیں۔ سائبر اور خلائی پروگرام پر بھی تیزی سے عمل درآمد ہو رہا ہے۔ اس کا اینٹی بلیسٹک میزائل سسٹم (A.B.M) متحرک ہو چکا ہے۔ جبکہ خلائی برتری کے لیے ''اسپیس وار فیئر'' بھی اس کے توسیع پسندانہ عزائم میں سرفہرست ہے۔ وہ آئندہ دس برسوں میں ہتھیاروں کی خریداری پر سو بلین ڈالر خرچ کرنے کا ارادہ رکھتا ہے۔

ایسی دنیا میں جہاں ہر روز آٹھ ہزار بچے زچگی کے دوران زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھتے ہوں اور خود بھارت میں تیس

کروڑ افراد قحط اور فاقے کا سامنا کر رہے ہیں۔ ناسا جیسا ادارہ ہر سال اس تحقیق پر اربوں ڈالر خرچ کر دیتا ہے کہ کیا مریخ پر انسان زندہ رہ سکتا ہے؟ لیکن وہ لوگ جو ''ناسا'' کو اس ریسرچ کے لیے فنڈ فراہم کرتے ہیں وہ زمین سے زندگی کے آثار بھی مٹاتے جا رہے ہیں۔ اس زمین جس کی رصدگاہیں، لیبارٹریاں اور ریسرچ سنٹر نظامِ فلکی کی رگوں میں زندگی کے امکانات تلاش کر رہے ہیں۔ اسی زمین پر جنگ کے وہ مہلک بیج بوئے اور کاٹے جاتے ہیں جو انسان پر زندگی کا دائرہ مختصر سے مختصر کرتے جا رہے ہیں۔ دنیا میں دو عظیم جنگیں ہوئیں۔ جنگِ عظیم اول پر چار ہزار پانچ سو بلین ڈالر خرچ ہوئے، کروڑوں لوگ مرے، جنگ عظیم دوئم پر ۱۳ بلین ڈالر صرف ہوئے اور کروڑوں لوگ مرے۔ کتنا عجیب تضاد ہے!

''انسانی کھوپڑیوں پر کھڑے ہو کر مریخ پر زندگی ٹٹولی جائے۔ کیا ممکن ہے؟''

اس پاگل پن اور جنون پر ''جون ایلیا'' کا شاعرانہ طنز حسب حال ہے

بستیاں چاند ستاروں پہ بسانے والو
کرہ ارض پہ بجھ رہے ہیں چراغ

اس کے ۸۰ فیصد میزائلوں اور طیاروں کا رخ پاکستان کی جانب جبکہ ۹۰ فیصد ملٹری کمانڈ اینڈ کنٹرول ''ڈھانچہ'' پاکستان کے گرد حصار بنائے ہوئے ہے۔ بھارت ''محدود ایٹمی جنگ''، ''کولڈ سٹارٹ'' اور ''پروایکٹو آپریشن'' کے مہلک نظریات کی بھی گردان کرتا رہا ہے۔ جبکہ اس کے فاٹا، بلوچستان اور پاکستان کے شہروں میں تخریبی کارروائیاں اب ''اوپن سیکریٹ'' ہیں۔ پاکستان کے لیے اپنے محدود وسائل کے باعث ہتھیاروں کی اس پاگل دوڑ میں شرکت ممکن نہیں۔ بیرونی کے ساتھ ساتھ اسے انتہا پسندی اور دہشت گردی جیسے اندورنی خطرات کا بھی سامنا ہے اس لیے اس نے "Maximum Deterrent" کی حکمت عملی اپنائی ہے۔ علاقائی سلامتی کے اس تناظر میں دفاع وطن کے حوالے سے پی او ایف کے محدود کردار کی اہمیت اور افادیت اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ ایسے میں اسے بھارتی دفاعی مصنوعات کی مقدار کا مقابلہ اپنے اعلیٰ معیار سے کرنا ہے۔ اور بڑی افواج کے مقابلے میں مختصر مگر ''سرعت الحرکتی'' چاق و چوبند فوج تیار رکھنی ہے مثلاً دنیا کی طاقتور پانچ خصوصی افواج میں برطانوی سپیشل ائیر سروس، امریکی نیوی سیلز، اسرائیلی شائنت ۱۳، پاکستانی سپیشل سروسز گروپ اور فرانسیسی نیشنل جینڈارمیری انٹرونشن گروپ شامل ہیں۔ خلیج ٹائمز اخبار نے اس فہرست میں پاک فوج کے سپیشل سروسز گروپ کو چوتھے نمبر پر رکھا ہے جس کی بنیاد برطانوی ایس اے ایس اور امریکی بحریہ کے سیلز کے ماڈل پر ہے۔ اس کا قیام ۱۹۵۶ء میں عمل میں آیا اس نے ملکی اور بین الاقوامی سطح پر پاک بھارت سمیت اہم کارروائیوں میں حصہ لیا۔ اب ایس ایس جی طالبان اور دیگر دہشت گردوں کے خلاف کارروائی میں مصروف عمل ہے۔ روسی کہاوت ہے ''اعلیٰ دفاع کے سو ہاتھ ہوتے ہیں۔'' پاکستان کو بیرونی خطرات کے ساتھ اندرونی محاذ پر انتہا پسندی اور دہشتگردی کا بھی سامنا ہے۔

یہ حقیقت اظہر من الشمس ہے کہ ہماری قیادتوں کو ماضی کا یرغمال بنے رہنے کی بجائے دور اندیشی کا ثبوت دیتے ہوئے اپنے دیرینہ تنازعات جن میں کشمیر سر فہرست ہے، باہمی افہام و تفہیم اور مذاکرات سے حل کرنے پاہئیں تا کہ محدود وسائل کا رخ برصغیر کے عوام کی خوشحالی اور خطے میں بھوک افلاک کے خاتمے کی جانب موڑا جا سکے۔ نیلسن منڈیلا نے کہا تھا

''راہنما کی زندگی میں ایک وقت ایسا آتا ہے جب اس کے لیے اپنے ساتھیوں سے آگے نکلنا ضروری ہو جاتا ہے تا کہ وہ کوئی سمت تلاش کر سکے۔''

اہل علم کے تجزیے اور غور فکر کے لیے عالمی دفاعی بجٹ،

پاک بھارت دفاعی تیاریوں، جنگی صلاحیت اور غربت کے انڈیکس کے حوالے سے گوشوارہ پیش خدمت ہے۔

عالمی دفاعی بجٹ

مجموعی عالمی دفاعی بجٹ ۲۰۱۶ء	۱۶۲۹ بلین ڈالر

دفاعی اخراجات کے اعتبار سے دنیا کے پانچ بڑے ممالک

امریکا	۵۸۱ء۰ بلین ڈالر
چین	۱۲۹ء۴ بلین ڈالر
سعودی عرب	۸۰ء۸ بلین ڈالر
روس	۷۰ء۰ بلین ڈالر
برطانیہ	۶۱ء۸ بلین ڈالر
انڈیا (آٹھواں نمبر)	۴۰ء۷ بلین ڈالر
پاکستان (پچیسواں نمبر)	۷ء۶ بلین ڈالر

دفاعی ساز و سامان کے پہلے پانچ بڑے عالمی خریدار

سعودی عرب	۲۶۲۹ ملین ڈالر
انڈیا	۱۵۵۰ ملین ڈالر
چین	۱۳۵۷ ملین ڈالر
انڈونیشیا	۱۲۰۰ ملین ڈالر
ویتنام	۱۰۵۸ ملین ڈالر
پاکستان (گیارہواں نمبر)	۶۵۹ ملین ڈالر

دفاعی ساز و سامان کے پہلے پانچ بڑے عالمی ایکسپورٹر

امریکا	۱۰۱۹۴ ملین ڈالر
روس	۵۹۷۱ ملین ڈالر
چین	۱۹۷۸ ملین ڈالر
فرانس	۱۲۰۰ ملین ڈالر
جرمنی	۱۱۱۰ ملین ڈالر
انڈیا (۲۹واں نمبر) ۲۰۱۴	۵۵ ملین ڈالر
پاکستان (۹۷واں نمبر) ۲۰۰۸	۱۰ ملین ڈالر

بھارت اور پاکستان کا تقابلی جائزہ

	بھارت	پاکستان
مجموعی قومی آبادی	ایک ارب تئیس کروڑ (۱،۲۳۶،۳۴۴،۶۳۱)	انیس کروڑ اکسٹھ لاکھ (۱۹۶،۱۷۴،۳۸۰)
مجموعی قومی بجٹ ۲۰۱۶ء	ایک سو اکتیس کھرب دو سو بیس ارب (۱۳،۱۲،۲۰۰) کروڑ روپے	چوالیس کھرب اکیاون ارب ۴،۴۵۱ء۳ بلین روپے
غربت کے عالمی انڈیکس میں درجہ بندی	ایک سو اٹھاسی ممالک میں سے ایک سوتیسواں نمبر (۱۳۰/۱۸۸)	ایک سو اٹھاسی ممالک میں سے ایک سو سینتالیسواں نمبر (۱۴۷/۱۸۸)
مجموعی دفاعی بجٹ ۲۰۱۶ء	۴۰ء۷ بلین ڈالر	۷ء۵ بلین دالر
دفاعی بجٹ کی عالمی رینکنگ	۸ویں	۲۵ویں
دفاعی بجٹ مجموعی جی ڈی پی کا	۱ء۷۴ فی صد	۳ء۵ فی صد

دفاعی پیداوار کا بجٹ	بائیس ہزار چار سو چھیالیس ملین ڈالر (۱۳۹،۱۵۲اروپے) کروڑ	نوسوملین روپے (۹۰۰ملین روپے)
دفاعی پیداوار کی ایکسپورٹ	۵۵ملین ڈالر (۲۰۱۴) [۲۹ واں نمبر]	ایک ملین ڈالر (۲۰۰۸) [۹۷نواں نمبر]
دفاعی پیداوار کی امپورٹ	۱۵۵۰ملین ڈالر [دوسرا نمبر]	۶۵۹ ملین ڈالر [گیارہواں نمبر]
مجموعی بیرونی قرضے	چار کھرب بارہ ارب ڈالر (۴۱۲،۲۰۰،۰۰۰،۰۰۰ڈالر)	باون ارب تینتالیس کروڑ ڈالر (۵۲،۴۳۰،۰۰۰،۰۰۰ڈالر)
زرمبادلہ کے مجموعی ذخائر	دوسو پچیانوے ارب ڈالر (۲۹۵،۰۰۰،۰۰۰،۰۰۰ڈالر)	اکیس ارب اٹھارہ کروڑ ڈالر (۲۱،۱۸۰،۰۰۰،۰۰۰ڈالر)
ریلوے لائنوں کی لمبائی	۶۳،۹۷۴ کلومیٹر	۷،۷۹۱کلومیٹر
مجموعی رقبہ	۳،۲۸۷،۲۶۳ مربع کلومیٹر	۷۹۶،۰۹۵ مربع کلومیٹر

بھارت اور پاکستان کی جنگی صلاحیت

	بھارت	پاکستان
مجموعی افواج	تیرہ لاکھ پچیس ہزار (۱،۳۲۵،۰۰۰)	چھ لاکھ سترہ ہزار (۶۱۷،۰۰۰)
بری فوج	گیارہ لاکھ انتیس ہزار نوسو (۱،۱۲۹،۹۰۰)	پانچ لاکھ پچاس ہزار (۵۵۰،۰۰۰)
بحری فوج	اٹھاون ہزار تین سو پچاس (۵۸،۳۵۰)	بائیس ہزار (۲۲،۰۰۰)
فضائی فوج	ایک لاکھ ستائیس ہزار دوسو (۱۲۷،۲۰۰)	پینتالیس ہزار (۴۵،۰۰۰)
ریزرو فوج	گیارہ لاکھ پچپن ہزار (۱،۱۵۵،۰۰۰)	پانچ لاکھ تیرہ ہزار (۵۱۳،۰۰۰)
جنگی طیارے	۱۹۰۵	۹۱۴
ہیلی کاپٹر	۵۸۴	۳۱۳
ٹینک	۶۴۶۴	۲۹۲۴
بحری جہاز	۲۰۲	۷۴
طیارہ بردار بحری جہاز	۲	-
سب میرینز	۱۵	۸
فریگیٹ	۱۵	۱۰
ایٹمی پروگرام کا آغاز	۲۰ جنوری ۱۹۷۲ء	۱۹۶۷ء
پہلا ایٹمی دھماکا	۱۸ مئی ۱۹۷۴ء	۱۸ مئی ۱۹۹۸ء
ایٹمی ہتھیاروں کی تعداد	۱۵۰	۱۲۰
زیادہ سے زیادہ میزائل رینج	۵۵۰۰/۵۸۰۰کلومیٹر	۲۷۵۰کلومیٹر

نوٹ: مندرجہ بالا تمام اعداد و شمار سال ۲۰۱۵ء۔۱۶ء تک کے ہیں۔

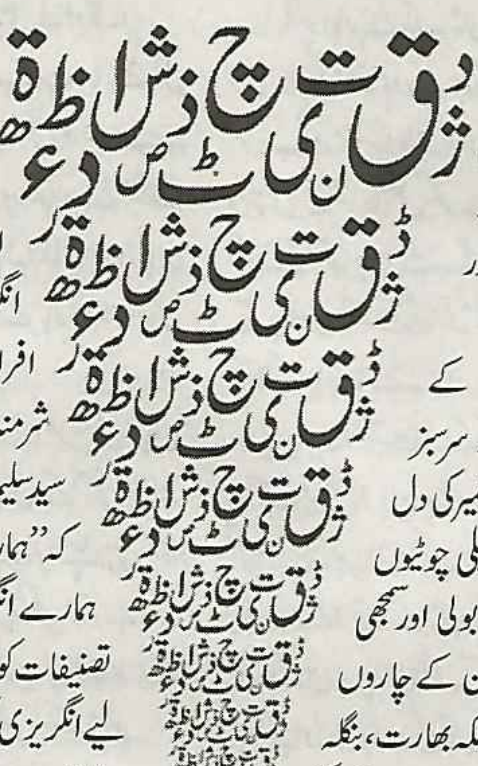
قومی زبان اردو، سرکاری دفاتر میں نفاذ کیوں اور کیسے؟

ہماری غلامانہ ذہنیت کا رویہ قائم رہا تو اردو زبان اپنا حسن کھو دے گی

ڈاکٹر محمد وسیم اکبر شیخ

محسن اردو اور سپریم کورٹ کے سابق چیف جسٹس جواد ایس خواجہ نے ستمبر ۲۰۱۵ء میں قومی زبان اردو کو سرکاری دفاتر میں نافذ کرنے کا فیصلہ دیا، کیونکہ عملی طور پر میڈیا، عدالتوں، اسمبلیوں، تعلیمی اداروں، دفاتر، جلسوں، سیمینارز اور احتجاجی مظاہروں میں اردو ہی بولی اور سمجھی جانے والی واحد زبان ہے۔

تھل کے صحراؤں، سندھ کے ریگستانوں پنجاب کے حسین اور سرسبز کھیتوں، سرحد کی سنگلاخ چٹانوں، کشمیر کی دل فریب وادیوں اور بلوچستان کی برفیلی چوٹیوں غرض کہ پاکستان کے شہر شہر گلی گلی بولی اور سمجھی جانے والی زبان اردو ہے۔ پاکستان کے چاروں صوبوں میں رابطہ کی واحد زبان ہے بلکہ بھارت، بنگلہ دیش، برما، نیپال اور ایشیا، امریکا اور یورپ کے کئی ممالک میں بیشتر آبادی اردو جاننے اور سمجھنے والے افراد پر مشتمل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اردو زبان جاننے والے افراد کو دنیا کے آدھے حصے کی شہریت رکھنے والا کہا جاتا ہے۔



اردو نہ صرف پاکستان بلکہ پاکستان سے باہر بسنے والے کروڑوں لوگوں کے دلوں کی دھڑکن بن چکی ہے لیکن افسوس کہ ۶۸ سال گزرنے کے باوجود ہم اس کا نفاذ عمل میں نہ لا سکے جبکہ دوسرے ممالک نے آزاد ہوتے ہی اپنے سابق حکمرانوں کی زبان و تمدن کو خیر آباد کہہ کر اپنی زبان اور تہذیب کو اپنا لیا۔ اس کی بڑی وجہ اپنی گفتگو اور تحریر میں انگریزی کا پیوند لگانے والے وہ لوگ ہیں جو اپنے سابق آقاؤں کی زبان کو دل میں بسائے ہوئے ان کی زبان و لباس اور تہذیب و تمدن کو باعث فخر اور وجہ ترقی سمجھتے ہیں۔ حالانکہ خود انگریز اپنی تقلید کرنے والوں کو نفرت اور حقارت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ اس سے زیادہ افسوس کا مقام یہ ہے کہ ہم اپنی زبان اردو کو حقیر سمجھتے ہیں مگر ہم انگریزی بھی ٹھیک طور پر نہیں بول سکتے۔ حقیقت یہ ہے کہ انگریزی کا استعمال بطور فیشن ہو رہا ہے اور انگریزی اسکولوں سے فارغ التحصیل افراد اردو لکھنا اور بولنا اپنے لیے باعث شرمندگی سمجھتے ہیں۔

سید سلیمان ندوی نقوش سلیمانی میں رقم طراز ہیں کہ ”ہمارے ہاں بدقسمتی سے یہ حالت ہے کہ ہمارے انگریزی خوان دوست اردو اخبارات اور تصنیفات کو ہاتھ تک لگانا جرم سمجھتے ہیں۔ ترجمہ کے لیے انگریزی کی دو سطریں دیجیے تو یہ کہہ کر مغرور انداز سے کاغذ میز پر رکھ دیں گے کہ بڑی مشکل ہے۔ اس کے لیے اردو میں الفاظ نہیں“ اردو میں الفاظ نہیں یا آپ کی نظر میں وسعت نہیں۔ اصل یہ ہے کہ کچھ تو اس تعلیم کا یہ حشر ہے

کہ غور وفکر وقت بینی اور نکتہ رسی کی قوت نوجوانوں سے مفقود ہو جاتی ہے اور علمی دلچسپی اور مذاق سلیم سے بے بہرہ رہتے ہیں اور زیادہ تر یہ ہے کہ ایک مدت تک اجنبی زبان اور بیگانہ خیالات پڑھتے پڑھتے اور سنتے سنتے مادری زبان سے انھیں بُعد ہو جاتا ہے اور چار جملے بھی غیر ضروری انگریزی الفاظ کی آمیزش کے بغیر نہیں لکھ سکتے بلکہ اپنی مادری زبان سے ان کو ایک گونہ نفرت سی ہے اور اس میں لکھنا پڑھنا اپنے لیے عار سمجھتے ہیں جب تک یہ حالت قائم ہے زبان کی ترقی کی کوشش بے سود ہے۔"

پاکستان میں اردو زبان کی ترقی اور ترویج اس لیے بھی ضروری ہے کہ برصغیر کے مسلمانوں کا روحانی ثقافتی، تاریخی، علمی اور ادبی ورثہ اردو کے دامن میں محفوظ ہے اور جدید دور میں تاریخ، طب، سائنس، قانون، حدیث، فقہ اور تفسیر کے علاوہ دوسرے علوم وفنون کا ترجمہ اردو میں منتقل ہو چکا ہے جو آنے والی نسلوں کے لیے بیش قیمت سرمایہ ثابت ہوگا۔

اردو زبان کے ارتقائی مطالعہ سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ اس کی ترکیب وتشکیل میں مختلف زبانوں کا حصہ ہے۔ یعنی ہندی، ترکی، عربی اور فارسی وغیرہ اور اردو نے مختلف الفاظ کو اپنے دامن میں جگہ دی ہے اور آج یہ الفاظ اردو زبان میں ایک مستقل جگہ رکھتے ہیں اور ہمارے باربار استعمال کرنے سے اجنبی معلوم نہیں ہوتے۔

برصغیر میں انگریزی کی آمد سے اردو نے انگریزی زبان سے بھی واضح اثرات قبول کر لیے اور انگریزی کے بعض الفاظ آج بھی مستقل طور پر اردو لغت میں شامل کیے جا چکے ہیں مثلاً اسکول، اسٹیشن، پالیسی، سیکرٹری وغیرہ وغیرہ لیکن مغرب زدہ طبقہ کی طرف سے اردو میں بے تحاشا انگریزی الفاظ کے استعمال سے اندیشہ ہے کہ اردو زبان اپنا تشخّص نہ کھو بیٹھے۔

حیرت اور افسوس کا مقام ہے کہ پاکستان ایسا ملک ہے جس کی قومی زبان تو اردو ہے مگر اسکولوں اور کالجوں کے داخلہ فارم انگریزی میں مرتب کیے جاتے ہیں جن سے کافی طلبہ کو پریشانی اور محتاجی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ڈاک خانوں کے پوسٹل آرڈر فارم اور سرکاری ونجی مکتوبات پر انگریزی میں لکھے ہوئے پتے عام لوگوں کے لیے پریشانی اور تکلیف کا باعث بنتے ہیں۔ بجلی، گیس، پانی اور ہوٹلوں میں پیش کیے جانے والے بل، بینکوں کی چیک بُکس، دوائیوں کے لیبل طریقہ استعمال اور ضروری ہدایات انگریزی میں لکھ کر ان کا مذاق اڑایا جا رہا ہے۔ ہوائی جہازوں، فلائنگ کوچ کے ٹکٹ اور کالجوں میں داخلہ کے قواعد وضوابط (پراسپیکٹس) انگریزی میں ہونے سے عام لوگوں اور طلبہ کو ذہنی دقت پیش آتی ہے۔ دکانوں، فرموں، اداروں اور کارخانوں کے تختے فیشن کے طور پر انگریزی میں لکھے جاتے ہیں۔

یہ صورت حال ایک لمحہ فکریہ ہی نہیں بلکہ ہم سب کے لیے باعث تشویش بھی ہے۔

اگر ہمارے ملک میں کلرکوں اور چپڑاسیوں کی تعداد میں دن بدن اضافہ ہو رہا ہے تو اس میں حیرت کی کوئی بات نہیں۔ غریب اور متوسط طبقہ کہاں جائے، غیر ملکی غیر مانوس زبان پر دسترس کیونکر حاصل کرے اسے روٹی کے بجائے پتھر ہضم کرنے کو کہا جاتا ہے۔ مجبوراً بہت سے طلبہ ہر سال انگریزی کے ہاتھوں شکست کھا کر تعلیم کو خیرباد کہہ دیتے ہیں اور کلرکی پر اکتفا کر لیا جاتا ہے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ کوئی طالب علم کتنا ہی ذہین کیوں نہ ہو ایک غیر ملکی زبان پر عبور نہ رکھنے کی وجہ سے بار بار فیل ہو کر تعلیم سے دلبرداشتہ ہو جاتا ہے۔ مڈل، میٹرک، ایف اے اور بی اے کے امتحانات میں کتنے طالب علم ایسے ہیں جو انگریزی کے ہاتھوں اپنے تابناک مستقبل سے ہاتھ دھو بیٹھے ہیں۔ اگر ان طلبہ اور طالبات کی تعداد کا کوئی اندازہ کرنا چاہے تو سالانہ رزلٹ اٹھا کر دیکھیے کہ کس طرح معصوم طلبہ و طالبات کی امیدوں پر پانی پھیرا جاتا ہے۔

اردو زبان کے بارے میں ایک مغربی زدہ طبقہ کا یہ کہنا

ہے کہ بعض انگریزی الفاظ کا اردو متبادل لفظ ملنا مشکل ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ان کا یہ خیال کم علمی تعصّب اور ناواقفیت پر منحصر ہے۔ دراصل وہ لوگ ایک عرصہ تک انگریزی سے آشنائی کے بعد اردو کے مزاج سے واقف نہیں رہے۔ درحقیقت اردو اپنی اصلاحات تلمیحات استعارات تشبیہات اور تراکیب و محاورات سے مزین ایک مکمّل زبان ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ قومی سطح پر قومی زبان کو نمائندگی اور فروغ دیا جائے۔ اگر ایسا نہ کیا گیا اور ہماری غلامانہ ذہنیت کا یہی رویہ قائم رہا تو اردو زبان اپنا حسن اور دلکشی کھو بیٹھے گی۔

کالجوں اور یونیورسٹی کے طلبہ کا کہنا ہے کہ ٹیسٹ اور امتحان کے تیاری کے دوران بار بار ڈکشنری کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ اس طرح بیشتر وقت ضائع ہوجاتا ہے جبکہ اپنی قومی زبان میں بآسانی لکھا اور لیکچر سمجھے جاسکتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ انگریزی زبان قوم کے نوجوانوں کی فطری صلاحیتوں پر مسلّط ہے اور ابلاغ کے عمل میں بڑی رکاوٹ ہے۔ پاکستان سے ملی اور نظریاتی طور پر متصادم ہے اور قومی تقاضوں کو پورا کرنے سے قاصر ہے کیونکہ نفسیاتی طور پر اجنبی اور غیر مانوس زبان میں جب کوئی مضمون پڑھا جاتا ہے تو ذہنی صلاحیتیں اس زبان کے مشکل الفاظ میں الجھ کر رہ جاتی ہیں اور اصل مضمون کی طرف توجہ کم ہوجاتی ہے۔ اس لیے اگر کوئی طالب علم زبان سیکھ بھی لے تو مکمّل عبور نہ رکھنے کی وجہ سے مختلف الجھنوں کا شکار ہوجاتا ہے اور اس زبان میں تحقیقی کام کرنے سے گریز کرتا ہے۔

چونکہ دفاتر میں سرکاری زبان انگریزی ہے۔ اس لیے طریقہ تعلیم بھی انگریزی ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ ہمارے کالج اور یونیورسٹیاں مغربی درسگاہوں کا چربہ ہیں تو بے جا نہ ہوگا کیونکہ یہ درسگاہیں، ادیب وکلا، صحافی ڈاکٹر انجینئر اور معیشت دان تیار کرتی ہے جو قومی مشینری کے پرزے ہوتے ہیں اور زندگی کے مختلف شعبوں میں خدمات سرانجام دیتے ہیں مگر آج کل یہ انگریزی سے مسلح اور اردو سے نابلد ہوتے ہیں۔ اس لیے ضروری ہے کہ خصوصاً تعلیمی اداروں میں اردو زبان کو فروغ دیا جائے تاکہ یہاں سے فارغ ہونے والے افراد قومی معیشت ثقافت اور ادب میں رنگ بھر سکیں۔

تعجّب کی بات یہ ہے کہ ایک طرف پاکستانی ذرائع ابلاغ قومی زبان کی ترقی و ترویج کے لیے کوشاں ہیں اور دوسری طرف ملک بھر میں گلی گلی انگلش میڈیم اسکول کھل رہے ہیں اور انگریزی اسکولوں میں تعلیم حاصل کرنا فیشن اسکول قائم کرنے والوں کے لیے سودمند تجارت کی صورت اختیار کرگیا ہے جس کی وجہ سے اردو اور انگریزی اسکول ذہنی طور پر ایک دوسرے سے متصادم ہیں۔

اردو کی ترقی کے سلسلہ میں مقتدر قومی زبان کا قیام عمل میں لایا گیا ہے۔ امید کی جاتی ہے کہ یہ مقتدرہ حکومت میں قومی زبان کی ترقی و ترویج میں اہم کردار ادا کرے گا۔

پرائمری مڈل تعلیم میں بچوں کو ذہن نشین کرایا جائے کہ غیر ملکی زبان ہے۔ ہماری قومی زبان اردو ہے نیز بچوں کو نصاب میں ایسی نظمیں شامل کی جائیں جن میں حب الوطنی اور قومی زبان کی اہمیت کو اجاگر کیا جائے۔

اردو کے نفاذ کی عملی تدابیر

☆ دفتروں، کارخانوں اور دکانوں کے بورڈ اردو میں لکھے جائیں اگر کہیں انگریزی ضروری ہو تو اردو ترجمہ ساتھ درج کیا جائے۔

☆ ریڈیو، ٹیلی ویژن اور دوسرے ذریعہ ابلاغ سے بھرپور انداز میں قومی زبان کی اہمیت کی تشہیر کی جائے۔

☆ مقابلے کے امتحانات، انٹرویو، ٹیسٹ اور تقرری کے خطوط اردو میں ارسال کیے جائیں۔

یہ بات خوش آئند ہے کہ ملک کے بڑے شہروں میں اردو ٹائپ اور مختصر نویسی کی کلاسیں شروع کی گئی ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ اس کی وسیع پیمانے پر حوصلہ افزائی کی جائے نیز دفتری اردو اور سرکاری مکتوب نویسی کی

ترتیب کا بھی اہتمام کیا جائے۔

یہ لازم ہے کہ صنعتی تکنیکی اور سائنسی تعلیم کے فروغ کے لیے پاکستانی دانشور سائنس دان اور ادیب انگریزی کتب کا اردو ترجمہ کریں اور یہ کام حکومت کی نگرانی و سرپرستی میں ہو۔

تقریباً ۹۸ فی صد نیوز چینل اور اخبارات اردو میں شائع ہوتے ہیں۔ جلسے، جلوس، قومی سطح کے سیمینارز اور اجلاسوں کی کارروائی بھی اردو میں ہوتی ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ ہر ضلع میں اردو اکیڈمی کا قیام عمل میں لایا جائے۔

انگریزی زبان کی علمی اور سائنسی اہمیت اپنی جگہ۔ لیکن قومی زبان کی نشوونما کے لیے ضروری ہے کہ ہمارے سائنس دان اور ادیب نہ صرف انگریزی بلکہ فرانسیسی جرمنی، روسی، چینی اور جاپانی زبان و ادب کا مطالعہ کریں اور ان کے اردو ترجمہ سے قومی ادب کو نکھار بخشیں۔

ملک بھر میں انگلش میڈیم اسکولوں کے قیام کی حوصلہ شکنی کی جائے۔

قومی اور صوبائی سطح پر ہونے والے اجلاس قومی زبان میں ہوں۔

میڈیکل اور انجینئرنگ میں اصطلاحات انگریزی میں ہوں تو کوئی حرج نہیں۔ باقی لیکچر اردو میں ہو اور رفتہ رفتہ اصطلاحات کا مترادف اردو میں تلاش کیا جائے۔

بعض لوگ بڑی دیانت داری اور خلوص سے یہ احتجاج کرتے ہیں کہ انگریزی کے بارے میں اتنی تنگ نظری نہ برتی جائے کہ انگریزی زبان و ادب سے بالکل ہی نظریں پھیر لی جائیں۔ ان کا نقصان یہ ہوگا کہ ہم انگریزی علوم وفنون میں پیچھے رہ جائیں گے۔ اس لیے کم از کم انگریزی مضمون کی حیثیت ضرور دی جائے کیونکہ یہ بین الاقوامی تشخّص کی حامی زبان ہے ان کا یہ احتجاج بجا ہے۔ چناں چہ ضروری ہے کہ اردو کی قومی زبان انگریزی کو بین الاقوامی زبان کے طور پر اپنایا جائے کیونکہ اردو پاکستان کے وجود اور ترقی کے لیے ناگزیر ہے۔ کوئی بھی زبان

عظیم لوگوں کی عظیم باتیں

☆ دعا اپنے لیے مانگنا عبادت ہے اور دوسروں کے لیے مانگنا خدمت ہے۔ عبادت سے جنت ملتی ہے اور خدمت سے اللہ ملتا ہے۔ (حضرت علیؓ)

☆ دل سمندر کی طرح ہے بظاہر خاموش مگر گہرائیوں میں طوفان موجزن ہیں۔ (ارسطو)

☆ انکساری کا راستہ لے کر چلو ورنہ ٹھوکر کھاؤ گے۔

(موڈی)

☆ سکون قلب کسی اور چیز کا نام نہیں بلکہ اللہ کے فضل کا نام ہے اور اللہ کا فضل جب نازل ہوتا ہے تو آپ کو سکون قلب محسوس ہوتا ہے۔ (واصف علی واصف)

☆ دنیا میں سب سے بڑی اور عظیم ہستی ماں ہے۔

(مولانا محمد علی جوہر)

(عبدالباسط رضا، لاہور)

قوموں کے تشخّص کو اجاگر کرنے میں مرکزی کردار ادا کرتی ہے۔ جس طرح چینیوں نے چینی زبان میں روسیوں نے روسی زبان میں جرمنیوں نے جرمنی زبان میں فرانس نے فرانسی اور جاپان نے جاپانی زبان میں ترقی کی ہے۔

یہ بات خوش آئند ہے۔ موجودہ حکومت نے وطن عزیز میں آزمائشی بنیادوں پر مختلف اداروں میں اردو کے نفاذ پر عمل کیا ہے۔ اس کے لیے مسلسل سرکاری سرپرستی کی ضرورت ہے کیونکہ نچلے اور متوسط طبقے میں اردو خواہ کتنی مقبول کیوں نہ ہو اور اس کے استعمال سے دفتری اور تعلیمی کارکردگی پر کتنا ہی خوشگوار اثر کیوں نہ پڑے لیکن جب تک حکمران طبقہ اردو کی اہمیت سے متاثر نہ ہوگا عملی طور پر اس کا مکمّل نفاذ مشکل رہے گا۔ تا کہ ان لوگوں کو اطمینان ہو جو عرصہ دراز سے قومی زبان کے نفاذ کے لیے اپنی زبان اور قلم سے جدوجہد کرتے رہے ہیں۔

رائفل اور ٹیلی سکوپ کی چوری
ضرور کسی سازش کا حصہ تھی

الجلاد

جلد سے جلد دولت حاصل کرنے کی خواہش
نے انہیں جرائم کی دلدل میں دھنسا دیا

تحریر: جیمز ہیڈلے چیز
ترجمہ: صداقت حسین ساجد

دوسری قسط

میگی کے دل میں انجانا سا خوف پیدا ہوا۔

"بہتر یہ ہوگا کہ آئندہ تم اپنے طور پر سفر کرو۔"

"کیا مطلب ہے تمھارا..... تم مجھے چھوڑ کر جا رہے ہو؟"

میگی کی آنکھوں میں خوف کی پرچھائیاں دیکھ کر چک اپنی مسکراہٹ چھپا کر آسمان کو تکنے لگا۔

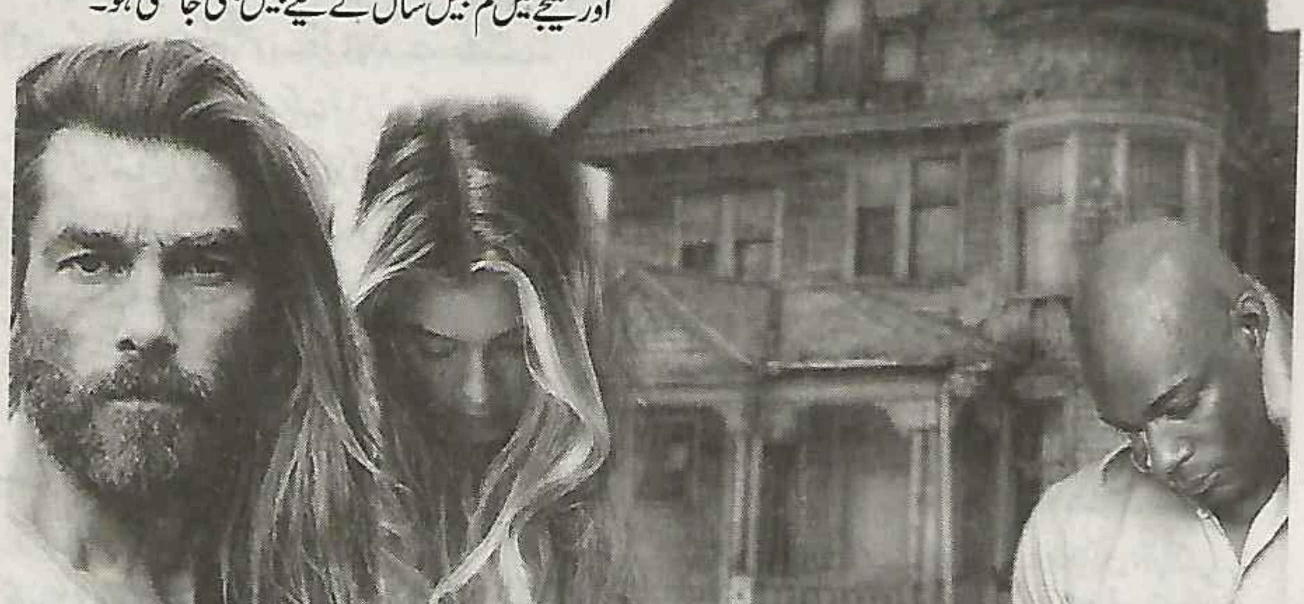
"دیکھو لڑکی! میں اس طرح کی زندگی سے عاجز آ چکا ہوں۔" وہ بولا۔ "مجھے دولت کی ضرورت ہے۔"

"چک! تم مجھ سے تعلق توڑنے کا ارادہ تو نہیں کر رہے؟"

"میری بات سنو!" چک نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔ "دولت حاصل کرنے کے لیے آدمی کو خطرات مول لینا پڑتے ہیں...... میں تمھیں ان خطرات میں شامل نہیں کرنا چاہتا، اس لیے مناسب یہی ہوگا کہ میں اور تم الگ ہو جائیں۔"

"خطرات سے تمھارا کیا مطلب ہے؟"

"پوکی نے ایک اچھا منصوبہ بنایا ہے...... اس میں مدد دینے کے لیے اسے میری مدد کی ضرورت ہے...... اسے ایک لڑکی بھی چاہیے، مگر اس منصوبے میں خطرات پیش آ سکتے ہیں اور نتیجے میں تم بیس سال کے لیے جیل بھی جا سکتی ہو۔"



چک بہت مطمئن تھا کہ وہ میگی کو بڑے اچھے طریقے سے سنبھال رہا ہے۔ میگی یہ سن کر ششدر رہ گئی۔

''تو یہ دونوں کوئی مجرمانہ منصوبہ بنا رہے ہیں۔'' اس نے سوچا۔

وہ تقریباً دو ماہ سے چک کے ساتھ تھی اور اگرچہ چک نے کئی بار چوری کرنے کا ارادہ کیا تھا، مگر کبھی اس پر عمل نہیں کیا تھا۔ میگی کا خیال تھا کہ اگر وہ چک کو اکسائے، تو وہ چوری کر سکتا ہے، لیکن اس نے ہمیشہ اسے روکا۔ وہ کبھی کبھی بھوکے بھی رہے، مگر اس نے چک کو چوری نہیں کرنے دی تھی، لیکن اب یہ سیاہ فام چک کو جرم کی طرف لے جا رہا تھا۔

''چک!'' میگی نے اس کا ہاتھ پکڑا۔ ''آؤ! اس سے پہلے کہ وہ واپس آئے، ہم یہاں سے چلے جاتے ہیں...... وہ پاگل ہے...... اس کا ساتھ مت دو...... ہم کہیں نہ کہیں کوئی نہ کوئی کام ڈھونڈ لیں گے...... آخر ہم اب تک ساتھ رہے ہیں...... تم چاہو گے، تو میں تمھارے لیے کوئی بھی کام کر لوں گی۔''

''بکواس بند کرو۔'' چک نے تیزی سے کہا۔ ''میں نے اس کا ساتھ دینے کا فیصلہ کر لیا ہے، اس لیے اب یہ نصیحتیں نہ کرو...... اگر تم چاہتی ہو، تو ضرور کام کرو، کیوں کہ شاید تمھیں پوری زندگی دھوپ میں کھڑے ہو کر سنگترے توڑنا پسند ہے، مجھے نہیں۔''

میگی کو پتا چل گیا کہ چک کو اس کے ارادے سے باز رکھنا ممکن نہیں۔ اس نے ایک گہری سانس لی۔ ظاہر تھا کہ اگر وہ گھر واپس نہیں جائے گی، تو یہی کچھ کرنا پڑے گا، مطلب سنگترے توڑنا پڑیں گے، مگر وہ اپنے گھر کے ماحول کی یکسانیت سے بے زار ہو چکی تھی۔

''کیا تمھیں بھی بیس سال کی سزا ہو سکتی ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''اگر منصوبہ ناکام ہو گیا، تو ضرور ہو سکتی ہے، مگر وہ ناکام نہیں ہو گا اور ہو بھی جائے، تو مجھے کوئی پریشانی نہیں...... میں جلد سے جلد دولت حاصل کرنا چاہتا ہوں اور یہ منصوبہ اس کا ایک ذریعہ ہے...... پوکی نے وعدہ کیا ہے کہ وہ اس منصوبے میں ساتھ دینے پر تمھیں پانچ سو ڈالر دے گا...... اس کا خیال تھا کہ تمھیں ہمارا ساتھ دینے پر کوئی اعتراض نہیں ہو گا، مگر میں نے کہا کہ یہ تمھارے مزاج کا کام نہیں ہے، بلکہ تمھارے اندر اس طرح کا کوئی کام کرنے کا حوصلہ ہی نہیں ہے۔''

میگی کے نزدیک دولت کی کوئی اہمیت نہیں تھی، لیکن تنہا رہ جانا اسے کسی بھی صورت گوارا نہیں تھا۔ چک کے ساتھ دو مہینے گزارنے کے بعد اب وہ اس سے الگ ہونے کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔

''مجھے کیا کرنا ہو گا؟'' آخر میگی نے پوچھا۔

چک نے اپنا چہرہ دوسری طرف کر لیا تا کہ میگی کو اس کے ہونٹوں پر کھیلتی فتح کی مسکراہٹ دکھائی نہ دے سکے۔

''تم سے جو کچھ بھی کرنے کو کہا جائے۔'' اس نے جواب دیا۔ ''اور اس کے بارے میں تمھیں جتنا بھی کم علم ہو، تمھارے لیے اتنا ہی سود مند ہو گا...... تم صرف اس شرط پر ہمارے ساتھ آ سکتی ہو کہ پوکی تم سے جو کچھ بھی کرنے کو کہے، تم کوئی سوال کیے بغیر اس کا کہنا مانو گی اور کبھی بحث نہیں کرو گی...... تمھیں پانچ سو ڈالر ملیں گے...... کام ختم ہونے پر ہم دونوں لاس اینجلس جائیں گے۔''

''مگر چک! یہ تو کوئی انصاف ہی نہ ہوا۔'' میگی نے کہا۔ ''کیا تم خود اندازہ نہیں لگا سکتے...... مجھے کچھ پتا نہیں ہے کہ میں کس خطرے کا حصہ بننے جا رہی ہوں...... پھر تم نے یہ بھی کہا کہ مجھے بیس سال کی قید ہو سکتی ہے...... اس کے باوجود تم بتانا نہیں چاہتے کہ وہ منصوبہ کیا ہے...... کیا یہ بات ٹھیک ہے؟''

''میں مانتا ہوں کہ یہ ٹھیک نہیں ہے۔'' چک کھڑا ہو گیا۔ ''مگر اس معاملے کی شرط یہی ہے...... تمھاری مرضی پر منحصر ہے کہ چھوڑ دو یا قبول کر لو...... پوکی اور میں آدھے گھنٹے میں یہاں سے روانہ ہو جائیں گے اور یہ تم پر منحصر ہے، ہمارا ساتھ دینا چاہتی ہو یا نہیں۔''

چک کو یقین ہو گیا تھا کہ اب میگی انکار نہیں کر سکتی، وہ ایک طرف کو جانے لگا۔ میگی نے اسے آواز دی۔

''چک! کیا تمھیں پوکی پر اعتماد ہے؟''

''میں کسی پر بھروسا نہیں کرتا...... تم پر بھی نہیں۔'' چک نے جواب دیا۔ ''اور نہ ہی کبھی کسی پر اعتبار کیا ہے، مگر میں اتنا ضرور جانتا ہوں کہ پوکی کا منصوبہ زبردست ہے اور مجھے یقین ہے کہ مجھے دولت ضرور ملے گی...... مجھے صرف اسی بات کی پروا ہوتی ہے...... یاد رکھنا...... میگی! ایک بار تم نے ساتھ دینے کا فیصلہ کرلیا، تو پھر مر کر ہی الگ ہوسکو گی۔''

چک چلا گیا اور میگی دیر تک نہر کنارے بیٹھی پانی کو تکتی رہی۔ اسے پوکی سے خوف آتا تھا، وہ سمجھ رہی تھی کہ وہ سارے کا سارا برا ہے اور پاگل بھی ہے، اسے یہ بھی احساس تھا کہ اس نے انکار کر دیا، تو پھر چک اس سے بچھڑ جائے گا۔ نیند کی گولیاں کھانا یا چاقو سے اپنی رگیں کاٹ لینا، چک سے بچھڑ کر زندہ رہنے سے زیادہ آسان تھا اور پھر وہ اٹھی اور ویران مکان کی طرف چل دی۔ چک اپنی چیزیں پیک کر چکا تھا اور اب باہر سیڑھیوں پر بیٹھ کر سگریٹ پی رہا تھا۔

''میں تمھارے ساتھ چلوں گی۔'' میگی نے چک سے کہا۔

''اور تم سے جو کرنے کو کہا جائے، کوئی بھی سوال پوچھے بغیر کرو گی۔''

''ہاں!''

''بہت اچھی بات ہے۔'' چک مسکرانے لگا۔ ''تمھیں ایک بات کا پتا ہے؟''

''کیا؟''

''میں تمھیں کھونا نہیں چاہتا تھا۔''

میگی کو اپنی آنکھوں میں نمی سی اترتی ہوئی محسوس ہوئی۔ یہ سب سے اچھی بات تھی، جو کسی نے اب تک اس سے کہی تھی اور جس طرح اس کا چہرہ چمک اٹھا، اسے دیکھ کر چک سمجھ گیا کہ اس نے درست وقت پر درست بات کی ہے۔ اس نے کھڑے ہو کر اپنے بازو کھول دیے اور میگی دوڑ کر اس سے لپٹ گئی۔

''اوہ...... چک! کیا یہ منصوبہ کامیاب ہو جائے گا؟'' چک کو میگی کا بدن لرزتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ ''میں بہت خوف زدہ ہوں...... وہ سیاہ فام...... مجھے یقین ہے کہ وہ پاگل ہے۔''

''تم اس کی فکر مجھ پر چھوڑ دو۔'' چک نے جواب دیا۔ ''اور اب جا کر اپنی چیزیں پیک کرلو۔''

بیس منٹ کے بعد پوکی ٹو ہولو ایک پرانی سی بیوک کار میں ظاہر ہوا۔ یہ گہرے نیلے رنگ کی اتنی معمولی اور عام سی کار تھی کہ کوئی بھی اسے دوسری بار دیکھنا پسند نہ کرتا، ایسی کار، جو ٹریفک کی بھیڑ میں کسی کو خاص طور پر متوجہ نہیں کرسکتی تھی۔ چک اور میگی کو سامان کے ساتھ سیڑھیوں پر بیٹھے دیکھ کر پوکی سمجھ گیا کہ چک نے میگی کو راضی کرلیا ہے۔

''ہمارا پہلا قیام فل فورڈ میں ہوگا۔'' اس نے چک کو مخاطب کیا۔ ''وہاں تم اپنے لمبے بالوں اور ڈاڑھی سے چھٹکارہ حاصل کرو گے...... جب ہم پیراڈائز سٹی میں داخل ہوں، تو ہم تینوں کو ایسے شریف اور معزز افراد دکھائی دینا چاہیے، جو اپنی چھٹیاں گزارنے آئے ہیں۔''

☆☆

سراغ رساں درجہ اوّل ٹام پیراڈائز سٹی پولیس ہیڈ کوارٹر کے سراغ رساں روم میں ایک ایسے آدمی کی طرح داخل ہوا، جس کا قد اچانک دس فٹ لمبا ہوگیا ہو۔ دوسرے درجے سے اوّل درجے میں اس کی ترقی کل ہی ہوئی تھی اور یہ وہ ترقی تھی، جس کے لیے وہ اٹھارہ ماہ سے کوشش کررہا تھا۔ اس ترقی کو اس نے اپنی بیوی کیرول کے ساتھ اپنی حد تک بڑے جوش و خروش سے منایا۔ سارجنٹ جان سراغ رساں روم کا انچارج تھا، اس نے ٹام کو آتے دیکھا، تو قدرے طنزیہ لہجے میں بولا۔

''اب یہ شہر بالکل محفوظ ہے...... آؤ! اپنی کرسی سنبھالو...... میں ذرا کھانا کھا کر آتا ہوں۔''

''مطمئن رہو...... سارجنٹ!'' ٹام نے آستین اوپر کرتے ہوئے کہا۔ ''میں سب کچھ سنبھال لوں گا...... فریڈ کی کوئی خبر ہے؟''

سارجنٹ فریڈ ہومی سائڈ ڈویژن ٹوٹی ہوئی ٹانگ لیے اسپتال میں داخل تھا۔ اگر وہ اپنے ڈویژن کا سارجنٹ نہ ہوتا، تو یہ ٹانگ ٹوٹنے کا واقعہ پورے ہیڈ کوارٹر میں اس کا مذاق اڑانے کی وجہ بنتا۔ فریڈ کا ایک چھ سالہ بیٹا تھا، فریڈ جونیئر، جو اپنے علاقے میں سلیری ایونیو کے نام سے مشہور تھا۔ اس نے ایک چڑچڑی خاتون کی بلی کے بچے کو صرف شرارت سے ایک درخت پر اچھال دیا تھا۔ فریڈ بوڑھی خاتون کی گالیوں سے بچنے کے لیے بلی کے بچے کو اتارنے خود درخت پر چڑھ گیا، مگر بدقسمتی سے درخت کی وہ شاخ، جس پر فریڈ بیٹھا تھا، ٹوٹ کر زمین پر آگری اور قدرتی بات تھی کہ اس کے ساتھ فریڈ بھی زمین بوس ہو گیا، نتیجے میں اس کی ٹانگ ٹوٹ گئی۔ بلی کا بچہ فریڈ کی ٹانگ تڑوا کر اپنے آپ اتر آیا۔

"فریڈ۔" جان مسکرایا۔ "وہ اپنے آپ کو بے عزت کر رہا ہے...... نرسیں اس کی بکواس کی شکایت کرتی ہیں، مگر وہ بہرحال صحت یاب ہو رہا ہے اور امید ہے کہ دو ہفتے میں ڈیوٹی پر واپس آجائے گا۔"

جان چلا گیا، تو ٹام نے سراغ رساں درجہ دوم میکس جیکوبی کو دیکھا، جو اپنی ہنسی چھپانے کی کوشش کر رہا تھا۔

"کوئی خاص خبر؟" ٹام نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"کچھ نہیں...... ہر طرف امن و امان ہے۔"

"اس وقت مجھے ایک مزے دار قتل کی واردات کی ضرورت ہے۔" ٹام بولا۔ "جنسی قتل ہو، تو زیادہ بہتر ہے...... آج کل فریڈ ہسپتال میں پڑا ہے، مجھے کارکردگی دکھانے کا اچھا موقع ملا ہے...... مجھے پتا ہے، فریڈ بے وقوف نہیں ہے، مگر میں بھی اس سے کم نہیں ہوں...... اب جب کہ مجھے ترقی مل گئی ہے، تو کیرول مجھے سارجنٹ بننے کے لیے تیار کر رہی ہے...... خواتین کبھی بھی کسی بات سے مطمئن نہیں ہوتیں...... تم خوش قسمت ہو کہ ابھی تک کنوارے ہو...... یہ نہ سوچنا کہ میں شادی کے خلاف ہوں...... اس کے حق میں بھی بہت کچھ کہا جا سکتا ہے۔"

ابھی جیکوبی نے کوئی جواب نہیں دیا تھا کہ فون کی گھنٹی بجنے لگی۔

"دیکھا تم نے!" ٹام نے فخر سے کہا۔ "میں جس وقت ہیڈ کوارٹر میں قدم رکھتا ہوں...... ایکشن شروع ہو جاتا ہے...... اوہ...... ہیلو! پولیس ہیڈ کوارٹر...... میں درجہ اوّل سراغ رساں ٹام بول رہا ہوں۔"

"سارجنٹ جان سے بات کراؤ۔" کسی مردانہ آواز نے غصے سے کہا۔

"سارجنٹ جان اس وقت ڈیوٹی پر موجود نہیں ہیں۔" ٹام کی پیشانی پر بل پڑ گئے کہ یہ کون بے وقوف ہے، جو جان کو اس سے بہتر افسر سمجھتا ہے۔ "مگر پتا تو چلے کہ معاملہ کیا ہے؟"

"میں ہارٹلے ڈوِن بات کر رہا ہوں...... کیا کپتان ٹیرل موجود ہیں؟"

ٹام سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ ہارٹلے نا صرف ڈسٹرکٹ اٹارنی کے آتشیں اسلحہ کا ماہر تھا بلکہ وہ ایک مہنگے اسلحہ ساز اسٹور کا مالک بھی تھا، جو امیروں کو ہر قسم کا شکاری اسلحہ مہیا کرتا تھا۔ بڑے اونچے تعلقات کا مالک ہونے کے ساتھ ساتھ وہ کپتان ٹیرل کا ذاتی دوست بھی تھا۔

"نہیں...... مسٹر ہارٹلے! چیف ابھی تک نہیں آئے...... کیا میں کوئی خدمت کر سکتا ہوں؟"

ٹام ساتھ میں یہ بھی سوچ رہا تھا۔

"کاش! میں یہ فون نہ ہی سنتا۔"

"کسی قابل آدمی کو جلدی یہاں بھیجو...... میرے اسٹور میں چوری ہو گئی ہے۔" جواب ملا۔ "اور جب کپتان ٹیرل آئے، تو اس سے کہنا کہ میں اس سے بات کرنا چاہتا ہوں۔"

"میں خود آ رہا ہوں...... مسٹر ہارٹلے! مجھے وہاں پہنچا سمجھیں...... بس!"

ٹام نے ریسیور رکھ دیا۔

"کیا مسٹر ہارٹلے کا فون تھا؟" جیکوبی نے پوچھا۔

"ہاں! چیف کو فون کرو کہ مسٹر ہارٹلے کے اسٹور میں

چوری ہوگئی ہے۔'' ٹام کھڑا ہوگیا۔ ''ان سے کہنا کہ میں تفتیش کرنے گیا ہوں۔''

ٹام پہنچا، تو مسٹر ہارٹلے نے مغرور لکھ پتیوں کے مخصوص انداز میں تیوری چڑھا کر پوچھا۔

''تم کون ہو اور جان کہاں ہے؟''

ٹام نخرے اٹھانے کے موڈ میں نہیں تھا۔

''یہ بے وقوف امیر اپنی جگہ اہم ہوگا، مگر اب میں بھی سراغ رساں درجہ اوّل ہوں۔''

''میں ٹام ہوں۔'' اس نے سخت لہجے میں جواب دیا۔

''آپ اسٹور میں چوری کے حوالے سے کیا کہہ رہے تھے؟''

''اوہ...... ہاں! میں نے تمھارا نام سنا ہے...... کیا ٹیرل آرہا ہے؟''

''انھیں خبر کر دی گئی ہے...... اگر یہ صرف چوری کی واردات ہے، تو میں بھی اس سے نبٹ سکتا ہوں...... چیف ذرا مصروف ہیں۔''

''اوہ...... ہاں! ضرور......'' ہارٹلے مسکرانے لگا۔ وہ اپنی کرسی سے اٹھا۔ ''میرے ساتھ آؤ۔''

وہ ٹام کو گودام میں لے گیا۔

''چوروں نے یہاں نقب لگائی ہے۔'' اس نے بتایا۔

ٹام نے اس چھوٹی سی کھڑکی کو دیکھا، جسے لوہے کی موٹی جالی سے محفوظ کیا گیا تھا، جالی ٹوٹ کر باہر کی طرف لٹک رہی تھی۔

''ایک لوہے کا تار...... ایک ہک اور ایک تار۔'' ٹام نے کھڑکی سے باہر تنگ گلی میں جھانکا۔ ''کوئی مشکل کام نہیں تھا...... چور کیا کیا لے گئے ہیں؟''

''تو کیا یوں جالی توڑی گئی ہے؟'' ہارٹلے نے ٹام کو قدرے توصیفی نگاہوں سے دیکھا۔ ''وہ میری ایک بہترین ٹارگٹ رائفل لے گئے ہیں...... جس کے ساتھ ٹیلی اسکوپ اور سائلنسر بھی لگا ہوا تھا...... اس کی قیمت پانچ سو ساٹھ ڈالر تھی۔''

''کوئی اور چیز بھی غائب ہے؟''

''رائفل کی گولیوں کا ایک ڈبا...... جس میں سو گولیاں ہوتی ہیں۔''

''رائفل کہاں رکھی جاتی تھی؟''

''آؤ! میں تمھیں دکھاتا ہوں۔''

ہارٹلے واپس اسٹور میں آیا اور کاؤنٹر پر رکھے ایک شیشے کے باکس کی طرف اشارہ کیا۔

''رائفل اس شوکیس میں تھی...... اسے باہر نکالنا مشکل نہیں تھا...... صرف شیشے کا ڈھکن اٹھانا پڑتا ہے...... میں نے اسے چھوا نہیں ہے کہ ہوسکتا ہے، اس پر انگلیوں کے نشانات موجود ہوں۔''

''ٹھیک ہے...... میں باقی عملے کو بلاتا ہوں...... ہم ہر جگہ انگلیوں کے نشانات تلاش کریں گے۔'' ٹام نے جواب دیا۔

مگر اس نے صاف شفاف چمک دار شیشے کو دیکھتے ہوئے اندازہ لگالیا تھا کہ یہ صرف ایک رسمی سی کارروائی ہوگی۔ رائفل کسی ایسے شخص نے چرائی تھی، جو دستانے پہنے ہوئے تھا۔

دو گھنٹے کے بعد چیف آف پولیس ٹیرل، جان اور ٹام...... ٹیرل کے دفتر میں بیٹھے اسی واقعے پر گفتگو کر رہے تھے۔

''کوئی سراغ نہیں...... انگلیوں کے نشانات نہیں...... یہ کسی ماہر کا کام ہے۔'' جان نے ٹام کی رپورٹ پڑھتے ہوئے کہا۔ ''جو کوئی بھی تھا، اسے پتا تھا کہ اسے کس چیز کی ضرورت ہے...... اسٹور میں اور بھی بہت سی رائفلیں اور گنیں تھیں، جنھیں چرایا جاسکتا تھا، مگر اس نے صرف ایک اور وہ بھی سب سے قیمتی رائفل چرائی۔''

''ہارٹلے کے اسٹور میں زیادہ تر شکاری گنیں اور رائفلیں ہیں۔'' ٹیرل نے کہا۔ ''مگر جو رائفل چرائی گئی، وہ ٹارگٹ رائفل ہے...... آخر وہی کیوں چرائی گئی؟''

''ایک رائفل جس میں ٹیلی اسکوپ لگی ہو اور سائلنسر بھی لگا ہو، کسی سرپھرے امیر نوجوان کو پسند ہوسکتی ہے۔'' ٹام نے کہا۔ ''ہوسکتا ہے، اسے شوکیس میں دیکھ کر ہی چور کے ہاتھوں میں خارش ہونے لگی ہو۔''

''ہوسکتا ہے۔'' ٹیرل نے جواب دیا۔ ''لیکن وہ رائفل

قاتلوں کا ہتھیار ہے...... پریس کو خبردار کردو...... رائفل کی ایک تصویر اخبارات میں شائع کرادو...... ممکن ہے، کوئی امید بھری اطلاع مل جائے...... میں اس لیے زیادہ پریشان ہوں کہ وہ قاتلانہ ہتھیار ہے، کہیں کوئی چالاک آدمی کسی کے قتل کا منصوبہ نہ بنارہا ہو۔"

☆☆

ڈین میکوئن فلوریڈا کیننگ اینڈ گلاس کارپوریشن کا صدر تھا، جو پھل پیدا کرنے والوں کے لیے پیکنگ کا سامان تیار کرتا تھا۔ میکوئن تین شادیاں کرچکا تھا، تینوں نے اسے چھوڑ دیا تھا، کیوں کہ اس کے رہن سہن، اس کی بدسلوکی اور اس کے مطالبات کو پورا کرنا ہر ایک کے بس کی بات نہیں تھی۔ میکوئن گھڑی کے مطابق چلتا تھا۔ صبح سات بجے سو کر اٹھتا، آدھے گھنٹے تک اپنے مکان کے تہ خانے میں ورزش وغیرہ کرتا، سات بج کر اکتیس منٹ پر غسل کرتا، آٹھ بجے ناشتا، نو بجے تک ضروری جوابات لکھواتا، ٹھیک نو بج کر تین منٹ پر اپنی رولز رائس کار میں دفتر کے لیے روانگی۔ یہ ایسے معاملات تھے، جن میں کبھی کوئی تبدیلی نہیں آتی تھی۔ تین سال کے دوران میں مارتھا ڈیلون نے اسے کبھی بھی ایک سیکنڈ بھی لیٹ ہوتے ہوئے نہیں دیکھا تھا، جب سے وہ اس کی سیکرٹری کے فرائض سرانجام دے رہی تھی۔

اس چمک دار صبح کو بھی جب میکوئن ناشتے کے کمرے میں داخل ہوا، تو مارتھا گھڑی دیکھے بغیر بتا سکتی تھی کہ اس وقت ٹھیک آٹھ بج رہے ہیں۔ مارتھا چھتیس سال کی لمبے قد کی مالک عورت تھی۔ خوب صورت بالکل نہیں تھی، لیکن ہوشیار اور چست بہت تھی، وہ اس دن کی ڈاک کے ساتھ اس کا انتظار کررہی تھی۔ اس نے سلام کیا، میکوئن نے سر کے اشارے سے جواب دیا۔ وہ ایسا آدمی تھا، جو الفاظ کو فضول استعمال کرنے کا قائل نہیں تھا۔

"کوئی خاص خط ہے؟" اس نے ناشتا کرتے ہوئے پوچھا۔

"جی نہیں...... وہی عام سی ڈاک ہے...... البتہ ایک عجیب چیز ضرور ہے۔" مارتھا نے جواب دیا۔

"عجیب چیز...... کیا مطلب؟"

مارتھا نے اس کے سامنے ایک سستا سا کاغذ رکھ دیا۔

"یہ بھی ڈاک میں شامل تھا۔" اس نے بتایا۔

میکوئن نے اپنی عینک لگائی اور کاغذ اٹھا کر دیکھا۔ کاغذ پر یہ پیغام لکھا ہوا تھا۔

آر...... آئی...... پی......

۰۹۰۳

الجلاد

"یہ کیا بلا ہے؟" میکوئن نے غصے سے کہا۔

ٹوکو کا منہ بن گیا، جو میکوئن کی کرسی کے پیچھے کھڑا تھا کہ آج صبح کی ابتدا اچھی نہیں ہوئی۔

"مجھے نہیں پتا۔" مارتھا نے جواب دیا۔ "میں نے یہ سوچا کہ اگر آپ یہ دیکھ لیں، تو اچھا ہے۔"

"مگر کیوں؟" میکوئن نے اسے گھورا۔ "کیا تم خود نہیں سمجھ سکتی تھیں کہ یہ کسی پاگل کی حرکت ہے...... پھر مجھے پریشان کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ تم نے جان بوجھ کر میرا ناشتا برباد کرنے کی کوشش کی ہے۔"

"میں معذرت خواہ ہوں...... مسٹر میکوئن!"

میکوئن نے گھوم کر ٹوکو کو تیز نظروں سے گھورا۔

"یہ ٹوسٹ بالکل ٹھنڈا ہے...... تم لوگوں کو کیا ہوگیا ہے؟ گرم ٹوسٹ لاؤ۔"

نو بج کر تین منٹ پر اس نے جوابات مکمّل کیے اور بدستور بگڑے ہوئے موڈ میں اپنی رولز رائس کار کی طرف بڑھا۔ برانٹ، اس کا ادھیڑ عمر ڈرائیور کار کا دروازہ کھولے کھڑا تھا، مارتھا اسے خدا حافظ کہنے سیڑھیوں تک آئی۔

"میں چھ بجے واپس آؤں گا...... آج ہالی ڈے آرہا ہے...... اس نے ساڑھے چھ بجے آنے کو کہا ہے، مگر تمھیں پتا ہے کہ وہ کس طرح کا آدمی ہے...... وہ کبھی وقت پر......"

یہ میکوئن کے منہ سے نکلنے والے آخری الفاظ تھے۔ اس

کے بعد جو خوف ناک منظر مارتھا کی نگاہوں نے دیکھا، وہ اسے مرتے دم تک نہیں بھول سکتی تھی۔ وہ میکوئن کے پاس کھڑی تھی، اس نے میکوئن کے ماتھے کو خون آلود ہوتے ہوئے دیکھا۔ ماتھے میں ہونے والے سوراخ میں سے اس کا بھیجا بہ کر باہر نکلا۔ خون اور اس کے مواد کے کچھ چھینٹے مارتھا کے چہرے اور کپڑوں پر بھی آئے۔ میکوئن بریف کیس ہاتھ میں لیے گرا اور باقی سیڑھیوں سے لڑھکتا چلا گیا اور مارتھا خوف کے مارے چیخنے لگی۔

ایک پٹرولنگ پولیس کار کے انچارج رابرٹ نے مارتھا کی چیخیں سنیں اور حالات جاننے کے بعد پولیس ہیڈ کوارٹر میں رپورٹ کی۔ اس کا فون ٹام نے اس وقت سنا، جب وہ مقامی پریس کو چرائی ہوئی ٹارگٹ رائفل کے بارے میں ہدایات دے کر فارغ ہی ہوا تھا۔ اس نے اس کی اطلاع ٹیرل کو دی اور خود جان کے ساتھ جائے وقوعہ پر روانہ ہو گیا۔ ٹیرل کو رپورٹ ملی، تو وہ سمجھ گیا کہ یہ ایک قتل کی واردات ہے اور قتل ایسا جرم تھا، جو کافی عرصے سے پیراڈائز سٹی میں سرزد نہیں ہوا تھا۔ خاص طور پر شہر کی ایک بہت بڑی بااثر شخصیت کا قتل......

وہ جائے وقوعہ پر پہنچے۔ پانچ منٹ کے بعد ایک ایمبولینس کے ساتھ پولیس میڈیکل افسر ڈاکٹر لوئیس بھی آ گیا۔ ٹیرل کے پہنچنے تک لاش کو مردہ خانے بھیج دیا گیا تھا۔

''اس لڑکی کا کیا حال ہے؟'' ٹیرل نے پوچھا۔

''میں نے اسے سکون آور ٹیکا لگا دیا ہے۔'' ڈاکٹر لوئیس نے بتایا۔ ''مگر تم کم از کم چوبیس گھنٹے تک اس سے پوچھ گچھ نہیں کر سکو گے...... وہ ڈر کے مارے آدھی پاگل ہو رہی ہے۔''

''کوئی خیال...... ڈاکٹر!''

''کسی طاقت ور رائفل سے گولی چلائی گئی ہے...... میں واپس جا کر گولی نکالوں گا، لیکن میرا اندازہ ہے کہ جس رائفل سے یہ گولی چلائی گئی ہے، اس پر ٹیلی اسکوپ لگی ہوئی تھی۔''

جان اور ٹیرل نے معنی خیز نگاہوں سے ایک دوسرے کو دیکھا۔

''گولی کس زاویے سے چلائی گئی ہے؟'' ''کچھ بلندی سے۔''

ٹیرل، ڈاکٹر لوئیس کے ساتھ ٹیرس پر گیا اور اپنے سامنے کے منظر کا جائزہ لیا۔

''شاید اس طرف کسی جگہ سے۔'' ڈاکٹر لوئیس نے ہاتھ کے اشارے سے بتایا۔ ''یہاں میرا کام ختم ہو گیا ہے، اس لیے میں جا رہا ہوں۔''

ٹیرل اور جان نے سامنے کا منظر دیکھا، بڑے بڑے درخت قطار کی شکل میں استادہ تھے۔ درختوں کے دوسری طرف ہائی وے سڑک واقع تھی۔ اس کے بعد کچھ خالی جگہ اور پھر کافی فاصلے پر رہائشی عمارتوں کا ایک بلاک جس کی چھت سیدھی تھی۔

''اگر نشانہ وہاں سے لیا گیا ہے، تو نشانچی کے ماہر ہونے میں کچھ شک نہیں۔'' جان نے کہا۔

''اس کے سوا کوئی جگہ بھی تو نہیں ہے جہاں سے گولی چلائی جا سکے۔'' ٹیرل بولا۔ ''تم نے سنا، ڈاکٹر لوئیس کیا کہہ رہا تھا...... کوئی طاقت ور رائفل جس میں ٹیلی اسکوپ لگی ہو...... ہو سکتا ہے کہ وہ ہارٹلے کے ہاں سے چرائی ہوئی رائفل ہو۔''

''ہاں! زخم سے گولی نکالنے کے بعد زیادہ یقین سے کہا جا سکے گا۔''

ٹیرل نے ٹام کو بلایا۔

''جتنے آدمیوں کی ضرورت ہو، ساتھ لے جاؤ اور رہائشی بلاک کو پوری طرح دیکھو۔'' اس نے حکم دیا۔ ''خصوصاً چھت پر اور ایسے اپارٹمنٹ دیکھو، جو خالی ہوں...... کوئی اپارٹمنٹ خالی نہ ہو، تو سارے اپارٹمنٹس دیکھو...... مجھے بتانے کی ضرورت نہیں ہے کہ تمھیں کیا کرنا ہے۔''

''ٹھیک ہے...... چیف!''

ٹام نے ہومی سائڈ محکمہ کے چار آدمی ساتھ لیے اور گاڑی میں بیٹھ کر اپارٹمنٹ بلاک کی طرف روانہ ہو گیا۔

''آؤ! جب تک ہم میکوئن کے جاپانی ملازم سے پوچھ گچھ کر لیں۔'' ٹیرل نے کہا۔

''ذرا دیکھیے! تو کون آیا ہے؟'' جان اچانک بولا۔

ایک سیاہ بالوں اور لمبے قد والا آدمی اپنی کار سے اتر رہا تھا۔ کبھی کسی نے اسے بتایا تھا کہ اس کی شکل مشہور فلمی ستارے جیمز اسٹوارٹ سے ملتی ہے، تب سے اس نے اپنی عادتوں میں اس کی نقل کرنا شروع کر دی تھی۔ یوں تو اس کا نام پیٹی ہملٹن تھا اور وہ اخبار پیراڈائز سٹی سن اور مقامی ٹی وی اسٹیشن کا کرائم رپورٹر تھا۔

''اسے تم سنبھالو۔'' ٹیرل نے سرگوشی کی۔ ''اسے رائفل کے بارے میں کچھ نہ بتانا...... یوں ظاہر کرنا جیسے تمھیں کچھ بھی پتا نہ ہو۔''

اتنا کہہ کر ٹیرل مکان کے اندر چلا گیا۔ ہر برانٹ، میکوئن کا ڈرائیور کچھ خاص نہیں بتا سکا تھا۔ وہ ابھی تک قتل کے واقعے کے بارے میں خوف زدہ تھا۔ ٹیرل کو جلد ہی محسوس ہو گیا کہ وہ اس سے سوال کر کے صرف وقت ضائع کر رہا ہے، مگر جاپانی ملازم ٹوکو جس نے قتل ہوتے ہوئے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا، نارمل تھا۔ اس نے ٹیرل کو وہ عجیب کاغذ دکھایا، جسے میکوئن نے ردی کی ٹوکری میں پھینک دیا تھا۔ اس نے ٹیرل کو میکوئن کے مزاج اور عادات کے متعلّق تفصیل سے بتایا تھا۔ اس کی بیان کردہ باتیں ٹیرل کو بہت سودمند معلوم ہوئیں۔

دوسری طرف جان کو ہملٹن سے نبٹنے میں خاصی مشکل پیش آ رہی تھی۔

''میں سمجھ گیا کہ بس یہ ایک واردات تھی، جو ہو گئی۔'' ہملٹن نے کہا۔ ''مگر تم نے کچھ نہ کچھ تو رائے قائم کی ہو گی...... میکوئن ایک اہم شخص تھا...... اسے قتل کر دیا گیا...... کینڈی کی طرح کیا تمھیں نہیں لگتا کہ یہ اس شہر کے لیے برسوں میں پیش آنے والی سب سے بڑی اخباری خبر ہے۔''

''میں سمجھتا ہوں کہ یہ ایک بڑی خبر ہے، مگر تم اسے کینڈی کے قتل سے کیوں ملا رہے ہو...... میکوئن امریکا کا صدر تو نہیں تھا۔''

''صاف بات کرو...... مجھے کوئی خبر ملے گی یا نہیں۔'' ہملٹن نے تیزی سے کہا۔

''اگر میرے پاس کوئی خبر ہوتی، تو تمھیں ضرور مل جاتی۔'' جان نے جواب دیا۔ ''اس وقت میرے پاس کہنے کے لیے کچھ نہیں ہے۔''

''ہارٹلے کے اسٹور سے جو رائفل چوری کی گئی ہے...... کیا یہ قتل اسی سے کیا گیا ہے؟''

''ہم اس امکان کی تحقیقات کر رہے ہیں۔''

''مجھے کس وقت تک کچھ بتا سکو گے؟''

''ہو سکتا ہے...... دو گھنٹے کے بعد...... ہم دوپہر تک ہیڈکوارٹر میں ایک پریس کانفرنس کر رہے ہیں۔''

ہملٹن واپس اپنی کار میں جا بیٹھا۔ جان نے اسے جاتے دیکھا اور پھر مکان میں چلا گیا۔ ٹیرل اس وقت ٹوکو سے پوچھ گچھ کر رہا تھا۔ جب اس کے پاس بتانے کو کچھ باقی نہ رہا، تو ٹیرل نے اسے واپس بھیج دیا۔ جب ٹیرل اور جان تنہا رہ گئے، تو ٹیرل نے اسے وہ کاغذ دکھایا۔

''کیا یہ کسی پاگل کی حرکت ہے؟''

''دھوکا دینے کی کوشش بھی تو ہو سکتی ہے۔''

دونوں کو پتا تھا کہ اگر کسی پاگل کے ہاتھ میں رائفل آ جائے، تو اسے پکڑنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ جان نے کاغذ ایک لفافے میں رکھ لیا۔

''میں اسے پولیس کی لیبارٹری بھیج رہا ہوں۔'' اس نے کہا۔ ''ہملٹن کے ذہن میں بھی ٹارگٹ رائفل موجود ہے...... ہمیں پریس پبلسٹی اور تنقید کا سامنا کرنا پڑے گا۔''

ابھی ٹیرل اور جان کو واپس ہیڈکوارٹر روانہ ہوئے پانچ منٹ بھی نہیں گزرے تھے کہ ہملٹن دوبارہ مکان پر پہنچ گیا۔

اس نے ٹوکو سے بات کی، اس کی تصویریں اتاریں، وہ جا رہا تھا کہ دو مزید اخباری رپورٹر آ پہنچے۔ ہملٹن کی رپورٹ گیارہ بجے کے ٹی وی پروگرام میں نشر ہوئی۔ ٹارگٹ رائفل کی تصویر...... میکوئن کے مکان اور اردگرد کے علاقے کی تصویریں دکھائی گئیں۔ خصوصاً اپارٹمنٹ بلاک کا منظر۔ ہملٹن نے اپنے ناظرین کو اس کاغذ کے بارے میں بھی بتایا۔

''یہ آدمی کون ہے؟'' (جاری ہے)